زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	7000 روپے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37 - اردو بازار کراچی

مستقل سلسلے

نومبر 2015
جلد 38 شمارہ 8
قیمت 60 روپے

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37-اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

آداب

دن، ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں بدلے اور پھر سالوں کی مسافت طے کر کے تاریخ کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ دنیا کے اکثر انقلاب وقت کے ساتھ ساتھ اپنا اثر کھوتے جاتے ہیں۔ سیاسی اغراض کے انقلابات شہرت دوام حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ لیکن کربلا کے انقلاب میں کوئی جذبۂ قومیت کار فرما نہیں تھا۔ یہ ایک اعلا مقصد کے حصول کا انقلاب تھا۔ اسی لیے آج تک لوگوں کے دلوں میں زندہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ نو، دس محرم الحرام کے دن خیر و عافیت سے گزر گئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں پر رحم فرمائے۔ خاص کر ہمارے عزیز وطن پاکستان پر جو اس وقت بہت ——— مصیبتوں اور آزمائشوں میں گھرا ہے۔ پے در پے ایک کے بعد ایک آزمائش ہمارے وطن عزیز کو درپیش ہے۔ دہشت گردی کی جنگ سے تو اس وقت افواج پاکستان نبرد آزما ہے ہی لیکن قدرتی آفات کا بھی مستقل سامنا ہے۔ پاکستان کئی سال سے سیلاب کی تباہ کاریوں کی زد میں ہے۔ کئی دیہات صفحۂ ہستی سے ہر سال مٹ جاتے ہیں۔

اب دس سال پہلے کی طرح زمین کی جنبش نے بہت سی زندگیوں کے چراغ گل کر دیے۔ پاکستان کے بیشتر شہروں میں زلزلے کے جھٹکے محسوس کیے گئے۔

جو قوم اللہ عزوجل کی نافرمانی کرتی ہے اس پر قحط و ذلت مسلط کر دی جاتی ہے۔ زلزلوں کے جھٹکوں کے ذریعے ہمارے ضمیر کو جھنجوڑا جاتا ہے تاکہ مسلمان گناہوں بھری زندگی سے کنارہ کشی اختیار کریں اور صلوٰۃ و سنت کے پابند ہو جائیں۔

ہم مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اللہ تعالیٰ سے سچے دل سے رجوع کر کے اپنے صغیرہ اور کبیرہ سارے گناہوں سے توبہ کرنی چاہیے۔ کیونکہ قدرت قوموں کو جگانے کے لیے ہی ایسے ——— جھٹکے دیتی ہے۔ یہ قوموں پر بیماریاں، آتش فشاں، سیلاب، سونامی اور زلزلے بھیج کر انہیں بتا دیتی ہے۔

یہ ایک قومی المیہ ہے اس لیے اپنے سارے اختلافات بھلا کر اپنے ہم وطنوں کی جس حد تک ممکن ہو سکے، مدد کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ آسانیاں پیدا کرنے والا ہے۔

اس شمارے میں،

- اداکار زاہد افتخار احمد سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ منشا پاشا کہتی ہیں میری بھی سنیے،
- "آواز کی دنیا سے"۔ اس ماہ مہمان ہیں مظہر علی قریشی،
- اس ماہ شفق راجپوت کے مقابل ہے آئینہ،
- "واپنرل"، تنزیلہ ریاض کا سلسلے وار ناول،
- "رداۓ وفا" فرحین اظفر کا سلسلے وار ناول،
- "میں گمان نہیں یقین ہوں"، نبیلہ ابر راجہ کے مکمل ناول کی آخری قسط،
- "دامن دل"، عنبرین ولی کا مکمل ناول،
- فائزہ افتخار کا دلچسپ ناولٹ "شاید"،
- مریم ماہ منیر کا ناولٹ "تم ہی میرا حوالہ ہو"
- "زندگی مسکرانے لگی"، ام ایمان کا ناولٹ،
- سعدیہ عزیز آفریدی، سمیرا غزل، عابدہ احمد، آسیہ عارف، عائشہ جمیل اور شازیہ ستار نایاب کے افسانے اور مستقل سلسلے،

تحفت،

کرن کتاب "یوگا کے ذریعے صحت مند اور اسمارٹ بنیے"، کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے۔

حمد باری تعالیٰ

ہر ایک لغزشِ پا کو سنبھالنے والا
وہی ہے سب کو غموں سے نکالنے والا

درونِ سنگ جو دیتا رزق کیڑے کو
وہی ہے دل میں امیدوں کو پالنے والا

یہ کہکشاؤں کی شمعیں اسی سے روشن ہیں
کہ جس کا نور ہے دو جہاں اُجالنے والا

بس اک نگاہ وہی گرہیں کھولنے والی
بس اک سخن وہی رستے نکالنے والا

فلک کو دیتا ہوا بے نشان پہنائی
زمین کی سمت ستارے اُچھالنے والا

اسی نے لفظ کی حرمت لبوں کو سکھلائی
وہی ہے پاسِ وفا دل میں ڈھالنے والا

درونِ جان یہ ہدایت کی لَو اُسی سے ہے
وہی ہے روح کا زنداں اُجالنے والا

امجد اسلام امجد

نعت رسولِ مقبول ﷺ

تیرے ہونے کا یقیں ہے مجھ کو
اپنے ہونے کا نہیں ہے یقیں مجھ کو

تیری سیرت ہے مرے پیشِ نظر
یہی دُنیا، یہی دیں ہے مجھ کو

خواب ہی میں تری صورت دیکھوں
شوق ہے، تاب نہیں ہے مجھ کو

ثبت جس پر ترے قدموں کے نشاں
جاں سے بڑھ کر وہ زمیں ہے مجھ کو

حی و قیوم کا بندہ ہوں میں
موت کا خوف نہیں ہے مجھ کو

نارِ ماحول بنے گی گلزار
یہ ابراہیمی یقیں ہے مجھ کو

محمد اکرم طاہر

★ ''کردار لیتے وقت کیا ذہن میں ہوتا ہے؟''

✳ ''یہی بات ذہن میں ہوتی ہے کہ جو بھی کردار کروں وہ چیلنجنگ ہو خواہ وہ نگیٹو ہو یا پوزیٹو ہو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے جو نگیٹو رول کیا وہ نہ صرف کرنے میں مجھے مزہ آیا بلکہ وہی سب سے زیادہ رجسٹرڈ بھی ہوا۔۔۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے ولن ٹائپ کے رول پسند ہیں بلکہ جو بھی کردار ہو اس میں پرفارمنس مارجن زیادہ ہو۔ کیونکہ میں تھیٹر سے آیا ہوں تو جب تک پرفارمنس والا کردار نہ کروں میری پیاس نہیں بجھتی۔ تو جب مجھے کوئی کردار آفر ہوتا ہے الحمدللہ کہ ہر ہفتے سات آٹھ اسکرپٹ مجھے آفرز ہوتے ہیں) تو ان سے میرے کچھ بنیادی سوال ہوتے ہیں' ایک تو یہ کہ اسکرپٹ فی میل Based ہے یا میل Based ہے کیونکہ مارکیٹ میں ابھی بھی کچھ رائٹرز

زاہد افتخار سے ملاقات

شاہین رشید

اکثر ڈراموں میں جو کردار نگیٹو ہوتا ہے وہ اپنے انجام تک نگیٹو رہتا ہے اور پوزیٹو کردار تو ویسے ہی لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹ رہا ہوتا ہے۔ مگر گذشتہ دنوں کچھ ڈرامے ایسے بھی دیکھنے میں آئے جن میں نگیٹو کردار سے کبھی بہت نفرت تو کبھی بہت ہمدردی ہونے لگتی تھی اور یہ کمال رائٹر کا تو تھا ہی مگر اس سے کہیں زیادہ اس اداکار کا تھا کہ جس کی پرفارمنس نے ناظرین کو متاثر کیا۔ کم عرصے میں اپنے آپ کو منوانے والا یہ فنکار زاہد احمد ہے۔ جسے آج کل آپ ''تم میرے پاس رہو'' اور ''سنگت'' میں دیکھ رہے ہیں۔

★ ''کیا حال ہیں جی۔۔۔ اور کیا مصروفیات ہیں؟''

✳ ''اللہ کا شکر ہے اور مصروفیات ماشاء اللہ کافی ہیں۔ کچھ اسکرپٹ ہیں میرے پاس جن کے مطالعہ میں لگا ہوا ہوں کہ کونسا اچھا ہے اور کونسا ایسا ہے جس پہ کام کیا جا سکتا ہے۔''

ایسے ہیں جن کے اسکرپٹ male Based ہوتے ہیں جو مرد کے کردار پر لکھتے ہیں۔ اور اگر ایسا کردار نہ ملے تو پھر یہ دیکھتا ہوں کہ اگر کوئی نگیٹو کردار ہے تو وہ کچھ کر تو رہا ہے نا۔۔۔ وہ فیصلے لیتا ہے یا ہنگامے لیتا ہے یا حرکتیں کرتا ہے یا اس کی اپنی ایک ادا ہوتی ہے جیسے ڈرامہ سیریل ''الوداع'' میں رمیز کا کردار تھا۔ اس کی ادا اس کی حرکتیں ہمیں اسکرپٹ پڑھتے وقت اتنا مزہ دے رہی تھیں کہ پھر اس کردار کو نبھانے میں بھی بہت مزہ آیا۔ تو بس میرا دل چاہتا ہے کہ میں جو بھی کردار کروں وہ ایویں ہی نہ ہو۔''

★ ''کردار پر آپ فوکس کرتے ہیں۔ ڈائریکٹر اور رائٹر پہ بھی نظر رکھتے ہیں؟''

✳ ''جی میں اپنے کردار پہ زیادہ فوکس ہوتا ہوں۔ ہمارے یہاں ڈائریکٹرز تو گنتی کے ہی ہیں اور رائٹرز بھی اور اگر آپ کسی خاص رائٹر کے انتظار میں بیٹھے رہیں

گے تو آپ کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ میں نے اس فیلڈ میں اپنے مختصر سے عرصے میں یہ بات نوٹ کی ہے کہ تھیٹر کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ایکٹر کا میڈیم ہے۔ فلم ڈائریکٹر کا میڈیم ہے تو اس طرح ٹی وی رائٹر کا میڈیم ہے۔ آپ کی پرفارمنس کتنی بھی اچھی ہو' کاسٹ کتنی بھی اچھی ہو۔ اگر اسٹوری میں دم نہیں ہے تو وہ نہیں چلے گی۔ تو کردار کے ساتھ ساتھ رائٹر پہ بھی نظر رکھتا ہوں۔"

★ "آج کل خواتین رائٹرز زیادہ لکھ رہی ہیں' مرد حضرات کم لکھ رہے ہیں اور خاص طور پر ڈائجسٹ رائٹر بہت لکھ رہی ہیں تو آپ کے خیال میں اچھا لکھ رہی ہیں؟"

✳ "یہ میرے خیال میں بہت نامناسب بات ہے کہ ڈائجسٹ رائٹرز ڈرامہ لکھ رہی ہیں۔ اور نامناسب میں نے اس لیے کہا کہ وہ ڈائجسٹ میں لکھیں سو بسم اللہ لیکن اگر کوئی پروڈکشن ہاؤس لکھے ہوئے ناول کو ڈرامہ ٹائز کرتے ہیں تو پھر ہمیں ایسے ڈرامے دیکھنے کو ملتے ہیں جس کے لیے آڈینس کہتی ہے کہ یہ تو بہت ہی سلو ڈرامہ ہے یہ کیا ہو رہا ہے سین سے سین جوڑا جا رہا ہے۔ جس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ کیونکہ ٹی وی کی لکھائی الگ ہے۔ اب جیسے خلیل الرحمن قمر ہیں۔ سمیرا فاضل ہیں یا عمیرہ احمد ہیں یہ جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو ڈائجسٹ لکھنے نہیں بیٹھتے بلکہ ٹی وی کا پلے لکھتے ہیں اور ہر چیز کو مد نظر رکھ کر وہ ڈرامہ لکھتے ہیں۔ یہ بالکل بھی مناسب نہیں ہے کہ ایک ناول آ رہا ہے اس میں سے کہانیاں نکال کر اسکرپٹ بنا لینا اور ڈرامہ لکھ لینا۔ اور مجھے یاد ہے کہ ایک ماہ قبل میں نے بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ بات کہی تھی کہ میں نے اپنے لیے تو یہ سوچ لیا ہے کہ اس طرح کے اسکرپٹ کرنا ان کا انتظار کرنا اور پھر ایسی پرفارمنس دینا کہ جن کو دیکھنے کے لیے مرد حضرات بھی دیکھنے کے لیے مجبور ہو جائیں (جیسے کہ میں نے الوداع میں کیا تھا الوداع کا کردار حد سے زیادہ دلچسپ ہو چکا تھا کیونکہ وہ مینٹل ٹارچر کرتا تھا) میری پہلی ترجیح ہوگی۔۔۔ اور اب میرے خیال میں اس

بات کی ضرورت ہے کہ "میل ویور شپ کو واپس لایا جائے جو ٹی وی کے ڈرامے دیکھ سکیں مردوں کو ڈرامہ دیکھنے کا کوئی ایشو نہیں ہوتا۔ لیکن جیسا کہ آپ نے کہا کہ عورت پر ظلم دکھایا جا رہا ہے تو ہر وقت یہی کچھ دکھایا جاتا رہے گا تو مردوں کا انٹرسٹ Interest ڈیولپ نہیں ہوگا اور خواتین بھی ہر وقت ایسی چیزیں دیکھ کر اکتا جائیں گی۔"

★ "بالکل اکتا گئی ہیں۔ کیونکہ کوئی انسان ایک مزاج کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔۔۔ ساس اگر بری ہے تو بری ہی ہے۔ کوئی غصے کا تیز ہے تو اس کو کبھی نرم دکھایا ہی نہیں جاتا؟"

✳ "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں' کیونکہ جب رائٹر لکھتا ہی اس نیت سے ہے تو پھر وہ ہر چیز کو بلیک اینڈ وائٹ' ہر کردار کو بلیک اینڈ وائٹ کر دیتا ہے اگر کوئی شیطان ہے تو وہ شیطان ہی ہے اور کوئی اچھا ہے تو بہت اچھا ہے۔ تو ایسا حقیقی زندگی میں ممکن ہی نہیں ہے۔۔۔ اگر الوداع سیریل کی بات کریں تو اس کی کہانی کوئی بہت زیادہ Fantastic نہیں تھی اس کی کہانی میں بہت سے سوالیہ نشان ہیں۔ کہانی میں دکھایا گیا کہ "حیا" کی شادی

رمیز کے ساتھ ہو چکی ہے تو اس لڑکی کو چاہیے تھا کہ اپنے میاں کو سمجھنے کی کوشش کرے اور (عمران عباس) ایچ ایس کو بھول جائے۔ مگر رائٹر نے سچویشن ایسی کریئیٹ کر دی کہ تھوڑا بہت بیلنس ہو گیا کہانی میں اور لوگوں نے شوق سے دیکھا۔۔۔ تو ایسے کردار کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ کچھ کرنے کو تو ہوتا ہے نا۔"

★ "مزید سوالات سے پہلے کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

✳ "جی میرا پورا نام زاہد افتخار احمد ہے اور پیار سے جائے (Jai) بلاتے ہیں ۲۰ ستمبر ۱۹۸۴ء میں میرا جنم ہوا۔ امی کی سائڈ سے ہم انڈیا لکھنؤ سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے میری اردو کافی صاف ہے اور لہجہ بھی لکھنؤ والا ہی ہے ابو کا تعلق راولپنڈی سے ہے ددھیال ہمارا چکوال سے تعلق رکھتا تھا اور چونکہ والد کا تعلق آرمی سے تھا تو اسلام آباد میں ہی میری پیدائش ہوئی اور یہیں پرورش پائی اور میں اسلام آباد میں ہی تھا بس اداکاری کی وجہ سے کراچی آنا پڑا اور ویسے آنا جانا لگا رہتا ہے۔ بہن بھائیوں میں ہم تین ہی بھائی ہیں۔۔۔ بہن نہیں ہے اور مارکیٹنگ میں ماسٹرز کیا ہے۔ شادی شدہ ہوں اور 5 ماہ کا بیٹا بھی ہے۔"

★ "تھیٹر تک کیسے رسائی ہوئی؟"

✳ "میرا اداکاری کا سارا سلسلہ اسلام آباد سے شروع ہوا۔ 2005ء میں پہلا تھیٹر دیکھا تھا۔ انگلش تھیٹر تھا اور کامیڈی پلے تھا اور میں بہت متاثر ہوا تھا۔ پلے کے اختتام پر پروڈیوسر نے اناؤنسمنٹ کی کہ تھیٹر میں کسی کو کام کرنے کا شوق ہے اور کوئی آڈیشن دینا چاہتا ہے تو یہ ہمارا طریقہ کار ہے۔ میں اپنے دوست کے ساتھ پلے دیکھنے آیا تھا تو میرے دوست نے کہا کہ آڈیشن دے دو کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ تم بنے ہی اس کام کے لیے ہو۔" خیر میں نے ساری معلومات لے کر ان کے ای میل میں Interest ڈال دیا کہ میں آڈیشن دینا چاہتا ہوں۔ آڈیشن بہت اچھا ہو گیا اور انہوں نے اسی وقت مجھے اپنے اگلے پلے کے لیے

رول آفر کر دیا اور یوں 2006ء سے لے کر 2013ء تک میں نے پانچ پلے اسلام آباد میں کیے اور 3 پلے کراچی آکر کیے جو کہ انور مقصود صاحب کے لکھے ہوئے تھے۔ "سوا چودہ اگست" اور "ہاف پلیٹ" "سوا چودہ اگست" میں میں نے قائداعظم کا رول کیا اور بس اس کے بعد سے ٹی وی سے آفرز آنا شروع ہو گئیں۔ تھیٹر میں کام کرنے سے پہلے 2000ء میں ایک ٹیلی کام کمپنی میں جاب کرتا تھا وہاں تقریباً "10 سال جاب کی اور جب آفرز آنے لگیں ٹی وی سے تو پھر میں نے سوچا کہ جاب کا سلسلہ ختم کر دوں کیونکہ سب کام ایک ساتھ نہیں ہو سکیں گے۔ چنانچہ مکمل طور پر تھیٹر اور ٹی وی کی طرف آگیا۔ یوں میرا پہلا ڈرامہ "محرم" تھا اور دوسرا "الوداع" تھا۔"

★ "آپ نے کہا کہ آپ جاب کرتے تھے، مگر پھر آپ نے اس فیلڈ کو اپنا پروفیشن بنا لیا، تو اس فیلڈ کے لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی روزی ہوائی ہوتی ہے تو ایسا ہے؟"

✳ "میں اسے مکمل طور پر ہوائی روزی نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ یہ اس انسان پر منحصر ہے کہ وہ اس روزی کو کس طرح سوچ رہا ہے وہ اپنا ریٹ کس طرح بڑھا رہا ہے یا بڑھانا چاہتا ہے یا پھر وہ کتنے کم ریٹس پہ بھی کام کرنے کو تیار ہے۔ اس کام میں پیسہ بہت زیادہ بھی ہے اور اگر آپ کے نخرے شروع ہو جائیں تو پھر پیسہ آپ سے بھاگتا بھی ہے آپ کو بہت ساری چیزیں Reject کر کے گھر بیٹھنا پڑتا ہے۔ تو میرا اپنا زاویہ یہ ہے کہ نہ تو میں پیسے کے پیچھے بھاگنا چاہتا ہوں اور نہ ہی فیم کے پیچھے تو مجھے اس فیلڈ میں آئے ہوئے صرف ایک ہی سال ہوا ہے اور میں صبر و سکون کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں۔"

★ "ویسے بھی ہر چیز تھوڑی ٹھنڈی کر کے کھانی چاہیے؟"

✳ "جی بالکل اور میں تو بہت ٹھنڈا کر کے کھانے کا عادی ہوں اور اس پروفیشن میں آنے کے بعد سب سے بڑا فائدہ جو مجھے نظر آیا وہ یہ کہ جب شوٹ وغیرہ

چل رہا ہوتا ہے تو شوٹ کے درمیان سین وغیرہ کرنے کے بعد اگلے سین کے لیے کافی وقت مل جاتا ہے اور جب شوٹ نہیں ہے اور ڈے آف ہے تو آپ کچھ بھی کرسکتے ہیں تو اس پروفیشن میں سب سے بڑا تحفہ جو مجھے ملا ہے وہ وقت کا ملا ہے اور اس وقت میں اپنے بارے میں کچھ سوچنے کا اور کچھ کرنے کا کافی ٹائم مل جاتا ہے تو میں خوش ہوں کہ مجھے جاب نہیں کرنی پڑتی کیونکہ دس سال جاب کرکے میں نے بہت ٹینشن میں وقت گزارا ہے اداکاری میرا جنون ہے اور مجھے بہت مزہ آرہا ہے کام کرکے۔"

★ "آپ کی بیگم بھی اس فیلڈ سے ہیں؟"

✳ "نہیں بیگم اس فیلڈ سے نہیں ہے میں نے ۲۷ سال کی عمر میں شادی کی ۴ سال ہوگئے ہیں شادی کو۔ بیگم ٹیلی کام انجینئر ہیں اور ہم دونوں کی ملاقات ٹیلی کام کمپنی میں ہی ہوئی تھی اور دو چار ملاقاتوں کے بعد ہی ہم نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے والدین سے مل لیتے ہیں اس سے پہلے کہ محبت پروان چڑھے اور بعد میں انکار ہو جائے تو بہتر ہے کہ پہلے والدین کے گوش گزار کردیں۔"

★ "زاہد۔۔۔ آپ نے اب تک جتنا بھی کام کیا حسین فنکاراؤں کے ساتھ، جیسے یمنیٰ زیدی، صبا قمر، اریج فاطمہ، آمنہ الیاس اور صنم جنگ، کس نے نخرے دکھائے، کس کے ساتھ کام کرکے اچھا لگا آپ کو؟"

✳ "میں کسی کا نام نہیں لوں گا۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ روزانہ بارہ بارہ گھنٹے کی شوٹ کرنا اور موڈ بنانا بہت مشکل کام ہے۔ تو سیٹ پہ آکر کوئی تھوڑا بہت نخرہ دکھا دے یہ چیزیں اس صورت میں چل جاتی ہیں بشرطیکہ آپ اپنا کام اچھا کررہے ہوں۔ ڈسپلن کا خیال رکھتے ہیں، اپنی لائنیں اچھی طرح یاد کرکے آتے ہیں تو اس معاملے میں، میں "صبا قمر" کی ضرور تعریف کروں گا کہ وہ ایک بہت ہی ڈسپلنڈ آرٹسٹ ہے اور اتنا نام کمانے اور اتنے ایوارڈ حاصل کرنے کے باوجود وہ ٹائم پہ بلکہ ٹائم سے پہلے ہی آجاتی ہے۔ ساری ہی آج کل کی لڑکیاں اچھی ہیں۔ صنم جنگ بہت زیادہ ڈیسنٹ لڑکی ہے اور بہت ہی اچھے گھرانے کی ہے۔ جب ہم سیٹ پہ آتے ہیں تو ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے ہیں اور یہی ایک وقت ہوتا ہے جب آپ سب لائنیں کراس بھی کرسکتے ہیں اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب آپ اپنے آپ کو ثابت کرسکتے ہیں کہ آپ کیا ہیں۔ یمنیٰ بہت لونگ آرٹسٹ ہے۔ اس کے بارے میں بھی کبھی کوئی برائی نہیں سنی اور اسے اپنے کام کا واقعی بہت جنون ہے اور یمنیٰ کے ساتھ جو ڈائریکٹر ایک بار کام کرتا ہے وہ اسے دوبارہ ضرور کاسٹ کرنا چاہتا ہے۔"

★ "آپ کے سیریل "محرم، جگنو تم میرے پاس رہو، الوداع" اور "سنگت بہت ہٹ گئے"۔۔۔ کونسا کردار آپ کی شخصیت کے قریب تھا اور کونسا کردار حقیقت کے قریب تھا؟"

✳ "سارے ہی ٹیڑھے میڑے کردار تھے اور اللہ کا شکر ہے کہ کوئی کردار میری شخصیت کے قریب نہیں

تھا "جگنو" میں یوزیٹو کردار تھا اور ضرورت سے زیادہ یوزیٹو بزدل قسم کا کردار تھا۔ ویسے وہ کردار کرنے میں مجھے مزہ آیا۔ حقیقت کے جو قریب لگا وہ "الوداع" میں رمیز کا کردار تھا حقیقی زندگی میں ایسے بہت سے کردار آپ کو نظر آئیں گے تو اس کردار میں پرفارمنس مارجن بھی بہت تھا اور میں نے انجوائے بھی کیا دلچسپ بات بتاؤں کہ اسکرپٹ میں اس کردار کے لیے جگہ جگہ لکھا تھا کہ وہ "حیا" کو مارتا ہے مگر میں نے اور ڈائریکٹر نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم مارپیٹ نہیں دکھائیں گے۔ اس اسکرپٹ میں کافی ساری لائنیں تو میں نے لکھی تھیں اور "تم میرے پاس رہو" کا کردار وہ واحد کردار ہے جو میں نے اپنے دل کی خوشی سے نہیں کیا .... اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ڈرامہ مجھ سے اس وقت سائن کروالیا گیا تھا جب میں اپنے پہلے پلے "محرم" سے فارغ ہوا تھا میری عادت ہے کہ میں اپنے کردار کو پورا پڑھ کر موڈ بنا کر کرتا ہوں۔ بدقسمتی سے اس وقت اس سیریل کا اسکرپٹ مکمل نہیں تھا اور مجھے صرف یہ کہا گیا کہ آپ کا اور بشریٰ انصاری کا ڈرامہ ہے ماں بیٹے کی کہانی ہے اس لیے آپ کرلیں.... تو مجھے پتا ہوتا تو یہ ایک روائتی قسم کا کردار ہے تو میں نہ کرتا۔ چونکہ ایک طرف کمٹمنٹ تھی اور دوسری طرف بشریٰ آپا تو میں نے اسے آخر تک نبھایا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس کردار کو بہت سی گالیاں پڑی ہوں گی۔"

★ "رومانٹک رول کرتے وقت اگر سامنے والا رسپانس نہ دے تو کوفت ہوتی ہے یا غصہ آتا ہے؟"

✳ "رومانٹک رول کرنے میں اچھا لگتا ہے اور واقعی بہت کوفت ہوتی ہے سین کچھ یوں ہوتے ہیں کہ تین بار شوٹ ہوتا ہے۔ ایک تب جب آمنے سامنے ہوتے ہیں اور دو تب جب لڑکی کا بھی سولو اور لڑکے کا بھی سولو ہوتا (Solo) ہے۔ تو جب سولو (Solo) ہوتا ہے تو آپ کھل کر ایکسپریشن دے سکتے ہیں۔ جبکہ آمنے سامنے والے سین میں کئی بار کیمسٹری نہیں بن پاتی تو پھر ایسے فنکاروں کے ساتھ یہی کرنا پڑتا ہے کہ اپنا ایکسپریشن دیں باقی ڈائریکٹر پہ چھوڑ دیں۔"

★ "اپنے ڈرامے دیکھتے ہیں؟"

✳ "جی میں نے اپنا ہر ڈرامہ دیکھا ہے اور میرے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ میں اپنے ڈرامے دیکھوں اور بہتر سے بہتر کرنے کی کوشش کروں۔"

★ "فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟"

✳ "مجھے نیچر سے بہت لگاؤ ہے گرینری مجھے بہت پسند ہے اور وقت ملے تو کہیں ایسی ہی جگہ پر چلا جاتا ہوں میوزک کا بہت شوق ہے۔ گانے کا شوق ہے مگر گا نہیں سکتا۔ اور چونکہ شوٹ میں بہت ٹائم لگ جاتا ہے۔ بارہ گھنٹے میں آپ کا کام دو گھنٹے کا ہو تو دس گھنٹے کی فرصت میں پھر میں میوزک سے ہی دل بہلاتا ہوں اور ایسا کردار جو کافی محنت طلب ہو اس سے فارغ ہو کر جب گھر آتا ہوں تو بہت اونچا میوزک سنتا ہوں تاکہ اس کردار سے نکل سکوں۔"

★ "کھانے پینے کے شوقین ہیں؟"

✳ "جی کھانے پینے کا بہت شوق ہے اور جب تک شادی نہیں ہوئی تھی اپنی مرضی سے کھاتا پیتا تھا یہ نہیں دیکھتا تھا کہ کیا کھا رہا ہوں۔ کتنا کھا رہا ہوں تو اب بیگم کنٹرول کرواتی ہیں ڈائیٹ پہ' کیونکہ مجھے اس فیلڈ میں رہنا ہے اور میری بیگم کا دل چاہتا ہے کہ میں ٹی وی پہ بھی اسمارٹ نظر آؤں مجھے بریانی' نہاری اور پائے بہت پسند ہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے زاہد صاحب سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے اپنی مصروفیات سے ٹائم دیا۔

✡ ✡

منشا پاشا

شاہین رشید

1 "نام؟"
"منشا پاشا۔"

2 "پکاری جاتی ہوں؟"
"منشو۔"

3 "پیدائش کی تاریخ؟"
"19 اکتوبر 1987ء۔"

4 "شہر؟"
"حیدر آباد۔"

5 "ستارہ؟"
"میزان۔"

6 "بہن بھائی؟"
"تین بڑی بہنیں اور پھر میں۔"

7 "تعلیمی ڈگری؟"
"میڈیا سائنس میں گریجویٹ ہوں۔"

8 "شادی؟"
"تقریباً" 2 سال۔"

9 "آج کل آن ایئر ڈرامے؟"
"تمہارے سوا۔"

10 "پہلی جاب؟"
"مومل پروڈکشن میں بہ حیثیت پروڈیوسر میری پہلی جاب تھی۔"

11 "پہلی سیلری؟"
"سیلری تو نہیں کہہ سکتے لیکن دوران تعلیم "ہم ٹی وی" پہ انٹرن شپ کی تھی تو مجھے تقریباً" چھ ہزار روپے ملے تھے۔"

12 "میری پہچان بنا؟"
"زندگی گلزار ہے۔"

13 "مرد کب اچھے لگتے ہیں؟"
"جب وہ خواتین کی عزت کرتے ہیں۔"

14 "بدتمیز ہوتے ہیں وہ لوگ؟"
"جو خواتین اور لڑکیوں کو بری نظر سے دیکھتے ہیں

اور انہیں گھورتے ہیں۔"

15 "سسرال میں پسندیدہ رشتہ؟"
"نند کا۔ اس کے ساتھ وقت گزارنا بہت اچھا لگتا ہے۔"

16 "چڑ جاتی ہوں؟"
"جب کوئی گہری نیند سے اٹھادے تب۔"

17 "اس دن بہت سکون ہوتا ہے؟"
"جب موبائل سروس آف ہوتی ہے۔ پہلے ایسا ہوتا تھا مگر اب ایسا نہیں ہوتا۔ اب شکر ہے حالات بہت اچھے ہیں۔"

18 "کم عمری کی پہلی فلم جو یاد ہے؟"
"جراسک پارک۔"

19 "اپنی ایک اچھی عادت؟"
"جو چیزیں پرانی ہو جائیں انہیں مستحق لوگوں کو دے دیتی ہوں۔ گھر میں ذخیرہ نہیں کرتی اور یہ بھی واضح کردوں کہ میں چیزوں کو بہت زیادہ پرانا نہیں کرتی۔"

20 "گھر میں پسندیدہ لباس؟"
"لمبی شرٹ اور پینٹ۔"

21 "میں بہادر ہوں اس لحاظ سے کہ؟"
"کہ مجھے کیڑے مکوڑوں سے ڈر نہیں لگتا اور جہاں کوئی کیڑا کسی کو نظر آجائے وہ مجھے ہی آواز دیتا ہے۔ ہے نا حیرت کی بات۔"

22 "پاکستان کے لیے سوچتی ہوں کہ؟"
"اپنے ملک سے اچھا کوئی ملک نہیں اللہ اسے ہمیشہ قائم ودائم رکھے۔"

23 "گھومنے کے لیے پسندیدہ ملک؟"
"ترکی۔"

24 "میں کریزی نہیں ہوں؟"
"شاپنگ کی مجھے ہر وقت بازار جانا اچھا نہیں لگتا۔ تب ہی بازار جاتی ہوں جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔"

25 "ایک دن کی حکومت مل جائے تو؟"
"توان قوانین کو تبدیل کردوں گی جو خواتین کو تحفظ نہ دے سکتے ہوں بلکہ ان قوانین کو نافذ کروں گی جو خواتین کے حق میں بہتر ہوں۔"

26 "کوئی فون نمبر مانگے تو؟"
"ہر ایک کو فون نمبر نہیں دیتی... جس کو ضروری سمجھتی ہوں اسی کو دیتی ہوں... ورنہ معذرت کر لیتی ہوں۔"

27 "بیگ میں رکھنا نہیں بھولتی؟"
"بیگ اسی وقت لیتی ہوں جب کہیں جانا ہو تو والٹ، سیل فون اور کچھ مزید ضروری چیزیں بیگ میں ڈالنا نہیں بھولتی۔"

28 "کیا بہترین پکالیتی ہوں؟"
"سب کچھ ہی... مگر مجھے لگتا ہے کہ میں دوسرے ممالک یعنی کانٹی نینٹل کھانے زیادہ اچھے پکالیتی ہوں۔"

29 "کھانے کے لیے مخصوص جگہ؟"

"کوئی نہیں جہاں کا کھانا لذت میں مشہور ہو وہیں سے کھاتی ہوں اپنی فیملی کے ساتھ۔"

30 "شاپنگ کے وقت کس بات کو مد نظر رکھتی ہوں؟"

"کہ جو چیزیں میں خرید رہی ہوں وہ ضروری ہیں یا نہیں اور کیا ان کو لینا فضول خرچی تو نہیں ہوگا۔"

31 "میں انجوائے کرتی ہوں؟"

"لوگ ادھر ادھر گھوم پھر کے انجوائے کرتے ہیں اور میں اپنے گھر میں انجوائے کرتی ہوں۔ گھر کو سجا کے۔ صاف ستھرا رکھ کر۔ کبھی کچن میں کچھ پکا کر کبھی اپنے بیڈ کے نرم بستر پر لیٹ کر... میرا گھر میرے لیے کسی جنت سے کم نہیں ہے۔"

32 "میں فریش ہوتی ہوں؟"

"جب بھرپور نیند کر کے اٹھتی ہوں۔ کچی نیند سے اٹھ جاؤں تو مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے۔"

33 "مجھے غصہ آتا ہے؟"

"ان لوگوں پر جو ہر وقت یہ سوچتے رہتے ہیں کہ یہ کام نہ کریں لوگ کیا سوچیں گے۔ یوں نہ کریں لوگ کیا سوچیں گے... بھئی لوگوں کو سوچنے دیں۔ آپ اچھا کام کریں گے تب بھی وہ سوچیں گے اور اچھا نہیں کریں گے تب بھی سوچیں گے۔ لوگوں کا تو کام ہی دوسروں کے بارے میں سوچنا ہے۔"

34 "دماغ ساتویں آسمان پہ کب جاتا ہے؟"

"شکر الحمدللہ میرا دماغ تو کبھی ساتویں آسمان پر نہیں گیا۔ ہاں جو لوگ شہرت پا کر مغرور ہو جاتے ہیں اور شہرت کو سر پر سوار کر لیتے ہیں۔ انہی کا دماغ ساتویں آسمان پر ہوتا ہے۔"

35 "مجھے ڈر لگتا ہے؟"

"اپنے شوہر کے غصے سے۔"

36 "زندگی میں چیلنج آیا؟"

"جب اس فیلڈ میں آئی تب اور جب میری شادی ہوئی تب کافی چیلنج آیا۔"

37 "ریموٹ کس چینل پہ رہتا ہے؟"

"جہاں کوئی اچھا پروگرام آ رہا ہو۔ کوئی بھی اچھا پروگرام ریموٹ کو نہیں روک سکتا۔"

38 "کھانے پہ غصہ کب اترتا ہے؟"

ہنستے ہوئے "جب بہت اپ سیٹ ہوتی ہوں۔ بھوک اڑ جاتی ہے اور کچھ نہیں کھاتی جب تک پریشانی دور نہ ہو جائے۔"

39 "ہسٹری میں میری آئیڈیل شخصیت؟"

"قائداعظم۔"

40 "میری ایک دیرینہ خواہش؟"

"کہ ایک بہت ہی اچھا سا گھر ہو میرے پاس۔"

41 "شادی کی رسموں میں پسندیدہ رسم؟"

"پہلے نکاح ہو جائے... تاکہ بعد میں رسمیں انجوائے کریں۔ مجھے نکاح کی رسم بہت پسند ہے۔"

42 "اپنے سرہانے کیا کیا چیزیں رکھتی ہوں؟"

"بہت سی چیزیں ہوتی ہیں مثلاً "لیمپ" پانی چارجر' فون اور کوئی نہ کوئی کتاب کیونکہ مجھے مطالعہ کی بہت عادت ہے۔"

43 "انسان کو کیا بات بہت نقصان پہنچاتی ہے؟"

"حد سے زیادہ ایمانداری' حد سے زیادہ مخلص ہونا' حد سے زیادہ کسی کا خیال رکھنا۔"

44 "پروفیشن جو اپنانا چاہتی تھی؟"

"یہی اپنانا چاہتی تھی۔ اسی لیے تو میڈیا سائنس میں گریجویشن کیا اور پھر جاب بھی کی۔"

45 "چھٹی گزارنے کے لیے بہترین جگہ؟"

"اگر چھٹیاں زیادہ ہوں تو پھر شہر سے باہر یا ملک سے باہر جا کر گزارنے میں مزہ آتا ہے۔ ورنہ تو پھر گھر پر ہی فیملی کے ساتھ وقت گزارنے میں مزہ آتا ہے۔"

46 "ایس ایم ایس سے لگاؤ؟"

"نہیں... کچھ خاص نہیں ہاں کوئی ضروری Sms ہو تو پھر جواب دے دیتی ہوں ورنہ نہیں۔"

47 "مجھے انتظار رہتا ہے؟"

"چھٹی کے دن کا تاکہ بھرپور طریقے سے انجوائے کر سکوں اور آرام کر سکوں۔"

48 "دتھکن میں دل چاہتا ہے؟"

"کہ اپنا کمرہ ہو اور اپنا بستر ہو۔ بس۔"

49 "مزاجاً" کیسی ہوں؟"

"ٹھنڈے دل و دماغ کی مالک ہوں۔ بلاوجہ کسی پہ غصہ نہیں نکالتی۔ ویسے بھی مجھے غصہ کم آتا ہے۔"

50 "مسائل کس سے شیئر کرتی ہوں؟"

"اپنی بہت ہی قریبی دوست سے۔"

51 "صبح سویرے اٹھتی ہوں یا آرام سے؟"

"جب کام پہ جانا ہو یعنی کوئی شوٹ ہو تو جلدی اٹھ جاتی ہوں ورنہ پھر دوپہر بارہ بجے کے قریب۔"

52 "کونسے وقت کا کھانا پسند ہے؟ ناشتا لنچ یا ڈنر؟"

"تینوں.... صبح جلدی اٹھ جاؤں تو ناشتا ضرور کرتی ہوں اور لنچ اور ڈنر تو اہتمام سے کرتی ہوں۔"

53 "موڈ آف ہوتا ہے؟"

"جب بلاوجہ کوئی تنقید کرے آپ کو خوامخواہ نصیحتیں کرے اور حوصلہ افزائی کی بجائے حوصلہ شکنی کرے۔"

54 "میں حیران رہ جاتی ہوں؟"

"ان لوگوں پر جو دیدہ دلیری سے جھوٹ بولتے ہیں اور دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں کہ وہ ایسا کیسے کر لیتے ہیں۔"

55 "بہت قیمتی چیزیں خریدنے کا شوق؟"

"نہیں، نہیں بالکل بھی شوق نہیں ہے قیمتی چیزیں خریدنے کا.... قیمتی چیزیں لیتی ہوں مگر بہت زیادہ نہیں۔"

56 "گھر آتے ہی دل چاہتا ہے؟"

"کہ بس جلدی سے فریش ہو کر کھانا کھاؤں اور اپنے بیڈ پر چلی جاؤں۔"

57 "فارغ اوقات میں کیا کرتی ہوں؟"

"زیادہ تر کسی اچھی سی کتاب کا مطالعہ کرتی ہوں۔"

58 "غلطی ہو جائے تو؟"

"تو اپنی غلطی مان کر سوری کر لیتی ہوں۔"

59 "زوال سے ڈر لگتا ہے؟"

"لگتا تو ہے۔ مگر اللہ کی مرضی سمجھ کر اس کی رضا پہ راضی ہو جاؤں گی کہ وہ جو کرتا ہے، بہتر کرتا ہے۔"

☼ ☼

ریڈیو کا میڈیا اس لحاظ سے آج تک بہت پاپولر ہے کہ اس میں آپ کو بارہ مسالوں کی چاٹ ہر وقت میسر ہوتی ہے۔ ریڈیو معلومات کا خزانہ بھی فراہم کرتا ہے زندگی گزارنے کے لیے گائیڈ لائن بھی دیتا ہے۔ انٹرٹینمنٹ کی خبریں بھی دیتا ہے اور سب سے بڑھ کر آپ کو روح کی غذا بھی فراہم کرتا ہے اور اس کے لیے ضروری نہیں کہ آپ کو کسی ایک جگہ پر بیٹھ کر آپ کو یہ سب مواد حاصل کرنا ہوتا ہے بلکہ ائیر فون اٹھایئے کانوں سے لگایئے موبائل فون کو جیب میں ڈالیں اور چلتے پھرتے، سوتے جاگتے اور کھاتے پیتے اس چھوٹی سی دنیا میں گم ہو جایئے اور لائف کو انجوائے کریں اور میں سمجھتی ہوں کہ باکمال ہیں وہ لوگ جو 24 گھنٹے آپ

بلکہ ہماری ریگولر پالیسی کے تحت میں نے ریٹائرمنٹ لے لی تھی جس میں ہم 58 سال کی یا 55 سال کی عمر میں پری میچورٹی ریٹائرمنٹ لے سکتے ہیں گولڈن ہینڈ شیک کے علاوہ.... تو وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لینے کی وجہ یہ تھی کہ مجھے اپنے دونوں بچوں کی شادی کرنی تھی۔ میرا آبائی گھر خداداد کالونی میں ہے اور وہیں میری پیدائش بھی ہوئی اور ہم چار بھائی ہیں اور میری والدہ جن کی عمر ماشاء اللہ 90 سال ہے وہ بھی اسی گھر میں رہتی ہیں اور میں روز ان سے ملاقات کرنے جاتا ہوں۔ اور انہی کے ساتھ کھانا بھی کھاتا ہوں۔ میری بیگم جن کا میرا ساتھ 31 سال رہا ان کا اچانک انتقال ہو گیا انہوں نے تقریباً "20 سال میرے ساتھ اسٹیٹ

آواز کی دنیا سے

مظہر قریشی

شاہین رشید

کو انٹرٹین کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ آدھی رات کو بھی۔ تو داد کے مستحق تو وہ لوگ ہیں جو آپ کی تفریح کا خیال رکھتے ہیں۔ انہی میں ایک مظہر قریشی صاحب ہیں جو 105۔FM سے وابستہ ہیں اور رات بارہ سے دو آپ کے لیے پروگرام کرتے ہیں۔

★ "جی جناب کیسے ہیں آپ؟"

✻ "میں جی الحمدللہ۔ اللہ کا شکر ہے۔"

★ "کیا مصروفیات ہیں آپ کی اور کچھ اپنے بارے میں بتایئے؟"

✻ "میں 2007ء میں اسٹیٹ بینک سے بہ حیثیت اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے ریٹائر ہوا تھا۔ میچورٹی میری عمر کی نہیں ہوئی تھی لیکن میں نے وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے لی تھی اور گولڈن ہینڈ شیک نہیں تھا

بینک میں جاب کی ہے اور ہم دونوں آفیسر تھے اسٹیٹ بینک میں۔ ان کے انتقال کے بعد زندگی بہت ویران ہو گئی تو میرے دوستوں اور استادوں نے مشورہ دیا کہ کتاب کا سہارا لے لو، زندگی آسان ہو جائے گی۔ اور میں نے کتاب کا سہارا لیا اور آج الحمدللہ ڈیڑھ ہزار کتابوں کی میری اپنی ذاتی لائبریری ہے۔"

★ "ریڈیو کب جوائن کیا؟"

✻ "2011ء کے اینڈ میں اور 2012ء کے شروع میں 99۔FM جوائن کیا اور جب میں وہاں آڈیشن دینے گیا اور انٹرویو دیا تو چینل کے سی او نے کہا آپ آج ایک پروگرام ریکارڈ کروا کے جائیں "مرزا غالب" یہ آپ کو بتاؤں کہ میں پہلی بار کسی ایف ایم چینل پہ گیا تھا اور پہلی ہی بار میں نے وہاں کی مشینری دیکھی تھی

اور جب میں نے اوکے کر دیا تو غالب پہ دس منٹ بات کی اور وہ باتیں جب سی او صاحب نے سنیں تو انہوں نے کہا کہ آپ غالب پہ ایک گھنٹے کا پروگرام ریکارڈ کروا کے جائیں اور وہ دن اور آج کا دن میں ریڈیو سے وابستہ ہوں۔ پہلے ایف ایم ۹۹ میں تھا پھر جنوری 2012ء میں FM 105 جوائن کر لیا اور آج تک وہیں ہوں۔"

★ "ایف ایم 99 کیوں چھوڑا؟"

✳ "اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں ریکارڈیڈ پروگرام زیادہ ہوتے تھے۔ البتہ اسپیشل کسی تہوار میں لائیو پروگرام ہوتے تھے اور ریکارڈیڈ شو سب لٹریری ہوتے تھے اور یہاں FM 105 میں سب لائیو شو ہوتے ہیں۔ تو 99 میں بھی میں نے کافی لائیو شو کیے۔ مگر اتنے نہیں جتنے 105 پر بلکہ آج تک لائیو شو ہی کر رہا ہوں اور آپ کو بتاؤں کہ میں نے "محرم" کی نویں اور دسویں کو بھی شو کیے عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ 14 اگست 23 مارچ اور نصرت فتح علی کی سالگرہ کے دن۔ ان کی وفات کے دن بھی میں نے پروگرام کیے اس طرح مہدی حسن کے انتقال پر 'مہ ناز کے انتقال پہ میں نے لائیو شو کیے۔"

★ "جاب کے دوران آپ کو کبھی خیال نہیں آیا کہ میری کوئی اور ایکٹویٹیز بھی ہونی چاہئیں؟"

✳ "اصل میں بات یہ ہے کہ میں نے بہت ذمہ داری کے ساتھ اپنی جاب کی اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ بینک میں 9 ٹو 5 والی کوئی ڈیوٹی نہیں ہے۔ میں نے اکاؤنٹ اور آڈٹ میں زندگی گزاری ہے اور بہت بعد میں ایڈمنسٹریشن میں بیٹھا تھا۔۔۔ تو بہت ٹف ڈیوٹی تھی میری تو دوسری سرگرمیوں کے لیے ٹائم نہیں تھا۔"

★ "سخت ڈیوٹی کے حساب سے سیلری بھی ہوگی اور بیگم کے بعد کا خلا ریڈیو سے پر کیا آپ نے؟"

✳ "بالکل۔۔۔ سیلری بہت اچھی تھی اور اس کا اندازہ آپ اس سے لگائیں کہ 40 ہزار تو میری پینشن کے آتے ہیں اور خلا کی بات کی آپ نے تو میری وائف کا جس دن انتقال ہوا اس کے دو دن کے بعد تو ہم نے اپنے نئے گھر میں شفٹنگ کرنی تھی تمام سامان بندھا

رکھا تھا اور بچوں کی شادی کے کارڈ بھی چھپ گئے تھے۔۔۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ میں تو گھر پر نہیں تھا اور میری بیگم میری ماں کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی اور میرے بھائی بھی گھر پر موجود تھے تو تیسرا یا چوتھا نوالہ کھانے کے بعد اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا جلدی سے اسپتال لے گئے تو پتا چلا کہ ان کا تو انتقال بھی ہو چکا ہے اور کچھ پتا نہیں چلا کہ اسے اچانک کیا ہوا۔"

★ "اوہو۔۔۔ زندگی میں سب کچھ ہو جاتا ہے۔۔۔ بیٹوں کی شادی بھی ہو گئی گھر میں بہوویں آ گئیں مگر آپ کی زندگی کا جو خالی پن تھا اس کے لیے کسی جیون ساتھی کا انتخاب کیا یا ریڈیو ہی سب کچھ تھا؟"

✳ "جی ریڈیو تو اب اوڑھنا بچھونا ہو ہی گیا تھا لیکن جیون ساتھی کا انتخاب بھی کیا اور وہ اس طرح کہ میری مرحومہ بیوی کی سب سے چھوٹی بہن جو مجھ سے بھی دس سال چھوٹی ہے اور اس کی شادی میرے سگے خالہ زاد بھائی سے ہوئی تھی اور وہ نیوی میں تھے اور ان کا انتقال ہو گیا تو وہ بیوگی کی زندگی گزار رہی تھیں تو میری ماں نے کہا کہ میں تمہیں اس طرح تو اکیلے زندگی نہیں گزارنے دوں گی تو پھر ان کے کہنے پر میں نے اپنی اس سالی سے نکاح کر لیا اور بہت خیال رکھتی ہیں میرے

بچوں کا، میرا ایک بیٹا امریکہ کے ایک بینک میں جاب کر رہا ہے وہ یہاں سے ایم بی اے کر کے گیا تھا اور ایک بیٹے نے یہاں نیوسٹ سے ایم بی اے کیا وہ ہیرالڈ گروپ میں ہے جہاں سے ڈان اخبار نکلتا ہے اب ہم میاں بیوی ہیں۔"

★ "ٹی وی کی طرف آپ کا رجحان نہیں ہوا؟"

✳ "میں سمجھتا ہوں کہ اس 60 سال کی عمر میں میں ٹی وی میڈیا کے لیے ان فٹ ہوں اپنے آپ کو ایکسپلور کرنا چاہیے کہ آپ کے اندر کیا صلاحیتیں ہیں۔ 1972ء میں گورنمنٹ کامرس کالج سے بی کام کیا تھا اور اس وقت میں کراچی میں بیت بازی کا چیمپئن تھا اور میرے استاد پروفیسر "انجم اعظمی" تھے میں اس زمانے میں اپنے کالج کے میگزین کا ایڈیٹر بھی تھا اور ثمینہ پیرزادہ کا کلاس فیلو بھی تھا۔"

★ "ریڈیو وہ ہی لوگ جوائن کرتے ہیں جو اسے سنتے ہیں تو آپ کیا اپنی مصروفیات سے اتنا ٹائم نکال لیتے تھے؟"

✳ "جی جی بہت پرانا ہوں ریڈیو سننے والوں میں 1995ء میں ایف ایم کا اجرا ہوا اور میں اس زمانے سے ریڈیو سن رہا ہوں۔ اردو لٹریچر کا ایک پروگرام آیا کرتا تھا جس کے میزبان خلیل اللہ فاروقی صاحب تھے جو کہ شاعر بھی ہیں استاد بھی ہیں ان کا پروگرام میں نے دس سال تک سنا اور نہ صرف میں ان کا Listener تھا بلکہ کالر بھی تھا۔ تو واقعی ریڈیو جوائن کرنے کے لیے ریڈیو سننا بھی بہت ضروری ہے۔"

★ "جب ایف ایم 99 پہ تھے تب اور اب جبکہ 105 میں ہیں تو کیا فارمیٹ ہے آپ کے پروگراموں کا؟"

✳ "میں ایک پروگرام "حرف فرشتہ" کرتا تھا بس ایک حرف فرشتہ ہے میرا سراپا / اس حوالے سے کچھ لوگ مجھے جانتے ہیں۔ اس پروگرام میں بڑے بڑے شاعروں کا ایک مصرعہ دے دیا کرتا تھا اور پوچھتا تھا کہ شاعر نے کیا کہا ہے جیسے یہ دل تم بن کہیں لگتا نہیں ہم کیا کریں تو "ہم کیا کریں" کیوں کہا ہے کیا بے اختیاری ہے۔ اور آج بھی میرے پروگرام کا فارمیٹ یہی ہے اور رات بارہ بجے سے 2 بجے کے بعد تک میرا پروگرام ہوتا ہے۔"

★ "لوگ سنتے ہیں کیونکہ نوجوان نسل تو شاعری سے بہت دور ہے؟"

✳ "بالکل سنتے ہیں اور بہت شوق سے سنتے ہیں نئی نسل کے لوگ کم سنتے ہوں گے لیکن میری نسل کے لوگ بہت سنتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جن کے لیے ہمیں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ آپ کو کال کرتے ہیں اور جو لوگ آپ کو Sms کرتے ہیں ان کی تعداد 2 فیصد بھی نہیں ہے۔ اصل سننے والے وہ ہیں جو اپنے آرام دہ بستر پر لیٹ کر آپ کو سن رہے ہوتے ہیں اور اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب مارکیٹ میں لوگ مجھے ملتے ہیں اور کبھی ریڈیو کا تذکرہ ہوتا ہے تو وہ بے ساختہ پوچھتے ہیں کہ اچھا وہ آپ ہیں مظہر قریشی۔"

★ "تو کیسے پہچانتے ہیں لوگ آپ کو؟"

✳ "اس طرح پہچانتے ہیں کہ جیسے میں کسی اسٹور پہ گیا، اسٹور کے مالک نے کہا کہ ہاں بھئی چل رہا ہے آپ کا ریڈیو، کیسا چل رہا ہے، اور ساتھ ہی ایک دوسرا بندہ بھی کھڑا ہے تو وہ جب بات سنتا ہے تو کہتا ہے کہ اچھا آپ ہیں وہ مظہر قریشی جو رات کو پروگرام کرتے ہیں۔ اس طرح لوگ پہچانتے ہیں اور ایسا کئی بار ہوا۔ خیر بات کر رہے تھے نئی نسل کی دوری سے تو میں سمجھتا ہوں کہ نئی نسل سے مایوس تو ہونا ہی نہیں چاہیے۔ مجھے جیسے 10 آدمی اگر ریڈیو پہ آ کر پروگرام کریں تو یقین کیجیے کہ جس طرح صحرا میں اذان دی جاتی ہے تو کبھی نہ کبھی جماعت بن ہی جاتی ہے۔ تو یہی میرا نظریہ ہے کہ آپ اپنا کام اپنا فرض ادا کیے جائیں۔ انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

★ "وقت کے ساتھ اور عمر کے ساتھ انسان میں تبدیلی آجاتی ہے۔ تو آپ اپنے پروگرام میں اپنے ہی دور کے گانے سنواتے ہیں یا آج کل کے دور کے بھی سنواتے ہیں؟"

✳ "ایسا کچھ نہیں ہے کہ میں صرف اپنے ہی دور کے گانے سنواتا ہوں۔ انسان کو دل سے جوان ہونا چاہیے۔ میں نے نئے گانوں کے لیے بہت محنت کی اور ہر سال کے ٹاپ ٹین گانے میں لگاتا ہوں۔ تو ایسا

نہیں ہے کہ میں اپنے ہی دور کے گانے لگاتا ہوں۔
میں ہر دور کے گانے لگاتا ہوں۔"

★ "نئی نسل کے جو نوجوان اس فیلڈ میں آنا چارہے ہیں ان کے لیے آپ کیا کہیں گے کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے؟"

✳ "پہلی بات تو یہ کہ آپ کو بڑوں کے ساتھ گفتگو میں بہت باتمیز ہونا چاہیے۔ اگر آپ کو دوستوں کے درمیان بیٹھ کر گالم گلوچ کی عادت ہے تو آپ ریڈیو پہ آنے کا سوچیے گا بھی نہیں اور آپ خواہ کچھ بھی پڑھ رہے ہوں لیکن آپ کو اردو انگریزی لٹریچر سے دوستی رکھنا پڑے گی۔ اخبارات کا مطالعہ کرنا ضروری ہے کتاب سے دوستی رکھنا بہت ضروری ہے۔ اگر ریڈیو کی طرف آنا ہے تو پھر ان ساری باتوں کا خیال رکھنا پڑے گا اور میں نے دیکھا ہے کہ نئی نسل کا بہت رجحان ہے ریڈیو کی طرف اور وہ جوائن کرنا بھی چاہتے ہیں اور کر بھی رہے ہیں۔"

★ "موڈ خراب ہو' گھر میں ٹینشن ہو' کوئی بد مزگی ہو جائے تو پھر پروگرام کرنے میں مشکل ہوتی ہے؟"

✳ "میں بالکل ایمانداری اور دیانت داری سے آپ کو بتاؤں گا کہ جس دن میرا ریڈیو کا شو ہوتا ہے دوپہر کو دو سے تین گھنٹے کی نیند لیتا ہوں۔ بالکل ریلیکس ہو کے رات کے گیارہ بجے گھر سے نکلتا ہوں۔ مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ مسئلہ کبھی کبھار ہو ہی جاتا ہے۔ کراچی کی سڑکوں پر تین بار تو میں رات کو ڈھائی تین بجے گھر آتے ہوئے لٹ چکا ہوں مگر ایسے واقعات کو میں اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتا اور میرے چینل والے میری بہت تعریف کرتے ہیں کہ جتنی تیاری کے ساتھ پروگرام کرنے آپ آتے ہیں کوئی اور نہیں آتا۔"

★ "رات کے وقت لائیو کالز بھی آپ لیتے ہیں تو کس کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ خواتین کی یا حضرات کی؛"

✳ "خواتین کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور آپ یقین کریں کہ بڑی باذوق خواتین ہوتی ہیں۔ اتنی اچھی اچھی نظمیں اور غزلیں سناتی ہیں کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اور دل چاہتا ہے کہ ان سے کہوں کہ آکر ریڈیو جوائن کرلیں۔ رات کے دو بجے اتنی انرجی ہوتی ہے کہ چہچہاتی آواز آجاتی ہے۔"

★ "جس طرح آپ کے پروگرام مقبول ہیں آپ کا دل چاہتا ہے کہ آپ بھی اسی طرح عوام میں مقبول ہوں؟"

✳ "جی دل تو بہت چاہتا ہے اور عام پبلک میں اپنی آواز کے ذریعے اپنے آپ کو شناخت کروانا بہت مشکل کام ہے۔... ایک رائٹر اور ایک ریڈیو کا پریزینٹر لوگوں کے درمیان ہوتا ہے مگر کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کون ہے۔ لیکن اس انٹرویو کے بعد یقیناً" لوگ مجھ سے رابطہ کریں گے اور مجھ سے ملنے کی خواہش بھی کریں گے۔"

★ "مزاج کے کیسے رہے' اب تک کی زندگی میں؟"

✳ "بہت ٹھنڈا مزاج میں نے پایا ہے زندگی میں آج تک میرا ہاتھ کسی پہ نہیں اٹھا اور اللہ کا شکر ہے کہ ہم نے اپنے بچوں کی تربیت بھی بہت اچھے انداز میں کی' لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ دونوں جاب کرتے تھے تو گھر کون سنبھالتا تھا تو بات یہ تھی کہ ہمارے گھر میں جو لڑکیاں بیاہ کر ہم لاتے تھے ان کی ہماری نظروں میں بہت قدر تھی۔ پھر ہمارے سر پر ہماری ماں کا سایہ رہا' اور تیسری بات یہ کہ بیگم جاب سے آنے کے بعد ایک

گھنٹہ آرام کرتی تھیں اور باقی سارا ٹائم بچوں کو دیتی تھی۔ غزالہ مظہران کا نام تھا۔"

★ "ریڈیو کے آر جے کہتے ہیں کہ معاوضہ اچھا نہیں ہوتا تو کیا ایسا ہی ہے؟"

✳ "جی معاوضہ بالکل بھی اچھا نہیں ہوتا اور کسی پریزینٹر کو ایک پروگرام کے 1000 روپے مل جائیں تو وہ بہت خوش قسمت ہوتا ہے۔ تو میں تو اپنا جنون اور اپنا شوق پورا کرنے کے لیے ریڈیو پہ آتا ہوں۔ گھر کا چولہا ریڈیو سے نہیں چل سکتا۔"

★ "فضول خرچ ہیں آپ؟"

✳ "میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے ہاتھ میں پیسہ رکتا نہیں ہے شاید میرا اسٹار ایسا ہے میرا اسٹار ٹورس ہے اور 21 مئی 1952ء میری پیدائش ہوئی اور میرے آباؤ اجداد مدھیہ پردیش گوالیار سے آئے تھے۔ 1948ء میں پاکستان آئے تھے۔ میرے والد ممبئی میں باوانی گروپ میں نوکری کرتے تھے اور میرے والد 1964ء میں انتقال فرما گئے تھے اس وقت وہ کراچی کے میئر تھے اور ان کا نام کا روڈ بھی ہے "ایس ایم توفیق" کے نام سے۔"

★ "کھانے پینے سے لگاؤ ہے؟"

✳ "کھانے پینے سے لگاؤ ہے ساتھ ہی پکانے سے بھی لگاؤ ہے اور میرے خاندان میں بچیاں فون کر کے مجھ سے پوچھتی ہیں کہ مظہر بھائی زردہ چڑھا دیا ہے شیرا کس طرح بنانا ہے۔ دال چاول شوق سے کھاتا ہوں اور ہاتھ سے کھاتا ہوں کیونکہ جب تک اچار چٹنی مکس نہیں ہوگا کھانے کا مزہ کیسے آئے گا۔"

★ "سیاست سے لگاؤ رہا؟"

✳ "زمانہ طالب علمی میں سیاست سے بہت لگاؤ رہا اور میں Leflist تھا ذوالفقار علی بھٹو مجھے بہت پسند تھے اور آج تک ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان جیسا لیڈر ابھی تک پاکستان کو نہیں ملا اور میں اپنے والد کے بارے میں آپ کو بتاؤں کہ میرے والد تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن تھے۔ 1948ء میں قائداعظم کے انتقال کے وقت اس جگہ پر "جھونپڑے" میں رہتے تھے اور وہ جگہ اس وقت مسلم آباد کہلاتی تھی، قائداعظم کے انتقال کی رات سید ہاشمی رضا صاحب جو اس وقت کراچی کے ایڈمنسٹریشن تھے۔ کے ساتھ قائداعظم کی وصیت کے مطابق ان کی قبر کی جگہ کے انتخاب میں پیش پیش تھے۔ میرے والد علی قریشی اس علاقے کی مسلم لیگ وارڈ کے سکریٹری تھے آج بھی والد صاحب کے نام پر ایک روڈ کا نام ہے۔ جو اگست۔ 1964ء میں کراچی کے میئر جناب ایس ایم توفیق صاحب کی منظوری سے والد صاحب کی بے مثال خدمت کے اعتراف میں رکھا گیا 1964ء کی بات ہے میں اس وقت کلاس 6th کا طالب علم تھا اور سب بہن بھائیوں میں بڑا تھا زندگی کا سفر بڑا کٹھن تھا جون ایلیا کا یہ شعر میرے جذبات کا عکاسی کرتا ہے کہ۔"

جو گزاری نہ جا سکی ہم سے
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے

★ "اپنے ریڈیو FM-105 کے حوالے سے بھی کچھ کہنا چاہ رہے تھے آپ؟"

✳ "جی جی۔ آپ کو بتاؤں کہ 2013ء میں ایف ایم 105 پاکستان کا بہترین ریڈیو قرار دیا جا چکا ہے۔ اور 2014ء میں اسے بہترین اس لیے کہا گیا کہ FM-105 پاکستان کے 74 فیصد آبادی تک اپنی نشریات پہنچاتا ہے اور اس چینل سے 9 زبانوں میں پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ فنانشل ٹائم لندن کی طرف سے قرار دی جانے والی دنیا کی سب سے بڑی "این جی اوز" لائنز کلب انٹرنیشنل نے سال رواں کا بہترین ریڈیو ایف ایم 105 کو قرار دیا اور یوں FM-105 مسلسل کئی سالوں سے ایف ایم کا بہترین چینل اور سب سے بڑا چینل قرار پا رہا ہے اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں بھی اس چینل کا حصہ ہوں اور 2012ء سے خدمات انجام دے رہا ہوں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے مظہر قریشی صاحب سے اجازت چاہی۔ اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے اپنی مصروفیات سے ٹائم دیا۔

✿ ✿

شفق راجپوت

ادارہ

س۔ آپ کا پورا نام؟ گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟

ج۔ شفق طاہر۔ یہ اسکول و کالج میں چلتا رہا ہے۔ قلمی نام شفق راجپوت اور میرے پاپا کبھی کبھی "شفو" کہہ کر بلاتے ہیں۔

س۔ کبھی آئینے نے آپ سے یا آپ نے آئینے سے کچھ کہا؟

ج۔ میں کہتی ہوں "ہائے یار... اوپری ہونٹ کا خم ہوتا نا زیادہ تو... مزا آجاتا اور آئینہ کہتا ہے اچھی خاصی تو ہو۔ ایویں ناشکراپن نہ کیا کرو۔ ہاہاہا...

س۔ آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟

ج۔ میرا رجسٹر ایک۔ میری ڈائریاں۔ میرے ڈائجسٹ۔ میرے ناول۔

س۔ آپ اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں۔

ج۔ وہ لمحے جب میں نے اپنے ہر رشتے کو اپنا ساتھ چھوڑتے دیکھا۔ سوائے ماں کے اور بے گناہ ہوتے ہوئے بھی سزا پائی۔ باتیں سنیں، مگر اللہ رحم کرنے والا ہے اس نے مجھے صبر دیا اور صبر کا پھل بھی۔

س۔ آپ کے لیے محبت کیا ہے؟

ج۔ محبت "بھروسہ" ہے۔ محبت "یقین" ہے۔ محبت "سچائی" ہے۔

س۔ مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہے۔

ج۔ بہت سارا پڑھنا اور زندگی میں کسی مقام پر پہنچنا کہ مجھ سے وابستہ لوگ مجھ پر فخر کریں۔

س۔ پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور مطمئن کیا ہو؟

ج۔ پچھلا پورا سال تو فارغ رہی ہوں۔ ضائع کیا ٹائم۔ تو کوئی خاص نہیں۔

س۔ آپ اپنے گزرے کل، آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں واضح کریں۔

ج۔ صرف اور صرف اللہ کی ذات پر یقین۔

س۔ اپنے آپ کو بیان کریں۔

ج۔ بہت حساس ہوں۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ رونا آجاتا ہے اور ذرا سا سخت لہجہ بھی تکلیف دیتا ہے کسی کا۔ اپنے لیے بھی۔ کسی دوسرے کے لیے بھی۔

س۔ کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑے ہوئے ہیں۔

ج۔ اپنی محبت کو کھو دینے کا ڈر۔

س۔ آپ کی کمزوری اور طاقت کیا ہے؟

ج۔ کمزوری میری بابا اور میری محبت۔ اور طاقت بھی یہ ہی ہیں۔ اور اللہ پہ یقین۔

س۔ آپ خوشگوار لمحات کیسے گزارتی ہیں۔؟

ج۔ ایک کپ چائے ساتھ کیک کھاتے اور اچھے سے سونگز سنتے ہوئے۔

س۔ گھر آپ کی نظر میں؟

ج۔ وہ جگہ جہاں سکون اور محبت ہو تو اس دنیا میں "جنت" ہے۔

س۔ کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں؟

ج۔ بہت مشکل سے معاف تو کر دیتی ہوں مگر بھول نہیں پاتی۔

س۔ اپنی کامیابیوں میں کیسے حصے دار ٹھہراتی ہیں؟

ج۔ صرف اور صرف اللہ کی ذات۔ وہ نہ چاہتا تو میں کبھی کہیں بھی کامیاب نہ ہو پاتی۔

س۔ سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے کاہل کر دیا یا واقعی ترقی ہے؟

ج۔ مشینوں نے کاہل تو کیا ہی ہے۔ مگر ترقی بھی تو ہے نا۔

س۔ کوئی عجیب خواہش؟

[illegible] خواہش ہے۔ ہاہاہا...

س۔ برکھارت کیسے انجوائے کرتی ہیں؟

ج۔ کبھی چائے بنا کے سیڑھیوں پر بیٹھ کے پیتے ہوئے۔ اور کبھی ساتھ پکوڑے بنا کے۔ مجھے کھانے پینے کا کافی شوق ہے۔

س۔ آپ جو ہیں' یہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟

ج۔ میں جو ہوں یہ نہ ہوتی تب بھی اس سے ملتی جلتی ہی ہوتی۔

س۔ آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب؟

ج۔ جب میں نماز اور قرآن کے بعد اپنے روم روم میں سکون اترتا محسوس کرتی ہوں۔ اور اپنی اسکول لائف یاد کرتی ہوں۔ خاص طور پر 9th10th کے دو سال۔

س۔ آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟

ج۔ انسان کا اچھا اخلاق۔ قدرت کے حسین نظارے۔ نیچرل بیوٹی۔ اور پرخلوص محبت جو آج کے دور میں نایاب ہے اور کم یاب بھی۔

س۔ کیا آپ نے اپنی زندگی میں وہ سب پالیا ہے جو پانا چاہتی تھیں؟

ج۔ ہائے۔۔۔ جو پانا چاہتی ہوں بس وہی نہیں پایا۔ مگر ابھی تو زندگی پڑی ہے ابھی تو میں چھوٹی سی ہوں۔ (ہاہا) اور میں اللہ کی رحمت سے مایوس بھی نہیں ہوں۔ انتظار جاری ہے۔ ان شاء اللہ' اللہ بہتر کرے گا۔

س۔ ایک خوبی یا خامی جو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟

ج۔ خوبی یہ کہ حسد نہیں ہے مجھ میں۔ پرخلوص ہوں ہر ایک کی خوشی پہ خوش ہوتی ہوں۔ خامی یہ کہ موڈی ہوں۔ اور اس سے خود مجھے بھی چڑ ہے۔

س۔ کوئی ایسا واقعہ جو آج بھی آپ کو شرمندہ کردیتا ہو؟

ج۔ نہیں ایسا کوئی واقعہ نہیں شکر اللہ کا۔ بچپن میں بلکہ FA تک لوگوں کے گھروں کی بیل بجا کے بھاگنے والی شرارت بہت دفعہ کی ہے۔ کبھی پکڑی جاتی تو ایک آدھ واقعہ ضرور تخلیق ہو جاتا۔

س۔ [illegible] کیا آپ مقابلے کا جواب [illegible] کرتی ہیں یا خوف زدہ ہو جاتی ہیں؟

ج۔ ناں جی! میں تو خوف زدہ ہو جاتی ہوں۔ ہار سے بہت خوف آتا ہے۔

س۔ متاثر کن کتاب۔ مصنف۔ موو‌ی؟

ج۔ قرآن پاک۔ پیر کامل۔ مصنف عمیرہ احمد' نمرہ احمد' سائرہ رضا' موو‌ی باغبان۔

س۔ آپ کا غرور؟

ج۔ غرور نہیں کرتی میں۔ فخر ہے اپنے ماما پاپا پہ۔ اپنی محبت پہ۔

س۔ کوئی ایسی شکست جو آج بھی آپ کو رلا دیتی ہے؟

ج۔ اللہ کا شکر ہے ایسی کوئی شکست نہیں۔ اور دعا ہے کہ ہو بھی نہ۔

س۔ کوئی ایسی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جس نے حسد میں مبتلا کیا ہو؟

ج۔ نہیں جی۔ حسد بالکل نہیں ہوتا۔ رشک آتا ہے۔ عمیرہ احمد پر جنہوں نے "پیر کامل" لکھا نمرہ احمد پر جنہوں نے "جنت کے پتے" لکھا۔ "مصحف" لکھا۔ سائرہ رضا پر جنہوں نے "اب کر میری رفو گری" لکھا اسے جتنی بار پڑھا ہے۔ تب تب روئی ہوں میں۔

س۔ مطالعہ کی اہمیت آپ کی زندگی میں؟

ج۔ سانسوں کی طرح ضروری ہے جناب!

س۔ آپ کی پسندیدہ شخصیت؟

ج۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم۔ قائداعظم

س۔ ہمارا پیارا ملک سارا کا سارا خوب صورت ہے آپ کا کوئی پسندیدہ مقام

ج۔ میں نے اپنے شہر گوجرہ اور لاہور شہر کے علاوہ اپنے ملک میں کوئی اور شہر دیکھا ہی نہیں ہے۔ شوق بہت ہے کہ پورا ملک دیکھوں۔ خاص طور پر ناردرن ایریاز۔ اور سیف الملوک جھیل۔ اور مجھے اپنا شہر بہت پسند ہے آپ حیران ہوں گے مگر مجھے لاہور نہیں پسند آیا۔

تنزیلہ ریاض

مہر کو کہانیاں سننے کا بے حد شوق ہے۔ اسکول کے فینسی ڈریس شو میں وہ شہزادی راپنزل کا کردار ادا کر رہی ہے' اس لیے اس نے اپنے پاپا سے خاص طور پر شہزادی راپنزل کی کہانی سنانے کی فرمائش کی۔ کہانی سناتے ہوئے اسے کوئی یاد آجاتا ہے' جسے وہ راپنزل کہا کرتا تھا۔

نینا اپنے باپ سے ناراض رہتی ہے اور ان کو سلام کرنا بھی گوارا نہیں کرتی' وہ ابا سے جتنی نالاں اور متنفر رہتی' لیکن ایک بات حتمی تھی کہ امی سے اسے بہت محبت تھی' لیکن اسے محبت کا مظاہرہ کرنا نہیں آتا تھا۔ اس کی زبان ہمیشہ کڑوی ہی رہتی۔ نینا اپنے خرچے مختلف ٹیوشن پڑھا کر پورے کرتی ہے۔ اس کی بہن زری ٹیلی فون پر کسی لڑکے سے باتیں کرتی ہے۔

سلیم کی محلے میں چھوٹی سی دکان تھی۔ چند سال پہلے میٹرک کا رزلٹ پتا کر کے وہ خوشی خوشی گھر واپس آرہا تھا کہ ایک گاڑی سے اس کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے اور وہ ایک ٹانگ سے معذور ہوجاتا ہے۔ ذہنی بیمار ہونے کی وجہ سے اس کی ماں نے مثبت قدم اٹھاتے ہوئے محلے میں ایک چھوٹی سی دکان کھلوادی' سلیم نے پرائیویٹ انٹر کر کے بی اے کا ارادہ کیا۔ سلیم کی غزل احمد علی کے نام سے ایک ادبی جریدے میں شائع ہوجاتی ہے' جو اس نے نینا کے ہاتھ بھجوائی تھی۔۔

صوفیہ کا تعلق ایک متوسط گھر سے تھا۔ وہ اپنی بہنوں میں قدرے دبی ہوئی رنگت کی مالک' لیکن سلیقہ شعاری میں سب سے آگے تھی۔ صوفیہ کی شادی جب کاشف نثار سے ہوئی تو پورے خاندان میں اسے خوش قسمتی کی علامتی مثال بنادیا گیا۔ کاشف نہ صرف چلتے ہوئے کاروبار کا اکلوتا وارث تھا' بلکہ وجاہت کا اعلا شاہکار بھی تھا۔ کاشف خاندان کی ہر لڑکی اور
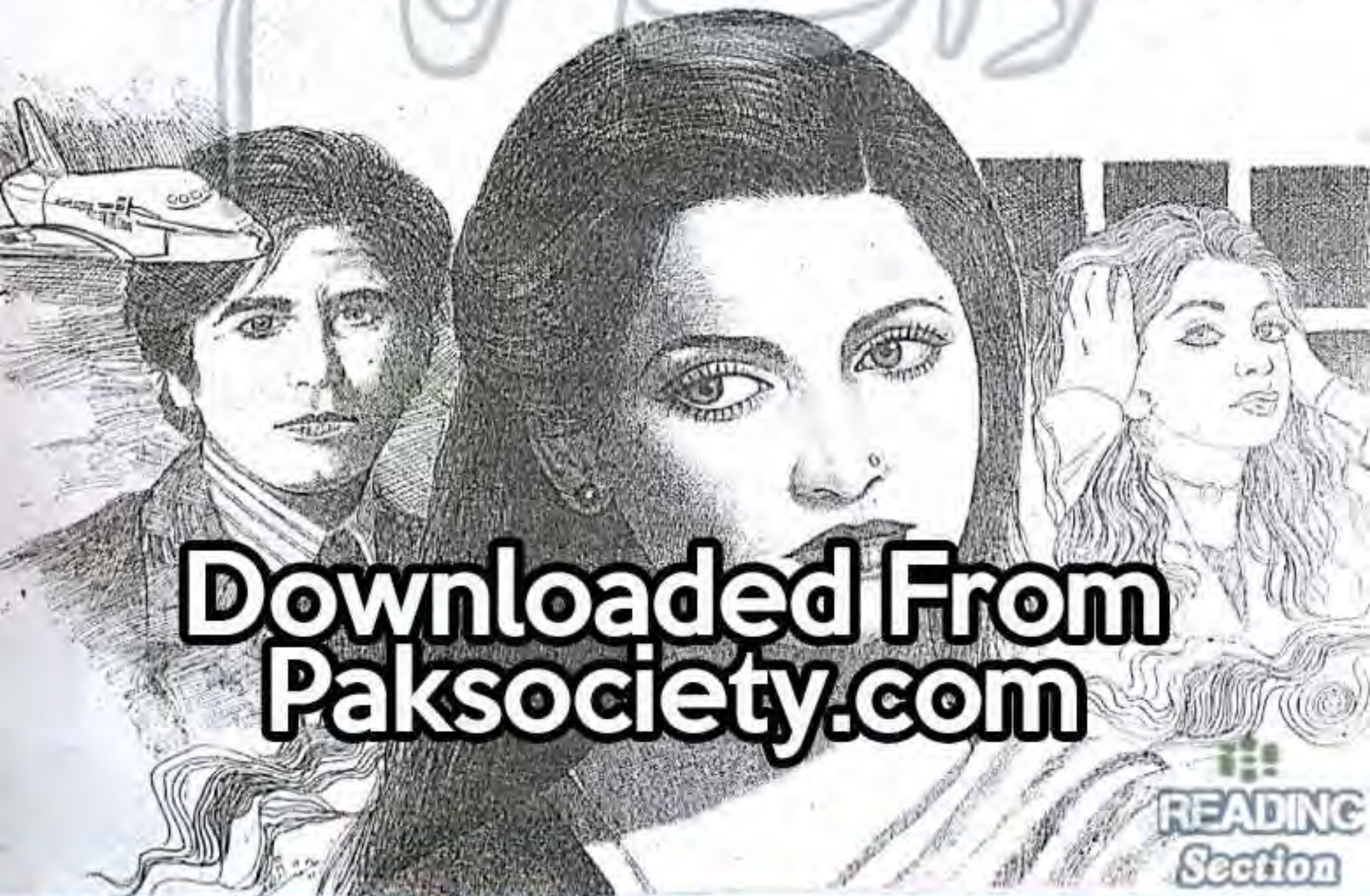
دوستوں کی بیویوں سے بہت بے تکلف ہو کر ملتا' جو صوفیہ کو بہت ناگوار گزرتا تھا۔ صوفیہ کو خاص کر اس کے دوست مجید کی بیوی حبیبہ بہت بری لگتی تھی۔ جو بہت خوب صورت اور ماڈرن تھی اور اس کی خاص توجہ کاشف کی طرف رہتی۔ حبیبہ کی وجہ سے کاشف اکثر صوفیہ سے کیے ہوئے وعدے بھول جاتا تھا۔ صوفیہ کے شک کرنے پر کاشف کا کہنا تھا کہ یہ اس کا کاروباری تقاضا ہے۔

بی بی جان 'صوفیہ کی ساس کو کاشف سے جھگڑا کرنے سے منع کرتی ہیں' لیکن صوفیہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی اور اکثر و پیشتر کاشف سے بحث کرنے لگتی جو کاشف کو ناگوار محسوس ہوتا۔ صوفیہ پریگننٹ ہو جاتی ہے اور بی بی جان کاشف سے صوفیہ کا خیال رکھنے کو کہتی ہیں۔

شہرین نے ضد کر کے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف جا کر سمیع سے شادی تو کرلی' لیکن پچھتاوے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ حالانکہ سمیع اسے بہت چاہتا ہے' اس کے باوجود اسے اپنے گھر والے بہت یاد آتے ہیں اور وہ ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے اور زیادہ تر پلز لے کر اپنے بیڈ روم میں سوئی رہتی ہے۔ سمیع نے اپنی بیٹی ایمن کی دیکھ بھال کے لیے دور کی رشتہ دار اماں رضیہ کو بلا لیا جو گھر کا انتظام بھی سنبھالے ہوئے تھیں۔ سمیع اور شہرین دونوں ایمن کی طرف سے لاپرواہیں اور ایمن اپنے والدین کی غفلت کا شکار ہو کر ملازموں کے ہاتھوں پل رہی ہے۔ اماں رضیہ کے احساس دلانے پر سمیع غصہ ہو جاتا ہے اور ان کو ڈانٹ دیتا ہے۔ شہرین کے بھائی بہن راستے میں ملتے ہیں اور سمیع کی بہت بے عزتی کرتے ہیں۔

اب آگے پڑھیے

پانچویں قسط

وہ روٹین کے مطابق ٹیوشن پڑھانے کی غرض سے نکلی تھی۔ پرپل کلر کے چھوٹے چھوٹے دائروں والی قمیص کے ساتھ 'سفید ٹراؤزر اور سفید ہی دوپٹا لیے' ایک ایک کرتے سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ غالب کی غزل کے وہ اشعار منہ ہی منہ میں دہرا رہی تھی جن کی تشریح اسے رانیہ کو کروانی تھی۔ آخری سیڑھی سے اترتے ہی اس نے سامنے چبوترے پر بیٹھے سلیم کو دیکھا۔ اسے دل ہی دل میں سخت پشیمانی محسوس ہوئی۔ سلیم کی بیساکھی سائڈ پر پڑی نظر آرہی تھی۔ اس کی دکان بائیں جانب بالکل سامنے ہی تھی' لیکن چونکہ سلیم چل نہیں سکتا تھا اور اپنی بیساکھی کو گھسیٹتا ہوا ان کے دروازے تک آیا تھا تو یہ بہت بڑی بات تھی۔

"تم صبح صبح یہاں کیوں بیٹھے ہو کزن۔۔۔ جانتے ہو نا میرے ابا لنگر تقسیم نہیں کرتے۔" عادت سے مجبور تھی اس لیے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں بولی تھی۔ سلیم نے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا' لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بالکل سپاٹ تھے۔ نینا چبوترے پر اس کے بالکل ساتھ آبیٹھی تھی تب ہی اس کی نگاہ سلیم کے عقب میں پڑے شاپر پر پڑی جس میں چپس کا بڑا والا پیکٹ تھا' اس کی پسندیدہ ببل گم بھی تھی اور چلی ملی بھی کے پیکٹ بھی نظر آرہے تھے۔ اب کی بار نینا کو کافی سے زیادہ پچھتاوا بھی ہوا اور ساتھ ہی ساتھ سلیم پر ٹوٹ کر پیار بھی آیا۔

"بولو نا یہاں کیوں بیٹھے ہو؟" وہ سوال پوچھے بنا رہ بھی نہیں سکی تھی حالانکہ جانتی تھی کہ وہ اس کی خاطر ہی آیا تھا۔ دو دن ہو گئے تھے وہ اس کی دکان تک نہیں گئی تھی۔ سلیم ابھی بھی کچھ نہیں بولا تھا شاید اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔

"میں زندہ ہوں۔۔۔ مری تو نہیں ہوں جو تم نے اتنا رونے والا منہ بنایا ہوا ہے۔" وہ چڑ کر بولی۔ سلیم نے کھا جانے والی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا پھر اسی کے انداز میں بولا۔

"تم سے کس نے کہہ دیا کہ جب تم مرو گی تو میں رونے والا منہ بناؤں گا۔"

"کہنا کس نے تھا۔۔۔ کسی کی مجال ہے کہ مجھ سے کچھ کہے۔۔۔ وہ تو میں نے خود ہی فرض کرلیا تھا۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"میتھس پڑھا پڑھا کر تمہیں عادت ہی پڑ گئی ہے غلط سلط چیزیں فرض کرنے کی۔۔۔ یاد رکھنا جب تم مروگی تو میں موتی چور کے لڈو سارے محلے میں بانٹوں گا اور ان تمام گھروں میں بھی دے کر آؤں گا جہاں جہاں تم ٹیوشن پڑھانے جاتی ہو۔"

"میرے ابا اگر یہ بات کہتے تو مجھے بالکل حیرت نہ ہوتی، لیکن تمہارے منہ سے یہ بات سن کر میرا دل بالکل ٹوٹ گیا ہے سلیم۔" وہ گہری سانس بھر کر بولی۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے نینا۔۔۔ کچھ اور ٹوٹا ہوگا۔۔۔ دل تو تمہارے پاس ہے ہی نہیں۔۔۔ جو چیز ہے ہی نہیں وہ ٹوٹ کیسے سکتی ہے۔" سلیم ابھی بھی خفگی جتانے کی کوشش میں مصروف تھا۔

"یہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔۔۔ واقعی کچھ اور ٹوٹا ہوگا۔۔۔ تم سے بہتر کون جانتا ہے کہ میں ایک دل لیس انسان ہوں۔" سلیم نے اس کی جانب دیکھا۔۔۔ سلیم چند لمحے کچھ نہیں بولا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے دیر بھی ہو رہی ہے اور پھر اتنی صبح دکان خالی چھوڑ کر اس طرح چبوترے پر آبیٹھنا کوئی مناسب حرکت نہیں تھی۔

"تم مجھ سے کیوں ناراض ہو؟" وہ ایک دم سے اس کی جانب مڑ کر پوچھنے لگا تھا۔ نینا نے گہری سانس بھری۔

"میں ناراض نہیں ہوں سلیم۔" اس کے علاوہ وہ کیا کہہ سکتی تھی۔

"تو پھر اس طرح کیوں کر رہی ہو میرے ساتھ۔۔۔ دو دن سے تم نے اپنی شکل نہیں دکھائی۔۔۔ منہ بنا کر چھپ کر کیوں بیٹھی ہوئی ہو۔" وہ سخت ناراضی بھرے لہجے میں بولا تھا۔ نینا چپ رہی۔

"دیکھو نینا۔۔۔ اس ساری کہانی میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے تم دل میں چھپا کر رکھو۔۔۔ یا اس پر جلتی کڑھتی رہو۔۔۔ ایک بات تھی۔۔۔ میں نے تمہیں کہہ دی اور سچ بتانا کہ کیا تمہارے لیے یہ بات کوئی انکشاف تھی۔۔۔؟ کیا تم یہ سب پہلے سے جانتی نہیں تھیں۔۔۔" نینا کی آنکھیں پھر خوامخواہ بھیگنے لگیں۔ اس نے پلکیں جھپکی تھیں۔

"مجھے افسوس ہے سلیم۔۔۔ لیکن میں۔۔۔" وہ اتنا ہی کہہ سکی۔ سلیم کے چہرے پر برہمی کے تاثرات بڑھے تھے۔

"اب بس بھی کرو۔۔۔ بہت ہو گیا یہ افسوس تعزیت اور پرسہ۔۔۔ کچھ چیزیں میرے جنازے پر کرنے کے لیے بھی بچائی ہیں یا نہیں؟" نینا نے اس کی جانب دیکھا تو سلیم کو اندازہ ہوا کہ اس کی آنکھوں کے کناروں پر کہیں ہلکی سی نمی چمک رہی تھی۔ اسے ہنسی آگئی۔ نینا چند لمحے اسے گھور کر دیکھتی رہی پھر وہ بھی ہنسی تھی۔

"بہت برے ہو تم سلیم۔۔۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے میں کسی کے سامنے کبھی نہیں روئی، لیکن تم نے مجھے رلا دیا۔" وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

"آج تو رو لیا میرے سامنے، لیکن دیکھو دوبارہ کبھی نہ رونا۔۔۔ میں بہت ہی کمزور انسان ہوں اور آنسو بے شک وزن میں بے حد ہلکے ہوتے ہیں، لیکن ان کا بوجھ بہت زیادہ ہوتا ہے اور یہ بوجھ ہر کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے رونا صرف اللہ کے سامنے کرو کیونکہ صرف اللہ ہی ہے جو آنسوؤں کا بوجھ سنبھال سکتا ہے۔" وہ سادہ سے لہجے میں نصیحت کر رہا تھا۔ نینا نے اپنے ہاتھ بڑھا کر وہ لفافہ اٹھایا تھا جس میں چپس اور جوس وغیرہ موجود تھے پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔

"جی اچھا۔۔۔ آپ کے اس نصیحت نما مشورے کا شکریہ۔۔۔ کوشش کروں گی کہ یاد رہ جائے۔" وہ ہمیشہ کی طرح اس کی چیزوں کے لیے شکریہ ادا کیے بنا آگے بڑھی تھی۔ سلیم نے بھی اپنی بیساکھی اٹھائی تھی۔ پھر جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے عقب سے اسے پھر آواز دی تھی۔

"اے نینا... سنو۔" وہ رکی تھی پھر اس نے مڑ کر استفہامیہ انداز میں اسے دیکھا۔
"جی فرمایئے۔"
"آئی لو یو۔" سلیم نے کہا تھا۔ نینا کی ناک پھول گئی اور پیشانی پر مصنوعی خفگی کی تیوریاں نمودار ہوئی تھیں۔
"اونہہ... دفع دور۔" وہ چڑ کر بولی تھی۔ سلیم نے قہقہہ لگایا۔ نینا آگے بڑھ گئی تھی۔ سلیم بھی اٹھا اور دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا دکان کی جانب بڑھا تھا اور ساتھ ہی کھڑکی کی اوٹ میں کھڑا وہ وجود بھی ہٹ گیا تھا جو ان دونوں کو کافی دیر سے ناگواری سے دیکھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا تمہاری بیوی مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے؟" حبیبہ نے اٹھلا کر سوال کیا تھا۔ کاشف اپنے گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں عجلت تھی جسے حبیبہ نے بطور خاص محسوس کیا تھا۔ وہ احساس زیاں کی سب سے اوپر والی سیڑھی پر کھڑی تھی۔ اپنا سب کچھ دے کر بھی وہ کاشف کو مکمل طور پر تو حاصل نہیں کر پائی تھی۔ کاشف نے اس کے انداز کو بغور دیکھا۔ وہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔
"کیا میری بیوی خوب صورت ہے؟" اس نے اس کی جانب دیکھ کر سوال کیا پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔
"واقعی...؟" اس کے انداز میں تحقیر و تضحیک کی آمیزش تھی۔ حبیبہ کھلکھلائی۔ اسے اطمینان ہوا تھا۔ کاشف بے شک اسے چھوڑ کر جا رہا تھا، لیکن وہ دل سے اپنی بیوی کا نہیں تھا اور یہ امر اسے خوش کرنے کو کافی تھا۔
"تم بہت خوب صورت ہو حبیبہ... تمہارے جیسی کوئی اور اللہ نے بنائی ہی نہیں ہے۔" کاشف نے اس کے بے داغ چہرے کی نرمی کو اپنی انگلی کے لمس سے پوری طرح محسوس کرتے ہوئے اسے مزید خوش کیا تھا اور پھر وہ اٹھ کر آئینے کی جانب بڑھا تھا۔ حبیبہ اس کی پشت کو دیکھتی ہوئی مغرورانہ انداز میں مسکرائی۔ حبیبہ کو کسی نے پہلی دفعہ نہیں سراہا تھا، لیکن کاشف کا سراہنا اور تعریف کرنا اسے پاگل سا کر دیتا تھا۔ کاشف کوئی عام مرد نہیں تھا۔ وہ ایک خوب صورت اور خوش حال مرد تھا، جس کو گفتگو کا سلیقہ تھا، جسے اچھا کپڑا پہننے اور اچھی خوشبو کے استعمال کا، صحیح صحیح ادراک تھا۔ اس کا ساتھ اور اس کا نام کسی بھی عورت کی خوش قسمتی کو چار چاند لگا سکتا تھا۔ سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ کاشف اس کے دل میں بستا تھا اور دل میں بسنے والا مرد جب عورت کی حسن و خوبصورتی کو سراہتا ہے، اس کی تعریف کرتا ہے تو عورت ہواؤں میں اڑنے لگتی ہے اور باقی دنیا اور دنیاداری جیسے اس کے جوتے کی نوک پر آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔
"تم مجھے چھوڑ تو نہیں دو گے نا کاشف۔" اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں نظر آتے اس کے سراپے کو ایک ٹک دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ مرد کی محبت میں مبتلا ہر عورت کو یہ خدشہ زندگی کے کسی نہ کسی مقام پر ستاتا ضرور ہے۔ اس نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا پھر مسکرایا۔
"تم چھوڑ دینے والی چیز ہو؟" حبیبہ نے نزاکت سے گردن ہلائی۔ اسے اس جواب نے مطمئن نہیں کیا تھا۔
"سوال در سوال کیوں کرتے ہو... صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم مجھے چھوڑ نہیں سکتے... یہ تمہارے بس کی بات ہی نہیں ہے۔"
کاشف دوبارہ سے پلنگ پر بیٹھ کر اب موزے پہن رہا تھا۔ اسے اپنے گھر جانا تھا جہاں اس کی بیٹی تھی اور ماں بھی۔ مرد کی گھر والیاں جگہ جگہ ہو سکتی ہیں، مگر گھر اس کا ایک ہی ہوتا ہے جہاں اس کی اولاد ہوتی ہے۔ کاشف کو

بھی گناہ میں لت پت ہو جانے کے بعد گھر یاد آیا تھا جہاں اس کی اولاد بھی اور ایک عدد منکوحہ بھی جن کے تمام حقوق اس کے نام تھے اور حقوق العباد کی سب سے بڑی خلاف ورزی' زنا ہے۔

"یہی سمجھ لو۔" وہ اسی عجلت بھرے انداز میں بولا تھا۔ حبیبہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے قریب آبیٹھی۔ وہ فی الوقت اسی بات سے بہت خوش تھی کہ اس کے کمرے میں موجود اس وجیہہ شخص کو بھی اس سے محبت ہے۔ وہ محبت کے ہاتھوں اتنا لاچار تھی کہ لٹ پٹ کر بھی کسی افسوس میں مبتلا نہیں تھی۔ وہ یہ بات سمجھ ہی نہیں پائی تھی کہ ان دونوں کے درمیان کوئی رشتہ نہیں تھا اور جہاں مرد عورت کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہوتا وہاں کوئی استحقاق نہیں ہوتا' کوئی رتبہ نہیں ہوتا' کوئی مقام نہیں ہوتا' کوئی عزت نہیں ہوتی۔

"یہی سمجھتی ہوں بلکہ سمجھتی ہی نہیں ہوں۔۔۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ تم مجھے چھوڑ نہیں سکتے۔۔۔ اتنی ہمت ہے ہی نہیں تم میں۔" وہ استحقاق بھرے انداز میں بولی تھی۔ کاشف موزے پہن چکا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے وہ مصنوعی سے انداز میں مسکرایا اور اس کے چہرے کو سہلانے کی فارمیلٹی پوری کرنے کے لیے اپنا ہاتھ اس کے گال پر رکھا تھا۔ اس کے لیے حبیبہ کے ناز و ادا فی الوقت بے کار تھے جبکہ حبیبہ ابھی بھی محبت کے اس سپنولیے کو گود میں لیے بیٹھی جس کا احساس کاشف نے اسے دلایا تھا۔ اس کے ہر جانب محبت ہی محبت تھی اور وہ اس اندھی محبت کے ساتویں آسمان پر پہنچنے کے قریب ہی تھی کہ گاڑی کے ہارن کی تیز آواز نے جیسے سارا طلسم توڑ ڈالا۔ اس کے چہرے کو سہلاتا کاشف کا ہاتھ رکا تھا۔

"اس وقت کون آسکتا ہے؟" اس نے حیرانی سے سوال کیا تھا۔ حبیبہ نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔ کاشف بعجلت اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکی کا پردہ اٹھا کر باہر جھانک کر دیکھا۔ بارش کی بوندوں نے شیشے کو دھندلا دیا تھا۔ اس نے بغور دیکھا اور پھر یک دم پردہ چھوڑ کر پیچھے ہوا۔ اسے اپنی گاڑی کو پہچاننے میں اب کی بار دقت نہیں ہوئی تھی۔ اس دوران ہارن کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"کون ہے؟" حبیبہ نے اس کے محتاط انداز پر حیرانی سے دیکھا تھا۔
"میری گاڑی ہے۔ کیا صوفیہ اور بی بی جان تم سے ملنے آنے والی تھیں؟" وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔
"ہاں۔ شاید۔ پتا نہیں۔ کیوں۔ کیا وہ آئی ہیں؟" حبیبہ نے اپنی ناپسندیدگی چھپائی تھی۔ اسے کاشف کا انداز برا لگا۔ جب عورت اپنی کشتیاں جلا کر میدان میں اترتی ہے تو اسے سامنے کھڑے حریف کی پشت پر موجود کشتیاں بھی زہر لگ رہی ہوتی ہیں۔ وہ کاشف کے لیے سارے خاندان کو چھوڑنے کو تیار تھی جبکہ وہ اپنی بوڑھی ماں اور عام سی بیوی بیٹی کو دیکھ کر اسے چھوڑنے کی کوشش میں تھا۔ وہ بھی کھڑکی کے قریب آئی اور ذرا سا پردہ سرکا کر نیچے کی سمت دیکھا اسے صرف گاڑی ہی نظر آئی تھی۔ گاڑی کے اندر کون کون تھا اتنی دور سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہی تھا۔
"یہ اس وقت یہاں کیا کرنے آئی ہیں؟" کاشف نے پھر اس سے پوچھا تھا۔ حبیبہ نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا پھر کاشف کی گھبراہٹ کو محسوس کرکے اس کے چہرے کے تاثرات بگڑے تھے۔
"تم اپنی گاڑی کو دیکھ کر اتنا گھبرا کیوں رہے ہو۔" وہ کھڑکی سے پیچھے ہٹ گئی تھی۔ ہارن دوبارہ بجایا گیا تھا۔ حبیبہ کو کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس کے گھر کے دونوں کل وقتی ملازم چھٹی پر تھے۔ وہ دروازہ کھولتی تو ہی دروازہ کھلنا تھا۔
"عجیب بات کررہی ہو تم۔ گاڑی میں صوفیہ بھی ہوسکتی ہے۔" وہ مسلسل کھڑکی کی جھری سے نیچے دیکھنے میں مصروف تھا۔ ہارن بجانے پر جب دروازہ نہیں کھولا گیا تو ڈرائیور گاڑی سے نکل کر گیٹ کی طرف آگیا تھا۔
"تو۔؟" صوفیہ نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں پوچھا۔ کاشف نے چڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ مل کر مسئلہ کا حل ڈھونڈنے کی بجائے بستر پر دراز ہوگئی تھی۔
"تو۔؟" کاشف نے دہرایا پھر ناک پھلا کر بولا۔
"وہ بیوی ہے میری۔ کچا کھا جائے گی مجھے۔"
"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تمہاری بیوی ایک چڑیل ہے۔ آدم خور چڑیل۔" حبیبہ ابھی بھی اسی انداز میں بولی تھی۔ اسے کوئی پروا نہیں تھی اور یہی بات کاشف کو غصہ دلا رہی تھی۔ اب کی بار وہ خاموش رہا تھا۔ حبیبہ اس کی خاموشی سے شہہ پاکر بولی۔
"ریلیکس کاشف۔ دروازہ نہیں کھلے گا تو وہ خود بخود واپس چلی جائیں گی۔" کاشف ابھی بھی کچھ نہیں بولا تھا۔ اس کی ساری توجہ کھڑکی سے نظر آنے والے منظر پر تھی۔ اس کا ڈرائیور گیٹ سے اندر جھانک کر دیکھنے میں مصروف تھا۔

☼ ☼ ☼

"کس سوچ میں گم ہیں۔" ایک ٹرے ان کے سامنے رکھتے ہوئے ان کی شریک حیات نے مسکراتے ہوئے سوال کیا تھا۔ سامنے ٹی وی چل رہا تھا' لیکن ان کی توجہ کسی طرف نہیں تھی۔ وہ واقعی گہری سوچ میں گم تھے۔ سوال پر ذرا چونکے گہری سانس بھرتے ہوئے ان کے چہرے کی جانب دیکھا۔
"جب اولاد جوان ہوجائے حلیمہ۔ بالخصوص بیٹیاں بڑی ہوجائیں تو باپ سوچوں میں ہی گم رہا کرتے ہیں۔" ان کا انداز سپاٹ' لیکن چہرہ ابھی بھی سوچ کی پرچھائیوں تلے دبا پڑا تھا۔ حلیمہ کے لیے ان کے یہ تاثرات نئے نہیں تھے۔ وہ شوہر کی ہر رمز سے واقف تھیں۔ انہیں جب کوئی بات بہت ہی زیادہ بری لگتی تھی تو انداز اور تاثرات بالکل اسی طرح سپاٹ اور لاتعلق ہوجایا کرتے تھے۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔" ان کی جانب کیک رس کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے ان کی اہلیہ نے فوراً "ہاں میں ہاں ملائی۔ حلیمہ ایک عجیب عورت تھیں۔ انہوں نے شاید ہی کبھی ان کی کسی بات کی تردید کی تھی۔ وہ جب بھی کبھی کوئی بات کہتے تھے "کرتے تھے یا کوئی فیصلہ کرتے تھے تو حلیمہ بلاچوں چراں کے مان لینے کی عادی تھیں اور اس کا کریڈٹ وہ ہمیشہ خود کو دیتے تھے۔ انہوں نے زندگی بھر نیک نیتی سے اپنی ذمہ داریاں نبھائی تھیں۔ بیوی اور بچیوں کو ہمیشہ وہ سب دیا تھا جن کی انہیں ضرورت تھی۔ وہ اپنی خود کی نظر میں ایک بہترین ذمہ دار شوہر تھے۔

"تم نے کیا سوچا ہے زری اور نیتا کے لیے۔ کوئی رشتے وغیرہ ہیں نظر میں؟" انہوں نے کیک رس کھانے کے بجائے چائے کی پیالی کے ساسر میں رکھا تھا۔ حلیمہ مسکرائیں اور حیران بھی ہوئیں۔

"یہ آج صبح صبح کون سی سوچیں بے حال کرنے لگیں آپ کو۔"

"بے حال تو واقعی ہو رہا ہوں۔ بیٹا تو دیا نہیں اللہ نے کہ ذمہ داریاں بانٹ لیتا۔ اب جو کچھ کرنا ہے بیٹیوں کے لیے مجھے ہی کرنا ہے۔" وہ سوچوں میں غرق تھے۔ حلیمہ کے چہرے پر بھی تفکر کا جال سا بچھنے لگا۔ ان کے لیے ازدواجی زندگی کی پہلی اور اہم شرط شوہر کی فرماں برداری تھی۔ اندھے اعتقاد والے لوگ جس طرح اخبار میں "آج کا دن کیسا گزرے گا" والا صفحہ دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں وہ اس طرح اپنے شوہر کی پیشانی دیکھا کرتی تھیں۔ وہ خوش ہوتے تھے تو یہ بھی خوش رہا کرتی تھیں اور اگر کبھی وہ پریشان اداس یا متفکر نظر آتے تو ان کا دن بھی اسی طرح گزرا کرتا تھا۔ اب بھی شوہر کو مسلسل ایک ہی سوچ میں گم دیکھ کر ان کو بھی بے اطمینانی نے گھیر لیا تھا۔ دل جیسے بالکل بجھ سا گیا تھا۔

"میں بڑی ہی بدقسمت ہوں۔ آپ کو بیٹے کی خوشی بھی نہ دے سکی۔" وہ اسی بجھے ہوئے انداز میں بولی تھیں۔

"یہ سب تو اللہ کے کام ہیں حلیمہ۔ اس نے بیٹا نہیں دیا۔ اس کی مرضی۔ میں اپنی بیٹیوں سے بھی خوش ہوں۔ یہ تو اللہ کی رحمت ہیں۔ اللہ جن انسانوں کو اہل سمجھتا ہے انہیں ہی اپنی رحمت سے نوازتا ہے۔ تم دل چھوٹا کیوں کرتی ہو۔" وہ ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دے رہے تھے۔ حلیمہ کا دل شوہر کے اس رویے پر اس قدر مشکور ہوا کہ آنکھیں بھر آئیں۔

"آپ بہت اچھے انسان ہیں۔ فرشتہ صفت۔ میرے ماں باپ کی کوئی نیکی ہی تھی جو میرے کام آگئی ورنہ مرد تو بیٹا نہ ہونے پر دوسری شادیاں کرلیتے ہیں، لیکن آپ نے ایسا کبھی سوچا بھی نہیں۔" وہ احسان مند ہوئی جا رہی تھیں۔

"حلیمہ تمہیں تو بس شوہر کی تعریف کا موقع دے اللہ۔ تم زمین آسمان کے قلابے ملانے لگتی ہو۔" وہ انہیں چڑانے لگے تھے۔ حلیمہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرائیں۔

"کیوں نہ کروں تعریف۔ آپ ہیں ہی اتنے اچھے۔ نہ صرف ایک اچھے شوہر بلکہ ایک بہترین باپ۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے مجھے آپ جیسا جیون ساتھی دیا۔ میں تو جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔" حلیمہ ایک بار پھر ان کی تعریف میں رطب اللسان ہوئی تھیں۔ ان کا سینہ بھی احساس تفاخر سے پھولنے لگا۔ وہ واقعی خود کو ایک بہترین شوہر اور باپ سمجھتے تھے۔ انہوں نے بیٹیوں کی آمد پر بھی اللہ کا شکر ادا کیا تھا اور کبھی اپنی اہلیہ کو بیٹا نہ ہونے کا طعنہ نہیں دیا تھا۔ وہ بیٹیوں سے ناخوش بھی نہیں ہوتے تھے، لیکن نیتا کی خود سری انہیں پریشان کرنے لگی تھی۔ وہ بدزبان بھی تھی اور بدمزاج بھی۔ اس کے علاوہ اس کی طبیعت میں ضد اور ہٹ دھرمی کا عنصر بھی بہت زیادہ تھا۔

"اچھا باپ ہوں یا نہیں یہ تو تب ثابت ہوگا نا جب بیٹیوں کی ذمہ داری سے فراغت ملے گی۔ ابھی تو ان کے مستقبل کی سوچ پریشان رکھتی ہے۔" وہ وہ اپنی پریشانی کی وجہ بتانے پر تیار ہو ہی گئے تھے۔ حلیمہ نے سر ہلا کر تائید تو

لی تھیں ساتھ ہی انہیں سی بی ڈی چاہی کی۔

"اللہ نے بیٹیوں کو جب اتنا بڑا کرنے میں مدد کی ہے تو آئندہ بھی وہی کوئی سبب بنائے گا ان شاء اللہ۔۔۔ آپ اتنا بھی مت سوچیں۔۔۔ اللہ خود ہی کوئی سبیل بنا دے گا۔"

"ان شاء اللہ۔۔۔ زری کی مجھے اتنی فکر نہیں ہے۔۔۔ وہ بہت سمجھ دار ہے۔۔۔ اچھا برا سمجھتی ہے۔۔۔ سارا مسئلہ نیہا کا ہے۔۔۔ وہ نا صرف ضدی ہے بلکہ اپنی مرضی کرتی ہے ہر معاملے میں۔۔۔ جس نے جو کہہ دیا اس کے پیچھے لگ جاتی ہے۔۔۔ اسے اپنے اچھے برے کی پہچان نہیں ہے۔۔۔ اس کی بہت فکر رہتی ہے مجھے۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"نیہا کی وجہ سے تو میں بھی بہت پریشان رہتی ہوں۔۔۔ بہت منہ پھٹ ہو گئی ہے۔۔۔ بہت زبان درازی کرنے لگی ہے۔" حلیمہ نے بھی فوراً "ہاں میں ہاں ملائی۔

"سنو۔۔۔ کیا اس نے کبھی تم سے کچھ کہا۔۔۔ کسی میں دلچسپی ہے اس کی۔۔۔ میرا مطلب۔۔۔" وہ جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گئے تھے۔ حلیمہ نے ناگواری سے سر ہلایا اور فوراً" تردید کی۔

"نہیں۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ ضدی ہے میری بیٹی، لیکن اس قسم کی بھی نہیں ہے۔"

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔۔۔ لیکن میں نے سوچا شاید۔۔۔ لڑکوں کے ساتھ پڑھتی ہے تو۔۔۔ شاید کہیں کچھ۔۔۔" وہ ایک بار پھر خاموش رہے تھے۔ انہیں مناسب الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔ انسان بھی بہت ہی عجیب چیز ہے۔ بعض اوقات دوسروں کی بیٹیوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے جو الفاظ اور انداز بنا کسی جھجک کے استعمال کر لیتا ہے، وہی الفاظ اور انداز اپنی بیٹیوں کے لیے نامناسب لگنے لگتے ہیں۔ حلیمہ نے سابقہ انداز میں سختی سے گردن ہلائی تھی۔

"نہیں۔۔۔ آپ جیسا سوچ رہے ہیں، ایسا کچھ نہیں ہے اور یہ بات میں اپنی بیٹی کے بارے میں حلفیہ کہہ سکتی ہوں کہ وہ ایسی کسی الٹی سیدھی سرگرمی میں ملوث نہیں ہے۔۔۔ آپ کو بھی اپنی تربیت پر بھروسہ ہونا چاہیے۔" وہ بھی کچھ کہتے کہتے چپ سے ہوئے پھر ٹھنڈی ہوتی ہوئی چائے کا سپ بھرا تھا۔ ان کا دل ابھی بھی اسی منظر میں اٹکا تھا جو انہوں نے صبح صبح کمرے کی کھڑکی سے دیکھا تھا۔

"سلیم کے ساتھ کافی بے تکلفی ہے اس کی۔۔۔" انہوں نے ان کے بھانجے کا نام لے ہی لیا تھا، لیکن اس انداز میں کہ حلیمہ کو محسوس بھی نہ ہو۔

"ہاں جی۔۔۔ دراصل اس کا بچپن گزرا ہے ان سب کے ساتھ۔۔۔ وہ سب اسے بہن سمجھتے ہیں۔" حلیمہ نے لفظ "بہن" پر زور دیتے ہوئے تسلی دینے والے انداز میں کہا تھا۔ ان کو یہ اندازہ تو ہو ہی چلا تھا کہ ان کے مجازی خدا کسی غلط فہمی کا شکار ہیں اور یہ بات ان کو اب جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنے لگی تھی۔ اپنی ہی اولاد کی بار بار صفائی دینا انہیں برا لگ رہا تھا جبکہ ان کی خاموشی سے ان کے شوہر کو مزید شہہ ملی تھی۔

"عجیب باتیں کرتی ہو حلیمہ۔۔۔ سمجھنے میں اور ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔۔۔ رشتے کہہ دینے سے بدل نہیں جاتے۔۔۔ معشوقہ کو محبوبہ کہو تو وہ حلال نہیں ہو جاتی۔۔۔ نیہا ان کی بہن نہیں ہے۔۔۔ نا ہی وہ اس کے بھائی ہیں۔۔۔ تم نیہا کو بولو کہ سلیم سے دور رہا کرے۔۔۔ مجھے وہ لڑکا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔۔۔ عجیب بے ہودہ سا لڑکا ہے۔۔۔ سارا دن محلے کی عورتوں سے ٹھٹھے لگاتا رہتا ہے۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بول رہے تھے۔ حلیمہ کا چہرہ بالکل بجھ گیا تھا، لیکن پھر بھی وہ کچھ نہیں بولی تھیں۔

"مجھے نیہا سے شکایت نہیں ہے۔۔۔ وہ تو بچی ہے۔۔۔ لیکن سلیم دکان پر بیٹھ بیٹھ کر بہت شاطر ہو گیا ہے۔۔۔ تم نے کبھی اس کے دیکھنے کے انداز پر غور کیا ہے۔۔۔ ہر عورت کو ایسے گھورتا ہے جیسے نگل لے گا۔۔۔ وہ ایک بدفطرت

انسان ہے۔" وہ ناک چڑھا کر بولے تھے۔ حلیمہ کو اس بات پر سخت اعتراض ہوا۔ وہ اپنے بھانجوں کی طبیعت سے واقف تھیں' لیکن صفائی دینا اور شوہر کو کسی غلط بات پر ٹوکنا ان کے نزدیک سخت بے ادبی تھی۔ اس لیے وہ چپ کی چپ رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼
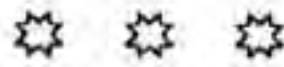
"بی بی جان! کوئی دروازہ نہیں کھولتا۔۔۔ لگتا ہے گھر میں کوئی نہیں ہے۔" ڈرائیور نے گیٹ سے گاڑی کی جانب آکر منہ بناتے ہوئے اطلاع دی تھی۔ صوفیہ نے جتاتی ہوئی نظروں سے ساس کو دیکھا جو خود بے زار ہوئی بیٹھی تھیں۔ وہ تو گھر سے بہت نیک نیت لے کر نکلی تھیں کہ ایک بیوہ عورت کی عدت ختم ہوئی ہے۔ اس کی دل جوئی کریں گی' اسے اپنی اپنائیت اور محبت کا احساس دلائیں گی اور سمجھائیں گی کہ ان کے گھر کے دروازے اس کے لیے کبھی بند نہیں ہوں گے' لیکن ساری پلاننگ ناکام ہو گئی تھی۔ نیک دل عورت تھیں۔ نیکی کرنے کا خیال ہی ان کے لیے خوش کن ثابت ہوا کرتا تھا۔ گھر سے خوش باش نکلی تھیں۔ راستے میں بارش کی بنا پر ٹریفک کا خوب ازدحام رہا تھا۔ آدھ پون گھنٹہ کا راستہ ختم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا۔ دوسری جانب صوفیہ کی طنزیہ شکل دیکھ دیکھ کر وہ پہلے ہی افسوس میں مبتلا ہوئی جارہی تھیں اور اب حبیبہ کی غیر موجودگی کی اطلاع نے مزید اکتا دیا تھا۔ گھنٹہ بھر کی ڈرائیو لاحاصل ثابت ہوئی تھی۔

"ارے بیٹا۔۔۔ تین چار بار بجاؤ نا گھنٹی۔۔۔" وہ افسوس بھرے انداز میں بولی تھیں۔

"بی بی جان گھنٹی میں پانی پڑ گیا ہے بارش کا۔۔۔ کرنٹ آرہا ہے۔۔۔ میں نے دروازہ بجایا ہے' لیکن۔۔۔" بی بی جان نے اس کی بات کاٹی۔

"ارے میاں تو زور سے بجاؤ نا۔۔۔ اندر کمروں میں آواز نہیں جاتی اس کی۔۔۔ وہ بیوہ عورت ہیں۔۔۔ بند کمرے میں کہیں پڑی ہوں گی۔۔۔ کیا پتا نماز قرآن میں مصروف ہوں۔۔۔ ان کو کہاں جانا ہے۔ گھر میں ہی ہوں گی۔۔۔ اتنی بارش میں بھلا نکلتا ہے کوئی گھر سے۔" انہوں نے اصرار کیا تھا۔ ڈرائیور سر ہلا کر دوبارہ گیٹ کی جانب چلا گیا تھا۔ وہ جانتی تھیں دوبارہ ان سے آیا نا جائے گا اس لیے چاہتی تھیں کہ یہ چکر ضائع نہ ہو۔ صوفیہ نے تاسف بھرے انداز میں انہیں دیکھا۔ حبیبہ کی غیر موجودگی کا سن کر ویسے ہی اس کے وجود میں الارم بجنا شروع ہو گئے تھے۔

"بی بی جان ہر بیوہ عورت نماز قرآن ہی نہیں پڑھتی رہتی۔۔۔ اس کی اور بھی مصروفیات ہوتی ہیں۔۔۔ اور آپ کب تک حبیبہ کو اس ایک بات کی بنا پر رعایت دیتی رہیں گی۔۔۔ وہ کوئی عام سی عورت نہیں ہے۔۔۔ ایک آزاد خود مختار عورت ہے۔۔۔ وہ واقعی گھر میں نہیں ہو گی۔۔۔ اس موسم میں نکل گئی ہو گی کہیں آوارہ گردی کرنے۔۔۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ کاشف کی گاڑی کو دیکھا تھا میں نے۔۔۔ آپ کا بیٹا سیر سپاٹا کروانے لے گیا ہو گا بے چاری کو۔"

صوفیہ نک چڑھے انداز میں بولی۔ بی بی جان نے اس کی جانب دیکھا نا اس کی بات کا جواب دیا۔ وہ بحث برائے بحث کی قائل نہیں تھیں اور پھر ایک ڈیڑھ سال میں وہ جان گئی تھیں کہ بہو کی جتنی تربیت وہ کر سکتی تھیں' کر لی۔ اب باقی وہ اپنے ذاتی تجربات سے سیکھے گی۔ چند منٹ میں ہی ڈرائیور نفی میں سر ہلاتا ہوا واپس آگیا تھا۔ بی بی جان کو بہت مایوسی ہوئی' لیکن انہوں نے ڈرائیور کو گھر کی طرف موڑنے کا کہہ دیا تھا۔ اس نے گاڑی ریورس کی۔ گاڑی ذیلی سڑک پر ڈالی اور چند لمحوں میں بڑی سڑک پر آگیا۔

"گاڑی کھڑی ہے اندر۔۔۔ مگر لگتا ہے گھر میں کوئی نہیں ہے۔" ڈرائیور نے عام سے انداز میں کہا تھا۔

"کس رنگ کی گاڑی کھڑی تھی اندر؟" اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ عام طور پر وہ گھر کے مرد ملازمین کو براہ راست کم ہی مخاطب کرتی تھی' لیکن اس وقت اس سے رہا نہیں گیا تھا۔

"سیاہ رنگ کی تھی جی۔۔۔" صوفیہ نے سر ہلایا پھر اس نے جتاتی ہوئی نظروں سے بی بی جان کی جانب دیکھا لیکن وہ اس کی جانب نہیں دیکھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر اکتاہٹ تھی۔ اس کا اپنا دل جل کر خاک ہوا جا رہا تھا۔

"اے لو۔۔۔ انسان دِکھا نہیں تمہیں کوئی۔۔۔ گاڑی دکھ گئی۔" وہ ڈرائیور کی بات پر غور کیے بنا اسے ڈپٹ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"تم لوگوں کو گھر سے جانا ہوتا ہے تو میری واپسی سے پہلے ہو آیا کرو۔۔۔ لیکن میں گھر آؤں تو مجھے گھر ملا کرو ورنہ میرا دل بے چین ہونے لگتا ہے۔۔۔ میں گھر آتے ہی سب سے پہلے تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔" کاشف نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے لاڈ بھرے لہجے میں کہا تھا۔ وہ جب گھر پہنچا تو اس کی توقعات کے برعکس بی بی جان اور صوفیہ ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ اسی لیے اس نے آرام سے یہ تاثر دیا تھا کہ وہ تو کب سے گھر پر موجود ان کا انتظار کر رہا تھا۔ بیڈ روم میں پہنچتے ہی اس کا انداز کافی والہانہ ہو گیا تھا کہ صوفیہ کو بھی شکوے شکایتیں بھول گئیں۔

"میں بھی کب جانا چاہ رہی تھی۔۔۔ لیکن بی بی جان نے اصرار کیا تھا۔۔۔ وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔۔۔ حبیبہ کی عدت ختم ہوئی ہے تو وہ اس سے ملنا چاہتی تھیں، لیکن وہ محترمہ تو گھر پر تھیں ہی نہیں۔" صوفیہ نے بات کا آغاز سادہ سے انداز میں کیا تھا۔

"تم لوگوں کو فون کر کے جانا چاہیے تھا نا۔۔۔ وہ بہت عجیب طرح کی عورت ہے۔۔۔ چوبیس گھنٹوں میں سے بیس گھنٹے تو وہ آوارہ گردی میں گزارتی ہے۔۔۔ اور اب تو صورت حال ہی تبدیل ہو چکی ہے۔۔۔ وہ پہلے بھی گھر پر کم ہی ٹکتی تھی اب تو خیر سے مجید بھی نہیں رہا۔۔۔ اب کون پابند کر سکتا ہے اس کو گھر کی چار دیواری میں رہنے کے لیے۔۔۔" کاشف نے سرہانا درست کر کے اپنی نشست کو آرام دہ بنایا تھا۔ صوفیہ کو اس کے منہ سے یہ جملہ سن کر بے حد حیرت ہوئی۔

"آج سورج کدھر سے نکلا تھا۔۔۔ آج تو کاشف صاحب اپنی پسندیدہ ترین ہستی کی خامیاں گنوا رہے ہیں۔" وہ اپنے دل کی خوشی چھپاتے ہوئے مزاحیہ سے انداز میں بولی تھی۔

"نہیں بھئی۔۔۔ خامیاں نہیں گنوا رہا۔۔۔ ہر انسان کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔۔۔ وہ اپنے شوہر کی زندگی میں بھی ایسی ہی تھی۔۔۔ آزاد منش۔۔۔ آوارہ گرد۔" وہ انتہائی تضحیک آمیز انداز میں بولا تھا۔ حبیبہ کی برائی صوفیہ کے مزاج کو بے حد شاش کر دیتی تھی، لیکن اسے حیرت بھی ہو رہی تھی، مگر اس نے اس کے متعلق سوال نہیں کیا تھا۔

"آپ کی گاڑی کہاں تھی شام کو۔۔۔؟" اس نے لہجے کو سرسری بناتے ہوئے سوال کیا تھا۔ کمرے کا ماحول بے حد خوش گوار تھا وہ شوہر پر شک کر کے اسے خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے بلاوجہ جھگڑا کرنے کی عادت بھی نہیں تھی، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان کے درمیان جھگڑے کی بنیادی وجہ شروع سے کاشف کی رنگین مزاجی رہی تھی جسے کاشف صوفیہ کی شکی طبیعت قرار دے کر چٹکیوں میں اڑا دیا کرتا تھا اور صوفیہ کے کسی قسم کے استفسار پر وہ غصے میں آجایا کرتا تھا اور چیخ چیخ کر بولنے لگتا تھا جس سے صوفیہ ڈر جایا کرتی تھی۔ کاشف اس کے ہر خدشے کو اتنی مہارت سے شک قرار دے دیتا تھا کہ بعض اوقات صوفیہ خود ہی سمجھنے لگتی تھی کہ شاید وہ اوور ری ایکٹ کرتی ہے۔ اس لیے اس نے گاڑی کے متعلق بھی عام سے انداز میں سوال کیا تھا۔

"حبیبہ کے گھر تھی۔۔۔ اسے کہیں جانا تھا تو اسی نے منگوائی تھی بمع ڈرائیور کے۔" کاشف نے سوچا سمجھا جواب دیا تھا۔

"اور آپ خود کہاں تھے۔۔۔ کس کے ساتھ وقت گزارتے رہے۔" وہ ابھی بھی تحمل سے بولی تھی۔ کاشف نے

اس کے چہرے کی طرف دیکھا پھر وہ مسکرایا تھا۔

"میں حبیبہ کے ساتھ رہا سارا دن۔۔۔ پہلے اس کے ساتھ ناشتا کیا۔۔۔ اس کے ہاتھ کی بنی چائے پی۔۔۔ پھر سارا وقت اس کے ساتھ محبت جتاتا رہا تاکہ وہ اپنے شوہر کو یاد کرکے اداس نہ ہو۔۔۔ پھر اسے شاپنگ پر لے گیا۔۔۔ اس کی پسندیدہ جگہ سے لنچ کروایا پھر اسے گھر ڈراپ کیا میں گھر واپس آنا چاہتا تھا' لیکن اس نے مجھے روک لیا۔۔۔ اسے اکیلے ڈر لگ رہا تھا۔۔۔ اس کی خاطر میں نے اس کو گود میں لے کر اس کا کندھا تھپتھپا کر اسے سلایا اور پھر گھر واپس آگیا۔" کاشف نے نہایت اطمینان سے صوفیہ کی گود میں سر رکھا اور اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا اور آنکھیں بند کرکے اسے سارا دن کی روئیداد سنائی تھی۔ صوفیہ نا سمجھی کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اسے بولنے کے لیے مزید لفظ ہی نہیں مل رہے تھے۔ کاشف نے یک دم آنکھیں کھولیں اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"یہی سب سوچتی رہتی ہو نا تم میرے بارے میں۔۔۔ ہے نا۔۔۔ بولو۔" وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کر رہا تھا۔

"یہ تو نہیں کہا میں نے۔" صوفیہ سنبھل کر بولی۔

"چہرہ دیکھو اپنا۔۔۔ اتنا شک مت کیا کرو بیگم۔۔۔ میں کئی دن سے اس کی طرف نہیں گیا۔۔۔ ہاں گاڑی ضرور بھیجتا ہوں بمع ڈرائیور کے۔۔۔ یہ تو میری ذمہ داری ہے یار۔۔۔ اس کے شوہر کا کتنا سرمایہ ہے میرے کاروبار میں۔۔۔ جبکہ تم سمجھتی ہو میں شاید رنگ رلیاں مناتا رہتا ہوں۔" وہ اسے شرمندہ کرنا چاہ رہا تھا اور کامیاب رہا تھا۔

"اف۔۔۔ یہ کب کہا میں نے۔۔۔ اب ایسے بھی ویلے نکمے نہیں ہیں آپ۔۔۔ اتنا تو جانتی ہوں میں۔" وہ گہری اطمینان بھری سانس لے کر بولی۔ یہ مشرقی عورت کی الٹی رمز ہے۔ شوہر اگر اپنے منہ سے اعتراف کرلے تو اسے جھوٹا سمجھا جاتا ہے اور صوفیہ کو اس کی ساری سچی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ یہی سمجھی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ اگر انکار کرتا تو صوفیہ کی نظر میں جھوٹا ٹھہرتا اور کاشف نے اسی لیے اطمینان سے اعتراف کرکے اسے گھما کر رکھ دیا تھا۔

"شکر ہے اتنا تو جان گئی ہو مجھے۔۔۔ دیکھو صوفیہ پلیز اب تم اپنے آپ کو ان فضول سوچوں سے نکال لو۔۔۔ میں واقعی اتنا فارغ نہیں ہوں۔۔۔ اتنا کام بڑھ گیا ہے۔۔۔ مجید کی وفات سے کام کا بہت بوجھ مجھ پر پڑ گیا ہے۔۔۔ بعض اوقات کھانا کھانے کے لیے دس منٹ کی فرصت بھی نکالنی محال ہوجاتی ہے۔۔۔ اس کے باوجود تم اگر یہ سمجھتی ہو نا کہ میں سارا دن غیر عورتوں کے ساتھ وقت گزارتا رہتا ہوں تو پلیز اپنے ذہن کو تھوڑا آرام دو۔۔۔ مجھے تمہارے اور زرمین کے علاوہ کسی دوسرے وجود میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔۔۔ تم دونوں کے بعد اگر کوئی چیز میری توجہ اپنی جانب کھینچتی ہے تو وہ میرا بزنس ہے۔۔۔ جس کے لیے میں دن بھر خوار ہوتا ہوں۔۔۔ میں تم دونوں کو زندگی کی ہر خوشی دینا چاہتا ہوں۔۔۔ یہ سب جو میرے پاس ہے نا یہ میرے ابا کا کمایا ہوا ہے۔۔۔ میں اس میں اضافہ نہیں کروں گا تو میری اولاد کے پاس فخر کرنے کے لیے کچھ نہیں بچے گا۔۔۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات۔۔۔" وہ ابھی بھی اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ صوفیہ کو دل ہی دل میں خود پر غصہ آیا اور اپنی سوچ پر شرمندگی بھی ہوئی۔ اس کا شوہر سارا دن کتنی محنت سے کام کرتا تھا' خوار ہوتا تھا اور وہ اس پر شک کرنے سے باز نہیں آتی تھی۔

"مجھے امید ہے آئندہ تم اس متعلق کوئی بات نہیں کروگی۔۔۔ اور سنو دوبارہ حبیبہ کے گھر جانے کی ضرورت نہیں۔۔۔ نہ تم وہاں جاؤ گی نہ زرمین کو لے جاؤ گی۔۔۔ مجید کے بعد اس عورت کے رنگ ڈھنگ بہت بدل گئے ہیں۔۔۔ بیس طرح کے آدمیوں سے تو یارانے ہیں اس کے۔۔۔" کاشف نے سخت لہجے میں کہا تھا۔

"مجھے تو پہلے دن سے وہ عورت کبھی اچھی نہیں لگی۔۔۔ شوہر کی زندگی میں اس کے ناز و ادا قابو میں نہیں رہتے تھے اور اب تو شوہر بھی نہیں رہا۔" صوفیہ تسلی بھری سانس لیتے ہوئے بولی تھی۔ سب کچھ اس کے حق میں ہو ہی

گیا تھا۔
"اچھا چھوڑو اس بی گریڈ عورت کو۔۔۔ یہ ذرا میرا سر دباؤ نا ذرا۔۔۔ کسی سیانے نے یہ نہیں بتایا تمہیں کہ بیوی جب محبت سے شوہر کا سر دباتی ہے نا تو اس کے سارے دن کی تھکن اتر جاتی ہے۔۔۔" اس نے اس کا ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھا تھا۔ صوفیہ جی جان سے نہال ہوتے ہوئے اپنے فرشتہ صفت شوہر کی پیشانی کو سہلانے لگی تھی اور ساتھ ہی اس دن اس نے اپنے آپ سے تہیہ کیا تھا کہ وہ اپنی بلاوجہ شک کی عادت کو ترک کردے گی۔ دوسری طرف کاشف کو اس رات بہت اطمینان کی نیند آئی۔ اس کی بیوی بھی اس سے راضی ہو گئی تھی اور دل بہلانے کو ایک عدد خوب صورت محبوبہ بھی مکمل طور پر مٹھی میں تھی۔ اللہ کو راضی کرنے کا اس نے ابھی سوچا نہیں تھا۔ اس کے نزدیک یہ بڑھاپے میں کرنے والا کام تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کے گیلے بال ٹخنوں تک پھیلے تھے اور ٹاول سے کافی دیر جھاڑ لینے کے بعد بھی پانی کی ننھی بوندیں فرش پر ٹپک رہی تھیں۔ اس نے آئینے میں کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹ کر بائیں کندھے پر پھیلایا تھا اور پھر دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے ان کو سہلانے لگی۔ پانی اس کی انگلیوں پر بھی چمکنے لگا، لیکن اسے اس عمل سے محبت تھی۔ وہ کچھ دیر بالوں کو اسی طرح سہلاتی رہی تاکہ نا صرف پانی نکل جائے بلکہ بغیر کنگھا کیے وہ سیدھے بھی ہو جائیں۔
اس کے بعد اس نے بالوں کو اسی طرح کندھے پر بکھرا رہنے دیا تھا۔ وہ اپنے بستر تک گئی تھی جہاں اس کے گلابی رنگ کے ٹاول پر اس کا سیل فون پڑا تھا۔ اس نے وہ سیل فون اٹھالیا اور پھر فرنٹ کیمرہ آن کر کے اس نے بالوں کو ایسے زاویے سے تصویر لی تھی کہ اس کی ایک آنکھ، ناک اور آدھے ہونٹ بھی تصویر میں سما سکیں۔ دو تین کلک کے بعد تصاویر چیک کی تھیں پھر برا سا منہ بنا کر اس نے وہ سب ڈیلیٹ کر دیں۔ اسے وہ پسند نہیں آئیں تھیں۔ ان میں اس کے بال ذرا بھی نمایاں نہیں ہو رہے تھے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے کی ایک ٹیوب لائٹ آن تھی۔
اس نے آگے بڑھ کر دوسری ٹیوب لائٹ بھی آن کر لی تھی اور پھر پہلے کی طرح اس نے چند تصاویر اتاری تھیں اور پہلے ہی کی طرح چند سیکنڈز میں وہ سب ڈیلیٹ کر دی تھیں۔ وہ مطمئن نہیں ہو رہی تھی۔ ان تصاویر میں اس کے بالوں کی خوب صورتی مکمل طور پر نمایاں ہی نہیں ہو رہی تھی۔
اسے اپنے لمبے بال بے حد پسند تھے۔ اس کے بال انتہائی خوب صورت تھے۔ ان کی لمبائی ٹخنوں تک تھی اور بالکل ریشم کی طرح نرم تھے۔ ان کا رنگ بالکل سیاہ نہیں تھا بلکہ وہ ہلکے سے بھورے تھے اور جب بھی وہ بال کھول کر سورج کی روشنی میں جاتی تھی تو کرنیں اس کے شہد رنگ بالوں سے پھسل پھسل کر عجیب سنہرا سا عکس پیش کرتی تھیں۔ وہ اسی سنہرے عکس کو کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کرنا چاہ رہی تھی، لیکن سورج کی روشنی مدھم پڑ چکی تھی اور فی الوقت یہ ممکن نہیں تھا۔ اس نے ناک منہ چڑھا کر مزید تصاویر لینے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ کیمرہ آف کرتے ہی سیل فون پر آئے ہوئے واٹس ایپ میسجز نمایاں ہوئے تھے۔ وہ پچاس سے زیادہ میسجز تھے۔ اپنے بیڈ پر نیم دراز ہو کر اس نے عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے اس نے پہلا میسج کھولا تھا۔ وہ مزید مسکرائی تھی پھر اس نے دوسرا میسج کھولا تھا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی اور پھر تیسرے میسج پر مسکراہٹ ہنسی میں بدل گئی تھی۔
یکے بعد دیگرے اس نے پچاسوں میسجز کھول کر دیکھ لیے تھے۔ آخری میسج پر پہنچتے تک اطمینان بھری

ہنسی اس کے ہونٹوں کے کناروں سے باہر ابلنے لگی تھی۔ پچاس کے پچاس میسج ایک ہی نمبر سے آئے ہوئے تھے اور میسج میں ایک ہی جملہ لکھا ہوا تھا۔

"راہنزل راہنزل۔۔۔ اپنے بال بکھراؤ۔۔۔ راہنزل راہنزل۔۔۔ اپنے بال بکھراؤ۔"

☆ ☆ ☆

"یہ کیا ہے اماں؟" وہ دھیرے دھیرے سیڑھیاں اتر کر ڈائننگ ٹیبل تک آئی تھی جب رانی کی آواز اسے سنائی دی۔ اماں رضیہ اور رانی سامنے کچن میں اپنے دھیان میں مگن تھیں اس لیے انہیں شہرین کے آنے کی خبر نہ ہوئی تھی۔ وہ عام طور سے سمیع کے آفس چلے جانے کے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد اٹھتی تھی اس لیے ان ڈیڑھ دو گھنٹوں میں اماں رضیہ ہی ان کی مالکن ہوتی تھیں۔ وہ تقریباً" دو سالوں سے ان کے پاس تھیں اور انہوں نے بہت اچھے طریقے سے سارا گھر سنبھالا ہوا تھا۔ اس لیے شہرین ان کی جانب سے بہت مطمئن تھی۔

"یہ کاغذات ہیں۔۔۔ سمیع نے دیے تھے۔" اماں رضیہ کی کافی مصروف سی آواز سنائی دی تھی۔

"آپ تو بڑی قابل ہیں اماں۔۔۔ سارے ہی کام کر لیتی ہیں۔۔۔ کھانا پکانا' سینا پرونا۔۔۔ اور یہ لکھت پڑھت بھی۔" رانی انہیں سراہ رہی تھی یا طنز کر رہی تھی۔ شہرین سمجھ نہ پائی۔ اس نے بہت آہستگی سے کرسی تھوڑا سا اٹھا کر آگے کی اور اس پر بیٹھ گئی۔ اس کی جانب ان دونوں کی پشت تھی۔

"ارے نوکر کیا اور نخرہ کیا۔ جو بھی صاحب لوگ کہیں سب کرنا ہی پڑتا ہے۔" اماں کا انداز کتاہٹ بھرا تھا۔

"آپ کو تو خیر کوئی بھی نوکر نہیں سمجھتا۔ اتنی عزت کرتی ہیں شہرین باجی آپ کی" رانی کی آواز آئی تھی۔

"ہاں اس میں کیا شک ہے۔ شہرین بھی اور سمیع بیٹا بھی دونوں نیک ماں باپ کی نیک اولادیں ہیں۔ خوب ادب آداب اور سلیقے والے لوگ ہیں۔ ہمیشہ عزت و احترام سے بات کرتے ہیں۔" اماں رضیہ کی بات سن کر شہرین کو اچھا لگا۔ وہ اور سمیع واقعی ملازموں کے ساتھ کافی اچھے طریقے سے بات کرنے کے عادی تھے۔

"ہمیں کیا پتا اماں ان کے ماں باپ نیک ہیں یا بد۔ ہم نے کون سا کسی کو یہاں آتے دیکھا ہے۔ میں کتنے عرصے سے یہاں ہوں۔ باجی کے میکے یا سسرال سے کبھی کسی نے قدم نہیں رکھا۔ چلو وہ نا سہی کوئی اور ہی سہی۔ کوئی تو آئے جائے اس گھر میں۔ بڑے لوگوں کے گھر تو مہمان ہی ختم نہیں ہوتے لیکن یہاں تو کبھی کسی مہمان کو دیکھا ہی نہیں۔ وہ جہاں میری بڑی بہن کام کرتی ہے۔ کہتی ہے آئے روز دعوتیں ہوتی ہیں۔ ایسے پیارے پیارے کپڑے پہن کر اس کی مالکن کی سہیلیاں اور ملنے والیاں آتی رہتی ہیں۔ اتنے مزے مزے کی چیزیں بنتی ہیں اس کی مالکن کے باورچی خانے میں۔" رانی بہت ہی لالچی سی لڑکی تھی۔ بات کرتے ہوئے بھی جیسے لالچ آواز سے جھلکنے لگا تھا۔

"آئے ہائے رانی تو یہاں کون سا بھوکی مرتی ہے۔ گوشت مرغ مچھلی۔ سب کچھ تو ملتا ہے تجھے۔ فریج میں آئس کریم جوس تو نہیں چھوڑتی۔ شہرین نے کتنے ہی پرانے کپڑے تجھے دیے ہوئے ہیں۔ پھر بھی تیرا لالچ ختم نہیں ہوتا۔" اماں رضیہ نے سخت لہجے میں ٹوکا تھا۔

"آپ تو ناراض ہی ہو گئیں اماں۔ میں نے کب کہا کہ میں بھوکی مرتی ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ مہمان نہیں آتے اس گھر میں۔ شہرین باجی کے اماں ابا یا سمیع بھائی کے اماں ابا کو بھی نہیں دیکھا۔ نانا نانی اور دادا دادی کی تو جان ہوتی ہے اپنے دوہتوں پوتوں میں لیکن کوئی ایمن سے ملنے بھی کبھی نہیں آتا۔ رونق نہیں ہے اس گھر میں" رانی ابھی بھی اپنے موقف پر قائم تھی۔ ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھی شہرین کو برا تو لگا لیکن جو بھی رانی کہہ رہی تھی وہ حقیقت ہی تھی سو اس نے ٹوکا نہیں تھا بلکہ خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہی۔

"ارے بی بی تمہارے پنڈوں گوٹھوں (دیہات گاؤں) میں رہ گئی ہیں ایسی رونقیں اب۔ شہروں میں نہیں ہوتا

یہ سب۔ معاف کرو مجھے اور کام کرنے دو۔" اماں رضیہ مزید اکتاہی ہوئی آواز میں بولی تھیں۔

"اچھا اچھا اماں کرو کام۔ ڈانٹو تو نہیں۔" رانی پھر بولی تھی۔

"ڈانٹ نہیں رہی ہوں صرف سمجھا رہی ہوں۔ تیری ماں آتی ہے مجھے کہہ کر جاتی ہے کہ تیرا خیال رکھا کروں اسی لیے کہہ رہی ہوں۔ اپنے کام سے کام رکھا کر۔ ملازموں کو زیب نہیں دیتیں ایسی باتیں۔ چل اٹھ ایمن بیٹا کے کپڑے بدل۔ اسے تیار کردے۔ اسپتال لے جانا ہے۔" اماں رضیہ نے کہا تھا۔ ایمن کے نام اور اسپتال کے ذکر پر شہرین چونکی۔

"ایمن کو کیا ہوا ہے۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ اسپتال کیوں جانا ہے۔" شہرین کے ذہن میں جو سوال اٹھا تھا وہی رانی نے پوچھ لیا تھا۔

"ایک تو تو ہم سب کی مالکن بنی رہا کر۔ سوال پر سوال کرتی جائے گی۔ کچھ نہیں ہوا ہے بچی کو۔ ٹھیک ٹھاک ہے۔ حفاظتی ٹیکا لگنا ہے۔ اس مہینے چار سال کی ہو رہی ہے۔ سمیع بیٹا کہہ گیا تھا کہ گاڑی بھیج دوں گا ایمن کو لے جانا۔ ڈاکٹر سے ٹائم لے رکھا ہے اس نے۔" اماں رضیہ نے اس کے تجسس کو دیکھتے ہوئے تفصیل سے جواب دیا تھا۔

"ایمن کی سالگرہ ہے اس مہینے۔؟" رانی کا لہجہ پرجوش ہوا تھا۔

"اماں سالگرہ بھی کرتے ہیں یہ لوگ بچی کی یا نہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ کرتے ہوں گے۔" وہ پھر اپنے حقوق سے تجاوز کرتے ہوئے ایک سوال پوچھ رہی تھی۔

"ارے میری ماں مجھے نہیں پتا۔ مجھے صرف ٹیکے کا بتایا ہے سمیع نے۔ اور تجھے بھی جو کہا ہے وہ کر۔" اماں رضیہ اس بار بہت سخت لہجے میں گھرک کر بولی تھیں۔

"اچھا اچھا۔ گھور کیوں رہی ہیں۔ جا رہی ہوں۔ کیا قسمت ہے ایمن بیچاری کی بھی۔ اتنی پیاری بچی ہے لیکن اس کے ماں باپ کو اس سے پیار ہی نہیں ہے۔" رانی کی دور جاتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔ شہرین وہیں بیٹھی رہ گئی۔ اس کے ملازمین اس کی ناک کے نیچے اس کے متعلق کیا کیا باتیں کرتے رہتے تھے۔

☼ ☼ ☼

"کیا کر رہی ہو؟" زری نے اسے بستر پر آڑا ترچھا لیٹا دیکھ کر پوچھا تھا۔ اس کے بال بکھرے تھے اور چہرہ بالکل بے رونق لگ رہا تھا جبکہ اس کے برعکس زری نے کلینزنگ کر کے ہاتھ منہ دھویا تھا پھر نائٹ کریم لگائی تھی۔ اپنے بالوں میں دس منٹ کنگھا پھیر پھیر کر خون کی روانی کو خوب بڑھایا تھا پھر بستر پر بیٹھ کر اس نے خوب سارا لوشن ہتھیلیوں پر انڈیلا تھا اور انگلیوں کا مساج کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے آپ سے کبھی لاپروائی نہیں برتتی تھی۔

"نماز پڑھ رہی ہوں۔" تہمینہ نے لیٹے لیٹے جواب دیا تھا۔ زری نے اسے گھورا۔

"لیٹ کر کون سی نماز پڑھ رہی ہو تم۔"

"جب نظر آ رہا ہے کہ لیٹی ہوئی ہوں تو پھر کیوں پوچھا کہ کیا کر رہی ہو؟" تہمینہ نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔

"اس لیے پوچھا کہ کہیں تم سو تو نہیں گئی۔" زری نے دائیں ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے سے بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی کو مروڑتے ہوئے مساج کرتے ہوئے کہا تھا۔

"فرض کر لو۔ اگر سو گئی ہوتی تو۔۔۔؟" تہمینہ نے ایک اور سوال پوچھا۔

"تو میں تمہیں وہ نا کہتی جو کہنے والی تھی۔" زری اطمینان سے بولی۔

"اچھا تو پھر کہہ دو بستی۔ کیا کہنا چاہتی تھی تم۔" تہمینہ کا مزاج کافی اچھا تھا۔

"میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ کبھی کبھی سونے سے پہلے کلینزنگ کرکے منہ دھولیا کرو۔ رنگ کتنا پھیکا سا ہو رہا ہے۔ اور اسکن بھی رف ہو گئی ہے تمہاری۔" وہ اس کا احساس کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ نینا نے پہلے منہ بنایا پھر تھوڑا سا ہنسی۔

"کیا بہت بری لگ رہی ہوں؟" اس کا مزاج اچھا ہو رہا تھا اس لیے زری نے بھی اتنی بات کہہ دی تھی ورنہ وہ برداشت کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔

"نہیں۔ بری تو نہیں لگ رہی لیکن اگر اپنا خیال رکھو تو فریش لگنے لگو گی۔ خوب صورت لگنے لگو گی۔" نینا اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اس نے اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھا۔ اس کے ہاتھ تو واقعی کتنے رف لگتے تھے جبکہ زری اتنی نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ وہ دوبارہ اپنی جگہ پر ڈھیر ہو گئی۔

"میرا دل نہیں کرتا یار۔ یہ کام نہیں ہوتے مجھ سے۔" اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔ اس کا موڈ اچھا تھا تب ہی ایسے کہہ دیا تھا ورنہ ایسے مشوروں پر وہ تڑخ کر زری کو "مائنڈ یور اون بزنس" کہا کرتی تھی۔

"خوب صورت لگنے کا دل نہیں کرتا۔ کیسی لڑکی ہو تم؟" زری حیران ہوئی حالانکہ جانتی تھی اس کی بہن ایسی ہی ہے۔

"میرا مطلب ہے کہ میرا یہ سب کرنے کو دل نہیں کرتا۔ مساج کلینزنگ۔ فیشل پیڈی کیور منی کیور۔" وہ اسی انداز میں لیٹی چھت کو تکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"تم بہت عجیب مخلوق ہو۔ آج کل کی لڑکیوں والی تو کوئی بات ہی نہیں تم میں۔ میں اگر یونیورسٹی میں پڑھتی ہوتی نا تو اتنا تیار ہو کر جایا کرتی۔ نئے نئے کپڑے بنواتی۔ اسٹائلش جوتے خریدتی۔ روزانہ بدل بدل کر بیگ لے کر جایا کرتی۔ تمہیں تو کوئی شوق ہی نہیں ہے۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو بہن۔ مجھے واقعی شوق نہیں ہے ایسے کاموں کا اور پھر یونیورسٹی جاتی ہوں بکرا منڈی نہیں کہ ہار پھول سہرے لٹکا کر جاؤں۔" اس نے اعتراف کیا تھا۔ زری اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے بستر پر آ گئی۔

"کیوں نینا۔ ایسا کیوں۔ تمہارا دل نہیں کرتا کہ تم خوب صورت لگو۔ تمہیں دیکھ کر سب کہیں کہ تم کتنی پیاری ہو۔ میں نے ڈائجسٹ میں پڑھا تھا کہ عورت کو ستائش کی حرص ہوتی ہے۔"

"تم نے آدھا جملہ پڑھا ہے۔ مکمل جملہ ایسے ہے۔ عورت کو ستائش کی حرص ہوتی ہے اور حرص بری بلا ہے۔" وہ اس کے چہرے کو دیکھ کر کہہ رہی تھی۔

"اوہو۔ میرا مطلب تھا کہ ستائش اچھی لگتی ہے عورت کو۔ سراہے جانا سب کو پسند ہوتا ہے۔" وہ وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر لوشن سے اس کا مساج کرنے لگی۔ نینا کو بہن کی یہ حرکت بڑی اچھی لگی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی زری کے سفید دودھیا نرم ملائم ہاتھوں میں اس کا بے رونق پھیکا سا ہاتھ بہت ہی عجیب لگ رہا تھا لیکن اصل چیز وہ خلوص اور محبت تھی جس سے زری اس کا مساج کر رہی تھی۔

"آج تو بڑی مہربان ہو رہی ہو ہمشیرہ۔ کیا بات ہے۔" وہ چڑاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"میں تو ہمیشہ سے ہی ایسی ہوں نینا۔ یہ تم ہو جو ہر وقت سڑی رہتی ہو۔ غصے اور خفگی کو اپنے ناک پر عینک کی طرح رکھ کر گھورتی رہتی ہو۔" زری نے اسی خلوص سے کہا تھا جس خلوص سے وہ مساج کر رہی تھی۔

"اور میں بھی ایسی ہی ہوں شروع سے۔ تمہارا میرا کیا مقابلہ۔ تم اماں ابا کی لاڈلی' خاندان بھر کی چہیتی۔ اور میں۔" اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

"ایسا نہیں ہے۔ تم پتا نہیں ایسا کیوں سوچتی رہتی ہو۔ امی اور ابا دونوں تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ بالخصوص ابا کو بہت محبت ہے تم سے۔" زری نے سمجھانا چاہا۔

"اوہ... اچھا... واقعی... ابا کو محبت ہے مجھ سے۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی تھی۔ زری نے تاسف بھرے انداز میں اس کا چہرہ دیکھا پھر کچھ کہتے کہتے ارادہ ترک کردیا۔ ان دونوں کے درمیان بحث کا یہ نیا موضوع نہیں تھا۔ نینا غلط فہمی کا شکار تھی کہ ابا اس سے محبت نہیں کرتے۔ اسی لیے وہ جب بھی کبھی ابا کے متعلق تحفظات کا شکار ہوتی تھی تو زری اسے سمجھانے کی کوشش کرتی تھی۔

"ہاں... ماں باپ کبھی اولاد سے نفرت نہیں کرتے۔" زری اسی پوائنٹ پر کھڑی تھی۔

"میں یہ نہیں کہہ رہی کہ وہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ محبت نام کی بھی کوئی چیز نہیں ہے ہمارے درمیان۔" نینا ابا کے ذکر پر چہرے کے تاثر کو بالکل سپاٹ کرلیا کرتی تھی۔

"محبت کسے کہتی ہو تم؟" زری نے اب اس کا بایاں ہاتھ تھام لیا تھا اور اس کا مساج کرنے لگی تھی۔

"محبت کو ہی محبت کہتی ہوں۔ کیا ہوگیا ہے... آج فلسفہ بلوانے پر کیوں تلی ہو۔" وہ مسکرا کر بولی تھی۔ ابا کے ذکر پر وہ ہمیشہ موضوع بدلنے کو ترجیح دیتی تھی۔ زری نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

"تم نے کبھی کسی سے محبت کی نینا۔ یا کسی کو تم سے محبت ہوئی۔" وہ کھوجنے والے انداز میں پوچھ رہی تھی۔ آواز خود ہی سرگوشی میں ڈھل گئی تھی۔ امی ابھی جاگ رہی تھیں۔ وہ اگر ان دونوں کی باتیں سن لیتیں تو اچھی خاصی شامت آسکتی تھی اس لیے وہ دھیمی آواز میں پوچھ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں اس دن والا سلیم کا اعتراف گونجنے لگا تھا۔

"ہاں... دنیا میں صرف ایک شخص ایسا ہے، جو واقعی مجھ سے محبت کرتا ہے۔" نینا نے اپنی آواز کو دھیما کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ اسی اونچی ٹون میں بولی تھی۔ زری نے کمرے کے ادھ کھلے دروازے کی جانب دیکھا۔

"کون...؟" زری کا تجسس عروج پر تھا۔

"سلیم کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے یار۔" وہ اپنی دھن میں بولی تھی۔ زری اس کے اعتراف پر بہت حیران ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یہ بات اس سے کبھی شیئر نہیں کرے گی لیکن اس نے تو بہت آسانی سے بتادیا تھا اور جب اس نے بتادیا تو اس کا بھی دل چاہا تھا کہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا راز بہن سے شیئر کرے۔ اس نے ساری تمہید باندھی ہی اس لیے تھی لیکن پھر بھی وہ اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے ڈر رہی تھی۔

"تمہیں بھی سلیم سے محبت ہے؟" اس نے ایک دم سوال کیا۔ حالانکہ اسے اس سوال کا جواب پتا تھا۔ نینا خود سلیم سے کہہ چکی تھی کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتی لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب نینا بولی۔

"دنیا میں امی کے بعد مجھے سلیم ہی سے محبت ہے۔" وہ سلیم کے نام پر زور دے کر بولی تھی۔ زری کو اس کا جواب سن کر بہت مایوسی ہوئی۔ وہ اس جواب کی توقع کر ہی نہیں رہی تھی۔ اسے اگر سلیم سے محبت تھی تو سلیم کو اس دن رو کر انکار کیوں کر رہی تھی وہ۔

"سلیم بہت اچھا انسان ہے۔ اس کا دل اتنا خالص ہے۔ ریاکاری سے بالکل پاک۔" نینا اس کی تعریفیں کرنے میں مگن تھی۔ زری کو اس منافقت کی سمجھ نہیں آئی تھی لیکن اس نے فی الحال اپنا راز شیئر کرنے کا ارادہ ترک کردیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم نے مجھے کیوں نہیں یاد کروایا ایمن کی ویکسی نیشن کا؟" رات کو اس نے سمیع سے شکوہ کیا تھا۔ صبح اماں رضیہ اور رانی کی باتیں سن کر وہ کافی دیر تک اسی متعلق سوچتی رہی تھی لیکن اس نے کسی کو ٹوکا یا ڈانٹا نہیں تھا لیکن دل میں الجھن سی بیٹھ گئی تھی کہ شاید وہ سب اپنی سوچ میں حق بجانب تھے۔ ان کے سامنے سمیع اور اس کا

تاثر ہی کچھ اس طرح کا جم رہا تھا کہ وہ اپنی بچی سے اس قدر لاپروا رہتے ہیں تو شاید انہیں اس سے محبت ہی نہیں ہے۔

سمیع نے کبھی اسے ایمن کے کام نا کرنے پر نہیں ٹوکا تھا۔ وہ پیدا ہوئی تھی تو اس کے اسپتال سے گھر آمد سے پہلے ہی اس نے ملازمہ کا انتظام کرلیا تھا لیکن تب شہرین ٹھیک رہتی تھی تو اس نے بچی کے سب کام ملازمہ کے سر پر نہیں چھوڑ رکھے تھے لیکن ایمن چھ مہینے کی ہوئی تو شہرین کو ٹائفائیڈ ہوگیا تھا جس کی بنا پر اتنی کمزوری ہوگئی کہ اس سے ایمن کے کام ہوتے ہی نہیں تھے تب سے ایمن ملازماؤں کے ہاتھوں میں ہی پلتی رہی تھی اور تب سے ہی شہرین نت نئی بیماریوں کا شکار رہتی تھی۔ سردرد کمر درد تو عام سی بات ہو کر رہ گئی تھی۔

سمیع نے اسے ویسے بھی ہتھیلی کا چھالہ بنا رکھا تھا۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر وہ گھبرا جایا کرتا تھا۔ وہ اسے گھر کے کاموں کے علاوہ ایمن کے کام کرنے پر بھی ٹوک دیا کرتا تھا جس کی بنا پر شہرین بھی لاپرواہوتی چلی گئی تھی حالانکہ ہر ایک دو مہینے بعد سوچتی تھی کہ بس اب اپنی بچی کو خود ہی سنبھالے گی لیکن آئے روز کی بیماریاں پیچھا ہی نہیں چھوڑتی تھیں۔

"میں نے اماں رضیہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ لے جائیں۔" سمیع نے اتنا ہی کہا تھا کہ شہرین نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تمہیں مجھ سے کہنا چاہیے تھا۔ ایمن کی ماں میں ہوں۔ اماں رضیہ نہیں ہیں۔" سمیع نے لیپ ٹاپ سے نگاہیں ہٹا کر لحہ بھر کے لیے اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔

"ایسے کیوں کہہ رہی ہو۔ کیا ہوا۔" وہ عام سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"ملازمین پر ہر کام نہیں چھوڑا جاسکتا۔ وہ الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں۔۔۔ تم مجھے یاد کرواتے کہ ایمن کو ویکسی نیشن کے لیے لے جانا ہے۔" وہ خفگی بھرے لہجے میں بولی تھی۔ سمیع نے گہری سانس بھری اور اپنے سامنے فائل کھولی پھر دوبارہ سے لیپ ٹاپ کی جانب دیکھ کر بولا۔

"میرے سیل میں ایمن کے لیے ریمائنڈر لگا ہوتا ہے۔ صبح مجھے الرٹ ملا تھا کہ آج اس کی ویکسی نیشن کی ڈیٹ ہے۔ تم سو رہی تھیں تو میں نے اس کی اپائنمنٹ کنفرم کرکے اماں رضیہ کو بتا دیا۔"

"تم مجھے جگا کر بتا دیتے سمیع۔" اس کی سوئی ایک جگہ ہی اٹکی تھی۔

"تم لیٹ اٹھتی ہو۔ میں نے سوچا جلدی جگا دیا تو پھر سردرد کی شکایت کروگی۔" سمیع ابھی بھی لاپروا سے انداز میں بولا تھا۔

"ایک تو میں اس سردرد سے عاجز ہوں۔ اپنے شوہر اور بچی کی ذمہ داریاں بھی ٹھیک سے نہیں اٹھا پاتی۔ اور لوگ پتا نہیں کیا کیا سمجھتے ہیں۔" اسے پھر اماں رضیہ اور رانی کی باتیں یاد آگئی تھیں۔

"کیا ہوا ہے۔ تمہاری امی کا فون آیا تھا کیا؟" سمیع نے پوچھا۔ عام طور سے جس روز شہرین اپنی امی سے فون پر بات کرلیتی تھی۔ اس روز اسی طرح خود ترسی کا شکار رہا کرتی تھی۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سرہلایا۔

"تو پھر میری امی کا آیا ہوگا۔" وہ حتمی نتیجے پر پہنچا تھا۔

"کسی کا فون نہیں آیا سمیع لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا جب اماں رضیہ سمجھتی ہیں کہ میں ایمن کا خیال نہیں کرتی یا اس کی جانب سے لاپروائی برتتی ہوں۔" وہ منہ لٹکا کر بولی تھی۔ سمیع نے چند لمحے کے لیے دوبارہ اس کی جانب دیکھا۔ اس کی پیشانی پر تیوریاں پڑنے لگی تھیں۔

"انہوں نے یہ سب کہا تم سے؟" وہ برا مان کر پوچھ رہا تھا پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔

"اماں رضیہ کون ہوتی ہیں ایسا سمجھنے والی۔ یا تم سے کچھ بھی الٹا سیدھا بولنے والی۔ وہ ایمن کی گورنس ہیں۔ انہیں کس لیے بلوایا ہے میں نے۔ کس چیز کی تنخواہ دیتا ہوں میں۔ یہ ان کی ذمہ داری ہے۔ میں بات کروں گا ان سے۔ اگر ان سے یہ سب نہیں ہوتا تو بتا دیں۔ میں نے تو ان کا لحاظ کر کے ہی انہیں یہاں بلوایا تھا کہ کہاں در در کی ٹھوکریں کھائیں گی اس عمر میں۔ وہ نہیں کر سکتیں اگر ایمن کی دیکھ بھال تو بے شک واپس چلی جائیں۔ ملازموں کی کمی نہیں ہے۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ میں ایمن کے لیے کسی اور کو ہائر کر لیتا ہوں۔" وہ سخت لہجے میں بول رہا تھا۔ شہرین نے ناک چڑھائی۔

"اتنا ایموشنل مت ہو۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ تو ہنسی خوشی سب کرتی ہیں۔ لیکن سمیع... میں خود ہی سوچ رہی تھی کہ..." وہ بات کرتے کرتے چپ ہوئی تھی۔ وہ اب اماں رضیہ کا نام نہیں لینا چاہتی تھی۔ سمیع کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ وہ واقعی کبھی کبھی بہت بدلحاظ ہو جاتا تھا۔ شہرین کو کوئی کچھ کہے یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔

"اوہو۔ تم خود ہی سب کچھ مت سوچتی رہا کرو۔ کچھ کام باقی لوگوں کے لیے بھی چھوڑ دیا کرو۔ میں نے تو کبھی کچھ نہیں کہا نا تم سے۔ میں جانتا ہوں جب تمہاری طبیعت ٹھیک ہوتی ہے تو ایمن کے سارے کام تم ہی کرتی ہو۔" وہ چڑ کر بولا تھا۔ شہرین نے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا لیکن وہ ابھی بھی کچھ سوچ رہی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ اس نے کبھی ایمن سے محبت کا والہانہ اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ جب بھی ایسا کرنے کے متعلق سوچتی تھی تو کوئی احساس تھا جو اسے روک دیتا تھا۔ اس کی پیدائش سے لے کر اب تک حالات اس طرح کے رہے تھے کہ ایمن واقعی نظر انداز ہوتی رہی تھی۔ بہت سارے عناصر تھے جو اس سب کے پیچھے کار فرما تھے لیکن سب سے بڑی وجہ شہرین کی طبیعت ہی تھی جو کبھی سنبھلتی تھی اور کبھی بگڑی رہتی تھی' آج کل چونکہ وہ ٹھیک تھی تو اس لیے بھی اس ساری صورت حال میں اسے اپنی کوتاہی بہت بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔

"اچھا چلو تم ناراض مت ہو۔ ایمن کی برتھ ڈے آرہی ہے۔" اس نے گفتگو کا موضوع بدل کر اچانک کہا۔ ایمن سے محبت کے اظہار کا فی الحال اسے یہی طریقہ سمجھ میں آیا تھا۔

"ہر سال ہی آتی ہے۔ کون سی نئی بات ہے۔" وہ لاپروائی سے بولا تھا۔

"ہاں۔ لیکن اس سال مجھے سیلیبریٹ کرنی ہے۔ بہت شاندار طریقے سے۔ ہر سال کی طرح نہیں کرنی کہ بس کہیں باہر کھانا کھانے چلے گئے اور بچی کے لیے کوئی تحفہ لے لیا۔ اس بار ویسے کرنی ہے جیسے سب کرتے ہیں۔ گھر میں پارٹی کرنی ہے۔ سب کو بلائیں گے۔" وہ حتمی لہجے میں بولی تھی۔

"یہ کیا نیا شوق چرایا ہے۔ بھئی پارٹی کرنے کا دل ہے۔" وہ اس کی فرمائش پر ہنسا تھا۔

"ہاں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ اس بار ایمن کے لیے کچھ اسپیشل سا کیا جائے۔ چار سال کی ہو جائے گی اور ابھی تک ہم نے اس کی کسی برتھ ڈے کی ڈھنگ سے تصاویر بھی نہیں بنائیں۔ لوگ کتنا کچھ کرتے ہیں اپنے بچوں کے لیے۔"

"ہمم..." سمیع نے ہنکارا بھرا پھر اس کی کنپٹی پر انگلی رکھ کر نیم سنجیدہ سے انداز میں بولا۔

"ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں زوجہ۔ ہو سکے تو اسے یہاں محفوظ کر لو۔ لوگ روگ ہوتے ہیں۔ ان کی پیروی مت کرو۔ اپنی اولاد کے لیے کبھی کسی کو دکھانے یا جتانے کے لیے کچھ نا کرنا۔ اس سے نا اولاد خوش ہوتی ہے نا لوگ اور نا ہی اللہ۔"

"سن لی ہے میں نے نصیحت اور شکر ہے مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں لوگوں کی خاطر کچھ نہیں کرنا چاہتی۔ میں تو اپنی بیٹی کی خاطر ہی کرنا چاہتی ہوں۔ اور تم بھی باتیں کرنے کی بجائے ذرا سا اچھی سی اماؤنٹ کا چیک

کاٹ کردے دو تو مہربانی ہوگی۔" وہ اس کی نصیحت کو خاطر میں نالاتے ہوئے بولی تھی۔

"تم میرا خرچہ کروا کر ہی دم لوگی۔" وہ خوشگوار انداز میں بات کر رہا تھا جس کا مطلب تھا اسے شہرین کی تجویز منظور تھی۔

"ہاں نا صرف خرچہ کرنا ہوگا بلکہ محنت بھی کرنی پڑے گی۔ میں امی لوگوں کو بھی بلواوں گی۔ بہت اچھی پارٹی کرنی ہے مجھے۔" وہ پرجوش تھی۔ سمیع لفظ "امی" پر لیپ ٹاپ کی جانب دیکھتا رہا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اسے ٹوک نہیں پایا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے۔ آج تو بالکل اچھا ٹیسٹ نہیں کیا آپ نے" اس نے رانیہ کی ٹیسٹ شیٹ اس کو چیک کرنے کے بعد واپس تھماتے ہوئے ناراضی بھرے لہجے میں کہا تھا۔ کافی دن ہو گئے تھے اب رانیہ کو پڑھاتے ہوئے اور ان دونوں کے درمیان استاد اور شاگرد والی اچھی کیمسٹری بن چکی تھی۔ رانیہ اپنا کام بہت ذمہ داری سے کرتی آئی تھی۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ نیناکو اس سے شکایت ہوئی تھی۔ رانیہ نے تھکے ہوئے انداز میں شیٹ پکڑی تھی اور غائب دماغی سے ان کا جائزہ لینے لگی۔ نیناکو اس کے بجھے بجھے سراپے نے حیرت میں مبتلا کیا تھا۔ وہ سولہ سترہ سال کی دبلی پتلی لیکن بہت پرجوش زندہ دل سی لڑکی تھی۔ اچھے مارکس لے کر خوب شور مچاتی تھی۔ دو تین بار تو وہ نینا کو اسی خوشی میں آئس کریم کھلا چکی تھی کہ میرے ٹیسٹ میں اچھے مارکس آئے ہیں۔ اسی طرح کبھی خراب مارکس آتے تھے تو "ہوہائے" ڈال کر واویلا بھی مچاتی تھی لیکن آج وہ نا بے چین ہوئی تھا نا کوئی خاص ردعمل ظاہر کیا تھا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے رانیہ" نینا نے بال پوائنٹ کو کیپ لگاتے ہوئے سرسری سے انداز میں سوال کیا۔ اس نے نا سمجھی کے عالم میں سر اٹھایا اور پھر گردن ہلا کر دوبارہ شیٹ دیکھنے لگی تھی۔ یہ بھی ایک غیر معمولی بات تھی۔ وہ بہت باتونی لڑکی تھی لیکن آج وہ کافی چپ تھی۔ اس کی بڑی بڑی گہری آنکھیں بھی سرخ سی ہو رہی تھیں۔

"کیا بات ہے ماما سے ڈانٹ پڑی ہے۔ روئی ہیں آپ؟" نینا نے دوبارہ پوچھا تھا۔

"نہیں نینا باجی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" اب کی بار اس نے نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھے بنا جواب دیا تھا۔

"آنکھیں کیوں اتنی سرخ ہو رہی ہیں۔ کیا ساری رات جاگتی رہی ہو؟" نینا نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ رانیہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ نینا کے لہجے میں شفقت اور ملائمت دونوں تھی۔ رانیہ چونکہ ایک پرابلمیٹک طالب علم نہیں تھی اس لیے نینا اس پر پہلے بھی زیادہ سختی نہیں کرتی تھی لیکن آج اس کو اس انداز میں دیکھ کر وہ مزید نرم لہجے میں سوال کر رہی تھی۔ رانیہ نے اس کی جانب دیکھا' کچھ کہنے کے لیے پر تولے پھر اس نے یک دم رونا شروع کر دیا۔ نینا پریشان ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی قریب ہوئی۔

"کیا بات ہے رانیہ۔ کسی نے کچھ کہا ہے۔ ماما نے زیادہ ڈانٹ دیا کیا؟" رانیہ کچھ نہیں بولی بلکہ ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں صاف کرنے لگی تھی جیسے اپنے بےوقت کے رونے پر خود بھی شرمندہ ہو گئی ہو۔

"آپ مجھ پر ٹرسٹ کر سکتی ہیں رانیہ۔ کوئی بات ہے جو آپ کو پریشان کر رہی ہے تو آپ مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں۔" اس نے بہت محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ اپنی تمام اسٹوڈنٹس کے ساتھ پڑھائی کے بعد اس کا لہجہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔

"بولو نا رانیہ" اس کی خاموشی سے اکتا کر نینا نے پھر پوچھا تھا۔ رانیہ کے چہرے پر کشمکش تھی جیسے کچھ کہنا بھی

چاہتی ہو' بتانے کی خواہش بھی ہو مگر ہچکچاہٹ بھی ہو۔
"اچھا آپ کی مرضی۔ لیکن اگر کوئی پریشان کن بات ہے تو اپنی ماما سے ڈسکس کرلینا۔ اوکے۔" نیناں نے اسے متامل دیکھ کر اپنی جانب سے بات ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسے یونیورسٹی سے دیر ہو رہی تھی اور کچھ اس میں صبر بھی اس سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ بال کی کھال نکال کر وقت برباد کرنے والے لوگوں میں سے نہیں تھی۔
"ماما سے ڈسکس نہیں کرسکتی میں۔ وہ مجھے ہی ڈانٹیں گی۔" رانیہ نے گلوگیر لہجے میں جواب دیا تھا۔
"ماما ڈانٹنے والی مخلوق ہی کا نام ہے لیکن ماما سے زیادہ اچھا دوست بھی کوئی نہیں ہوتا۔ ڈانٹنے ڈپٹنے کے بعد بھی ان جیسا اعتبار اور محبت آپ سے کوئی نہیں کرسکتا۔" وہ نصیحت کررہی تھی۔
"نیناں باجی۔ وہ دراصل ایک لڑکا ہے... مجھے تنگ کررہا ہے کچھ دنوں سے۔" رانیہ اتنا کہہ کر چپ ہوگئی تھی۔
نیناں نے سرہلایا۔ اس کے نزدیک یہ عام سی بات تھی جو ہر تیسری لڑکی کے ساتھ وقوع پذیر ہو رہی تھی۔
"فیس بک پر...؟" اس نے اب کی بار ذرا سخت لہجے میں سوال کیا تھا۔
"جی فیس بک پر بھی اور واٹس ایپ پر بھی۔" رانیہ شرمندگی سے بولی تھی۔
"سب سے پہلے تو آپ مجھے یہ بتائیے کہ آپ نے فیس بک پر اپنا کانٹیکٹ نمبر دیا ہی کیوں۔ یہ نہیں کرنا چاہیے تھا آپ کو۔" وہ اب کی بار پہلے سے زیادہ سختی لہجے میں سمو کر پوچھ رہی تھی۔
"نہیں نیناں باجی میں نے نہیں دیا تھا۔ دراصل میں جہاں پہلے ٹیوشن پڑھتی تھی وہاں کے کچھ اسٹوڈنٹس نے اپنے اسکول میں واٹس ایپ کا ایک گروپ بنایا ہوا تھا جہاں وہ ایگزام کے دنوں میں ایک دوسرے کے ساتھ اپنی تیاری' پرانے پیپرز اور اس طرح کی چیزیں شیئر کرتے تھے۔ ماما سے پوچھ کر میں نے بھی ان لوگوں کو اپنا نمبر دیا ہوا تھا۔ شاید وہاں سے کسی نے لیا ہے۔" وہ وضاحت آمیز انداز میں جلدی جلدی بولی تھی۔
"تو اب کیا پرابلم ہے۔ کیا کہتا ہے وہ۔ آئی مین وہ لڑکا جو آپ کو ٹیز کررہا ہے۔" نیناں کے چہرے پر سختی ہر سوال کے ساتھ بڑھتی رہی تھی۔ اسے ہمیشہ ان بچوں پر غصہ آتا تھا جو ٹیکنالوجی کا غلط استعمال کرتے تھے اور پھر دوسروں کو موردالزام ٹھہراتے تھے۔
"وہ کہتا ہے مجھے فیس بک پر ایڈ کرو... مجھ سے دوستی کرو... مجھ سے فون پر باتیں کرو... باربار واٹس ایپ کرکے ایک ہی بات کہتا ہے۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہوئی تھی۔
"کیا...؟" نیناں نے استفہامیہ انداز میں اسے دیکھا تھا۔
"ایک ہی بات لکھتا رہتا ہے۔ آئی لو یو راپنزل... آئی لو یو راپنزل۔" رانیہ کے لہجے میں جھجک اور شرمندگی ایک ساتھ بڑھی تھی۔ آنکھیں بھی دوبارہ نم ہوئی تھیں۔
"راپنزل..." نیناں نے یہ لفظ پہلی بار سنا تھا۔

☆ ☆ ☆
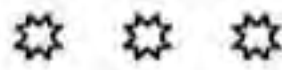
حبیبہ اس کی زندگی سے چپ چاپ نکل کر اس کے شوہر کی زندگی میں اس طرح داخل ہوئی کہ اسے پتا ہی نا چل سکا۔ وہ پہلے اس سے خار کھاتی تھی' چڑتی بھی کوستی تھی۔ اسے دل ہی دل میں برا جانتی تھی اور پھر یوں ہوا کہ وہ اور کاشف مل کر اسے برابھلا کہنے لگے۔ اس کا ذکر آتا تو کاشف ناک چڑھا کر کہتا۔
"کیا یہ ضروری ہے کہ جب ہمیں اپنی باتیں کرنی چاہئیں' تب ہم کسی تھرڈ کلاس عورت کو یاد کریں... مت کیا کرو اس کا تذکرہ میرے سامنے... اس کے مرے ہوئے شوہر کی لاج رکھ رہا ہوں' ورنہ تو ایں کی آواز بھی نا سنتا کبھی۔" اس کے لہجے کی حقارت' تضحیک اور نفرت صوفیہ کے دل میں سکون بن کر اترتی تھی۔ وہ ان دنوں اتنی

پرسکون رہنے لگی تھی کہ اسے خود بھی اپنی زندگی پر رشک آتا۔ وہ ساری باتیں جو اس کی خوش قسمتی کے بارے میں خاندان میں مشہور تھیں وہ بالکل حقیقت لگتی تھیں۔ وہ سب ایک اچھی خوش حال مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔

کاشف کا کاروبار خوب ترقی کررہا تھا۔ وہ مہینے میں دو تین دن کے لیے اپنے بزنس کی پروموشن کے لیے شہر سے باہر بھی جاتا تھا۔ ایک بار وہ ایک ہفتے کے لیے دبئی بھی گیا اور جب بھی وہ گھر سے جاتا۔ اداسی اس کے پورے وجود پر چھائی رہتی تھی۔ وہ زرمین کو اتنی بار گود میں لے کر گلے سے لگاتا کہ اس کی اداسی کو محسوس کرکے صوفیہ کی آنکھیں نم ہوجاتیں۔ اس کا شوہر اپنی فیملی کے لیے اتنی محنت کررہا تھا۔ اپنے وقت اور آرام کی قربانی دے رہا تھا تو وہ کیوں نا ایسے انسان کی محبت میں مبتلا ہوتی۔ ہر گزرتا دن اس کے دل میں کاشف کی قدرو منزلت کو بڑھا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر محبت کی پٹی اتنی زور سے بندھ گئی کہ اسے اس کے پار کچھ نظر آنا ہی بند ہوگیا۔

☆ ☆ ☆

"یہ راہنزل کون ہے؟" اس نے کاؤنٹر پر کھڑے ہوکر پہلا سوال یہی کیا تھا اور ساتھ ہی ہاتھ بڑھا کر اوپر لٹکتا پاپڑ والا پیکٹ اتار لیا تھا۔ سلیم کاغذ قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھا ہی تھا۔ اس کا سوال سن کر چڑ کر بولا۔

"مجھے کیا پتا کون ہے۔۔۔ مجھ سے تو ایسے پوچھ رہی ہو جیسے میری پھپھی کی بیٹی ہو۔"

"بات سنو سلیم، تم ذرا آپے میں رہا کرو۔۔۔ تمہیں ذرا سی اہمیت دے دو نا۔۔۔ سر ہی چڑھ جاتے ہو۔" نیناں اس سے زیادہ چڑ کر بولی۔ اس نے اطمینان سے پیکٹ کھول لیا تھا اور اب کڑکڑ کی آوازیں پیدا کرتے ہوئے پاپڑ چبا رہی تھی۔

"جی اچھا میڈم جی۔۔۔ اور کوئی حکم۔۔۔" اس نے فائل سائڈ پر رکھ دی تھی، پھر وہیل چیئر ذرا سی کاؤنٹر کی جانب کھسکائی تھی۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اسے ایک مشہور میگزین کے ایڈیٹر نے کال کی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ وہ ان کے لیے مزید لکھے لیکن وہ پاپڑ چبانے میں غرق تھی۔

"تمہارا جی نہیں بھرتا ان چیزوں سے۔" وہ ناک چڑھا کر سوال کررہا تھا۔ نیناں نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں۔۔۔ کوئی اور سوال۔۔۔" توقع کے مطابق کورا سا جواب آیا تھا۔

"مت کھایا کرو اس طرح کی چیزیں۔۔۔" وہ اب اس کی فکر کررہا تھا لیکن اس پر اثر نہیں ہوا۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" چھوٹا سا پیکٹ تھا۔ ایک ختم کرکے اس نے دوسرا بھی اتار لیا تھا۔

"تو تمہارے ابا تمہیں کھانے کو نہیں دیتے کیا یا مجھ غریب کا ہی نقصان کیے جانا ہے۔" وہ اس کے کھانے کی رفتار سے مزید چڑھ رہا تھا، نیناں نے ناک پھلائی پھر لہجے میں مصنوعی خفگی پیدا کرکے بولی۔

"میرے ابا کا نام احترام سے لو۔۔۔ میں اپنے ابا کو جو مرضی کہوں وہ میرے ابا ہیں۔ میں جو چاہے کہہ سکتی ہوں، تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ان کے بارے میں کوئی بات کرو۔"

"مجھے کوئی شوق بھی نہیں ہے بڑوں کے بارے میں عزت و احترام کے بغیر بات کرنے کا۔۔۔ آپ کے شوق آپ کو ہی مبارک ہوں۔" سلیم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

"یہ ہوئی نا بات شریف لڑکوں والی۔۔۔ اب ذرا میرے سوال کا جواب دو۔ یہ راہنزل کیا ہے؟" وہ پھر سے سوال دہرا رہی تھی۔ رانیہ کے سامنے اس نے اپنی لاعلمی ظاہر نہیں کی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ اسے پتا نہیں تھا کہ راہنزل کیا ہے۔ رانیہ کا فون نمبر اس کے پاس تھا اور اس نے اسے تسلی دی تھی کہ وہ پریشان نا ہو، وہ اس تنگ کرنے والے لڑکے کا کچھ نا کچھ ضرور کرلے گی، اسی لیے اب وہ گھر جانے کی بجائے یہاں کھڑی تھی۔

دراصل سلیم کے پاس موبائل ایزی لوڈ کی سہولت تھی۔ اسی لیے سیلولر کمپنیز میں اس کے تھوڑے بہت تعلقات بھی تھے۔ اس نے سوچا تھا وہ رانیہ کا مسئلہ اسے بتا کر مدد کے لیے کہہ دے گی۔ "راہنزل" کا تذکرہ تو اس نے صرف تمہید باندھنے کے لیے کردیا تھا اور وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ جب رانیہ اس کے سامنے دوبارہ یہ لفظ دہرائے تو اسے پتا ہو۔ اپنے شاگردوں کے سامنے اسے "لاعلم" ظاہر ہونے سے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔

"راہنزل تم ہو۔" سلیم نے مذاق اڑانے والے انداز میں اسے کہا تھا۔ نمنا نے سابقہ انداز میں اسے دیکھا' پھر افسوس سے سر ہلایا۔

"تمہیں بھی عزت راس نہیں آتی نا... میں جب بھی تمہیں پڑھا لکھا' قابل آدمی سمجھ کر تم سے کوئی مدد لینے آتی ہوں... پچھتاتی ہوں... ہمیشہ پچھتاتی ہوں۔"

"ارے واہ تم تو شاعری بھی کرنے لگی... آتی ہوں' پچھتاتی ہوں۔" وہ عادت کے مطابق ابھی سنجیدہ نہیں ہوا تھا۔

"معاف کرو بھئی... سارے خاندان میں تم ہی کافی ہو ایک شاعر... ہمیں اپنے ماتھے پر یہ کلنک کے ٹیکے مزید نہیں لگوانے۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ سلیم نے اس سے بھی زیادہ برا منہ بنایا۔

"اچھا تو پھر جاؤ یہاں سے اور خبردار اب پاپڑ چپس کھانے یا چلی ملی مانگنے میری دکان پر آئی تو... اللہ بچائے ان غریب غربا رشتے داروں سے۔"

"اچھا فرض کرو اگر دوبارہ آگئی تو کیا کرو گے۔" اس نے پوچھا۔

"تمہارے ابا کو شکایت کردوں گا کہ آپ کی بیٹی مجھے تنگ کرتی ہے۔" وہ دھمکانے والے انداز میں بولا۔

"ہاہا... ابا سے بات کرنے کی ہمت ہے تم میں... ان کے سامنے تو تمہاری گھگی بندھ جاتی ہے۔"

"اتنی ہمت تو تم میں بھی نہیں ہے... تمہاری تو سانس ہی بند ہونے لگتی ہے۔" اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"اب ایسی بات بھی نہیں ہے... اور ہر بات میں میرے ابا کا ذکر کرنا ضروری ہوتا ہے کیا؟" وہ سوال کر رہی تھی اور یہی وہ حد تھی جو سلیم پہچانتا تھا کہ اب اسے مزید نہیں چڑانا۔ اپنے ابا کے ذکر سے وہ ہمیشہ کتراتی تھی۔

"اچھا بتاؤ کیا کام ہے۔ کیا پوچھنا تھا۔" وہ سنجیدہ ہوا۔

"اونہہ... سارا موڈ ہی غارت کردیا... اب چلتی ہوں... رات کو آؤں گی تو بات کریں گے۔" وہ چبوترے سے نیچے اتری تھی۔

"رکو تو... کیا لفظ پوچھ رہی تھی... راہنزل... ؟ میرا خیال ہے کسی کہانی کا کردار تھا... ویسے کیوں پوچھ رہی ہو۔" اسے سنجیدہ دیکھ کر نمنا دوبارہ چبوترے پر چڑھی تھی' پھر اسے رانیہ کا پورا مسئلہ بتایا تھا۔

"اس سیلولر کمپنی کا بندہ آتا تو ہے میرے پاس... میں فون کرتا ہوں اس کو... پوچھتا ہوں کہ کیا ہوسکتا ہے... ویسے تم اس لڑکی کو بھی سمجھاؤ نا کہ کچھ دن کے لیے اپنا نمبر بند کردے اور آئندہ الٹے سیدھے لوگوں کو مت دے اپنا نمبر۔" اس نے پوری بات سن کر مشورہ دیا تھا۔

"کہا تو تھا میں نے... دیکھو اب کیا ہوتا ہے... ویسے لڑکی تو بہت اچھی ہے وہ۔" وہ رانیہ کی حمایت میں بولی۔

"اچھا چلو تم اب جاؤ... گاہک آرہے ہیں۔" سلیم نے تین چار لڑکوں کو دکان کی جانب آتے دیکھ کر اسے اشارہ کیا تھا۔ نمنا سر ہلا کر پھر چبوترے سے اتر گئی۔

"یہ کام کردینا بھولنا مت۔" اس نے تاکید کی۔

"گاہکوں میں لگ کر کہیں بھول ہی نا جاؤں۔ ایسا کرو مغرب کے وقت دوبارہ یاد کروانا مجھے۔" نمنا نے جاتے جاتے سر ہلایا تھا۔

"مجھے مسز تحریم لودھی نے آپ کے متعلق بتایا تھا۔" شہرین نے اپنے سامنے بیٹھی چالیس بیالیس سالہ پروقار سے حلیے والی خاتون کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ایمن کی برتھ ڈے پارٹی کے ارینج مینٹیس کے سلسلے میں ان سے ملنے کے لیے آئی تھی۔ سمیع کے کسی شناسا نے ان کے بارے میں بتاتے ہوئے کافی تعریف کی تھی اور ان کے کام کو تسلی بخش سے اوپر کے ریمارکس دیے تھے۔

"آپ نے لاسٹ منتھ ان کے بیٹے کی برتھ ڈے کی پوری پارٹی ارینج کی تھی نا۔۔۔ میں نے اس کی تصاویر دیکھی ہیں۔۔۔ مجھے اچھا لگا آپ کا کام۔۔۔ مسز تحریم کافی تعریف بھی کررہی تھیں۔" شہرین نے وضاحت کی۔ وہ خاتون خوش ہوئی تھیں۔

"بہت شکریہ۔۔۔" وہ اس فیلڈ میں بہت پرانی نہیں تھیں۔ اپنے ہی گھر سے کیٹرنگ کا نیا نیا کام شروع کیا تھا۔ اس لیے محنت بھی کافی کرتی تھیں اور ریٹس بھی مناسب سے تھے۔

"دراصل میری بیٹی کی فورتھ برتھ ڈے ہے کچھ دنوں میں۔۔۔ میں چاہتی ہوں آپ ہمارے لیے بھی بہت اچھے سے ارینج منٹ کریں۔ دراصل یہ برتھ ڈے بہت اسپیشل ہے۔ ہمارے کچھ بہت ہی خاص مہمان آرہے ہیں اس روز۔۔۔ وہ میری بیٹی کو پہلی بار دیکھیں گے تو میں کافی کانشس سی ہورہی ہوں۔۔۔ میں چاہتی ہوں ان پر میرا اور میری بیٹی کا بہت زبردست سا امپریشن جمے۔" وہ اپنا مدعا بیان کررہی تھی۔ وہ خاتون اس کی بات سنتے سنتے سر بھی ہلاتی جارہی تھیں۔ اس کی بات ختم ہوئی تو بولیں۔

"پھر تو آپ بالکل صحیح جگہ پر آئی ہیں۔ میں پوری کوشش کروں گی کہ سو فیصد آپ کے معیار پر پوری اتر سکوں۔ آپ اپنا بجٹ' ڈیمانڈز اور لوکیشن بتایے۔۔۔ ڈیٹ اور ٹائمنگ بھی بتا دیجیے۔۔۔ میرے پاس بہت ہی ہارڈ ورکنگ لوگوں کی ٹیم ہے۔۔۔ اللہ نے چاہا تو ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔" نئی ہونے کے باوجود وہ خاتون کافی پروفیشنل تھیں۔ شہرین نے اس کی پوچھی گئیں سب باتیں بتانی شروع کی تھیں جنہیں وہ اپنے آئی پیڈ میں محفوظ کرتی جارہی تھی۔

"یہ کچھ تصاویر ہیں' گزشتہ چھ ماہ کی ان برتھ ڈے پارٹیز کی جو ہم نے ارینج کی تھیں۔ آپ مناسب سمجھیں تو تھیم ان میں سے سلیکٹ کرلیں۔ آپ کی بیٹی کی برتھ ڈے ہے تو تھیم آف کورس گرلش ہوگی۔۔۔ آج کل سنڈریلا' ایلس اور لٹل مرمیڈ کی تھیمز زیادہ پاپولر ہیں۔ "ہیلو کٹی" بھی بچیوں میں کافی مقبول ہے۔" وہ اپنا آئی پیڈ اس کی جانب کرکے اسے تصویریں دکھانے لگیں۔ مختلف قسم کے فیری ٹیلز اور کارٹون کریکٹرز والی تھیم کی پارٹیز کی تصاویر ایک کے بعد ایک شہرین کے سامنے آتی جارہی تھیں اور وہ دیکھتے ہوئے ریجیکٹ کرتی جاتی تھی۔

"اگر آپ کو ان میں سے کچھ بھی پسند نہیں آرہا تو آپ خود اپنی پسند بتا دیجیے۔ ہم اس کے مطابق کام کرلیں۔۔۔ بچیوں میں آج کل باربی اور پرنسس ہی زیادہ ان ہیں۔" ان خاتون نے اپنا مشورہ دیتے ہوئے اس کی رائے بھی جاننی چاہی تھی۔ شہرین نے نفی میں سر ہلایا۔

"اس کے علاوہ کچھ اور ہے؟" اس نے پوچھا تھا۔

"آپ کی پشت پر جو بورڈ ہے اس پر بھی کچھ آئیڈیاز ہیں۔ وہاں بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔۔۔ فیری ٹیل میں سے نہیں چاہیے تو کوئی بھی کارٹون کریکٹر سلیکٹ کرلیں۔۔۔ اسپنج باب ہے' شان دا شیپ بھی پسند کرتے ہیں بچے۔۔۔ کیونکہ برتھ ڈیز بچوں کا فنکشن ہوتا ہے تو بچوں کی پسند کو مدنظر رکھنا بے حد ضروری ہے۔" وہ خاتون پچھلی دیوار کی طرف لگے دیوار کی طرف اس کی رہنمائی کرتے ہوئے مسلسل بول رہی تھیں اور اسے مختلف کارٹون کریکٹرز کے

بارے میں بتاتی جا رہی تھیں۔ شہرین چپ چاپ ان تصاویر کو دیکھنے لگی جو بورڈ پر چسپاں کی گئی تھیں۔ چند لمحے وہ ان پر ہی غور کرتی رہی، پھر بالآخر اس نے ایک کارڈ پر انگلی رکھی تھی۔

"یہ۔۔۔" اس نے سوالیہ انداز میں اس خاتون کا چہرہ دیکھا اور ان کی رائے جاننا چاہی۔۔۔ وہ خاتون اس کے برابر آگئی تھیں۔ وہ ایک بڑے سے قلعے کی کھڑکی میں بیٹھی ہوئی شہزادی کی تصویر کا کارڈ تھا۔ تصویر میں اس کریکٹر کے لمبے بالوں نے شہرین کی توجہ اپنی جانب کھینچی تھی۔ اس کے سنہرے بال قلعے کی کھڑکی سے نیچے کی جانب تصویر کی آخری سرے تک جا رہے تھے۔

"راپنزل۔۔۔؟" اس خاتون نے بھی سوالیہ انداز میں شہرین کا چہرہ دیکھا۔ شہرین نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"او کے۔۔۔ ڈن۔۔۔" وہ مسکرائی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"نیناباجی! حمزہ مجھے تنگ کر رہا ہے۔" وہ چائے کا کپ لے کر امی کے دیوان پر آکر بیٹھی ہی تھی کہ برکت نے تان لگائی تھی۔ وہ گھر میں بچوں کو ٹیوشن نہیں پڑھاتی تھی لیکن کبھی کبھی پڑوسیوں کے بچے اس سے میتھ سیکھنے یا انگلش کی گرامر وغیرہ کرنے آجایا کرتے تھے۔

"حمزہ تم باز آتے ہو کہ لگاؤں ایک تھپڑ۔" اس نے وہیں سے آواز لگائی۔

"نیناباجی قسم سے میں تنگ نہیں کر رہا۔ میں نے تو اپنی کتاب میں اسے اس کی امی کا نام لکھا دکھا رہا ہوں۔۔۔ لیکن یہ دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔" حمزہ نے بھی جواب دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور برآمدے میں ان کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

"کیا مسئلہ ہے تمہارا حمزہ کے بچے۔۔۔ ہر وقت شرارتیں سوجھتی ہیں تمہیں۔" اس نے اس کا کان زور سے کھینچا تھا۔

"آہ۔۔۔ نیناباجی میری غلطی ہو یا نا ہو۔۔۔ آپ ہمیشہ مجھے ہی ٹوکتی ہیں۔ حالانکہ میری امی جب بھی کوئی مزے کی چیز بناتی ہیں۔۔۔ میں سب سے پہلے آپ کے لیے لاتا ہوں لیکن پھر بھی۔۔۔" اس نے مصنوعی انداز میں ہنکارا بھر کر اپنی ناراضی ظاہر کی تھی۔

"ہوئے تمہاری امی کو مزے کی چیز بنانی آتی بھی ہے۔۔۔ پیکٹ کے مسالے ڈال کر بھی بریانی نہیں بنانی آئی انہیں۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔ حمزہ کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔

"میں بتاؤں گا امی کو کہ نیناباجی ایسے کہہ رہی تھیں۔۔۔ بلکہ وہ چپلی کباب بھی نہیں لاؤں گا جو امی بنا رہی تھیں۔۔۔ امی نے کہا تا کہ جب پڑھ کر آؤ گے تو نیناباجی کے لیے لے جانا۔" نینا نے منہ سائڈ پر کر کے اپنی ہنسی روکی تھی۔ وہ گریڈ 8 کا اسٹوڈنٹ تھا اور باتیں کرنے میں سب کے کان کترتا تھا۔

"اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔ کبھی کبھی اچھا بھی پکا لیتی ہیں تمہاری امی۔۔۔ چپلی کباب تو ہمیشہ ہی اچھے بناتی ہیں۔" وہ بدقت ہنسی روکتے ہوئے اسے تاکید کر کے بولی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

آسیہ عارف

اس نے اسپتال سے باہر قدم رکھا تو تیز' آنکھوں کو چبھتی دھوپ نے اس کا استقبال کیا' گرمی حد سے سوا تھی' سورج جیسے سوا نیزے پہ تھا۔ جون کی اس آگ برساتی ڈھلتی دوپہر نے سب کو گھروں میں دبک کے بیٹھنے پہ مجبور کردیا تھا لیکن اس کا تو بہت سے لوگوں کی طرح یہ معمول تھا' وہ موسموں کی شدت کا خیال رکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ سڑک دور دور تک خالی تھی۔ اسے بس پکڑنے کے لیے مین روڈ تک جانا تھا' اس نے اپنے قدموں کو اس آخری حد تک تیز کیا جتنا وہ کرسکتی تھی۔ روڈ پہ آکے کھڑے ہوئے اسے کچھ لمحات ہی گزرے تھے۔ بس آگئی کھچا کھچ بھری' لوگوں سے لدی ہوئی' اس نے اللہ کا شکر ادا کیا' اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور دروازے سے بمشکل گھستے ہوئے اس ہجوم کا حصہ بن گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ پسینے میں شرابور ابھی گلی میں داخل ہوئی ہی تھی

کہ اسے رانی پردہ ہٹا کے گلی میں جھانکتی نظر آئی' اس کے تھکے ماندے قدم مزید سست ہو گئے۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" تھکن اس کے لہجے سے بھی ظاہر ہو رہی تھی۔

"اماں کب سے نکلی ہوئی ہیں۔ انہیں دیکھ رہی تھی۔" اماں کا تو معمول تھا صبح ناشتے کے بعد نکلنا اور سورج ڈھلنے کے بعد گھر آنا' پیچھے کوئی مرے' جیسے ان کی بلا سے' اس دوران انہیں محلے کے ہر گھر میں کچھ وقت باتیں کرنے کے لیے مل ہی جاتا۔ اس محلے میں سارا مزدور طبقہ رہتا تھا' زندگی کے اصل تجزیہ نگار' اکلوتا ٹین کی چھت والا کمرہ تندور بنا ہوا تھا۔ ابا اپنے کمزور وجود سمیت جھلنگا سی چارپائی پہ بے سدھ سوئے ہوئے تھے۔

"کچھ پکایا ہے؟" اس نے پانی کا گلاس تھامتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ ٹنڈے پکائے ہیں میں لاتی ہوں روٹی۔"

☼ ☼ ☼

"اماں شانی کدھر ہے؟" شام پوری طرح پھیل چکی تھی۔ ٹیوشن والے بچوں سے فرصت ملتے ہی اسے اکلوتے بھائی کا خیال آیا۔

"گیا ہوگا اپنے لفنگے دوستوں کی طرف' ہمیں کون سا بتا کے جاتا ہے۔" جواب اماں کے بجائے رانی کی طرف سے آیا۔ اس نے اماں کی جانب دیکھا' اب رانی کی کلاس شروع' اماں اپنے اکلوتے بیٹے کے خلاف کوئی بات نہیں سنتی تھی لیکن اماں بے نیازی سی پنکھا جھلتی رہیں۔

"کنزیٰ پتری آؤ کھانا کھالو۔" کھانے کی ٹرے رانی سے لیتے ہوئے ابا نے محبت بھرے انداز میں اسے بلایا۔

"آپ کھالیں' ابو مجھے ابھی بھوک نہیں۔" وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ کنزیٰ چار بہن بھائیوں میں سے سب سے بڑی تھی' اس سے چھوٹی ارم تھی' جو شادی شدہ تھی' پھر شانی اور سب سے چھوٹی رانی تھی۔ ان کے ابو سبزی اور پھل بیچتے تھے۔ اکثر ان کی دیہاڑی اچھی لگ جاتی لیکن اس کی اماں روز کماؤ روز کھاؤ کے فارمولے پہ عمل کرتی تھیں' اس لیے جب کسی بنا پہ اس کے ابو کی دیہاڑی نہ لگتی یا وہ کام پہ نہ جاتے تو نوبت فاقوں تک بھی آجاتی۔ ایسے میں چھوٹے بہن بھائی بہت شور کرتے لیکن کنزیٰ چپ رہتی' خاموشی سے حالات کا جائزہ لیتی رہتی' اگر اماں انہیں چپ کروانے کے لیے کسی ہمسائی سے کچھ لاتیں بھی تو اس میں سے اس کا حصہ نہیں نکلتا۔ خیر یہ تو باتیں اس وقت کی تھیں جب اس کے ابو کام کرتے تھے۔ ایک بم دھماکے میں اس کے ابو بری طرح زخمی ہو گئے' ان کی ایک ٹانگ ہی اڑ گئی تھی۔ اس نے بھوک کو اکثر اپنے ارد گرد منڈلاتے تو دیکھا تھا لیکن اس بار وہ حملہ آور ہوئی تھی پوری طاقت سے۔ بہت ظالم ہوتی ہے' یہ بے بس کر دینے والی جس نے انہیں بھی بہت جلدی بے بس کر دیا تھا۔

حکومت کی طرف سے جو مدد ملی تھی' وہ کچھ ابو کے علاج پر خرچ ہو گئی' کچھ سے ان کے تھوڑے سے دن گزرے لیکن کب تک۔ بیٹھ کے کھانے سے تو قارون کے خزانے بھی ختم ہو جائیں' یہ تو تھوڑی سی رقم تھی۔ اب ایک سوالیہ نشان سامنے تھا' شانی اس وقت بارہ سال کا تھا اور کنزیٰ میٹرک کر چکی تھی۔ پھر اسے ہی ہمت پکڑنی پڑی اور اس نے اپنی کلاس فیلو کے ابو کے اسپتال میں ریسپشن گرل کی جاب کی۔ اسکول چھوڑتے وقت اسے یہ اندازہ تو تھا کہ وہ آئندہ پڑھنے کے لیے گھر سے باہر نہیں نکل سکے گی لیکن اسے اتنی جلدی کمانے کے لیے نکلنا پڑے گا' یہ تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا لیکن وقت ہمیشہ ہماری سوچ کے مطابق نتائج نہیں لاتا' بعض اوقات اس کے نتائج بہت غیر متوقع اور ناقابل قبول ہوتے ہیں' جو قبول کرنا پڑتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

"ایکسکیوزمی!" وہ تیزی سے رجسٹر پہ پنسل چلا رہی تھی جب کسی نے کسی مریض کا روم پوچھنے کے

لیے اسے متوجہ کیا۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے آنے
والے کو سمجھا رہی تھی جب داخلی دروازے سے وہ
داخل ہوا' اوف۔ تو اس کی نائٹ ڈیوٹی ختم ہو گئی' اس
نے جلدی سے خود کو کاؤنٹر کے پیچھے گم کرنے کی بے
سود کوشش کی' حالانکہ وہ جانتی تھی وہ اس کی طرف
دیکھے گا بھی نہیں' وہ بغیر رکے ناک کی سیدھ میں چلتا
اس کے پاس سے گزر گیا۔

کالے بادل آسمان کو ڈھانپے برسنے کو تیار تھے' گرمی
کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ وہ موسم کے تیور دیکھ کے پریشان
ہو گئی اور رکشا لینے کی نیت سے وہیں کھڑی ہو گئی
اسپتال کے سامنے۔ اسے شدتوں سے ہمیشہ سے ڈر
لگتا تھا چاہے وہ موسموں کی ہوں یا جذبوں کی۔ وہ بہت
معتدل مزاج رکھتی تھی' یہ اس پہ اللہ کا خاص کرم تھا
کہ ایک غیر متوازن ماحول میں رہتے ہوئے بھی
متوازن شخصیت کی مالک تھی۔ وہ سوچوں میں گم تھی'
جب اس کے پاس بائیک رکی۔

"آئیں۔ میں آپ کو چھوڑ دوں گا' موسم بھی
خراب ہے۔" اس نے نظریں جھکائے ہوئے اسے
مخاطب کیا۔

"شکریہ! آپ کو زحمت ہو گی' میں رکشا لے لیتی
ہوں۔" اس کی نظر نزدیک آتے رکشے پہ پڑ چکی تھی۔
رکشا نہ بھی ہوتا تو بھی وہ اس کے ساتھ جانے کا رسک
نہیں لے سکتی تھی۔

"زحمت کیسی؟ میرا بھی تو وہی راستہ ہے جو آپ کا
ہے۔" بادل زور سے گرجے اور اس کے رکشے کو
روکتے ہاتھ ایک دم ٹھٹکے' اس نے بہت حیرت سے
اسے دیکھا' وہ اب بھی ایک راستے کی بات کر رہا تھا
جب ان کی الگ الگ منزلوں کا نہ صرف تعین ہو چکا تھا
بلکہ وہ اپنی منزل پہ پہنچ بھی چکا تھا۔ وہ اسے کوئی بھی
جواب دیے بغیر رکشے پہ بیٹھ کے اسے چلنے کا اشارہ
کر چکی تھی۔ دن تو پہلے ہی اچھا نہیں گزرا تھا۔ اب
رات بھی بہت بے کل گزرنے والی تھی' یہ کون سا
پہلی رات تھی' پچھلے دس سالوں میں اس کی کئی راتیں
ایسی گزری تھیں۔

"آج میری دھی بڑی خاموش ہے' اسپتال کی بھی
کوئی بات نہیں بتائی۔" ابا کے اندر وہ انٹینا فٹ تھا جو
انہیں اس کے دل کے سگنل دیتا تھا' وہ اس کی اداسی
محسوس کر چکے تھے۔ وہ اس کے بارے میں حساس بھی
بہت تھے۔ شاید وہ سمجھتے تھے اس نے ان کی ذمہ
داریاں اٹھا رکھی ہیں۔

"نہیں ابا! آتے ہوئے بھیگ گئی تھی۔ اس لیے
طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" بارش اب بھی وقفے وقفے
سے ٹین کی چھت پہ ٹن ٹن برس رہی تھی۔ اس
چھت کے نیچے سوئے چاروں افراد گہری نیند کے مزے
لے رہے تھے۔ وہ باہر برستی بارش اور اپنے اندر برستی
بارش کا موازنہ کر رہی تھی۔ آج کی رات ایسے ہی
گزرنی تھی' گیلی آنکھوں' بھرے گلے اور دکھتے دل
کے ساتھ۔

☼ ☼ ☼

گلزار اسی کے محلے کا تھا اور اسی اسپتال میں وارڈ
بوائے تھا جہاں وہ جاب کرتی تھی' ان کا آپس میں کوئی
رشتہ' کوئی تعلق نہیں تھا۔ سوائے دل کے تعلق کے
اور یہ ناتا تو سب پہ بھاری ہوتا ہے۔ ان کے درمیان
کوئی عہد و پیمان نہیں ہوئے۔ سوائے رسمی بات چیت
کے اور وہ بھی بہت کم' کیونکہ بقول گلزار اسے اپنی
محبت سے زیادہ اس کی عزت عزیز تھی لیکن انجانے
میں کوئی معاہدہ تو طے پایا تھا جو وہ کئی سال اس پہ چلے۔
اس میں دراڑ تب پڑی جب دو سال پہلے کنزئی سے
چھوٹی ارم کی منگنی اپنے ماموں کے ہاں ہوئی تب گلزار
نے اس سے پوچھے بغیر اپنی ماں بہنوں کو اس کے گھر
بھیج دیا۔ تحفظات دونوں طرف سے تھے' گلزار بھی
اپنی فیملی کا واحد کماؤ مرد تھا جسے ابھی اپنی دو بہنیں بیاہنا
تھیں اور ایسی ہی کئی ذمہ داریاں واحد کماؤ فرد کی
حیثیت سے کنزئی پہ بھی تھیں۔ ان کی زندگیوں میں
ان کے اپنے لیے گنجائش بہت کم تھی۔ یہ احساس
انہیں ہر وقت دلایا جاتا' پھر بھی گلزار نے ایسا سوچا
کیسے؟ اس سوال کی کچھ سزا تو گلزار کو بھی ملی ہو گی لیکن

کنزی کو تو پوری پوری سزا دی گئی۔ انتہائی ایمان داری سے بے حس' خود غرض کے طعنے دے دے کے۔ وہ معاہدہ جو بہت خاموشی سے طے پایا تھا۔ اسی خاموشی سے ٹوٹ گیا اور اپنے ساتھ بہت کچھ اور بھی توڑ گیا۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن وہ بخار میں تپ رہی تھی۔ بارش اسے بہت مہنگی پڑی تھی۔ اسپتال سے تین چھٹیاں ہو گئیں۔ ان تین دنوں میں رانی کی مشکوک حرکتوں نے اسے بہت پریشان کر دیا' شانی اور اماں سارا دن اپنے دوروں پہ ہوتے اور ابا چارپائی پہ' انہیں اس کا بار بار دروازے سے جھانکنا کیسے نظر آتا۔ ایسی ہی حرکت اس نے سامنے والے چاچا ذوالفقار کے نتھے کی بھی دیکھی تھی۔ اس نے کچھ سوچا اور ابا کے پاس بیٹھ گئی۔

"پریشان ہو؟" اس کے ابا چہرے خوب پڑھ لیتے تھے۔ وہ بات کرتے ہوئے جھجک رہی تھی لیکن کرنی اسے ابا سے ہی تھی کیونکہ اماں تو بات سمجھتی بعد میں تھیں' شور پہلے ڈال دیتیں اور اس سے تو انہیں ویسے بھی شکایت تھی کہ میرے بچے اسے چبھتے ہیں۔

"ابا میں سوچ رہی ہوں رانی کی شادی کر دیں۔" اس نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا' وہ کچھ دیر اسے دیکھتے رہے' پھر آنکھیں موند لیں۔ ان کے چہرے پہ بے بسی رقم تھی۔ شاید وہ بھی ان دیکھا خطرہ بھانپ چکے تھے۔ غریبوں کے پاس اور ہوتا ہی کیا ہے سوائے عزت کے۔

"پہلے تمہیں چھوڑ کے ارم کی' کی اب رانی کی کیسے کر دیں۔" تھوڑی دیر بعد انہوں نے جواب دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی اماں آ گئیں۔

"ابا! اماں سے کہیں اس کے لیے رشتہ دیکھیں' ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے' رہی میری بات تو مجھے ہمیشہ آپ کے پاس رہنا ہے۔" اس وقت تو نہیں لیکن بعد میں موقع ملتے ہی اس نے ابا سے کہہ دیا جب ایک بات ٹھان لی جائے تو پھر اس سے پیچھے کیا ہٹنا۔

☆ ☆ ☆

کیا اب بھی معجزے ہوتے ہیں' وہ سوچ سوچ کے حیران ہوتی اور حیران ہو ہو کے سوچتی۔ اس کے ساتھ تو واقعی معجزہ ہوا تھا۔ جس نے اس کے سارے غم دور کر دیے تھے۔ ابا کے بات کرنے سے قبل ہی چاچا ذوالفقار رشتہ لے کے آ گئے۔ جو ابا نے چھوٹتے ہی قبول کر لیا تھا۔ فی الحال صرف منگنی کا ارادہ تھا۔ شادی کنزیٰ کی اور اس کی اکٹھی کرنی تھی۔ رانی کی منگنی میں دو دن رہ گئے تھے۔ وہ گھر آئی تو بڑی خوشگوار سی ہلچل مچی تھی۔ سارے صحن میں بیٹھے مٹھائی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ارم بھی آئی ہوئی تھی۔

"مٹھائی کس خوشی میں کھائی جا رہی ہے؟" اس نے شانی کی گود سے ارم کے بیٹے کو لیتے ہوئے رس گلا منہ میں ڈالا۔

"تمہاری منگنی کی خوشی میں۔" جواب رانی کی طرف سے آیا۔

"کیا...." رس گلا اس کے گلے میں ہی اٹک گیا' اس نے شدید صدمے سے ابا کی طرف دیکھا۔ نتھے اور گلزار کی اچھی سلام دعا تھی جیسے ہی گلزار کی اماں کو رانی کی منگنی کا پتا چلا اور چاچا ذوالفقار کو لے کے ایک بار پھر آ گئیں۔ ان کی دونوں بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی اور اس بار وہ بہت خلوص سے رشتہ لے کے آئی تھیں۔ ابا نے فوراً" ہاں کر دی۔ سارے بے حد خوش تھے۔ خاص طور پہ ابا خود بہت مطمئن تھے۔ بس اماں تھوڑی الجھی ہوئی تھیں۔ دو مہینے بعد کی شادی کی تاریخ بھی رکھ دی گئی تھی' انہیں کون سا لمبا چوڑا جہیز تیار کرنا تھا۔

"مگر ابا میرے بغیر یہ سب کیسے چلے گا۔" اس کی پریشانی بجا تھی۔

"بیٹا اگر میرے بغیر چل سکتا ہے تو تمہارے بغیر بھی چل جائے گا' میں نے تمہارے ماموں سے شانی کی نوکری کی بات کی ہے۔ اللہ مسبب الاسباب ہے' کوئی سبب بنا ہی دے گا۔ ابا کے اطمینان میں اس کے خدشوں سے کوئی فرق نہیں آیا' یہی پختہ ایمان کی نشانی ہوتی ہے۔"

وہ تو ہواؤں میں اڑ رہی تھی' فضاؤں میں جھول

رہی تھی۔ بار بار اپنی چھوٹی انگلی میں پہنے چھلے کو دیکھتی' صبر کا پھل واقعی میٹھا ہوتا ہے لذت بھرا۔ ان دو مہینوں میں انہوں نے خوب آوارہ گردی کی' شہر کا چپا چپا گھوم لیا خوب مستیاں کیں' ڈھیروں ڈھیر باتیں کیں' میچور ہو کے بھی ٹین ایجرز والی حرکتیں کیں۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کوئی اتنا بھی بجنت آور ہو سکتا ہے جسے اچانک وہ خوشی مل جائے جو ملنے کی امید ہی نا ہو۔ کیا وہ گنتی کے ان خوش نصیبوں میں سے تھے جن کے نصیب میں محبت کا ساتھ لکھ دیا جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

اس کا اسپتال میں آخری دن تھا۔ ہفتے بعد اس کی شادی تھی۔ اس کی دس سالہ خدمات کے اعزاز میں عملے نے پارٹی ارینج کی تھی۔ اس کی جگہ شانی کو جاب بھی آفر کی گئی۔ وہ ایک بھرپور خوشیوں سے بھرا دن گزار کے آئی تھی لیکن گھر میں تناؤ کی کیفیت تھی۔ ابا اور اماں میں لڑائی ہو رہی تھی شانی' ذوالفقار چاچا بھی کمرے میں بیٹھے تھے۔ اس کا دل برے اندیشوں سے کانپ کے رہ گیا' جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ وہ دروازے سے پلٹ کے ڈیوڑھی میں بیٹھی رانی کے پاس آئی۔ اس کا چہرہ بھی ستا ہوا تھا۔

"رانی کیا ہوا ہے؟" اندیشے اس کی آواز میں لہرا رہے تھے اور اس کی آنکھیں چیخ چیخ کے کہہ رہی تھیں۔ خدارا کوئی بری خبر مت سنانا' یہ معصوم دل سہہ نہیں سکے گا۔ وہ گم صم بیٹھی تھی۔

"اماں گلزار کے گھر جا کے رشتے سے انکار کر آئی تھیں۔ بقول ان کے گلزار کی اماں نے ان کے بھیجے ہوئے جہیز کا مذاق بنایا ہے۔ گلزار کی اماں نے اس بات کی تردید بھی کی تھی' پھر وہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ معافی مانگنے بھی آئی تھیں۔ ابا ذوالفقار چاچا نے بھی سمجھا کے دیکھ لیا لیکن وہ تو اکڑ ہی گئیں۔" وہ خاموش تھی' اس کی آنکھیں بھی بالکل خشک تھیں جیسے گہرے صدمے کے زیر اثر ہو جو وہ پہلے دیکھ رہی تھی وہ خواب تھا یا یہ خواب ہے؟ اس کی خوشیوں کی عمر اتنی ہی تھی ایک مہینہ اور تین ہفتے بس۔۔۔

دوسرے دن اماں حسب معمول دورے پہ نکل گئیں تو ارم اور اس کا شوہر بھی آگئے' شانی ذوالفقار چاچا کو بھی بلا لایا تھا۔ وہ لوگ آپس میں نہ جانے کیا ڈسکس کر رہے تھے۔ اس کا ان کی طرف دھیان بالکل نہیں تھا وہ اپنے موبائل پہ تباہ شدہ خوشیوں کا ملبہ دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد شانی اور چاچا باہر چلے گئے' چونکی وہ اس وقت جب اس نے چاچا کو تھمے اور گلزار کے ساتھ آتے دیکھا۔

"یہ کیا ہو رہا تھا؟" شانی مولوی صاحب کو بھی لے آیا تھا۔ ارم اور کنزی نے جلدی سے اس کے اوپر بڑی چادر ڈال دی۔ فوراً" نکاح کی کارروائی شروع کر دی گئی' جب نکاح کے بعد دعا مانگی جا رہی تھی تو وہ بھی اپنے ہاتھ پھیلائے اپنے پیا کا نام اپنی لکیروں میں تلاش کر رہی تھی جو روز اول سے اس کے نصیب میں لکھ دیا گیا تھا۔ بس مقررہ وقت کی دیر تھی۔ اس وقت اماں بھاگی بھاگی آئیں' شاید انہیں کسی نے اطلاع دی تھی۔ ابا نے فوراً" شانی کو بلا کے کچھ سمجھایا' وہ اسے بازو کے گھیرے میں لیے ابا کے پاس لے آیا۔

"سدا خوش رہو۔" انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے دعا دی۔ وہ بالکل فریز تھی' سمجھ نہیں پا رہی تھی کیا ری ایکٹ کرے۔ اگلے ہی پل وہ گلزار کے ساتھ اس گھر سے رخصت ہو گئی' اپنے باپ کی دعاؤں اور بھائی کے مان کے ساتھ۔ اماں واویلا کرنے لگیں تو ابا نے سرد سی آواز میں انہیں روک دیا۔ آج انہیں اپنی بیٹی کی خوشیوں کے لیے ایک انتہائی قدم اٹھانا پڑا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ یہ قدم ان کی صابر بیٹی کی زندگی حسین تر بنا دے گا۔

☆ ☆

فائزہ افتخار

شب ہجر سے

چھٹی قسط

"تین سال بعد"

بڑی ہی کوئی سنسان شاہراہ تھی۔

کسی پہاڑی علاقے کی سنگلاخ چٹانوں کو چیرتی... بل کھاتی ہوئی... دور دور تک اگر ان دو گاڑیوں کے علاوہ کوئی چیز نظر آتی تھی تو وہ رنگین ٹرک تھے... مال اسباب سے بھرے، بمشکل سست روی سے اس سڑک پہ چلتے۔

اور وہ دونوں گاڑیاں... وہ برق رفتاری سے ایک دوسرے کے آگے پیچھے دوڑتی، کبھی کسی ٹرک کو اوور

ناولٹ

ٹیک کرتیں تو پٹھان ڈرائیور اونگھتے اونگھتے چونک کر بڑبڑا کے ان نوجوانوں کی شوخی کی شان میں کچھ نہ کچھ کہہ دیتا۔

دونوں گاڑیوں میں تیز آواز میں گونجتے انگریزی گیت... ہو ہاؤ... ایک دوسرے کو چڑانے کے لیے بجاتے ہارن اس سنسان، ویران مگر خطرناک پر پیچوں والی شاہراہ پہ رونق سی لگا رہے تھے۔

پھر سفید گاڑی نامحسوس طریقے سے دوسری گاڑی سے کافی آگے نکل آئی... اس کی رفتار خطرناک حد تک تیز ہو رہی تھی اور اس لحاظ سے اس گاڑی سے ابھرنے والی نسوانی چیخیں بھی بلند سے بلند ہو رہی تھیں۔

یہاں تک کہ سفید گاڑی کے پیچھے کسی دھبے کی صورت نظر آنے والی سیاہ گاڑی کی ہیڈ لائٹس اب

نقطے میں... معدوم ہو میں... اور پھر یہ نقطہ بھی نظر سے اوجھل ہو گیا... ایک موڑ مڑتے ہوئے سفید گاڑی کے بریک اچانک چرچرائے اور پھر ماحول پہ ایک سکوت سا چھا گیا۔

تانیہ نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ اس نے پھر سے چلا کے اس سکوت کو توڑا۔

"یاہو... ہم آگے نکل آئے۔ ہم جیت گئے سعد... وہ پیچھے رہ گئے۔ ہار گئے وہ سعد۔"

میں نے ایک نظر اس کے خوشی سے تمتماتے چہرے کو دیکھا اور دروازہ کھول کے باہر نکلا... مسلسل تین چار گھنٹوں کی ڈرائیونگ... اور پھر تانیہ کی فرمائش پہ لگائی اس ریس نے مجھے تھکا سا دیا تھا۔ کھلی فضا میں بازو کھول کر میں اپنے اعصاب تازہ دم کرنے لگا۔

"کبھی کبھی آگے نکلنے والا ہار جاتا ہے۔ تانیہ اور جو پیچھے رہ گیا ہو۔ وہ جیت چکا ہوتا ہے۔"

میں گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگا کے کھڑا ہو گیا۔ نظریں سامنے پہاڑوں کے پھیلے سیاہ سایوں پہ تھیں۔

"اف... ڈائیلاگز... تم ڈائیلاگز بہت بولتے ہو، لگتا ہے بہت فلمیں دیکھ رکھی ہیں۔" وہ بھی میرے برابر آن کھڑی ہوئی مجھے شرارت سوجھی یکدم اس کی جانب جھکا۔

"مجھے اور بھی بہت کچھ فلمی آتا ہے... کر کے دکھاؤں؟"

"شٹ اپ سعد۔" وہ گھبرا کے پرے ہٹی۔

"مجھ سے کوئی بدتمیزی کرنے کی کوشش مت کرنا۔"

میں بے تحاشا قہقہے لگانے لگا۔ اسے ستانے میں پتا نہیں کیوں مزا بہت آتا تھا۔

"ایک تو تم لڑکیوں کے دماغ میں خناس بھرا ہوتا ہے۔ فوراً" ہی غلط فہمیاں اور خوش فہمیاں ٹپا ٹپ برسنے لگتی ہیں۔ میں فلمی ایکشن سینز کی بات کر رہا تھا... کر کے دکھاؤں فائٹ؟"

میں نے کراٹے کے داؤ کے انداز میں بازو لہرائے۔

"ابھی دوستی ٹھیک سے ہوئی نہیں اور تم فائٹ کرنے لگے۔"

"دوستی میں کسی سے نہیں کرتا۔" میں دوبارہ گاڑی کی جانب بڑھا۔

"ہاں۔ خود سے ہو جائے وہ الگ بات۔"

"ارے یار وہ محبت ہوتی ہے جو کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔" اس نے برابر والی سیٹ پہ بیٹھتے بیٹھتے جیسے میری معلومات میں اضافہ کرنا چاہا۔

"اور کبھی کبھی نہ کی جاتی ہے۔ نہ ہوتی ہے۔ بس وہم

ساہوتا ہے کہ شاید ہو گئی ہے۔" میں کار اسٹارٹ کرتے کرتے رک سا گیا۔

"تمہیں کبھی محبت ہوئی ہے سعد؟"

ثانیہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا اور میں نے اتنے ہی کورے انداز میں روکھا سا جواب دیا۔

"نہیں میں وہمی نہیں ہوں۔۔۔ کیونکہ وہم کا کوئی علاج نہیں ہے۔" اور سفید گاڑی پھر سے خطرناک موڑوں پہ دوڑنے لگی۔

☼ ☼ ☼
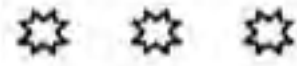
"کیا؟ سعد چار دن سے پاکستان میں ہے؟"

نائلہ حق دق رہ گئیں۔۔۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ تین سال بعد اکلوتا بیٹا وطن واپس آئے۔۔۔ اور نہ آنے سے پہلے ماں کو اطلاع دے اور نہ ہی آنے کے چار دن بعد تک رابطہ کرے۔

"ہاں۔۔۔ صبح ہی بات ہوئی ہے اس سے' آنا تو اس نے طے شدہ پروگرام کے مطابق اگلے مہینے ہی تھا مگر پھر دوستوں کے ساتھ پہلے آنے کا ارادہ بن گیا۔"

رضوان بھی کچھ دل شکستہ لگ رہے تھے مگر نائلہ کے سامنے اپنی حالت پوری طرح چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے سعد کی اس عجیب و غریب حرکت کی توجیہہ پیش کر رہے تھے۔

"بتا رہا تھا کہ اس کے کچھ دوست پاکستان دیکھنا چاہتے تھے ان کی فرمائش پہ' یہ پلان کیا اس نے۔ ان کو گھمانے کے بعد فارغ ہو کے ہی آئے گا گھر۔۔۔ ابھی نتھیا گلی میں ہے ایک دو دن میں اس کے غیر ملکی دوست واپس جانے والے ہیں۔"

"مگر۔۔۔ مگر رضوان یہ کوئی طریقہ ہے بھلا۔۔۔ بتا تو سکتا تھا وہ' اس کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔"

"پریشان کیوں ہو رہی ہو۔۔۔ اب یہیں ہو گا وہ تمہارے پاس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔"

"مجھے بہلائیں مت رضوان۔۔۔ دکھ آپ کے چہرے پہ بھی صاف نظر آ رہا ہے۔ ہم تین سال سے اسے ایک نظر دیکھنے' سینے سے لگانے کے لیے تڑپ رہے ہیں یہ تڑپ اس کے دل میں بھی ہونی چاہیے مگر نہیں وہ تو دوستوں کے ساتھ تفریح کر رہا ہے۔"

"نائلہ۔۔۔ وہ بڑا ہو گیا ہے۔" ان کے رونے پہ رضوان نے تسلی دینا چاہی۔

"گھر سے باہر رہنے والوں کی عمر نسبتاً" زیادہ جلدی بڑھ" ہے۔ یوں سمجھو اس کی عمر تین سال نہیں' تین دہائیاں بڑھی ہے۔ اور اتنا عرصہ گھر اور اپنوں سے دور رہنے سے وہ ہمارا اتنا عادی بھی نہیں رہا ہو گا جتنا پہلے تھا۔ وہ مشینی دنیا ہے۔ انسان وہاں رہتے رہتے خود بھی مشین بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو احساسات و جذبات سے بالکل عاری ایک مکمل مشین۔ تمہیں اب ایک بدلے ہوئے سعد کے لیے خود کو ذہنی طور پہ تیار کرنا ہو گا۔"

☼ ☼ ☼

وہ انگریزوں کے دور کی ہی کوئی عمارت تھی۔

بے حد خوب صورت پر شکوہ۔۔۔ جسے اب گیسٹ ہاؤس میں بدل دیا گیا تھا۔ ہم پانچوں اسی گیسٹ ہاؤس میں رکے تھے آج کی رات میں اور میرے چاروں دوست۔۔۔

ترکی نژاد رحمت۔۔۔ جسے پاکستان سے ان دیکھی بلا وجہ کی وابستگی تھی اور سب سے پہلے اس نے میرے ساتھ آنے کا شوشا چھوڑا تھا اور پھر ایک ایک کر کے وہ تینوں بھی شامل ہو گئے۔

خالص امریکی نیدرے۔۔۔ کوہ پیمائی جس کا شوق تھا اور جو یہاں سے سیدھا نیپال جانے والا تھا۔ ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے۔

آدھا تیتر آدھا بٹیر نازی۔۔۔ جس کا مرحوم باپ پاکستانی تھا اور ماں جرمن ہے۔ وہ اپنے باپ کا آبائی شہر اور ملک دیکھنے کے چاؤ میں آ گئی تھی۔

اور ثانیہ جس کے ماں باپ دونوں ہی خالص پاکستانی تھے مگر وہ اپنے ہوش میں پہلی بار پاکستان آئی تھی۔ پہلی اور آخری بار اپنی ماں کی تدفین کے لیے آئی تھی۔

رات کے اس اولین پہر میں بھی خنکی خاصی ہو گئی تھی۔ ہم سب آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھے تھے۔

بلکہ وہ چاروں۔۔۔

میں ان میں ہو کے بھی موجود نہیں تھا۔
میں تو کبھی اپنے آپ میں بھی نہیں ہوتا تھا۔
اپنے وجود کو کہاں کھو آیا تھا۔۔۔ یہ خبر نہیں تھی۔۔۔ اور نہ ہی میں نے کبھی خود کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔۔۔ جانتا تھا ڈھونڈنے نکلا تو خود کو تو شاید دوبارہ پا نہ سکوں۔۔۔ کہیں کچھ ایسا نہ ہاتھ لگ جائے جس کا بار اٹھانا ممکن نہ ہو۔

وہ سب ہنس بول رہے تھے۔ چہلیں کر رہے تھے۔
گنگنا رہے تھے۔۔۔ چھیڑ رہے تھے ایک دوسرے کو۔۔۔ اور میں چت لیٹا آسمان کے تاروں میں کچھ کھویا ہوا تلاش کر رہا تھا۔

جلتے الاؤ کے دوسری جانب بیٹھی تانیہ نے مجھے دیکھتے ہوئے نازی کے کان میں سرگوشی کی۔
"یہ سعد کے ساتھ پرابلم کیا ہے؟ مجھے تو اس سے ملے دو ہی ماہ ہوئے تم لوگ دو سال سے ایک ساتھ ہو کچھ تو اندازہ ہو گا۔ یہ اتنا سڑا ہوا کیوں رہتا ہے؟"
"یار مجھے لگتا ہے۔۔۔ سعد کے ماضی سے کوئی بڑی ہی المیہ قسم کی لو اسٹوری وابستہ ہے۔" نازی نے افسوس سے سر ہلایا۔
"ظاہر ہے۔۔۔ المیہ ہی ہو گی۔۔۔ درد بھری۔۔۔ دکھی کہانی۔۔۔ اتنے سڑے ہوئے انسان کے ساتھ کچھ بھی اچھا کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر وہ لڑکی تھی کون؟"
تانیہ کے لہجے میں جلن تھی۔۔۔ جس کی تپش شاید اس الاؤ سے بھی بڑھ کے تھی جو ہم دونوں کے درمیان حائل تھا۔

☼ ☼ ☼

"سعد۔۔۔ سنو۔۔۔ سعد رکو تو۔"
میں جوس لے کر ڈھلان سے اتر رہا تھا جب وہ ہاتھ میں برگر پکڑے پکڑے میرے پیچھے پکارتی چلی آئی۔
"میں نہ کسی کے لیے رکتا ہوں نہ پلٹتا ہوں۔"
"اف۔۔۔ پھر سے ڈائیلاگز۔۔۔ سنو ایک بات کرنا تھی تم سے۔ دو دن بعد ہم سب اپنے اپنے گھر چلے جائیں گے پتا نہیں پھر کب ملیں۔"
"یہ تو میں بھی جانتا ہوں بس یہی بتانا تھا؟" وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی پھر بھی میں نے رفتار کم نہ کی۔
"نہیں۔۔۔ بتانا تو کچھ اور ہے مگر اس سے پہلے کچھ پوچھنا ہے۔" اور پھر برگر کا بڑا سا لقمہ توڑ کر بھرے منہ کے ساتھ پوچھنے لگی۔
"تم اب بھی اسے چاہتے ہو؟"
بالآخر وہ مجھے مجبور کر ہی گئی کہ میں چونک کر پلٹوں اور اسے نظر بھر کے دیکھوں۔
"کسے؟"
"اس کو۔۔۔ جس کے لیے اداس رہتے ہو۔ اکیلے گھومتے ہو ستارے گنتے ہو۔"
"میں اب جو بھی کرتا ہوں۔ صرف اپنے لیے کرتا ہوں۔ صرف اور صرف اپنے لیے۔ آئی ہیو فالن آؤٹ آف لو۔"
"I have fallen out of love"
میں دوبارہ لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔
"گریٹ" میرے جواب سے وہ کھل سی اٹھی۔
"مطلب اب تمہاری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں دراصل اتنی اہم بات کرنا تھی تم سے تو پہلے سب کچھ پوچھ کے تسلی کرنا ضروری تھا۔"
"تانیہ تمہاری اہم باتیں مجھے بور کر رہی ہیں۔"
میرے چہرے کے بگڑتے زاویوں کو بھی وہ کسی خاطر میں نہ لائی اور مزے سے کہنے لگی۔
"نہیں اب بور نہیں ہو گے کیونکہ اب میں بڑی کیوٹ بات کرنے والی ہوں۔ بس اس سے پہلے کے یہ سوال ضروری تھے۔ تم جانتے ہو کسی ایسے شخص کی محبت میں مبتلا ہونا بڑا عذاب ہے۔ جو پہلے سے کسی اور کی محبت میں۔۔۔"
میں چلتے چلتے ایک دم مڑ کے حیرت سے اسے گھورنے لگا تو وہ بھی پل بھر کو خاموش ہوئی پھر اپنے ہاتھ پہ لگی کیچپ کو زبان سے چاٹتے ہوئے کہنے لگی۔
"لیکن اچھا ہوا تم نے کلیئر کر دیا۔ اب میں بڑے

آرام سے کہہ سکتی ہوں کہ آئی لو یو۔"
یہ کہہ کر اس نے برگر کا ایک بڑا سا لقمہ لیا۔
"کیا؟ کیا؟ کیا؟"
میں بوکھلا کے رہ گیا اور وہ برگر کے لقمے سے بھرے منہ کے ساتھ اسی اطمینان سے دہرا رہی تھی۔
"آئی لو یو۔"
حیرت کے جھٹکے سے نکلنے میں مجھے بس ایک سیکنڈ اور لگا تھا اور اب میں بے تحاشا ہنس رہا تھا۔ وہ حیرت سے مجھے قہقہے لگاتے دیکھ رہی تھی۔ کچھ کہنے کی کوشش کی تو حلق میں پھنسے نوالے کی وجہ سے اس سے بولا نہ گیا۔ جھٹ میرے ہاتھ سے جوس کا پیکٹ چھین کر بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے اس نے برگر حلق سے نیچے اتارا۔
"اس میں اتنا ہنسنے والی کیا بات ہے۔ پیار تو ہو جاتا ہے ناں۔"
"اتنا اچانک ہو جاتا ہے؟"
میں طنزیہ انداز میں سر جھٹک کے دوبارہ چلنے لگا۔
"میری زندگی میں تو سب کچھ اچانک ہی ہوتا ہے۔" وہ پھر سے میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔
"اور پتا ہے سعد... وہی پرفیکٹ بھی ہوتا ہے جو اچانک ہو اور جو میں باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ کروں... تو ایک دم سے بوگس بالکل بکواس۔"
"ابھی بھی بکواس اور بوگس ہی ہے۔" میں بڑبڑاتا ہوا چلتا رہا۔
"لو۔" اس نے جوس دوبارہ میری جانب بڑھایا۔
"نہیں تم ہی پیو۔" میں نے انکار میں گردن ہلائی۔
"نہیں بس پی لیا تم لے لو۔"
"شکریہ... مگر میں جھوٹا نہیں پیتا۔"
"ارے... مگر جھوٹا پینے سے تو پیار بڑھتا ہے۔"
مجھے پھر سے ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔
"تانیہ تم کیا چیز ہو زندگی میں پہلی بار کسی نے مجھے دوبار ہنسایا ہے۔"
"تو پھر تو تمہیں مجھ سے شادی ضرور کرنی چاہیے۔"

"کیا... شادی؟"
وہ بولڈ تھی... منہ پھٹ اور ظاہر ہے آزاد فضاؤں کی پروردہ... یہ میں جانتا تھا مگر اتنی جلدی اظہار محبت سے شادی تک زقند بھرے گی اس کا اندازہ نہیں تھا۔
"ہاں... شادی، مجھ جیسی لڑکی تمہیں کہیں نہیں ملے گی دن میں دوبار تمہیں ہنسا سکتی ہو... پتا ہے سعد تمہاری ساری زندگی ہنستے ہنستے گزرے گی۔"
اس بات پہ میں نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا جہاں سادگی تھی۔ معصومیت تھی اور سچائی۔
"تانیہ... میں اپنی زندگی گزار چکا ہوں۔" سرد لہجے میں کہہ کر میں آگے بڑھ گیا اور اس بار وہ میرے پیچھے نہیں آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کب آرہا ہے سعد؟" مہ پارہ نے رضوان کے برابر والی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔
"کل ان شاء اللہ۔"
رضوان جب پلیٹ میں سلاد نکال رہے تھے تو یہ بتاتے ہوئے مسرت سے ان کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔
"نیاز بھائی اور بھابھی کو بھی فون کرتی ہوں۔ وہ بھی آجائیں اس جمعے دو دن تو ویسے بھی چھٹی ہوگی۔"
نائلہ کے بتانے پہ مہ پارہ کا جی مکدر ہو گیا۔
"ایسی بھی کیا بے تابی میکے والوں کو بلانے کی بھابھی! کچھ دن تو ہمیں سعد کے ساتھ ڈھنگ سے گزارنے دیں... اس کے آتے ہی گھر مہمانوں سے بھر دیں گی کیا؟"
"مہ پارہ ٹھیک کہہ رہی ہے نائلہ... اسے کچھ دن آرام کرنے دو... گھبرا جائے گا اتنے لوگوں میں۔"
"لوگ؟" وہ تلملا اٹھیں۔
"سگا ماموں ہے اس کا اور آپ کو تو پتا ہی ہے کہ میں نے سعد اور بلی کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے۔ رشتہ پکا کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اتنی پیاری بچی اور اکلوتی، ہمارے سعد کی طرح اس کے لیے کئی رشتے آئے ہوں گے۔ کہیں وہ لوگ ہاں نہ کر دیں

آپ نے مجھے ان کے کان میں بات بھی تو نہیں ڈالنے دی۔"

"اس لیے کہ وقت سے پہلے بیٹی والوں کو آس دلانا ٹھیک نہیں ہے۔ کیا پتا بعد میں سعد راضی نہ ہو۔۔۔ اس کی پسند بھی تو معنی رکھتی ہے۔"

"مجھے پسند ہے۔ کیا یہ کافی نہیں۔" نائلہ کی بات پہ مہ پارہ نے بڑے طنز سے انہیں دیکھا۔

"واہ بھابھی اس گھر کی لڑکی بھی اپنی پسند سے شادی کر کے نکلی ہے۔ وہ بھی آپ کی مہربانی سے۔ ام ہانی کے وقتوں میں تو آپ بڑی محبت کی دیوی بنی ہوئی تھیں۔۔۔ پھر سعد کے لیے یہ سختی کیوں؟"

ام ہانی کے ذکر پہ نائلہ کو ذرا کی ذرا چپ لگ گئی۔ پھر جلدی سے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے انہوں نے بات ہی بدل ڈالی۔

"دادا جی کی کھانسی پھر بڑھ گئی ہے موسم بدلتے ہی۔"

☆ ☆ ☆
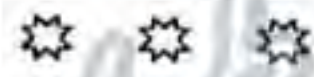
"عجیب سرپھری لڑکی ہے۔" میں کوفت سے بڑبڑاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔

"جمعہ جمعہ دو مہینے ہوئے ہیں جان پہچان کو۔۔۔ اور چلی ہے شادی کی بات کرنے۔"

میں بیگ میں اپنے بکھرے کپڑے ٹھونسنے لگا کل علی الصباح روانگی تھی واپسی کے لیے۔"

"شکر ہے صبح جان چھوٹے گی۔ پھر وہ کہاں میں کہاں، زبردستی ہی گلے پڑ رہی ہے۔"

موبائل فون پہ ہونے والی رنگ نے میرا دھیان تانیہ کی بک بک سے ہٹایا۔

"السلام علیکم امی۔" ایک ہاتھ سے فون کان سے لگائے اب میں دوسرے ہاتھ سے پیکنگ کر رہا تھا۔

"وعلیکم السلام جیتے رہو۔ صبح آ رہے ہو ناں بیٹا؟"

"جی اگر آپ کی اجازت ہو تو۔۔۔" عرصے سے ان سے بات کرتے ہوئے میرا انداز ایسا ہی ہوتا تھا۔

روکھا۔۔۔ اور کچھ کچھ طنزیہ۔۔۔

"میں تو کب سے راہ دیکھ رہی ہوں سعد۔"

"یعنی میں یہ سمجھوں کہ میری سزا ختم ہو گئی ہے؟"

"سعد کبھی مائیں بھی سزا دیتی ہیں؟" ان کے سوال پہ میرے ہونٹوں پہ ایک تلخ سی مسکراہٹ آئی۔

"جی دیتی ہیں کبھی کبھی۔" وہ چپ سی کر گئیں ذرا دیر کے لیے۔

"اچھا۔۔۔ یہ گلے شکوے واپس آکر کر لینا۔ ابھی مجھے یہ خوشی تو محسوس کر لینے دو کہ میرا بیٹا میرے گھر واپس آرہا ہے۔ میں تو کتنے ہی دن تمہیں اپنے قریب سے ملنے بھی نہیں دوں گی۔ بلکہ ایسی زنجیر سے باندھ دوں گی کہ تم حویلی کے ہی ہو کے رہ جاؤ گے۔"

"یعنی، سزا برقرار رہے گی؟ صرف نوعیت بدل جائے گی۔۔۔ پہلے جلاوطنی تھی۔ اب نظربندی۔" میں تلخی سے ہنس دیا۔

"نظربندی ہی سمجھ لو۔ تمہاری شادی کا سوچ رہی ہوں میں۔"

"شادی؟"

"ہاں۔۔۔ بیلی پسند کی ہے میں نے تمہارے لیے، رضوان کہہ رہے تھے تمہاری مرضی پوچھ لوں اس لیے ذکر کر رہی ہوں ورنہ میں جانتی ہوں تمہارا جواب ہاں میں ہی ہو گا بھلا کیا برائی ہے بیلی میں۔"

"برائی تو ہے۔۔۔" میں مسلسل مسکرا رہا تھا۔

"وہ کیا؟"

"انیس سال کی ہے وہ بھلا انیس سال بھی کوئی شادی کی عمر ہوتی ہے اور مجھ سے پورے تین سال چھوٹی عمر کا فرق تو بہت بڑی خامی ہے امی۔"

"سعد۔" ان کی آواز پست ہو گئی۔ میں کہتا چلا گیا۔

"آپ کو میری شادی کرنا ہے ناں امی ٹھیک ہے میں آپ کی خواہش پوری کر دوں گا۔۔۔ ایک لڑکی پسند ہے مجھے، آپ کو بھی پسند آئے گی۔ سب سے اچھی خوبی یہ ہے کہ وہ میری ہم عمر ہے اور شادی کے لیے یہی سب سے اہم چیز ہے ناں امی؟"

"تمہیں۔۔۔ تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے؟ مگر کون؟"

"بتاؤں گا نہیں دکھاؤں گا کل اپنی ساتھ ہی لے کر

آؤں گا اسے' آپ سے ملوانے کے لیے۔"

میں نے فون رکھا اور تیزی سے چلتا اسی ہوٹل کے سیکنڈ فلور پہ موجود تانیہ کے کمرے کے دروازے کے باہر رکا۔۔۔ دستک پہ وہ چپس کا پیکٹ ہاتھ میں لیے باہر نکلی۔

"سعد تم اس وقت' چپس کھاؤ گے؟"

"صبح کیا کہہ رہی تھیں تم؟"

میں نے اس کا چپس والا بڑھا ہوا ہاتھ نظر انداز کرتے ہوئے بنا تمہید کے پوچھا۔

"صبح..." وہ ذہن پہ زور ڈالنے لگی۔

"کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو۔" میں نے خود ہی کہہ ڈالا اس سے پہلے کہ وہ صبح سے اب تک کی گئی چھ ہزار باتیں ایک ایک کرکے گنواتی۔

"ابھی بھی ہے موڈ مجھ سے شادی کا یا ارادہ تبدیل ہو گیا؟"

"کم آن سعد..... میں نے سوچ سمجھ کے کہا تھا ایک تم ہی ہو جو اسے مذاق سمجھ کے ٹال رہے ہو ورنہ یہاں سب کو احساس ہے کہ میرے دل میں تمہارے لیے کیا ہے اور میں اس بارے میں کس حد تک سنجیدہ ہوں۔"

"اوکے۔ اس کا مطلب ہے تم واقعی شادی کے لیے خاصی سیریس ہو۔"

"آف کورس۔۔۔ ہوں۔"

"میں بھی سیریس ہوں۔"

"واٹ۔"

"ہاں تمہارے پاس دو تین گھنٹے ہیں تیاری کے لیے تمہیں صبح میرے ساتھ نکلنا ہو گا۔۔۔ میری حویلی جانے کے لیے میرے گھر والے تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"مجھ سے ملنا۔۔۔ مگر۔" صبح اس نے مجھے حیران کیا تھا اور اب میں اسے نہ صرف حیران بلکہ پریشان کر رہا تھا۔

"تو کیا ان سے ملوائے بغیر ان کی رضامندی لیے بنا تم سے شادی کر لوں۔ فکر مت کرو کوئی مسئلہ پیدا نہیں کریں گے وہ بس ایک رسمی سی کاروائی ہو گی ان سے ملاقات۔۔۔ میری شادی میرا ذاتی مسئلہ ہے۔"

اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا اور میں اسے جلد از جلد پیکنگ کی تاکید کرتا وہیں چھوڑ کے واپس آگیا۔

"مگر وہ لڑکی ہے کون؟ کیسی ہے؟ کس خاندان کی ہے؟ ہم کچھ نہیں جانتے۔۔۔ ایسے کیسے وہ اس سے شادی کر سکتا ہے۔" نائلہ نے ایک طوفان کھڑا کر رکھا تھا۔

"اگر وہ اسے پسند کرتا ہے تو بلی کو زبردستی اس کے سر پہ تھوپنے کی کوشش مت کرو۔"

رضوان نے ٹھنڈا کرنا چاہا۔۔۔ مگر بے سود۔

"اور وہ چاہے زبردستی اس انجان لڑکی کو ہمارے سر پہ تھوپ دے۔"

"زندگی اس نے گزارنی ہے۔ ہم نے نہیں' ہو سکتا ہے وہ اس کے لیے بہتر ثابت ہو۔۔۔ لا تو رہا ہے وہ اسے اپنے ساتھ خود دیکھ لینا۔" اب بھلا مہ پارہ پیچھے کیوں رہتیں۔ لگیں کانوں کو ہاتھ لگانے۔

"توبہ توبہ۔۔۔ یعنی اب لڑکی خود اپنے آپ کو پسند کروانے لڑکے کے ساتھ اس کے گھر آ رہی ہے۔ بھابھی بڑا تجسس تھا ناں آپ کو یہ جاننے کا کہ وہ کس خاندان سے ہے تو اسی حرکت سے اس کے گھرانے کا اندازہ لگالیں۔۔۔ جہاں لڑکی کو اتنی چھوٹ دی گئی ہو۔"

"بلاوجہ کے اندازے مت قائم کرو تم دونوں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ یہ باتیں تو اب یہاں بھی معیوب نہیں سمجھی جاتیں اور اس لڑکی نے تو ساری عمر باہر گزاری ہے۔ بتایا تو ہے سعد نے کہ ماں کی وفات کے بعد صرف ایک بار پاکستان آئی تھی پہلے اور اس کا باپ بھی کچھ دنوں میں پاکستان آئے گا ہم سے ملنے اور سب طے کرنے۔"

"طے تو ہو گیا سب کچھ تقریباً۔" مہ پارہ نے سر جھٹکا اور نائلہ آہ بھر کے رہ گئیں۔

"کیا کیا سوچا تھا میں نے سعد کے لیے۔"

"خدا سے اچھی امید رکھو نائلہ ہو سکتا ہے جو ہونے جا رہا ہے وہ تمہاری سوچ سے کہیں بڑھ کے اچھا ہو۔" رضوان نے ایک بار پھر تسلی دی۔

☆ ☆ ☆

اسلام آباد سے لاہور تک کی فلائٹ تو خیریت سے ہو گئی۔ مگر لاہور سے یہاں تک کا ٹرین کا سفر تانیہ کے لیے ایک ایڈونچر تھا مارے جوش کے وہ آپے سے باہر ہو رہی تھی خدا خدا کر کے اسے ٹرین سے اتار کے اسٹیشن تک لایا تو تانگے کو دیکھ کے مچل گئی۔ مگر حویلی سے ڈرائیور آیا تھا زبردستی اسے کار میں سوار کیا اور اب کب سے اس کی اوٹ پٹانگ باتیں اور حرکتیں برداشت کر رہا یہ راستہ کٹ جانے کا منتظر تھا۔

"سعد... وہ دیکھو... وہ دیکھو... وہ۔"

وہ آدھی سے زیادہ باہر نکلی مٹکے سر پہ رکھ کے گزرتی عورتوں کو دیکھ کے جوش سے پاگل ہو رہی تھی... اور ڈرائیور کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ مجھے بیک ویو مرر سے صاف نظر آ رہی تھی۔

"بس کرو تانیہ۔"

"اے ہیلو..."

اب وہ گلی ڈنڈا کھیلتے بچوں کو پکار پکار کے متوجہ کر رہی تھی۔

"سر اندر کرو تانیہ۔" اور میں مسلسل اسے ٹوکنے میں مصروف۔

"تمہیں پتا ہے سعد میں پہلی بار کوئی گاؤں دیکھ رہی ہوں۔"

"میں کہہ رہا ہوں سر اندر کرو ورنہ یہی آخری بار دیکھنا بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ دیکھو سامنے سے ٹریکٹر آ رہا ہے اندر ہو جاؤ۔"

میں نے اسے خبردار کرنا چاہا تھا مگر ٹریکٹر کا سن کے وہ مزید باہر لٹک گئی۔

"واؤ ٹریکٹر! سعد مجھے ٹریکٹر میں بیٹھ کے تمہارے گھر جانا ہے۔" اب میں نے باقاعدہ کھینچ کر اسے اندر سیٹ پہ پٹخا۔

"یہی حرکتیں رہیں تو ٹریکٹر کی بجائے ایمبولینس پہ ہی لے جانا پڑے گا۔"

"وہ کیا کہتے ہیں اس موقع پہ کہ اگر شکل اچھی نہ ہو تو بات کم از کم اچھی کر لینی چاہیے۔"

"اور اگر شکل پہلے ہی کافی اچھی ہو تو؟" میں اترایا تو وہ منہ چڑانے لگی۔

"پھر وہی ہوتا ہے جو میرے کیس میں ہوا کہ لڑکی خود پرپوز کر دیتی ہے۔"

حویلی پہنچتے پہ وہ اسی جوش و خروش سے گاڑی سے اتری تھی مگر پھر ایک دم ہی اس کے چہرے پہ مایوسی آ گئی۔

"سعد۔" وہ مرے مرے لہجے میں کہتی عجیب سمجھ میں نہ آنے والی مظلومیت چہرے پہ لیے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"یہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں ہے سعد۔"

"مثلاً"... کیا نہیں ہے؟"

"یار... میں اتنی ایکسائٹڈ تھی کہ یہاں بڑا شاندار استقبال ہو گا میرا... ڈھول باجے اور ہار پھول... مگر مگر یہاں تو اتنی خاموشی... نہ ڈھول بج رہا ہے نہ راستے میں پھول بچھے ہیں۔"

"اوہو... پھر تو رات کو تمہیں آتش بازی کے شاندار مظاہرے کی بھی امید ہو گی۔"

میں نے طنزیہ مسکراہٹ چہرے پہ سجا کے تسلی دی۔

"اندر آؤ تانیہ ایک فلمی قسم کی تمنا تو تمہاری پوری ہو ہی جائے گی۔"

"وہ کیا؟"

"بڑے دادا... ایک اچھی فیملی فلم کسی دادا جی کے بغیر کبھی مکمل نہیں ہوتی اور میرے بڑے دادا بڑے ہی فلمی ہیں' آؤ تو سہی۔"

میں اس کا ہاتھ تھام کے کھینچتا اندر لے جانے لگا... مگر اندر داخل ہوتے ہی سب کو منتظر کھڑا دیکھ کے میں نے سٹپٹا کے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور وہ... وہ پاگل سب کو ایک ساتھ دیکھ کے اتنی گھبرا گئی کہ میرا بازو زور سے تھام کے تقریباً" ساتھ ہی چپک گئی۔

وہیل چیئر پہ ڈربے سمیت بیٹھے بڑے دادا جی نے چشمے کے پیچھے چھپی آنکھیں سکوڑ کے بغور تانیہ کی

اس واہیات حرکت کو دیکھا اور بڑبڑانے لگے۔ امی کے چہرے پہ بھی ناگواری تھی اور اس سے پہلے کہ مہ پارہ پھوپھو حسب عادت کانوں کو ہاتھ لگا لگا کے توبہ توبہ کرنے لگتیں میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑایا۔

"یہ... یہ ثانیہ ہے۔"

"ہائے۔"

میرے تعارف کرانے پہ ثانیہ نے مسکرا کے ہاتھ لہرایا۔ جس پہ سب کے ماتھے کے بل مزید گہرے ہو گئے۔ جسے محسوس کرتے ہی ثانیہ کو جھٹ سے میری سب ہدایات یاد آگئیں۔

"اوہ... سوری السلام علیکم... آداب۔"

"جیتی رہو..." ابو نے مسکرانے میں پہل کی۔

میری آنکھ کے اشارے پہ ثانیہ فوراً" بڑے دادا کی جانب بڑھی۔ اور فوراً" بڑے ہی دوستانہ انداز میں ہاتھ آگے بڑھایا۔

"کیسے ہیں بڑے دادا؟"

میرا دل چاہا میں اپنا سر پیٹ لوں۔ بڑے دادا نے نیچے کی جانب اشارہ کیا۔ وہ کچھ سمجھے بنا ان کے پیروں کی جانب دیکھنے لگی، جو بلند فشار خون کی وجہ سے سوجے ہوئے تھے۔ ثانیہ نے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔

"اوہ... کتنی سویلنگ ہے ناں' چچ چچ۔"

میں نے ماتھے پہ ہاتھ مارا اور اسے اشارے سے بڑے دادا کے سامنے جھک کر ان سے پیار لینے کا کہا۔ شکر ہے اس بار وہ سمجھ گئی اور وہ فوراً" ان کے سامنے سر جھکایا۔

"جیوندی رہ۔" بڑے دادا نے اس کے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

"رضوان... کڑی ہے سوہنی... مینوں پسند ہے۔" انہوں نے فیصلہ سنا دیا تو ابو بھی طمانیت سے مسکرا دیے اور باقاعدہ اعلان کر ڈالا۔

"آپ کو پسند ہے دادا جی تو ہمیں بھی پسند ہے کیوں نائلہ؟" امی نے البتہ مسکرانے تک کی زحمت نہیں کی اور پلٹ کے اندر جانے لگیں' ابو نے معذرت خواہانہ نظروں سے مجھے دیکھا اور ان کے پیچھے گئے۔ میں مہ پارہ پھوپھو سے ثانیہ کا تعارف کرانے لگا اور جب وہ ثانیہ کو اس کا کمرہ دکھانے لے گئیں تو میرے قدم بھی خود بخود امی اور ابو کی جانب اٹھ گئے۔

"نائلہ... عقل سے کام لو بیٹا اتنے عرصے بعد گھر آیا ہے تمہیں دل بڑا کر کے اس کی خوشی میں خوش ہونا چاہیے۔" ابو انہیں سمجھا رہے تھے۔

"کچھ دن بعد نیاز بھائی بھابھی اور بیلی آ رہے ہیں۔ میں انہیں کیا کہوں گی؟"

"ہم نے بیلی کا رشتہ مانگا تو نہیں تھا ابھی۔" وہ شاید کچھ اور بھی کہتے... مگر مجھے دیکھ کے بات بدل ڈالی۔

"لو بھئی اب ماں بیٹے کی جذباتی ملاقات برداشت نہیں ہو گی مجھ سے' میں چلا۔" امی نے نامحسوس طریقے سے رخ موڑ لیا۔ میں ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"امی۔" میرے پکارنے پہ شاید ان سے رہا نہیں گیا وہ ساری خفگی بھول کے مجھے گلے لگانے پہ مجبور ہو گئیں۔

"سعد... میرا بچہ شکر ہے اللہ کا جس نے میرے دل اور آنکھوں کو پھر سے ٹھنڈک پہنچائی۔" ان کے گلے لگتے ہی میرے اندر کی برف پگھلنے لگی۔ میری اندر جتنے بھی گلے شکوے تھے وہ اس برف کے ساتھ ہی پگھل کے بہہ گئے اور میں نے ان کے سامنے گویا ہتھیار ڈال دیے۔

"سوری امی۔" ماں ہی تھیں ناں آخر ذرا سی سوری پہ بہل گئیں۔ اور کچھ ہی دیر بعد وہ سب بھول بھال کے کھانے کی میز پہ ثانیہ کی تواضع کر رہی تھیں البتہ مہ پارہ پھوپھو جلدی ٹلنے والوں میں سے نہیں تھیں۔

"تمہارے ابا کو پتا ہے کہ تم یہاں اپنا رشتہ طے کرتی پھر رہی ہو۔" ان کے تیکھے سوال کا جواب ثانیہ نے ہلکے پھلکے انداز میں دیا۔

"جی' پتا ہے وہ بہت خوش ہیں سعد انہیں بہت پسند آیا ہے۔"

"اوہ... تو سعد بردکھوے کے لیے بھی ہو آیا؟"

"بس... بس... دکھ... دکھوا؟" تانیہ کے حلق میں یہ لفظ اٹک اٹک گیا اور وہ جھک کے میرے کان میں سرگوشی کرکے پوچھنے لگی۔

"یہ کیا اسکائپ کو کہتے ہیں اردو میں؟"

"دراصل پھوپھو... میری کل رات ہی تانیہ کے ڈیڈ سے اسکائپ پہ ہی بات ہوئی ہے۔"

"واہ... ٹیکنالوجی۔" ابو خوشدلی سے کہہ رہے تھے۔

"عجیب انسان ہیں بھلا داماد ایسے پسند کیے جاتے ہیں؟" پھوپھو کے اعتراضات جاری تھے۔

"ان کے پاس پسند کرنے کے علاوہ کوئی چوائس ہی نہیں تھی۔ کیونکہ میں نے سعد کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرنی۔ یہ بات وہ جانتے ہیں۔"

"بیٹا میری بات بھی کروا دو اپنے ڈیڈ سے چاہے اسکائپ پہ ہی سہی... ان سے سب معاملات طے کر لیے جائیں۔"

"طے تو یہ دونوں کر چکے ہیں بھائی صاحب۔" پھوپھو کی مسلسل طنزیہ گفتگو سے بچنے کے لیے میں نے موضوع بدلنا چاہا۔

"تم یہ پلاؤ لو... ماما کے ہاتھ کے کھانے کی عادت ایک بار تمہیں ہوگئی تو تم یہاں سے جانے کا نام نہیں لو گی۔"

"لو... میں ویسے بھی کب جا رہی ہوں۔" وہ اترا کے بولی تو امی مسکرا دیں۔

"اور کیا... اپنی بیٹی تو پرائی ہوتی ہے۔ ایک دن چلی جاتی ہے۔ اصلی بیٹی تو وہ ہوتی ہے جو ہمیشہ کے لیے ہمارے آنگن میں ہوتی ہے۔"

"ہاں اور اگر بیٹی ام ہانی جیسی بے مروت ہو تو پھر بالکل ہی پرائی۔"

اتنے عرصے بعد ام ہانی کا نام سن کر میرا پانی کے لیے اٹھا ہاتھ جہاں کا تہاں رہ گیا... ماہ پارہ پھوپھو کی بات سن کے امی بھی افسردہ سی ہوگئی تھیں۔

"وہ اپنے گھر خوش ہے۔ مطمئن ہے ہمیں اور کیا چاہیے ماہ پارہ۔"

ابو کا تو شاید اب کام ہی یہی رہ گیا تھا۔ پھوپھو کی سب کٹھلی نوکیلی باتوں کا ازالہ کیے جانا۔ مگر وہ کسی کو خاطر میں ہی نہ لائیں... سر جھٹک کے کہنے لگیں۔

"ہونہہ رہنے ہی دیں بھائی صاحب اوروں کی بھی بیٹیاں بیاہ کے جاتی ہیں ایسے میکے والوں پہ کوئی خاک تو ڈال کے نہیں جاتا... اتنی لاتعلقی بس بھولے بسرے کبھی عید، شب برات پہ فون کرلیا۔ ہاں بھئی بڑے کمشنر صاحب کی بیگم جو ہوئیں وہ۔"

میں نیپکن سے ہاتھ صاف کرنے لگا کھانے سے جی ہی اچاٹ ہوگیا۔ امی بھی اب ملول نظر آ رہی تھیں۔

"صحیح کہہ رہی ہے یہ رضوان ڈیڑھ مہینہ پہلے خبر ملی کہ سندھ سے دوبارہ سالار کی تعیناتی یہیں نزدیکی شہر میں ہوئی ہے... مشکل سے دو گھنٹے کا راستہ ہوگا۔ مگر اسے توفیق نہ ہوئی ملنے کی۔"

"سعد... یہ ام ہانی کون ہے؟" تانیہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

میں نظر چرا کے رہ گیا اور ماہ پارہ پھوپھو اس ذکر کو طول دینے لگیں۔

"لیکن اگر وہ لوگ دوبارہ یہاں شفٹ ہوگئے ہیں تو آپ خود ہی فون کرلیتیں بھابھی۔"

"اب تو کرنا ہی پڑے گا۔ اتنی بڑی خوشخبری دینے کے لیے... اور مجھے یقین ہے سعد کی خوشی میں شامل ہوئے بنا وہ رہ ہی نہیں پائے گی... سعد تم خود کیوں نہیں چلے جاتے اسے لانے کل صبح؟"

ابو کے پوچھنے پہ میں نے ایک لمحہ دیر نہ کی جواب دینے میں۔

"نہیں... میں نہیں جا سکتا میں نے تانیہ سے وعدہ کیا ہے کل اسے یہ جگہ دکھانے کا۔" اور تانیہ مجھے ٹکر ٹکر دیکھتے ہوئے وہ وعدہ یاد کرنے لگی۔ اور پھر میری جان کو ہی آگئی۔

"تم بہت ہی عجیب انسان ہو... اچانک سے کبھی بھی کچھ بھی کہہ دیتے ہو۔" میں حسب عادت تیز تیز چل رہا تھا اور وہ حسب سابق میرے پیچھے پیچھے۔

"تو اچھا ہے تمہاری زندگی میں تو وہی پرفیکٹ ہوتا ہے جو اچانک ہو۔"

"مگر اتنا اچانک! اب بتاؤ بھلا کب وعدہ کیا تھا تم نے مجھ سے یہ جگہ دکھانے کا۔"

"کیا تھا تمہیں یاد نہیں ہوگا اور میرے پیچھے آنا بند کرو وہ رہا تمہارا کمرہ جاؤ۔"

"ایک تو تمہارا کمرہ میرے کمرے سے اتنی دور ہے ہم یہاں بیٹھ کے کچھ دیر باتیں کریں۔"

"نہیں تانیہ یہاں ان باتوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تمہیں خود کو اس ماحول اور روایات کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔ کم از کم جب تک تم یہاں ہو میرے آس پاس منڈلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خصوصاً" رات میں یا اکیلے میں۔"

"ہونہہ..." وہ منہ بسورتی اپنی کمرے میں چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی میرے قدموں کی رفتار خود بخود دھیمی پڑ گئی۔ جیسے اس سے بھاگنے یا دور جانے کے لیے ہی ان میں بجلی بھرتی ہو۔ میں موڑ مڑ کے اس راہداری میں داخل ہوا جہاں ام ہانی کا کمرہ تھا... میرے ست پڑتے قدم بالکل بے جان ہو گئے۔

میں خالی خالی نظروں سے اس کمرے کے بند دروازے کو دیکھنے لگا۔ کوئی تھا جو مجھے وہاں دھکیل رہا تھا۔ میں کھنچتا ہوا گیا اور کچھ دیر بعد میرا ہاتھ اس دروازے کی ناب پہ تھا سنسان راہداری میں دروازہ کھلنے کی ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ اندر قدم دھرتے ہی اس کی خوشبو میرے حواسوں پہ سوار ہونے لگی۔ میں نے گھبرا کے روشنی کی۔

سب وہی تھا۔

اس کی کتابیں...

اس کا لیمپ...

اس کا تکیہ... اس کا کمبل

دیوار پہ لگی ہم دونوں کی تصویریں۔

مجھے لگا میرا وجود سر سے پیر تک جکڑ رہا تھا ان زنجیروں سے خود کو چھڑانے کے لیے میں نے پورا زور لگایا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ ہانپتا ہوا میں اب تانیہ کے کمرے کے باہر کھڑا بے تابی سے دستک دے رہا تھا... وہ باہر نکلی تو میری وحشت اور خوف دیکھ کے گھبرا گئی مگر اسے کسی بھی سوال کا موقع دینے سے پہلے ہی میں اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچتا ہوا لے جانے لگا۔

"ارے سعد کہاں لے جا رہے ہو مجھے' ارے چپل تو پہننے دو سعد۔ کمال ہے! ابھی اتنے لیکچر دے رہے تھے کہ تم سے دور رہوں' زیادہ آس پاس نہ منڈلاؤں' اکیلے میں نہ ملوں اور اب خود اتنی رات کو مجھے ہاتھ پکڑ کے پتا نہیں کہاں..." اور پھر وہ ایک دم خود ہی چپ ہو گئی۔

میں اسے آنگن میں لے آیا تھا...

ستاروں کی چھاؤں میں...

وہ بھی گنگ سی ہو کے ستاروں بھرا آسمان دیکھنے لگی جو میں پہلے ہی ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا... اس کا ہاتھ اب بھی میرے ہاتھ میں مضبوطی سے دبا ہوا تھا... میں نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیا اور وہ میرے ساتھ آ لگی... یونہی میرے کاندھے کے پار سے آسمان کو دیکھتے دیکھتے بے خودی سے پوچھنے لگی۔

"کوئی ستارہ ٹوٹا ہے کیا؟"

"نہیں کچھ اور ٹوٹا ہے۔" اسی بے خودی میں' میں نے جواب دیا اور پھر کان لگا کے کچھ سنتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں یہ بانسری سنائی دے رہی ہے۔"

"نہیں۔"

"مجھے سنائی دے رہی ہے۔ سنو غور سے... یہ ہے تاں سنی تم نے..."

اس نے لاچاری سے انکار میں سر ہلایا اور اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے آہستگی سے نکالتے ہوئے جیسے ہی الگ ہوئی میں نے دوبارہ اسے اپنے پاس کھینچ لیا۔ اور منت کرنے لگا۔

"نہیں تانیہ مجھ سے دور مت جاؤ ورنہ' ورنہ میں خود سے بھی دور ہو جاؤں گا۔"

"سعد۔" میرے بدلے ہوئے انداز اسے متوحش کر رہے تھے اور اسے کیا... خود مجھے بھی مجھے بھی کہاں اندازہ تھا کہ تین سال بعد پھر سے میں اس بے کلی اور

وحشت کو پھر سے اسی بھرپور طریقے سے محسوس کروں گا۔

"میرے پاس رہو تانیہ۔۔۔ تاکہ میں اپنے آپ میں رہوں۔ اگر میں اپنا نہ رہا تو۔۔۔ تو تمہارا ابھی نہیں ہو سکوں گا۔" میں نے اس میں پناہ لے لی۔

☆ ☆ ☆

سب کے سامنے کہہ چکا تھا۔ ناچار صبح اسے قصبے کی سیر کے لیے لے جانا ہی پڑا۔ ورنہ رات بے خودی میں جو کچھ سرزد ہوا تھا مجھ سے اس کے بعد اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

"ویسے تمہیں رات کو ہوا کیا تھا؟" بھٹا کھاتے ہوئے وہ سوال کر بیٹھی۔

"کچھ نہیں بہانے بنا رہا تھا تمہارے قریب ہونے کے۔" میں ایک نمبر کا جھوٹا۔

"دلفنگے۔" وہ ہنس دی مجھے بھی ہنسی آگئی۔

"ہوں۔۔۔ لفنگا یہ ایک بار ببلی نے بھی کہا تھا مجھے۔"

"ببلی کون؟" وہ چونکی کچھ ٹھٹکی۔

"میری کزن۔"

"اور وہ تمہاری کزن تمہیں لفنگا کیوں کہتی تھی ایسا کیا کرتے تھے تم اس کے ساتھ۔" وہ زیادہ چونکی کچھ اور ٹھٹکی۔۔۔ میں چپ چاپ بس مسکراتا رہا۔

"اوہ تو کہیں تمہاری یہ کزن وہ ہی تو نہیں تھی جسے تم پہلے چاہتے تھے جس سے تمہیں محبت تھی۔"

مجھے پھر سے ہنسنا چاہیے تھا مگر میں حد درجہ سنجیدہ ہو گیا۔

"نہیں وہ محبت نہیں تھی۔"

"تو پھر کیا تھا؟"

"پاگل پن۔۔۔ ضد۔۔۔ خواہش۔۔۔ بچپنا۔"

"اوہ بچپنا۔" اس نے اطمینان کی سانس لی۔

"مگر اب تو تم بچے نہیں ہو۔۔۔ اب کوشش کر کے دیکھو۔۔۔ شاید سچ مچ ہو جائے تمہیں محبت۔"

وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے میرے سامنے آن کھڑی ہوئی اور میں اس سے نظر چرانے پہ مجبور ہو گیا۔

"نہیں شاید نہیں یقیناً" اب یہ دوبارہ کبھی نہیں ہو گا۔" اور ارد گرد نظر ڈالتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ ہم چلتے چلتے کھنڈر کی عقبی دیوار کے پاس آ گئے تھے۔

وہ ٹوٹی ہوئی دیوار جس کے اس پار کھائی تھا۔ میں قدم بڑھاتا کھائی کے پاس پہنچا اندر جھانکتے ہوئے پوری شدت سے چلا اٹھا۔

"آئی لو یو۔۔۔"

میرے عجیب و غریب رویے اور کتراۓ کتراۓ انداز کو سمجھنے کی کوشش کرتی تانیہ یکدم کھل سی گئی یہ سن کے اور بھاگتے ہوئے میرے پاس آئی۔۔۔ مسرت سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

"او سعد۔۔۔ آخر تم نے کہہ ہی دیا۔۔۔ میں کب سے یہ تین الفاظ تم سے سننے کے لیے ترس رہی تھی۔"

"اور میں کب سے یہ تین الفاظ کسی نہ کسی کھائی میں گراتا آرہا ہوں۔" وہ پھر سے حیران ہوئی۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ کچھ پوچھتی' میں نے اس کے ہاتھ اپنے شانے سے ہٹائے۔

"مجھے جانا ہے تانیہ۔ ابھی۔۔۔ اسی وقت۔۔۔ ہانی کو لینے۔" اور اسے یوں ہی حیران پریشان چھوڑ کے میں چل دیا۔

☆ ☆ ☆

ابو سے پتا لے کر میں ام ہانی کے گھر پہنچا اور گیٹ کے باہر ہی کھڑے ہو کے مجھے احساس ہو گیا کہ یہ ام ہانی کا نہیں' سالار کا گھر ہے۔

بھلا ام ہانی کا گھر اور ایسا اجاڑ۔۔۔ ویران۔۔۔ وہاں تو پھول کھلتے۔۔۔ کلیاں چٹختی نظر آتیں۔۔۔ یہاں خزاؤں کے ڈیرے تھے اور سوکھے زرد پتوں کے ڈھیر۔ ام ہانی کا ہوتا۔۔۔ تو کوئل کوکتی یہاں۔۔۔ چڑیاں چہچہاتیں۔ یہاں تو گدھ اور کوے منڈلا رہے تھے۔

زنگ آلود گیٹ کو بمشکل دھکیل کے اندر داخل

ہوئے میں بے یقین سا تھا کہ ام ہانی یہاں نہیں ہو سکتی۔ وہ ایسی جگہ ہو بھی کیسے سکتی ہے اور اگر ہے تو یہ جگہ ایسی کیسے ہو سکتی ہے۔

تب ہی بالکونی پہ ٹنگا ایک گلابی دوپٹا ہوا کے دوش پہ لہراتا نیچے آیا اور میرے چہرے پہ ٹھہر گیا۔ آہستگی سے دوپٹے کو ہاتھ میں لیتے ہوئے میں نے ام ہانی کی مہک کو محسوس کیا اور اس بھروسے اندر قدم بڑھائے کہ وہ اندر ہی ہوگی کہیں نہ کہیں۔

ایک ملازمہ مجھے بڑے سے مہمان خانے میں چھوڑ گئی۔ ایک طویل راہ داری سے گزرتے ہوئے اور اس طویل راہ داری پہ پڑنے والے ہر قدم کے ساتھ سالار کی ایک قد آدم تصویر میرے سامنے آرہی تھی۔ میں نظر چرا تا رہا اور اب مہمان خانے میں لگی جابجا اس کی تصویریں مجھے جھنجلاہٹ میں مبتلا کررہی تھیں۔ میں اسے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ بالکل بھی نہیں۔ تب ہی میری نظر مشرقی دیوار کے ایک کونے میں لگی پینٹنگ پہ گئی۔ وہ اسی کھنڈر کی تصویر تھی۔

وہی کھنڈر... میں اس پینٹنگ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کے نیچے ام ہانی کے دستخط نہ بھی ہوتے تب بھی میں جان جاتا۔ یہ اسی نے بنائی ہے۔ مگر... مگر کھنڈر کی اس عمارت کو اس نے نہ جانے کیوں دھند میں ڈوبا ہوا دکھایا تھا۔

"سعد..." میں اس کی آواز پہ پلٹا۔ وہ ام ہانی ہی تھی۔ ویسی کی ویسی۔ "تم واپس کب لوٹے سعد؟"

"جس وقت تمہاری نظر مجھ پہ پڑی... بس وہی لمحہ تھا میرے واپس پلٹنے کا۔" میں یہ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ پتا نہیں کیوں کہہ گیا' وہ گنگ تھی۔ میں نے بات سنبھالی۔

"ابو نے کہا تھا تمہیں لانے کے لیے... سوچا اچانک آکے تمہیں سرپرائز دیتا ہوں لیکن شاید پریشان کردیا۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی یہاں... کوشش...

"بس اچانک تمہیں دیکھا... تو..."

"تو خوشی ہوئی؟" میں نے بڑی آس سے پوچھا۔

"کیسے ہیں سب...؟" اب کے بات اس نے بدلی۔ "تایا ابا... بڑی امی... پھوپھو... بڑے دادا..."

"سب تمہارا انتظار کررہے ہیں' چلو..." وہ کچھ کشمکش کا شکار لگ رہی تھی۔ "تم بیٹھو تو... کیا لوگے؟ چائے؟"

"کچھ نہیں... بس تم تیاری کرو' نکلتے ہیں۔"

"سعد... میں ضرور چلتی... مگر... دراصل..."

اس کی ہچکچاہٹ نے مجھے امی کی باتیں یاد دلادیں۔

"سنا ہے تم شادی کے بعد بمشکل ایک آدھ بار گئی ہو وہاں... بہت مصروف رہنے لگی ہو شاید... یا نئی زندگی میں پرانے رشتے یاد نہیں رہے... مگر میں بہت اعتماد کے ساتھ کہہ کر آیا ہوں کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہنی میری منگنی پہ نہ آئے۔" ساتھ جانے کی بات سننے کے بعد اس کے چہرے پہ مسلسل ہوائیاں اڑ رہی تھیں... مگر منگنی والی بات پہ وہ جی بھر کے خوش ہوگئی۔

"سچ... تمہاری منگنی ہو رہی ہے... کس سے؟ کون ہے... کیسی ہے وہ؟"

"لڑکی ہے... اچھی ہے... پسند ہے مجھے... اور اتفاق سے وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے... تمہارے سرتاج کی طرح صرف خود کو پسند نہیں کرتی۔" میں نے ہر طرف آویزاں سالار کی تصویروں کی جانب لطیف سا طنز کیا تو وہ شرمندگی سے وضاحت دینے لگی۔

"ارے... یہ تو میں نے لگائی ہیں... وہ گھر پہ کم ہوتے ہیں نا... اسی لیے لگائی ہیں... تاکہ وہ ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہیں... میں کہیں آتی جاتی بھی نہیں ہوں اسی لیے... ایک منٹ بھی دور نہیں رہ سکتی سالار سے..."

میں جان گیا تھا کہ یہ ساتھ نہ جانے کی تمہید باندھی جارہی ہے... مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ کیونکہ ام ہانی کے عقب میں مجھے سالار وہاں آتا نظر آرہا تھا... جس سے ام ہانی بے خبر لگ رہی تھی... اور اپنی ہی دھن میں کہتی جارہی تھی۔

"بہت پیار کرتے ہیں وہ بھی مجھ سے۔۔۔ منع نہیں کریں گے جانے سے۔۔۔ مگر میں جانتی ہوں۔۔۔ ان کے لیے بہت مشکل ہو جائے گا اگر۔۔۔" اور جیسے ہی سالار نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا۔۔۔ وہ نہ صرف فوراً چپ ہو گئی۔۔۔ بلکہ میں نے اس کے چہرے سے زندگی کی رمق دور ہوتے بھی دیکھی تھی۔۔۔ اس کا بدن باقاعدہ کپکپا سا اٹھا تھا۔۔۔ سالار کے لمس سے۔۔۔ جیسے خوف سے جھرجھری لی ہو اس نے۔۔۔ جبکہ وہ مسکرا رہا تھا۔۔۔ بڑے مہربان انداز میں۔

"تم میری مشکل کو چھوڑو ام ہانی۔۔۔ بس وہ کرو جو تمہارا دل چاہے۔" پھر وہ میری جانب متوجہ ہوا۔

"تم وہی لڑکے ہو نا۔۔۔ ام ہانی کے کزن۔۔۔ سعد۔۔۔"

"جی۔۔۔ کمال ہے۔۔۔ آپ کو یاد رہا۔۔۔ کیسے ہیں آپ۔"

"یہ تو تم ام ہانی سے پوچھو۔ کیسا ہوں میں۔۔۔ اور اسے کیسا لگتا ہوں؟" اس کا ہاتھ جواب تک ہانی کے شانے پہ تھا وہ پھسل کے اس کی کمر کے گرد حائل ہوا۔۔۔ اور سالار نے اسے خود سے قریب کر لیا۔۔۔ ام ہانی اب اور بھی سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔ جیسے اس کا سانس رک رہا ہو۔۔۔ میں کچھ دیر اور اس کے چہرے کو دیکھتا تو شاید اس کے خوف و ہراس کی وجہ جان پاتا۔۔۔ لیکن میری تو اپنی سانس رکنے لگی تھی ان دونوں کو ایک دوسرے سے اتنا قریب دیکھ کے۔

"ابو نے مجھے ہانی کو لینے بھیجا تھا۔۔۔ مگر وہ تو غالباً اب آپ کے بغیر کہیں بھی آتی جاتی نہیں ہے۔۔۔ تو میں چلتا ہوں پھر۔۔۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"ایسے کیسے جا سکتے ہو تم؟" مجھے روکنے کے بعد وہ اسی محبت کے ساتھ ام ہانی سے گویا ہوا

"اتنے مان سے بلا رہے ہیں تو چلی جاؤ۔۔۔ دل ٹوٹ جائے گا ان سب کا۔"

"نہیں۔۔۔ میں۔۔۔ میں پھر۔۔۔ پھر کبھی۔۔۔ میرا مطلب۔۔۔ ہے۔۔۔ کہ میں بعد میں چلی جاؤں گی۔" بہت وقت کے بعد ٹوٹ ٹوٹ کے الفاظ اس کے لبوں سے آزاد ہوئے۔

"نہیں۔۔۔ میں کہہ رہا ہوں کہ تم ابھی جاؤ گی تو تم جاؤ گی، ورنہ سب سمجھیں گے میری محبت خود غرض ہے اور میں نے تمہیں خود سے باندھ رکھا ہے۔" اس نے ام ہانی کی کمر سے اپنا بازو الگ کیا تو جیسے اس کی جان میں جان آگئی۔۔۔ مگر حیران وہ اب بھی تھی اور میں۔۔۔ میں تو جیسے کسی معمے کو حل کرنے کی تگ و دو میں تھا۔

"جاؤ۔۔۔ جلدی کرو۔۔۔ وہاں بے چینی سے تمہارا انتظار ہو رہا ہو گا۔"

سالار کے کہنے پہ وہ یوں بھاگی جیسے قید سے رہائی ملی ہو۔ میں یہ گتھیاں سلجھانے میں ناکام ہونے لگا تو دیوار پر لگی اس پینٹنگ کو گھورنے لگا۔

دھند میں چھپا کھنڈر۔۔۔

"میں نے کہا تھا نا۔۔۔ سالار مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انہیں میرا بہت خیال ہے۔ اب دیکھو نا، صرف میری خوشی کی خاطر مجھے بھیج دیا، ورنہ اکیلے کیسے رہیں گے۔" میں خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ مسلسل بولتی جا رہی تھی۔ مسلسل۔۔۔ بے تکان۔۔۔ اور بے تکا۔ بلاوجہ اپنے انداز سے خوشی اور ہیجان ثابت کرنے کی ناکام کوششوں میں ہلکان۔۔۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کتنی بھونڈی اداکارہ ہے۔

"اُفف۔۔۔ اب اتنی فکر رہے گی مجھے ان کی۔۔۔ کیسے رہیں گے اکیلے۔۔۔ سعد۔۔۔ میں کہے دیتی ہوں۔۔۔ میں زیادہ دن نہیں رکوں گی۔۔۔ سالار خود سے کبھی نہیں کہیں گے۔۔۔ مگر میں جانتی ہوں انہیں کتنی پرابلم ہو گی۔ میرے بغیر۔ اور سب سے بڑی بات۔۔۔ وہ تو ایک منٹ کے لیے مجھے اپنی نظروں سے اوجھل۔۔۔"

"تم نے اس پینٹنگ میں اس کھنڈر کو دھند میں کیوں چھپایا ہوا تھا۔" میرے اچانک سوال پہ وہ چپ کر گئی اور پھر گھبرا کے رخ پھیر کے باہر دیکھنے لگی۔

"دھند میں منظر واضح نہیں ہوتے۔ جو نظر آتا ہے وہ اصل میں ہوتا کچھ اور ہے۔۔۔ لیکن میں اس کھنڈر کے چپے چپے اور نقش نقش سے واقف ہوں۔ اس پہ کتنی بھی دھند ہو۔۔۔ کتنا ہی کچھ چھپانے کی کوشش کی جائے۔۔۔ مجھے سب صاف نظر آتا ہے۔" میں نے کچھ

جتانا چاہا۔۔۔ مگر وہ ایسی بن گئی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔۔۔ سمجھنا تو دور کی بات۔۔۔ پھر وہ سارا رستہ چپ رہی۔ یہ چپ حویلی جا کے بھی اس پہ چھائی رہی۔۔۔ خاص طور پہ جب مجھ پہ نظر جاتی۔۔۔ وہ مزید خائف لگنے لگتی۔

"تمہیں تو ہماری کبھی یاد ہی نہیں آئی۔۔۔ جس آنگن میں کھیل کے بڑی ہوئی' جہاں سے رخصت ہوئی' اس کو بھول گئی۔" امی نے اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے گلہ کیا۔۔۔ اور مہ پارہ پھوپھو نے حسب عادت گھما کے بات۔۔۔

"مگر آنگن میں جس کے ساتھ کھیل کے بڑی ہوئی اسے نہیں بھولی۔۔۔ دیکھو نا۔۔۔ ہمارے بلانے پہ بھی نہیں آئی' مگر سعد لینے گیا تو آگئی۔"

"کیسے آتی پھوپھو۔۔۔ کمشنر کی بیگم کی زندگی اتنی آسان نہیں ہوتی۔ ایک تو ان تین سالوں میں چار الگ الگ جگہ پوسٹنگ' پھر سالار کے ساتھ آئے روز کسی نہ کسی سرکاری یا غیر سرکاری تقریب میں جانا۔۔۔ اور گھر۔۔۔" میں جان گیا کہ میرے اندر آتے ہی وہ یہ راگ الاپنا شروع ہوئی ہے۔ صرف مجھے سنانے کے لیے۔۔۔ میں اطمینان سے میز پہ رکھی فروٹ کی ٹوکری سے آلو بخارا اٹھا کے کھانے لگا۔

"گھر کا تو پوچھیں ہی مت پھوپھو۔۔۔ اتنے کام اور اتنی ذمے داریاں۔۔۔"

"اب رہنے بھی دو ہانی۔۔۔ کون سے کام اور کون سی ذمے داریاں۔۔۔ نہ سسرال والے' نہ بال بچے۔۔۔ اور پھر کمشنر کی بیگم صاحبہ۔۔۔ کتنے تو نوکر چاکر ہوں گے۔ اب بناؤ مت ہمیں۔۔۔ یوں کہو کہ نئی زندگی کے ہنگاموں میں ہم تمہیں یاد نہ رہے۔"

"ایسا نہیں ہے پھوپھو۔۔۔ دراصل سالار کو نہ تو کسی اور کے ہاتھ کا کھانا پسند آتا ہے' نہ وہ اپنے ذاتی کام کسی اور سے کرواتے ہیں اور سب سے بڑی بات۔۔۔ میں انہیں دو منٹ بھی اپنے آس پاس نہ نظر آؤں تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں۔" اب میں ٹانگیں پسار کے بالکل اس کے سامنے والے صوفے پہ بیٹھ گیا۔۔۔ انگور کا گچھا ہاتھ میں لے کر انگور کے دانے ٹونگتے ہوئے اور گا ہے بگاہے اور بظاہر عام سی نظر اس پہ ڈالتے ہوئے۔۔۔ مگر میری یہ عام سی نظر بھی نہ جانے کیوں اسے بولائے دے رہی تھی۔ جیسے کسی کا جھوٹ سر عام پکڑا جائے۔

"ماشاء اللہ۔۔۔ چلو۔۔۔ ہماری خوشی کے لیے یہی بہت ہے کہ سالار تمہیں چاہتا ہے۔" امی نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا تو وہ پھر سے شروع۔۔۔

"کوئی ایسا ویسا تائی امی۔۔۔ میں تو کہتی ہوں۔۔۔ ایسا شوہر قسمت سے کسی کسی کو۔۔۔" اسی وقت اس کی نظریں مجھ سے ملیں۔۔۔ جانے کیا محسوس کر لیا اس نے کہ چپ ہو گئی۔۔۔ میں جو جتانا چاہتا تھا۔۔۔ وہ میں نے جتا دیا اور اسے مزید کہانیاں گھڑنے سے بچا لیا۔

"سعد۔۔۔ مجھے تانیہ سے تو ملواؤ۔۔۔ بہت شوق ہے مجھے اسے دیکھنے کا۔" اس نے اپنا نہیں' میرا دھیان ہٹانا چاہا' خود سے۔

"اسی لیے تو لایا ہے سعد اسے۔۔۔ کہ ہم سب اسے دیکھ لیں اور پھر اس کی پسند کی داد دیں۔" پھوپھو کی طنزیہ گفتگو کا تانا وہیں جڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ "پسند تو خیر سعد کی ہمیشہ سے بہت اچھی رہی ہے۔" ام ہانی کے مسکرا کے کہنے پہ میں نے بھی مسکرا کے ہی جتایا۔

"اپنے مجازی خدا کی طرح تم بھی خاصی خود پسند ہو گئی ہو۔۔۔ نہیں؟" اس نے گھبرا کے ادھر ادھر دیکھنا چاہا۔۔۔ مگر کسی نے میری بات پہ توجہ نہیں دی تھی۔ امی اور پھوپھو کا الگ ہی مسئلہ شروع ہو چکا تھا۔

"بجلی کے ساتھ ہے تانیہ۔۔۔ اتنی دوستی ہو گئی ہے دونوں میں۔۔۔ شکر ہے۔۔۔ ورنہ نند بھابھی کی کہاں بنتی ہے۔" امی کی بات کا الٹا مطلب نکالے اب پھوپھو الجھ رہی تھیں۔

"ارے۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی۔۔۔ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں بھابھی۔"

☼ ☼ ☼

عرصے بعد وہ اپنے اس کمرے میں آئی تھی اور آتے ہوئے وہ مصنوعی مسکراہٹ نوچ کے باہر ہی پھینک آئی تھی۔ جس کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے اس کا

چہرہ اب چیخنے لگا تھا۔ اپنی اور سعد کی تصویر پہ نظر پڑتے ہی اس کے کانوں میں سعد کی آواز گونجی۔
"میرے بغیر جو بھی کام کروگی۔۔۔ وہ غلط ہو گا۔۔۔ دیکھ لینا۔"
"دیکھ لیا۔۔۔" اس کے لبوں سے آہ سی نکلی۔ پھر وہ اپنی رائٹنگ ٹیبل تک آئی۔۔۔ جس کی سطح پہ گرد کی ایک تہ جمی تھی۔۔۔ دراز سے اپنی اسکیچ بک نکال کے یوں ہی ورق پلٹے تو سب سے پہلے سالار کا بنایا اسکیچ ہی سامنے آیا۔
وہی خوف۔۔۔ وہی ہراس پھر سے اس پہ طاری ہو گیا۔ دھڑ دھڑ کرتے دل کے ساتھ اس نے فوراً اسکیچ بک بند کی۔۔۔ دراز میں پھینک کے بند کیا اور دوپٹے سے ماتھے پہ آیا پسینہ صاف کرنے لگی۔
تب ہی دھڑ سے دروازہ کھلا اور ثانیہ بڑے جوش کے عالم میں اندر داخل ہوئی۔
"ام ہانی۔۔۔" اس کے انداز میں استفسار بھی تھا اور اشتیاق بھی۔۔۔ خود کو سنبھالتے ہوئے ام ہانی نے اثبات میں سرہلایا۔
"آپ ام ہانی ہی ہو نا۔۔۔ سعد کی بہن؟" اور آگے بڑھ کے گرمجوشی سے ہانی کے گلے لگ گئی۔ "اور تم ثانیہ۔۔۔"
"ارے۔۔۔ سعد نے بتایا میرے بارے میں؟ تب ہی آپ نے فوراً مجھے پہچان لیا۔۔۔ مگر اس نے مجھے آپ کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔۔۔ ایک لفظ بھی نہیں۔۔۔ پھر بھی میں نے پہچان لیا۔"
"اچھا۔۔۔ وہ کیسے۔۔۔"
"پھوپھو اور نائلہ آنٹی سے پتا چلا کہ آپ اس کی بچپن کی اتنی اچھی دوست ہیں اور وہ ہمیشہ سے آپ سے بہت اٹیچ رہا ہے' تب سے میں اتنی ایکسائٹڈ تھی آپ سے ملنے کے لیے۔"
"اچھا۔۔۔ ہوں۔۔۔ مگر کیوں۔۔۔" ام ہانی کو وہ پٹر پٹر بولنے والی لڑکی بھا گئی۔۔۔ دل چاہا اسے بار بار بولنے پہ اکسائے۔
"جو لوگ سعد کو اچھے لگتے ہیں وہ مجھے بھی اچھے لگتے ہیں۔ جو اسے پیارے ہیں وہ مجھے بھی پیارے ہیں۔۔۔ پتا ہے مجھے تو اب رنگ بھی صرف وہ اچھے لگتے ہیں جو وہ پہنتا ہے۔" ہانی اسے تکتی جارہی تھی۔۔۔ بہت محبت سے۔۔۔
"کیا دیکھ رہی ہیں۔"
"تمہیں۔۔۔ تم مجھے بہت اچھی لگی ہو۔" اس نے بڑے ہی سچے دل سے کہا۔
"ارے۔۔۔ کہیں آپ کے ساتھ بھی تو وہ مسئلہ نہیں۔۔۔ کہ چونکہ میں سعد کو اچھی لگتی ہوں تو اس لیے آپ کو بھی اچھی لگ رہی ہوں۔" وہ کنگ ہو گئی۔ "بتایئے نا۔"
"ہاں۔۔۔ شاید۔۔۔" مختصراً وہ اتنا کہہ پائی۔

٭ ٭ ٭

"اوہ تیری۔۔۔" میں نے کچھ ایسا دیکھا تھا کہ نہ صرف ٹھٹک کے رک گیا' بلکہ بے ساختہ میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے اور علی جو بیلی کا ہاتھ تھامے بڑی ہی گھامڑانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ عشق جھاڑ رہا تھا' ہڑبڑا کے پرے ہٹ گیا اور بیلی۔۔۔ وہ تو سرپٹ بھاگ لی۔
"وہ نا۔۔۔ سعد۔۔۔ میں بیلی سے یہ کہہ رہا تھا کہ۔۔۔ کہ۔۔۔" میں نے ہنستے ہوئے علی کی مشکل آسان کی۔
"جو بھی کہہ رہا تھا' کہتا رہ۔۔۔ ایسی باتیں کسی اور کو تھوڑا ہی بتائی جاتی ہیں' احمق۔۔۔"
"نہیں' نہیں۔۔۔ وہ تو۔۔۔ قسم سے نہیں۔" وہ مزید گڑبڑا گیا۔۔۔ مگر میں مطمئن تھا۔۔۔ ثانیہ بیلی کے بارے میں کچھ مشکوک تھی۔۔۔ اسے لگ رہا تھا۔۔۔ بیلی ہی وہ ہے جس سے ماضی میں میری کوئی وابستگی رہ چکی ہو۔
"چلو۔۔۔ یہ مسئلہ تو حل ہوا۔۔۔ خود بخود ٹھنڈی پڑ جائے گی اب وہ۔۔۔"

٭ ٭ ٭

ام ہانی سب کے منع کرنے کے باوجود کچن میں مصروف تھی اور ثانیہ اسٹول پہ بیٹھی گاجر کھاتے ہوئے مسلسل اس سے سوالات اور جرح۔۔۔ اور اب

فرمائشیں کرتی جارہی تھی۔

"شادی کے بعد آپ مجھے بھی کوکنگ سکھائیں گی۔"

"میں نے بھی تائی امی سے ہی سیکھا ہے۔ تم بھی ان سے ہی سیکھ لینا۔"

"لیکن سعد کو تو آپ کے ہاتھ کا پسند ہے' اسی لیے تو اس نے آج خاص آپ کے ہاتھ کے پراٹھے کی فرمائش کی ہے۔ کیا آپ اس کی سب پسند ناپسند سے واقف ہیں؟" اس کے سوال پر ام ہانی مسکرائی۔

"پسند ناپسند سے ہی واقف نہیں ہوں۔ مجھے تو یہ بھی پتا چل جاتا ہے کہ اس کی پسند کب بدلنے والی ہے۔"

"پھر تو آپ کو یہ بھی پتا ہوگا کہ وہ... میرا مطلب ہے کہ کچھ سال پہلے جو اس کا کرش... یعنی... وہ... آپ سمجھ رہی ہیں نا... کیا اب بھی وہ..." روٹی بیلتے ہوئے ہانی کے ہاتھ تھم گئے۔ اس سے جھکا ہوا سر اٹھا کے تانیہ کی جانب دیکھا تک نہ گیا۔ کہ نہ جانے اس کے چہرے پہ کیا ہو جس کا وہ تاب نہ لا سکے۔

"بتائیں نا..." وہ سب جاننے پہ مصر تھی۔

"کیا وہ واقعی سیریس تھا... یا بس ایسے ہی..."

"تم کیوں پوچھ رہی ہو پرانی باتیں..." ام ہانی نے اپنے ہاتھوں کی لرزش چھپانے کی کوشش کی۔ "اس کا آج تم ہو تانیہ... اور آنے والا کل بھی..."

"مگر اس وقت اس کا گزرا ہوا کل بھی تو اس کے سامنے ہے۔" تانیہ کی بات پہ اس کے ہاتھ سے گھی کا کٹورا گرتے گرتے بچا' وہ متوحش ہو کے اسے تکنے لگی۔ "گزرا ہوا کل..."

"ہاں... بچپن کی محبت... اور وہ بھی پہلی محبت... پہلی محبت انسان کبھی نہیں بھولتا... خاص طور پہ جب عرصے بعد وہ سامنے آئے... سنا ہے راکھ میں دبی چنگاریاں پھر سے بھڑک جاتی ہیں۔" اس کی باتیں سن کے ام ہانی کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی۔

"تانیہ... تم... تمہیں کوئی غلط فہمی..." اس کا لہجہ اتنا پست تھا کہ وہ خود ہی چپ ہو کر رہ گئی۔

"میرے دماغ میں تو اس وقت سے خطرے کا سائرن بج رہا ہے ہانی... جب سے میں نے بیلی کو دیکھا ہے۔"

"بیلی..." ام ہانی نے تصدیق چاہی۔

"ہاں... ٹھیک ہے میری اور سعد کی منگنی ہے اور کچھ دن بعد ہماری شادی ہونے والی ہے لیکن وہ یہاں ہے... اگر دونوں کے درمیان پھر سے وہی پرانی والی..." بیلی کے ذکر پہ جیسے ہانی کی رکی ہوئی سانسیں بحال ہو گئی تھیں۔

"تم غلط سوچ رہی ہو تانیہ... ایسا کچھ بھی نہیں ہے... سعد کے دل میں کبھی بھی بیلی کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔"

"سچ... آپ مجھے بہلانے کے لیے تو نہیں کہہ رہی؟" وہ اب بھی بے یقین تھی۔

"میں قسم کھا کے کہہ سکتی ہوں۔"

"پکا..."

"سو فیصد پکا۔"

"اف... شکر..." تانیہ نے ایک گہری طمانیت بخش سانس بھری۔

"بوجھ اتر گیا دل سے... آپ بہت اچھی ہیں ہانی... بہت اچھی..." اس نے دفور جذبات سے ہانی کے ہاتھ تھام لیے اور اس کے ہاتھوں کے لمس میں موجود حدت نے ام ہانی کے دل میں اس پیاری سی لڑکی کے لیے پیارا سا احساس جگا دیا۔

☆ ☆ ☆

عرصہ ہو گیا تھا۔ بڑے دادا سے گپ شپ لگائے۔ میں بڑا موڈ بنا کے ان کے کمرے کی جانب بڑھا۔ پتا تھا کہ لاڈ بھی ہوں گے... گلے شکوے بھی... اور پھر رج کے ڈانٹ بھی ملے گی۔ کسی نہ کسی بہانے ان کے دروازے کے پاس پہنچتے ہی مجھے مہ پارہ پھوپھو کی آواز سنائی دی۔ گلے شکوے... رنج اور دکھ میں ڈوبی آواز...

"دادا جی... آپ سالوں سے اس بستر پہ ہیں..."

زندگی اور موت کے درمیان۔۔۔ نہ جیتے ہوئے۔۔۔ نہ مرتے ہوئے۔۔۔ میں بھی سالوں سے اس حال میں ہوں۔ آپ کی تکلیف کو مجھ سے زیادہ کوئی نہیں محسوس کر سکتا۔ کیا آپ نے کبھی میری تکلیف کو محسوس کیا۔ وہ تکلیف جو اپنی ہم جولیوں کو ان کے گھر میں اور شوہر اور بچوں کے ساتھ مگن دیکھ کے مجھے ہوتی ہے۔" وہ تکلیف جو اپنی اجاڑ زندگی اور سونی ہتھیلیوں کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ بتائیں دادا جی۔۔۔"

مجھے حیرت سی ہوئی۔۔۔ بھلا پھوپھو کی کیسی بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے بڑے دادا۔۔۔ تجسس سے بے تاب ہو کے میں نے ذرا سا اندر جھانکا۔ مہ پارہ پھوپھو بڑے دادا کی پائنتی بیٹھی ان کے بڑے سے پلنگ کے پائے سے سر ٹیکے رو رہی تھیں اور بڑے دادا۔۔۔ وہ منہ کھولے سو رہے تھے۔ ان کے خراٹے بہت ہلکی آواز میں پھوپھو کی سسکیوں کے درمیان دب رہے تھے۔ مجھے مزید حیرت ہوئی۔۔۔ بڑے دادا کی نیند تو بڑی کچی تھی۔ پھر وہ ایسے بے خبر کیسے ہو سکتے ہیں اور پھر ذرا غور سے دیکھنے پہ یہ حیرت دور ہو گئی۔ ان کا آلہ سماعت ان کے سینے پہ دھرا تھا۔ اس وقت وہ کسی بھی آہٹ، کسی کھٹکے، کسی سرگوشی، کسی آہ، کسی سسکی کو سننے سے قاصر تھے۔

"بڑا ظلم کیا آپ نے دادا جی۔۔۔ بڑا ظلم کیا۔۔۔ اکیلا کر دیا مجھے۔" وہ اب تک رو رہی تھیں۔ اب سمجھ آیا کہ شاید بڑے دادا کا آلہ سماعت بھی پھوپھو نے ہی نکال کے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ میرا دل پھوپھو کے دکھ پہ بوجھل سا ہو گیا۔۔۔ اور اسی کیفیت میں، میں صحن میں آ کے بیٹھ گیا۔ پتا بھی نہ چلا کب تانیہ میرے برابر آ کے بیٹھ گئی۔

"گم صم۔۔۔ اداس۔۔۔ چپ چاپ۔۔۔ کیا۔۔۔ منگنی نے ایک دن پہلے ایسی حالت ہوتی ہے۔" اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا میرے پاس۔ اس نے میرا چہرہ اپنی انگشت شہادت سے اپنی جانب کیا۔

"تم خوش نہیں ہو سعد؟" اس ہر دم ہنسنے مسکرانے والی پیاری لڑکی۔۔۔ جس کا دل اور جس کی فطرت ہی بے حد پیاری تھی۔ اسے اپنی وجہ سے تشویش کا شکار دیکھ کے مجھے ندامت سی ہوئی۔

"خوش ہوں۔" اس کی تسلی کے لیے میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"تو ظاہر کیوں نہیں کرتے؟ وہ کیا چیز ہے سعد جو تمہیں کھل کے خوش بھی نہیں ہونے دیتی۔"

"کسی کا دکھ۔۔۔"

"کس کا۔۔۔؟"

"اپنوں کا۔۔۔ میں کتنا انجان۔۔۔ کتنا غیر بنا رہا اپنے اپنوں سے۔۔۔ جب ان کے ساتھ تھا تو اپنی لاپروائی کی وجہ سے۔۔۔ یا شاید کم عمری کی وجہ سے دھیان نہیں تھا۔ اب احساس ہو رہا ہے کہ اس حویلی کے اندر کتنی سسکیاں گھٹ گھٹ کے مرجاتی ہوں گی۔"

"تم کس کی بات کر رہے ہو سعد؟"

اس گھر میں بہت کچھ بدلا ہے تانیہ۔۔۔ پرانی روایتیں، پرانی سوچ، سب کچھ، مگر صرف ہم مردوں کے لیے۔ اس حویلی کی عورتوں کے لیے کبھی کچھ نہیں بدلا۔۔۔ چاہے وہ معمولی ملازمہ سلمٰی ہو یا پھر پھوپھو۔" تانیہ کا چہرہ بھی بجھ سا گیا۔ اس کا حساس دل اس دکھ کو اسی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔۔۔ جیسے میں۔۔۔ نہ جانے یہ اس کی حساسیت تھی۔۔۔ یا اس کی مجھ سے محبت۔۔۔

"تمہیں اگر ان کے حالات پہ دکھ ہے سعد تو پھر تم ان کے حالات بدل بھی سکتے ہو۔" اس نے حوصلہ دلانا چاہا۔

"میں۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ تم۔۔۔ کیونکہ جس کے دل میں دوسرے کے لیے احساس ہو۔۔۔ وہی اس کے لیے کچھ کر سکتا ہے۔۔۔ کسی کی مدد کرنے کے لیے اپنا بااختیار ہونا اتنا ضروری نہیں ہے۔ جتنا دوسرے کے لیے ہمدردی محسوس کرنا۔۔۔ اور وہ تم کر رہے ہو۔" میں مسکرا دیا۔ وہ واقعی بہت پیاری تھی۔ باہر سے بھی۔۔۔ اندر سے بھی۔۔۔ جتنا میں اسے جان رہا تھا۔۔۔ اتنا خود سے نظر چراتا، پھر رہا تھا۔ اتنی پیاری۔۔۔ اور اتنی محبت کرنے

والی لڑکی سے بھی شادی کا فیصلہ کیوں کر بیٹھا؟ صرف امی کو زچ کرنے کے لیے؟

صرف اس لیے۔۔۔ کہ اگر انہوں نے میری پسند جانتے ہوئے بھی میری جانب سے نظریں پھیرے رکھیں۔۔۔ میری چاہت کی پروا نہ کی۔۔۔ تو میں بھی بدلے کے طور پہ بلی کے بارے میں ان کی پسندیدگی کو چٹکی میں اڑا سکوں۔ انہوں نے صرف اپنی پسند کی بہو لانے کے لیے یہ سب کیا تھا۔۔۔ تو میں ان کا اپنی پسند کی بہو لانے کا خواب، محض خواب ہی بنا کے رکھ دوں۔۔۔ اس لیے اپنی زندگی کے ڈرامے میں، میں نے ثانیہ کا کردار زبردستی شامل کیا۔ کر تو بیٹھا تھا۔۔۔ مگر اب شرمندگی ہوتی تھی۔ جب جب بھی ثانیہ کی اجلی فطرت کی کوئی نہ کوئی جھلک میرے سامنے آتی تھی۔ اس کی خوشیاں مجھے وہمی سا کر رہی تھیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی یہ خوشیاں میری وجہ سے چھن جائیں۔ یہ وہم ہو چلا تھا مجھے۔۔۔ اسی لیے جب امی کے بڑے چاؤ سے رکھی ڈھولک پہ اسے تالیاں پیٹ پیٹ کے خود اپنے سہاگ کے گیت گاتے دیکھا۔۔۔ تو میں وہاں سے اٹھ کے چھت پہ چلا گیا۔ حویلی میں شام بڑی حسین اترتی تھی۔ حد نظر تک آسمان کی لالی۔۔۔ اور پھر اس لالی میں نیلاہٹ گھلی تو میں نے جانا۔۔۔ ہلکے نیلے رنگ میں ملبوس وہ ام ہانی تھی جو چھت پر سے دھلے کپڑے سمیٹنے آئی تھی۔ میں نے رخ پھیر لیا۔ صرف اور صرف اپنی نظروں کو محصور ہونے سے بچانے کے لیے۔۔۔ جو آج بھی اس پہ پڑ کے واپس پلٹنا بھول جاتی تھیں۔۔۔ مگر میں نے اس بار کامیابی سے ان کو واپس پلٹنے پہ مجبور کیا۔۔۔ نیچے جھانکا تو قہقہہ نکل گیا۔ علی اور بلی۔۔۔ علی نے قہقہے کی آواز پہ ہڑبڑا کے اوپر دیکھا۔ بلی تو فوراً ہاتھ چھڑا کے بھاگ گئی۔ علی غصے میں منہ پہ ہاتھ پھیرتا بڑبڑاتا جانے لگا۔

"کیا ہوا؟" مجھے ہنستا دیکھ کے ام ہانی نے پوچھا۔

"بھاگ گئے دونوں۔۔۔"

"کون۔۔۔؟" وہ قریب چلی آئی۔

"علی اور بلی۔۔۔ چھپ چھپ کے رومانس جھاڑ رہے تھے۔"

"واقعی۔۔۔" اس کے لیے بھی یہ ایک انکشاف ہی تھا۔

"بڑے چھپے رستم نکلے یہ تو۔۔۔"

"تمہاری شادی پہ سیٹنگ ہوئی تھی ان کی۔۔۔ علی بتا رہا تھا کہ تمہاری رخصتی کے اگلے روز وہ دونوں یہیں چھت پہ لڑ رہے تھے کسی بات پہ۔۔۔ کہ دور سے بانسری بجنے کی آواز آئی۔" نہ جانے کیوں میں یہ فضول سی کہانی کھڑے کے اسے سنانے لگا اور وہ بھی بڑی محو ہو کے سن رہی تھی۔

"اس بانسری کی لے میں پتا نہیں کیا تھا کہ دونوں کے دل خود بخود ایک دوسرے میں کھو گئے۔"

"جھلی بھی نا۔" وہ سر جھٹک کے رہ گئی۔

"بھلا ایسے بھی کہیں ہوتا ہے۔"

"کیا پتا سچ ہو ہنی۔" میں اسے یقین دلانے پہ مصر تھا۔

"ہم کیا جانیں۔۔۔ ان دو دلوں پہ کیا گزری تھی۔۔۔ یہ تو وہ لمحے۔۔۔ وہ سر۔۔۔ وہ بانسری کی لے ہی بتا سکتی ہے کہ اس وقت ان پہ وہ۔۔۔" ابھی میں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ فضا میں پھر سے بانسری کی وہی آواز ابھری۔ میں چپ ہو گیا۔ بالکل چپ۔۔۔ میں کیوں چپ ہوا تھا۔۔۔ یہ میں جانتا تھا۔ وہ کیوں چپ تھی۔۔۔ یہ نہ وہ جانتی تھی، نہ میں۔۔۔ کتنی ہی دیر ہم دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے گئے۔ اس سکوت میں کچھ تھا۔۔۔ تو وہ بانسری کی آواز۔۔۔

"یہ تو وہ بجاتا تھا۔۔۔ سلمٰی کا عاشق۔۔۔" وہ ہلکا سا بڑبڑائی تو میں بھی جیسے ایک سحر کے عالم سے نکلا۔

"ہاں۔۔۔ مگر وہ دونوں تو اسی رات یہاں سے کہیں دور چلے گئے تھے۔۔۔ پھر یہ کون ہے؟" میرے سوال پہ وہ مسکرائی۔

"بستیاں بسی ہوں تو عاشق دوبارہ پیدا ہو جاتے ہیں۔"

"کیا عشق بھی دوبارہ پیدا ہو جاتا ہے۔" میرے دوسرے سوال پہ وہ نہ مسکرا سکی، نہ کچھ کہہ سکی۔

اسے پھر سے چپ لگ گئی۔ میں چند قدم آگے بڑھ کے اس کے قریب آیا۔

"علی ٹھیک کہتا تھا ہانی۔۔۔ یہ بانسری فضا میں گونجتی ہے تو دلوں میں رستے بنتے چلے جاتے ہیں۔۔۔ چاہے دروازے بند ہوئے سالوں ہی کیوں نہ بیت چکے ہوں۔۔۔ رستہ بن ہی جاتا ہے۔" وہ جیسے ہوش میں آئی۔ اور پلٹ کے تیزی سے واپس جانے لگی۔ میں کتنی ہی دیر وہاں کھڑا رہا، بند دروازے میں سے بنتے رستے کا تماشا دیکھتا۔

☼ ☼ ☼

تقریباً" بھاگتے ہوئے وہ نیچے آئی تھی اور اسی طرح بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ کس سے بھاگ رہی تھی۔ یہ وہ بھی جانتا تھا۔ جس سے وہ بھاگی تھی۔ اس لیے اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔

"کیا عشق بھی دوبارہ پیدا ہو جاتا ہے۔" یہ سوال اس کے ذہن میں ڈنگ مار رہا تھا۔

"کیوں کی سعد نے ایسی بات۔۔۔ وہ بھی۔۔۔ وہ بھی اس موقع پہ۔۔۔" اور ابھی الجھنیں مزید باقی تھیں۔ نائلہ کمرے میں اسی کی منتظر تھیں۔ ان کے ہاتھ میں کچھ جوڑے تھے۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی ہانی۔" وہ نائلہ کو پاکے ٹھٹکی۔۔۔ پھر اپنی گھبراہٹ کو اعتدال میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔

"جی تائی امی۔۔۔ کہیے۔۔۔ کوئی کام تھا۔"

"سعد کی منگنی کی تقریب کے لیے میں نے تمہارے اور سالار کے لیے جوڑے بنوائے ہیں۔۔۔ یہ دکھانے تھے۔"

"اس کی کیا ضرورت تھی تائی امی۔" وہ جز بز سی ہو گئی۔

"تحفہ ضرورت سے نہیں۔۔۔ محبت سے دیا جاتا ہے ہانی۔" وہ مسکرائیں۔۔۔ پھر بھی کچھ تھا جو ام ہانی کو کھٹک رہا تھا۔ بہت بری طرح۔

"اور میں نے تمہاری سب ذمے داریاں ماں کی طرح نبھائی ہیں، تو یہ کیوں نہیں؟" ان کا لہجہ میٹھا تھا۔۔۔ از حد۔۔۔ مگر پھر کیوں ام ہانی کو ایسا لگ رہا تھا کہ ان کی شیریں بیانی کے پیچھے کچھ اور تھا۔ کچھ ایسا جو وہ ابھی کہہ نہیں پا رہیں۔۔۔ مگر کہیں گی ضرور۔۔۔

"تمہاری ماں ہوں تو سالار کی ساس بھی تو ہوں۔۔۔ تمہارے لیے کچھ لیتی تو اسے کیسے بھول جاتی۔۔۔ ویسے وہ اب تک آیا کیوں نہیں تقریب کے لیے۔" اتنا اچانک سوال تھا ان کا کہ وہ گڑبڑا گئی تھی۔

"جی۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ تو۔۔۔"

"فون آیا اس کا۔۔۔"

ام ہانی نے انکار میں سر ہلایا۔

"تم نے کیا؟" اس سوال پہ وہ پھر سے نفی میں گردن ہلا کے رہ گئی۔

"کرنا چاہیے تھا۔" وہ سنجیدہ ہو گئیں۔۔۔ اور لہجہ نصیحت آمیز۔۔۔

"بلکہ تمہیں اسے ساتھ لے کر آنا چاہیے تھا۔۔۔ سعد تو ابھی بچہ ہے۔ ان نزاکتوں کو نہیں جانتا۔ تمہیں اکیلا ہی لے آیا۔۔۔ نہ جانے اس نے ڈھنگ سے سالار کو انوائیٹ بھی کیا یا نہیں؟ دیکھو۔۔۔ ابھی اور بھی مہمان آئیں گے۔ سب اس کے بارے میں سوال کریں گے۔ بیاہی بیٹی داماد کے ساتھ آئے تو اس کی بھی عزت بنتی ہے اور میکے والوں کا مان بھی۔۔۔" ام ہانی سر جھکا کے رہ گئی۔ اس کے پاس ان کی تمام باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ نائلہ نے قریب آکے محبت سے اس کے گال تھپتھپائے۔

"تمہاری ماں بن کے یہ باتیں میں ہی تمہیں سمجھاؤں گی کہ کیسے تمہیں میکے اور سسرال دونوں کا بھرم رکھنا ہے۔"

"جی۔۔۔" وہ کمزور آواز میں اتنا کہہ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

دن کا آغاز ہی افراتفری اور ہنگامے سے ہوا تھا۔ کیوں نہ ہوتا۔ میری زندگی میں ہونے والا کون سا واقعہ تھا جو ہنگامہ پرور نہ تھا اور یہ تو میری منگنی تھی۔ تقریباً"

دور نزدیک کے سب ہی رشتے دار اتنے مختصر مدت میں دیے گئے دعوت نامے کے باوجود آگئے تھے۔ خوشی سے بے حال۔۔۔ مگر پہلے سے نہ بتانے کا شکوہ کرتے ہوئے اور ان سب شکووں کے ساتھ ساتھ بھرپور تیاریاں کرتے ہوئے۔

"ہاجرہ۔ میری ساڑھی استری کی۔۔۔" یہ امی کی پکار تھی۔

"ابھی وہ میری کر رہی ہے بھابھی۔۔۔" پھوپھو کے کہنے پہ امی جھنجلا سی گئیں۔

"لو۔۔۔ تم بھی ساڑھی پہنو گی؟"

"کیوں۔۔۔ میں کیوں نہیں پہن سکتی۔" ان کے اعتراض کا جواب خالہ بتول نے اپنے انداز میں دیا۔

"ہمارے وقتوں میں تو صرف بیاہتا عورت پہنتی تھی ساڑھی۔"

"خالہ اب رہنے بھی دیں پرانے بوسیدہ اصول۔" پھوپھو کلس گئیں۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ رہنے دیے۔۔۔ تب ہی تو کہا۔۔۔ کہ ہمارے وقتوں میں۔۔۔ تم پہنو۔۔۔ ساڑھی۔۔۔ گھاگرا۔۔۔ کوٹ پتلون۔۔۔ دفع دور۔۔۔" امی انہیں الجھتا چھوڑ کے اب کسی اور ملازمہ سے اپنی ساڑھی استری کروانے کا کہہ رہی تھیں۔

"نائلہ۔۔۔ اس سے کہہ کر میرا بادامی جوڑا بھی استری کروا دے۔" خالہ نے اب انہیں فرمائش داغی۔

باہر برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑا۔۔۔ ابابیلوں کی قطاریں گنتا میں نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سب آوازیں سنتا رہا تھا۔

"واؤ۔۔۔ کتنے پیارے گجرے بنائے ہیں آپ نے۔" اندر ثانیہ کہہ رہی تھی۔۔۔ نہ جانے کس سے۔

"ہانی بیٹا۔۔۔ گجرے بن جائیں تو مہندی گھول دینا۔" امی کے کہنے پہ مجھے علم ہوا کہ گجرے ام ہانی کے بنے ہوئے تھے۔ جن کی ثانیہ تعریف کر رہی تھی۔

"جی اچھا تائی امی۔۔۔" اس کی مدھم آواز نے قطاریں گنتے ہوئے میرا دھیان ہٹا دیا۔ نہ جانے کتنی ہوئی تھیں۔۔۔ سات یا چھ۔

"میں گھول دوں آنٹی۔" بجلی نے بڑے شوق سے پوچھا تھا۔۔۔ مگر پھوپھو نے صاف صاف منع کر دیا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ تم رہنے دو۔۔۔ بلکہ کوئی بھی اور یہ زحمت نہ کرے۔۔۔ مہندی تو صرف ام ہانی لگائے گی۔۔۔ اس کے ہاتھ کی گھلی مہندی کا رنگ بہت گہرا آتا ہے۔"

"ارے واہ۔۔۔ آپ کی ایک اور کوالٹی کا پتا چل گیا۔۔۔ اب میں شادی پہ بھی آپ سے ہی مہندی لگواؤں گی۔"

"ضرور۔۔۔" ثانیہ کی فرمائش پہ اس نے فوراً حامی بھرلی تھی۔ مجھ سے اب رہا نہ گیا۔ میں اندر جانے لگا۔

"اور پرانی ہیروئنوں کی طرح اپنے ہاتھ پہ سعد کے نام کا پہلا حرف بھی لکھواؤں گی 'ایس۔۔۔' گجرے میں دھاگا پروتی ام ہانی کا ہاتھ رکا تھا اور میری نظر رکی تھی اس پہ۔۔۔ میں جانتا تھا۔۔۔ وہ کہاں کھو گئی ہے۔ اسی پل میں۔۔۔ جس پل میں نے اس دیوانگی کے عالم میں اس کے ہاتھ پہ مہندی سے اپنے نام کا پہلا حرف لکھا تھا۔ اسے تو شاید احساس بھی نہ ہوا تھا کہ اندر داخل ہوتے ہی کوئی ٹھٹک کر رک گیا ہے اور بے خودی سے اسے دیکھتا چلا جا رہا ہے۔

"ہانی۔۔۔" ثانیہ نے جھک کے اس کے کان میں سرگوشی کی تو وہ چونک سی گئی۔

"ہوں۔۔۔"

"کیا میں بہت حسین لگ رہی ہوں؟" ثانیہ کے معصومیت سے پوچھنے پہ وہ مسکرا دی۔

"ہاں۔۔۔ بہت۔۔۔"

"تب ہی سعد کی نظر مجھ سے ہٹ نہیں رہی۔" وہ اترائی۔

"دیکھیں نا۔۔۔ بت بن کے مجھے تکتا جا رہا ہے۔" ہانی نے سامنے دیکھا اور وہ جان گئی۔۔۔ یہ بت کسے تک رہا ہے۔ گھبرا کے وہ سوئی' دھاگا' پھول' گجرے سب چھوڑ کے وہاں سے چل دی۔

"ہانی۔۔۔ کیا ہوا؟" ثانیہ نے حیران ہو کے اسے پکارا' مگر وہ جا چکی تھی۔ وہ چلی گئی۔۔۔ تو میں یہاں رک

کے کیا کرتا۔۔۔ میرے قدم بھی اپنے کمرے کی جانب
بڑھنے لگے۔

"سعد۔۔۔" ثانیہ نے اب مجھے پکارا۔۔۔ اور یقیناً"
میرے نہ رکنے پہ وہ ناراض ہوئی ہوگی۔۔۔ تب ہی کچھ
ہی دیر بعد میرے پیچھے وہاں چلی آئی۔ میں دراز میں
عرصے سے چھپا کے رکھا ام ہانی اور سالار کی شادی کا وہ
کارڈ نکال کے دیکھ رہا تھا جس پہ میں نے سالار کا نام
کاٹ کر اپنا لکھنے کے بعد سوچا تھا۔۔۔ شاید میں نے تقدیر
کا لکھا ہی بدل دیا ہے۔ ثانیہ کے آنے کے بعد میں نے
کارڈ وہیں چھپا کے پھر سے دراز مقفل کر دیا۔

"کیوں عین منگنی والے دن چھاپہ پڑوانا ہے تم
نے؟" میرے ہلکے پھلکے انداز پہ وہ بھی بدستور خفگی
سے مجھے گھورتی وہیں کھڑی رہی۔

"اب کیا ہوا؟"

"تم مجھ سے بھاگ رہے ہو؟ چھپ رہے ہو مجھ
سے؟"

"نہ۔۔۔ بالکل بھی نہیں۔" وہ سچ اندازہ لگا بیٹھی
تھی، مگر میں مکر گیا۔

"ویسے بھی۔۔۔ کوئی فائدہ نہیں۔۔۔ جتنا بھی بھاگو۔۔۔
کتنا بھی دور جاؤ۔۔۔ کہیں بھی چھپ جاؤ۔۔۔ اگر کسی کی
جڑیں دل کے اندر تک اتری ہوں تو واقعی۔۔۔ کوئی
فائدہ نہیں۔" چھپاتے چھپاتے۔۔۔ پردے ڈالتے
ڈالتے بھی میں کچھ سچ کہہ ہی گیا۔

"تم بدلے بدلے لگ رہے ہو سعد؟ یا۔۔۔ یا یہ میرا
وہم ہے؟"

"وہم ہی ہوگا۔" میں نے ٹالنا چاہا۔

"جیسے مجھے بھی وہم ہوا تھا۔۔۔ کہ سب بدل گیا
ہے۔۔۔ سب کچھ۔۔۔ مگر اب احساس ہوا کہ کچھ نہیں
بدلا۔۔۔ سب کچھ پہلے جیسا ہی ہے۔" وہ مطمئن ہوکر
مسکرائی۔ حالانکہ میں نے اس کو اطمینان دلانے والی
کوئی بات نہیں کی تھی۔ اگر وہ جان جاتی کہ میری اس
بات کا مفہوم کیا ہے تو شاید اس کا اطمینان ہمیشہ ہمیشہ
کے لیے رخصت ہو جاتا۔۔۔ مگر وہ مسکرا رہی تھی۔

"شکر۔۔۔ میں ایسے ہی گھبرا گئی تھی۔ حالانکہ ہانی
نے بھی مجھے یہی کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا اس نے؟ یہی کہ۔۔۔ تم صرف میرے ہو
اور میں ہی تمہارا آج ہوں اور میں ہی تمہارا آنے والا
کل۔۔۔" میں مسکرا دیا۔۔۔ عجیب کرب سے۔۔۔

"اور یہ نہیں بتایا ہنی نے کہ میرا گزرا ہوا کل کون
سا تھا۔"

"اوں۔۔۔ ہوں۔۔۔ صرف اتنا کہا کہ جو گزر گیا وہ
دوبارہ نہیں آتا۔۔۔ اور سعد کو تو یوں بھی رکنے یا پیچھے مڑ
کے دیکھنے کی عادت نہیں ہے۔۔۔ یہ سچ ہے نا سعد؟"
میں خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا گیا۔ میری خاموشی
پہ وہ گھبرا گئی۔

"بتاؤ نا۔۔۔ ہانی سچ کہہ رہی ہے؟ تم میرے ہی ہو؟"
وہ اتنی آس اور امید سے مجھے دیکھ رہی تھی کہ میرا دل
موم ہو گیا۔

"تم بہت اچھی ہو ثانیہ۔۔۔" میں نے ہولے سے
اس کی ناک دبائی۔

"اتنی اچھی کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہونی
چاہیے تھی۔"

"کیوں؟ کیا محبت اتنی بری چیز ہے؟"

"ہاں۔۔۔ صرف بری ہی نہیں۔۔۔ کمینی اور ڈھیٹ
بھی۔۔۔ کتنا بھی خود سے الگ کرو۔۔۔ جدائی کی مار مارو۔۔۔
یہ ڈھیٹ وہیں کھڑی رہتی ہے۔ ٹلتی نہیں ہے۔۔۔ اس
لیے کہتا ہوں۔۔۔ کبھی نہ کرنا محبت۔۔۔ مجھ سے بھی
نہیں۔"

"مگر۔۔۔ اب تو کر بیٹھی۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"یوں کہو۔۔۔ اب تو مر بیٹھی۔"

☆ ☆ ☆

منگنی کی رسم ادا ہو رہی تھی۔ میرے دل پہ ایک
بوجھ تھا۔ قدموں میں بیڑیاں۔۔۔ مگر ان من من بھر
بھاری بیڑیوں کے ساتھ بھی مجھے قدم تو اٹھانے ہی
تھے۔ اس راستے پہ تھا۔۔۔ جس پہ میں خود ثانیہ کا ہاتھ
تھام کے یہاں تک لایا تھا۔ اسے بیچ راستے پہ چھوڑ کے
کیسے پلٹ جاتا اور پلٹتا بھی تو کیوں؟ کس کے لیے؟ اس

کے لیے؟ جو نہ کل میری تھی' نہ آج ہے۔ اس کے حقوق تو عرصہ پہلے کسی اور کے نام ہو چکے اور میں نے اپنی یہ پسپائی جب کھلے دل سے نہ صرف تسلیم کی تھی بلکہ حوصلہ کرکے اسے خود کسی اور کے ساتھ رخصت بھی کیا تھا۔

وعدہ بھی کیا تھا اس سے کہ میں پلٹ کے نہ دیکھوں گا۔ یہ خیال تک نکال دوں گا اس سے۔۔۔ پھر کیوں؟ کس لیے؟ کس کی خاطر۔۔۔ سب بے سود ہے۔۔۔ بے کار۔۔۔ میں نے خود کو ڈانٹا۔۔۔ ڈپٹا۔۔۔

اور ثانیہ کی انگلی میں مبارک سلامت اور تالیوں کے شور میں انگوٹھی پہنادی۔ سامنے نظر اٹھائی تو سب کے خوشی سے دمکتے چہرے تھے۔ بس ایک اس چہرے پہ ہلکی سی زرد پرچھائیں تھی۔ مجھے وہم۔۔۔ نہیں۔۔۔ خوش فہمی سی ہوئی۔۔۔ مگر اگلے ہی لمحے دور ہو گئی۔۔۔ سب کے درمیان کھڑی ام ہانی اپنے ہاتھ میں دبے فون کو دیکھ رہی تھی۔ جس پہ آتی کسی فون کال نے اس کے چہرے کی رنگینی پل بھر میں نوچ ڈالی تھی۔ پھر وہ نامحسوس طریقے سے سب کے درمیان سے نکل کے جانے لگی۔ اب ثانیہ مجھے انگوٹھی پہنا رہی تھی۔ کسی کا دھیان اس کے جانے پہ نہ تھا اور میرا دھیان۔۔۔ وہ تو وہ ساتھ لے گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

کمرے تک آتے آتے ام ہانی نے سالار کی کال لے لی۔

"ہیلو۔۔۔"

"فرصت مل گئی؟" سالار کا لہجہ زہر بھرا تھا۔

"جی۔۔۔ وہ وہاں شور بہت تھا' اس لیے کال ریسیو نہیں کی۔ اندر آتے ہی میں نے فوراً"۔۔۔

"میں بہت دیر سے فون کر رہا تھا ام ہانی۔۔۔" وہ دھاڑا۔

"جی۔۔۔ میں بھی کل سے آپ کو بار بار فون کر رہی ہوں۔۔۔ آپ نے اٹھایا ہی نہیں۔"

"بہت خوب۔۔۔ تو تمہاری اتنی ہمت کہ اب تم مجھ سے بدلے لوگی۔" سالار الٹا پڑ گیا تو اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا سالار۔۔۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ اس وقت میں فون نہیں اٹھا سکی۔۔۔ بتایا تو ہے آپ کو۔۔۔ وہاں شور بہت تھا۔"

"کچھ زیادہ لمبے جواب نہیں دینے لگی تم؟ کتنی مشکل سے میں نے تمہیں صرف ہاں میں جواب دینا سکھایا تھا۔" سالار کی بات پہ ام ہانی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر کچھ کہے بغیر لب سی لیے۔

"جتنی جلدی ہو سکے۔۔۔ واپس آؤ۔"

"جی۔۔۔" اس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"میں صبح ہوتے ہی نکل آؤں گی۔"

"صبح کس نے دیکھی ہے۔" وہ پھر سے دھاڑا۔

"صبح تک کا انتظار نہیں کر سکتا میں۔۔۔ میں نے کہا۔ جتنی جلدی ہو سکے۔" وہ حواس باختہ ہو گئی۔

"ایسے کیسے اچانک نکل آؤں سالار۔۔۔ سب لوگ پوچھیں گے۔ ویسے بھی پہلے ہی آپ کے نہ ہونے پہ سوال کر رہے ہیں۔"

"میں نے کہا۔۔۔ ابھی اسی وقت۔۔۔" وہ یقیناً "نشے میں تھا۔۔۔ تب ہی ایک ہی بات پہ اڑا ہوا تھا۔

"منگنی ہو گئی؟"

"جی۔۔۔ ابھی ہوئی ہے رسم۔۔۔"

"تو بس پھر۔۔۔ رکنے کا کیا جواز ہے؟ میں نے تمہیں منگنی میں شرکت کی اجازت دی تھی۔ اس سے زیادہ کی نہیں۔۔۔ تمہیں اب تک گھر پہ ہونا چاہیے تھا۔"

"مگر سالار۔۔۔ اس وقت۔۔۔"

"ابھی وقت ہے ام ہانی۔۔۔ آجاؤ۔۔۔ دیر کی۔۔۔ تو نتائج کا ذمے دار میں نہیں ہوں گا۔" اس نے غصے میں فون پٹخ دیا تھا اور ام ہانی جیسے ہوا میں معلق ہو کے رہ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

✡ ✡

عنبرین ولی

"ماہی گڑیا... اٹھ جاؤ... نماز کا وقت نکلا جارہا ہے۔" صولت آپا اس کے قریب بیٹھی دھیمی آواز میں اسے جگا رہی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی نرم انگلیاں اس کے بال بھی سہلا رہی تھیں۔ ماہی نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں۔

"آپا... آپ اتنے پیار سے جگاتی ہیں کہ جی چاہتا ہے میں لیٹی رہوں اور آپ میرے بال سہلاتی رہیں۔" وہ پھر سے آنکھیں بند کر کے بولی۔ صولت آپا مسکرائیں۔

"مسکہ مت لگاؤ اور اٹھو۔ اس سے پہلے کہ امی آجائیں اور تمہارے ساتھ ساتھ میری بھی شامت آجائے۔ شرافت سے اٹھ جاؤ۔" وہ بستر سے اٹھ گئیں اور اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے زبردستی اٹھایا۔ وہ منہ بناتی اٹھی۔ گرتی پڑتی واش روم پہنچی، مرمر کر وضو کیا اور آدھی سوئی، آدھی جاگی کیفیت میں نماز پڑھی۔ اسے صبح سویرے جاگنا دنیا کا سب سے مشکل کام لگتا تھا اور عافیہ ممانی کو اسے نیند سے بے دار کروانا اس سے بھی زیادہ مشکل اور ان دونوں کے ان مشکل ترین کاموں کو بے حد آرام سے، جو ہستی سرانجام دیتی تھی وہ صولت تھیں۔ عافیہ ممانی نے شکر ادا کیا تھا کہ ماہی کی صبح جگانے کی ذمہ داری ان کے ناتواں کاندھوں پر نہیں پڑی، وگرنہ وہ اس بوجھ سے شاید کبڑی ہو جاتیں۔ جیسے تیسے نماز ادا کر کے وہ پھر سے بستر پر گر گئی۔ ابھی آنکھ لگے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ صولت آپا نے اسے پھر سے جگا دیا۔

"تم آج کا دن بھول گئیں۔ آج تمہارا کالج میں پہلا دن ہوگا۔ اعلا تعلیم حاصل کرنے کی طرف پہلا قدم۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ان کی اس بات نے اس کی ادھ کھلی آنکھوں کو پورا کا پورا کھول دیا۔ اسے بالکل بھی یاد نہیں تھا کہ کلاسز شروع ہونے والی ہیں۔ رات کو بھی کسی نے بھی اسے یاد دلانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

"آپا... آج..." وہ غم سے چور لہجے میں بولی۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ماہی کی کیفیات سے واقف تھیں۔ جس لڑکی کی صبح دوپہر بارہ بجے ہو سات بجے کالج کے لیے روانہ ہونا کسی بڑے سانحے سے کم تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔

"اٹھو اور اپنی تیاری شروع کرو۔ مجھے بھی تیار ہونا ہے اور ہاں آج تمہارا پہلا دن ہے۔ اس لیے وقت کی پابندی کا خیال رکھنا۔" وہ اس کا گال تھپتھپا کر بولیں۔ وہ برے برے منہ بناتی کھڑی ہو گئی۔ مسئلہ ہی یہی تھا کہ وہ صولت آپا کی کہی گئی ایک بات بھی نہیں ٹال سکتی تھی۔ اس گھر میں واحد صولت آپا تھیں، جن کی ہر بات وہ بلاچوں چرا مان جایا کرتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے آئینہ دیکھتے ہوئے کاجل کی لکیر کو گہرا کیا۔ نیچرل کلر کی لپ اسٹک لگائی۔ اس کے کیلے بال اونچی پونی میں قید بہت بھلے لگ رہے تھے۔ سفید یونیفارم میں اس کی گندمی رنگت چمک رہی تھی۔ دوپٹا شانوں پر پھیلا کر اس نے ایک مکمل نگاہ خود پر ڈالی اور سیاہ بیگ کاندھے سے لٹکا کر باہر نکل آئی۔ دسترخوان پر گھر کے تمام افراد موجود تھے۔ اس نے آکر سب کو سلام کیا اور بیٹھ گئی۔

"لگتا ہے محترمہ ماہی کو کالج جانے کی کچھ زیادہ ہی خوشی ہے۔ اس لیے اس قدر تیاری کی گئی ہے۔" سب سے پہلے سیماب کی زبان کو کھجلی ہوئی تھی۔ ماہی نے ایک غصیلی نظر اس پر ڈالی مگر بولی کچھ نہیں۔

"ماشاء اللہ۔۔ ہماری ماہی تو یونیفارم میں بہت پیاری لگ رہی ہے۔" ممانی نے دل سے تعریف کی مگر ماہی کو ان کی تعریف مسکہ لگی۔

"صبح صبح بٹرنگ۔۔" سیماب اس کے تاثرات بھانپ کر بولا۔ وہ مسکراہٹ دبا گئی۔

"ہنسنے سے اجتناب؟ لگتا ہے تمہیں دانت برش کرنے کا وقت نہیں ملا۔" سیماب کی بے چین زبان کو سکون بھی نہیں مل سکتا تھا۔

"مامی۔۔ اپنے اس لنگور بیٹے سے کہیں کہ صبح صبح میرے منہ نہ لگے' ورنہ اس کے ساتھ بہت برا ہوگا۔" وہ غصے سے آواز دبا کر بولی' کیونکہ قریب ہی ماموں بھی موجود تھے۔ مامی نے سیماب کو غصے سے گھورا۔

"ماہی۔۔ دفع کرو اسے۔ یہ تو ہے ہی فضول۔۔ فضول باتوں میں اس نے پی ایچ ڈی کر رکھا ہے۔ تم ناشتا کرو شاباش۔۔" وہ اسے پچکارنے لگیں۔ وہ بھی فوراً" ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ناشتا کرنے کے دوران اسے محسوس ہوا کہ کوئی اسے گھور رہا ہے۔ یہ سیماب کے علاوہ کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے پراٹھے کے نوالے کو منہ کی طرف لے جانے سے پہلے اس کی طرف دیکھا۔

"دم کیس۔۔ اکیسواں نوالہ۔۔" اس کی مبالغہ آرائی سے لپٹی سرگوشی نما آواز اس تک پہنچی۔۔ اس نے غصے سے نوالہ پلیٹ میں پھینکا۔

"مامی۔۔" اس بار اس نے آواز دبانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس کی آواز میں ایسا درد تھا کہ ماموں بھی اخبار میں سے سر نکال کر اسے دیکھنے لگے۔

"سیماب کب سے میرے نوالے گن رہا ہے۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔ باپ کو اپنی طرف متوجہ پا کر اس کا رنگ ہی اڑ گیا۔

"مم۔۔ مم۔۔ میں نے کب تمہارے نوالے گنے؟" وہ ہکلانے لگا۔

"سیماب۔۔ کیا بدتمیزی ہے یہ؟" اب کی بار عافیہ ممانی کی جگہ ماموں بولے۔۔ ان کی بارعب آواز نے اسے گردن جھکانے پر مجبور کر دیا۔

"عافیہ۔۔ اسے اس وقت تک ساتھ کھانا کھانے کی اجازت نہیں' جب تک یہ سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کا طریقہ نہیں سیکھ لیتا۔" ماموں کے بے تحاشا سخت لہجے پر ماہی بھی گھبرا گئی۔

"کبھی تو انسانوں والی حرکتیں کر لیا کرو۔" شوہر کے اٹھ جانے کے بعد عافیہ ممانی نے پھر سے اسے لتاڑا۔ ماہی کے معاملے میں وہ بہت حساس تھے اور وہ ذرا سی شرارت بھی' جو ماہی کو پریشان کرے ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔

"میں تو بس مذاق کر رہا تھا۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ اس کے چہرے پر پھیلی جھلاہٹ نے ماہی کو بے حد مزا دیا۔ ماہی کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ نے اس کا غصہ بڑھا دیا۔ وہ بھی وہاں سے اٹھ گیا جبکہ وہ اطمینان سے ناشتا کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"یہ سارا فساد میری مامی کا پھیلایا ہوا ہے۔ کیا مزے کی زندگی تھی میری مگر میری مامی بھی نا! انہیں لگتا ہے کہ میں بگڑ جاؤں گی مگر خیر کوئی بات نہیں۔ انہیں جو سوچنا تھا وہ سوچ چکیں اور کر بھی چکیں مگر میری لائف کی تو بینڈ بج گئی۔ اب تو میں چاہ کر بھی پہلے کی طرح انجوائے نہیں کر سکتی۔" وہ اداسی سے بولی' اس کے برابر بیٹھی گل مہر حیران نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر پہلے دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے نام بتائے تھے اور اس کے بعد سے ماہی کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔

"کیا مطلب ماہی؟" مہر نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"یار!... مطلب یہ کہ میں نے ہمیشہ سے ایوننگ شفٹ میں اسکول پڑھا ہے۔ مجھے صبح دیر تک سونے کی عادت ہے بچپن سے۔ اس لیے ممانی نے مجھے ہمیشہ دوپہر کے اسکول میں پڑھایا۔ میٹرک کے بعد میں نے پہلے ہی اعلان کردیا تھا کہ میں پرائیویٹ پڑھوں گی کیونکہ یہاں ایسا کوئی کالج نہیں جو ایوننگ کلاسز دیتا ہو' اگر ہوتا بھی تو ماموں کم از کم مجھے کالج لیول پر ایوننگ ٹائم میں کالج جوائن کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ سو میں مطمئن تھی کہ پرائیویٹ پڑھوں گی مگر میری ممانی نے میری خوشیوں کی نیا ڈبو دی۔" وہ سرد آہ بھر کر بولی۔ مہر پوری دلچسپی سے اسے سن رہی تھی۔

"میرے علم میں لائے بغیر سیماب کو دوڑا دوڑا کر کالج کے فارم منگوائے' اپنی مرضی کے مضامین منتخب کیے اور ان تمام خفیہ کارروائیوں کے نتیجے کے طور پر میں تمہیں یہاں اس کالج میں دکھائی دے رہی ہوں۔" اس نے کچھ اس انداز میں کہا کہ مہر چاہ کر بھی اپنی مسکراہٹ روک نہ پائی۔

"اگر تمہیں سائنس کے مضامین میں دلچسپی نہیں ہے تو تمہاری ممانی نے تمہیں سائنس ڈیپارٹمنٹ میں کیوں داخل کروایا؟"

"ارے کیا بتاؤں میں تمہیں... میری ممانی کو لوگوں کا خوف ہے۔ وہ لوگوں کی باتوں سے خوف زدہ رہتی ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میرے ماموں لیکچرار ہیں اور میتھس پڑھاتے ہیں۔ ان کے سب سے بڑے سپوت عالی شان بھائی وہ انجینئر ہیں اور آج کل آسٹریلیا میں ہیں۔ پھر ان سے چھوٹی صولت آپا۔ انہوں نے کیمسٹری میں ماسٹرز کیا ہے اور وہ بھی پچھلے تین ماہ سے پڑھا رہی ہیں اور پھر ان کے بعد میری ممانی کا سب سے چالاک' کمینہ اور میری جان کا دشمن بیٹا سیماب۔ وہ بھی اکنامکس پڑھ رہا ہے اور آخری سال میں ہے۔ ایسے میں اگر وہ میری بات مان لیتیں اور مجھے پرائیویٹ پڑھنے کی اجازت دے دیتیں تو بقول ماہی کے کہ لوگ کہتے کہ شوہر کی یتیم بھانجی کو گھر بٹھا دیا کہ اس پر پیسہ خرچ کرتے دل تنگ پڑ رہا تھا اور ایسی اور بہت سی باتیں مگر میں اپنی ضد پر اڑی تھی کہ میں پرائیویٹ ہی پڑھوں گی۔ پھر صولت آپا نے سمجھایا کہ ممانی کا کہنا بھی غلط نہیں۔ مجھے ان کے جذبات سمجھنے چاہیے اور پھر میں مان گئی۔" وہ تفصیل سے بولی۔

"تم بہت دلچسپ لڑکی ہو..." مہر نے دل سے کہا تو وہ ہنس پڑی۔

"سب یہی کہتے ہیں۔" ماہی نے کالر جھاڑ کر کہا۔

"فرینڈز؟" مہر نے یک دم ہی اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر کہا جسے ماہی نے فوراً" تھام لیا۔

"ارے اگر تمہیں میں نے اپنا فرینڈ نہ مانا ہوتا تو کیا میں اپنے اوپر بیتی ظلم کی کہانی سناتی... میں نے تو تمہیں دیکھتے ہی طے کرلیا تھا کہ تم ہی میری دوست بنوگی۔" وہ ہنس پڑی۔

☼ ☼ ☼

"ایک پلیٹ مجھے بھی..." مانوس سی آواز اس کے

کانوں سے ٹکرائی تو وہ اچھل پڑی۔ اس کے بالکل برابر سیماب کھڑا تھا۔ چہرے پر شیطانی مسکراہٹ سجائے۔ ماہی کے ہاتھوں میں پکڑی گول گپوں سے بھری پلیٹ گرتے گرتے بچی۔

"تم... تم آج اتنی جلدی کیسے آگئے۔" وہ گھبرا کر بولی۔ آج وین والا اسے لینے کے لیے نہیں آیا تھا۔ مہر تو اپنے ڈرائیور کے ساتھ جاچکی تھی۔ وہ سمجھی کہ سیماب ہمیشہ کی طرح دیر سے ہی آئے گا۔ اس لیے پہلے ایک چاٹ کی پلیٹ کھائی اور پھر گول گپوں کو دیکھ کر بھی اس کی نیت خراب ہوگئی۔ چاہ کر بھی وہ خود کو روک نہ پائی۔ ابھی تو اس نے صرف دو گول گپے ہی کھائے تھے کہ سیماب ٹپک پڑا۔

"میں تو نیک ارادے لے کر آیا تھا کہ محترمہ کو انتظار کی کوفت سے بچا سکوں اور جلدی گھر پہنچا دوں مگر یہاں تو..." وہ اس کی پلیٹ کی طرف اشارہ کرکے بولا۔

"میں شاید غلط وقت پر آگیا۔" وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر بولا۔ ماہی کا دل چاہا کہ وہ کہے کہ تم تو ہمیشہ ہی غلط وقت پر انٹری دیتے ہو مگر ایسے نازک وقت میں وہ اس سے کوئی لڑائی افورڈ نہیں کرسکتی تھی۔ اس لیے خاموش رہی۔ سیماب اس کے ہاتھوں سے پلیٹ لے چکا تھا اور بڑے مزے سے کھا رہا تھا۔ وہ محض دیکھ کر رہ گئی۔

"چلو اب بل بھی پے کرو۔" ماہی نے اس کے حکم پر اسے غصے سے گھورا اور چپ چاپ اپنے پرس میں سے پیسے نکالے۔ بل ادا کرکے وہ اس کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گئی۔

"آہ آج تو بہت حسین دن ہے۔ خوب مزا آئے گا جب گھر کے تینوں بڑوں سے تمہیں ڈانٹ پڑے گی۔" اس کے بیٹھتے ہی وہ مزے لے کر بولا۔ وہ گھبرا گئی۔

"سیماب دیکھو... مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی، اس لیے میں نے گول گپے خرید لیے۔ بریک ٹائم میں کام کررہی تھی نا تو دھیان نہیں رہا کہ کچھ کھاسکوں۔" اس نے جھوٹ گھڑا۔

"ہاں تو میں نے کب کہا تم نے شوق کی وجہ سے گول گپے کھائے ہیں۔ امی کو بتاؤں گا کہ تمہیں بھوک لگ رہی تھی۔" وہ اطمینان سے بولا۔ بائیک ہوا سے باتیں کررہی تھی۔ ماہی کا دل چاہا کہ وہ اس کی گردن دبوچ لے مگر ہر خواہش تو پوری ہو نہیں سکتی۔

"پلیز سیماب... گھر میں کسی کو مت بتانا۔ تم تو بہت اچھے ہو۔ بہت سویٹ ہو نا۔" وہ اب مکھن لگا رہی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔ ماہی کی حالت اسے خوب مزا دے رہی تھی۔

"ماہی... میں بہت برا لڑکا ہوں۔ خباثت میں تو پی ایچ ڈی ہوں میں' اور لنگور بھی ہوں۔" چند روز پہلے سیماب کو اس نے جن القابات سے نوازا تھا وہ اس نے دہرادیے۔

"ارے وہ تو میں نے مذاق مذاق میں کہہ دیا تھا۔ تم بھی نا بہت سینسیٹو ہو 'مذاق بھی نہیں سمجھتے' دل پر لے لیتے ہو۔" وہ یوں بولی جیسے وہ سچ میں نا سمجھ ہو۔ سیماب کا دل چاہا قہقہہ لگا کر ہنس پڑے مگر وہ خود پر بمشکل کنٹرول کرپایا۔ "ہاں نا... دیکھو میں نے تمہاری ان ساری باتوں کو سنجیدگی سے لے لیا اور ان سب باتوں نے مجھے بہت دکھی بھی کردیا ہے۔" اس نے بائیک روکتے ہوئے کہا اور مصنوعی آنسو صاف کیے۔

"میرے دکھوں کا مداوا کرنا چاہتی ہو نا تو وہ پرفیوم کی بوتل میرے حوالے کردو جو عالی شان بھائی نے تمہیں دی تھی۔" وہ مطلب پر آگیا۔ ماہی نے غصے سے اسے گھورا۔ مگر کیا کرتی مجبور تھی ہامی بھرنی پڑی۔

☆ ☆ ☆

رات ہی اسے ماہی کا پیغام ملا تھا کہ وہ صبح کالج نہیں آسکے گی۔ اس نے جواباً "اس سے نہ آنے کی وجہ دریافت کی تھی مگر اس نے کہا کہ جب ملاقات ہوگی تب ہی وہ تفصیل سے بات کرے گی۔ اسی لیے صبح فجر کی نماز ادا کرکے وہ پھر سے سوگئی۔ ساڑھے سات بجے کے قریب عائشہ بیگم اس کے کمرے میں آئی تھیں۔

مہر اپنے نرم بستر پر گہری نیند کے مزے لے رہی تھی۔ انہیں اس کے یوں بے خبر ہو کر سونے پر حیرت سی ہوئی۔ کالج ڈیز میں وہ اس وقت اور اس طرح کبھی سوتی دکھائی نہیں دی تھی۔ وہ اتنی پرسکون نیند میں تھی کہ ان کا دل نہیں چاہا کہ اسے جگائیں مگر وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ مہر کی کوئی ضروری کلاس مس ہو جائے اور دوسری بات رات ہی شاہ دل واپس آیا تھا اور ایک گھنٹے میں اسے پھر سے نکلنا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جگا گئیں۔

"جی مما۔۔۔" وہ اپنی آنکھیں مسلتے ہوئے بولی۔ اب بھی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔

"مہر۔۔۔ کالج جانے کا وقت ہو گیا ہے اور تم اب تک سوئی ہوئی ہو۔" وہ ہلکی سی خفگی لیے پوچھ رہی تھیں وہ جو لیٹی تھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"رات ماہی کا ٹیکسٹ آیا تھا کہ آج وہ کالج نہیں آئے گی۔ گھر میں کچھ مصروفیت ہے اس لیے۔ پھر میں نے سوچا کہ میں بھی چھٹی کر لوں، ویسے بھی آج کوئی پریکٹیکل نہیں۔ آپ کو بتانا بھول گئی۔" اس نے بات ختم کر کے بالوں میں کیچر لگایا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ اب جلدی سے منہ دھو کر نیچے آؤ۔ شاہ دل ناشتے پر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" وہ نارمل لہجے میں بولیں جبکہ وہ چونک گئی۔

"چاچو کب آئے؟" وہ حیران سی بولی۔

"تمہارے چاچو رات بہت دیر سے آئے تھے۔ اس لیے تمہیں جگایا نہیں۔ کچھ دیر میں وہ پھر چلا جائے گا، آ کر مل لو۔" وہ بستر سے اٹھتے ہوئے بولیں۔ مہر کا منہ بن گیا۔

"السلام علیکم۔۔۔" اس نے ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہی سنجیدہ سی آواز میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ کیسا ہے میرا بچہ۔" شاہ دل بھرپور لہجے میں بولا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ تقریباً ایک مہینے بعد وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ مہر نے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ شاہ دل کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

"مہر۔ کیا بدتمیزی ہے یہ؟" عائشہ بیگم کو شدید غصہ چڑھ گیا تھا۔ "بھابھی پلیز۔۔ مت ڈانٹیں اسے۔" وہ فوراً" اس کی مدد کو لپکا۔

"مہر ناراض ہے مجھ سے۔ اس کا اتنا حق تو بنتا ہے کہ وہ اپنی ناراضی ظاہر کرے۔" مہر کا دل بھر آیا۔

"آئی ایم سوری گڑیا۔" وہ ناشتا چھوڑ کر اس کے پاس آگیا۔ وہ رونے لگ گئی۔

"ارے۔۔ ارے۔۔" شاہ دل گھبرا گیا جبکہ عائشہ بیگم سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

"بیٹا سچ کہہ رہا ہوں' بہت مصروفیت ہے۔ میں چاہ کر بھی گھر کے لیے وقت نہیں نکال پاتا۔" اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"آئندہ اس طرح مت رونا۔" وہ اس کے چہرے پر پھیلے آنسو صاف کرنے لگا۔ وہ اس کے عزیز ترین مرحوم بھائی کی آخری نشانی تھی اور بہت عزیز تھی۔ مہر مسکرا دی۔

"آؤ ناشتا کرلو۔ مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔" دونوں نے مل کر ناشتا کیا' کچھ دیر تو وہ اس سے باتیں کرتی رہی' پھر شاہ دل کی فرمائش پر کچن میں چائے بنانے چلی گئی۔ اس دوران عائشہ خاموش بیٹھی رہیں۔

"بھابھی آپ کیوں چپ ہیں؟" وہ ان کی خاموشی توڑ کر چکا تھا۔

"مہر کی حرکتیں دیکھی ہیں؟ بھلا اس میں رونے والی کون سی بات تھی اور تم۔۔ تم نے بھی تو اسے سر چڑھا رکھا ہے۔ لڑکیوں کے لیے اتنا لاڈ پیار ٹھیک نہیں ہوتا۔ وہ تمہاری غیر موجودگی برداشت نہیں کرسکتی۔ نہ جانے شادی کے بعد سسرال میں کیسے رہے گی۔" وہ پریشان تھیں' شاہ دل مسکرا دیا۔

"بھابھی آپ بے وجہ پریشان ہوتی ہیں۔ بچپن سے سارا وقت اس نے میرے ساتھ گزارا ہے اور پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ میں اتنے لمبے وقت کے لیے اس سے دور رہا ہوں تو وہ اس دوری کو بہت محسوس کررہی ہے۔ شادی کے بعد وہ بالکل نارمل ہوجائے گی۔ پھر وہ اپنی ساری توجہ اپنے گھر کو دے گی تو میری حیثیت ثانوی ہوجائے گی۔ آپ بے فکر رہیں۔" وہ تسلی دینے کے انداز میں بولا۔

"تم بھی شادی کا سوچو' عمر نکلی جارہی ہے۔" ہزار بار کا کہا گیا جملہ ایک بار پھر اس کے سامنے دہرایا جارہا تھا۔ وہ ہنس پڑا اور موبائل اٹھا کر کوئی نمبر پریس کرنے لگا۔ اس کی بے نیازی پر عائشہ کھول کر رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

سب حق دق بیٹھے تھے۔ آوازیں جیسے گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ عالی شان ایسا بھی کرسکتا ہے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس گھر کا وہ بیٹا جو اپنے کپڑے تک اپنی ماں کی پسند سے خریدا کرتا تھا۔ آج ایک عدد بیوی اور بچی کے ہمراہ ان کے سامنے کھڑا تھا۔ سب سے زیادہ شاک تو عافیہ بیگم کو لگا تھا۔ عالی شان کے پاکستان آنے کی خوشی تو جیسے کہیں منوں مٹی تلے دفن ہوگئی تھی۔ وہ صوفے پر ڈھے سی گئی تھیں۔ کتنے ارمان تھے ان کے دل میں۔ عالی شاہ کے اس ایک قدم نے سب کچھ خاک میں ملا دیا تھا۔ وہ گھر کے بیچوں بیچ سر جھکائے کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی خوب صورت سی بیوی اور چھ ماہ کی بچی بھی تھی۔ جو کرسٹینا کے بازوؤں میں سوئی ہوئی تھی۔ کرسٹینا بھی چپ چاپ کھڑی تھی۔ پاکستان آنے سے پہلے عالی شان نے یقیناً" اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ اس لیے وہ اس طرح کے ری ایکشن کے لیے ذہنی طور پر تیار تھی۔ اس کے چہرے پر کچھ خاص تاثرات نہیں تھے۔

کسی نے بھی انہیں بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔ چاروں طرف اس قدر خاموشی تھی کہ سانس لینے کی آواز بھی سنی جاسکتی تھی۔ سب جیسے عافیہ بیگم کے بولنے کے منتظر تھے۔ انہوں نے سب کی طرف ایک نظر دیکھا۔ سب ہی ان کی طرف متوجہ تھے۔

"صولت اس سے کہہ دو کہ رات ہوچکی ہے۔ اس لیے آج کی رات اس گھر کو ایک سرائے سمجھ کر یہیں گزار لے۔ صبح ہونے سے پہلے یہ اپنے خاندان کو جہاں لے کر جانا چاہے جاسکتا ہے۔" انہوں نے عالی

شان بھائی کی طرف بے تحاشا غصے سے دیکھ کر کہا تھا اور صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"امی پلیز۔۔۔ میری بات تو۔۔۔" ان کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی عافیہ بیگم کا زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا تھا۔

"تمہارے اور میرے درمیان جو رشتہ تھا' اسے میں آج ابھی اور اسی وقت توڑ رہی ہوں۔ ماں جیسا لفظ میرے لیے مت ادا کرنا۔ میں تمہاری کچھ نہیں لگتی۔" الفاظ تھے کہ پگھلا ہوا سیسہ۔۔۔ ان کے تھپڑ سے کہیں زیادہ ان کے لفظوں نے انہیں تکلیف دی تھی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتے تھے مگر وہ وہاں لمحے بھر کے لیے بھی نہ رکیں۔ ایک ایک کر کے سب وہاں سے چلے گئے۔ ان کے اس اقدام نے سب کو بہت دکھی کیا تھا۔ وہ وہیں صوفے پر بیٹھ کر رونے لگے۔ کرسٹینا اپنی جگہ شرمندہ سی کھڑی تھی۔ اس میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ انہیں سہارا ہی دے دے۔

☆ ☆ ☆

ماہی کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ ایسے حالات میں کالج جائے جبکہ سب دکھی تھے۔ اس نے مہر کو پھر سے ایک میسج کیا اور اپنے کالج نہ آنے کی اطلاع کردی۔ مہر کو اس نے یہی کہا تھا کہ مہمانوں کی موجودگی کی وجہ سے وہ آج کے روز بھی غیر حاضر رہے گی۔ عالی شان نے ماں کا کہا مانا تھا اور صبح ہی صبح چلے گئے تھے۔ گھر میں عجیب سا سناٹا طاری تھا۔ گھر میں سب نے معمول کے مطابق ناشتا بھی کیا تھا۔ گھر کے کام بھی ہو رہے تھے مگر پھر بھی کمی سی تھی۔ گھر کے کونے کونے میں ایک عجیب سا خالی پن اور وحشت بکھری پڑی تھی۔ وہ گھبرا کر رہ گئی۔ دن بہت مشکل سے گزر رہا تھا۔ وقت گزاری کے لیے وہ چھت پر چلی گئی۔ ٹھنڈی ہوا نے اس کے اعصاب پر کافی اچھے اثرات مرتب کیے تھے۔ وہ کافی دیر وہیں کھڑی عالی شان بھائی کے اس انتہائی قدم کے متعلق سوچتی رہی۔ بہت دیر وہ چھت پر گزار کر نیچے آئی تو اس نے عافیہ ماہی کو لاؤنج میں بیٹھے ہوئے پایا۔ ان کے ہاتھ میں فون تھا۔ سیڑھیاں اتر کر وہ ان تک پہنچی تھی کہ وہ خدا حافظ کہہ کر ریسیور کریڈل پر رکھنے لگیں۔

"کس کا فون تھا؟" وہ ان کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"تمہاری دوست مہر کا۔۔۔ کہہ رہی تھی کہ تمہارے موبائل پر پچاس بار کال کرنے کی کوشش کی مگر تم نے اس کا فون اٹھایا ہی نہیں۔ پھر اس نے لینڈ لائن پر کال ملائی۔" انہوں نے اسے بتایا تو وہ سر پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔ موبائل وہ تکیے کے نیچے ہی رکھ آئی تھی' اٹھانا بھول گئی تھی۔

"مہر پوچھ رہی تھی کہ ایکسپو سینٹر میں جو بکس فیسٹیول ہے اس میں تم اس کے ساتھ جاؤ گی کہ نہیں؟ میں نے تمہاری طرف سے ہاں کردی ہے۔ کس وقت جانا ہے اور کس کے ساتھ یہ تم دونوں طے کرلینا۔" وہ تفصیل سے بولیں۔ مہر نے اس سے کچھ دن پہلے ذکر کیا تھا کہ ایکسپو میں بکس فیسٹیول ہونے والا ہے۔ مہر کتابوں کی ازحد شوقین تھی۔ کتابوں سے کچھ دلچسپی تو اسے بھی تھی مگر اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ جائے۔

"ماما۔۔۔ میں نہیں جارہی ایکسپو سینٹر۔۔۔ گھر کے حالات ایسے ہیں اور۔۔۔" ماما کے گھورنے پر اس کا منہ بند ہو کر رہ گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے گھر کے ماحول کو۔۔۔ پہلے جیسا ہی ہے۔۔۔ کوئی بھی فرد کم نہیں۔" انہوں نے سخت لہجے میں کہا تھا۔ اس کا منہ لٹک گیا۔

"اور ماہی تم مجھے یوں منہ لٹکا کر گھومتی نظر نہ آؤ۔ اپنے کمرے میں جاؤ اور مہر کو کال کر کے پروگرام مرتب کرو۔ کل تم دونوں کو سیماب چھوڑ آئے گا۔" وہ حتمی لہجے میں بولیں۔ ماہ کے چہرے پر بارہ بج گئے تھے۔ وہ پہلی مرتبہ اس سے یوں اتنے سخت لہجے میں مخاطب ہوئی تھیں۔ وہ اپنے آنسو ضبط کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اسے جاتا دیکھتی رہیں۔

شام میں جب سیماب آیا تو اس نے عافیہ ماہی کے

روپے کی شکایت کی۔ وہ ہنس پڑا۔

"تمہیں معلوم تو ہے کہ وہ کتنی دکھی ہیں اور وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی ہیں کہ انہیں بھائی کے ہونے نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔ بس اسی لیے وہ اس طرح کا رویہ ظاہر کررہی ہیں اور تم کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہو؟ عالی شان بھائی سے میں آج مل کر آیا ہوں۔ وہ بالکل ٹھیک ہیں اور میں نے ان کے لیے ایک کرائے کا گھر بھی ارینج کرلیا ہے۔ کل وہ ہوٹل سے گھر شفٹ ہو جائیں گے اور دیکھنا تم امی کا غصہ بھی جب اترے گا تو وہ بھائی کو معاف کرکے گھر بلالیں گی۔" وہ اسے نرمی سے سمجھانے لگا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا بس کچھ دن کی بات ہے۔ اب تم ایک کام کرو جلدی سے صولت آپا کو کہہ دو کہ مما کا حکم ہے کہ وہ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔" وہ صولت کے پاس پہنچ گئی جو گم صم سی بیٹھی تھیں۔ اس نے عافیہ کا آرڈر انہیں سنایا اور ان کے برابر لیٹ گئی، جلد ہی وہ سو گئی، اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ اس کی فکر میں وہ رات بھر جاگتی رہی ہیں۔

☆ ☆ ☆

"آپا اٹھ جائیں نا۔ آج کیا ہو گیا ہے آپ کو۔" وہ ان کے سر پر کھڑی چلا رہی تھی۔ فجر کے بعد ان کی آنکھ لگی تھی اور ابھی نو بجے تھے کہ وہ انہیں جگانے لگی مگر صولت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہ تھک کر خود بھی وہیں ان کے پاس لیٹ گئی۔ تکیے سے اندھیرے میں کب اس کی آنکھ لگی اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔ کتنی دیر گزری اسے نہیں پتا تھا صولت کے جھنجوڑنے پر وہ جاگی۔ وقت دیکھ کر اسے جھٹکا لگا تھا۔ فوراً" سے پہلے اس نے مہر کو ٹیکسٹ کیا کہ وہ پونے گھنٹے تک پہنچ جائے گی۔ ٹیکسٹ سینڈ کرکے وہ باتھ روم میں گھس گئی۔ وہ نہا کر آئی تو صولت کو بیڈ پر اسی حالت میں بیٹھے دیکھ کر تپ گئی۔

"آپا جلدی کریں۔ دیر ہو رہی ہے۔" وہ ان کے سر پر کھڑی مچل کر بولی۔ "آپ کو پتا ہے کہ ہم پہلے ہی لیٹ ہو چکے ہیں اور مہر اسے تو آپ سے ملنے کا بھی بہت شوق ہے۔ اب جلدی کریں تیار ہو جائیں۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی تو وہ کھڑی ہو گئیں۔ وہ بالکل چپ تھیں۔ ماہی جب تک تیار ہوئی صولت نہا کر آچکی تھی۔ وہ بال سلجھانے لگیں۔ بال سمیٹ کر انہوں نے دوپٹا لپیٹا اور آئینے میں ایک نگاہ خود کو دیکھا۔ پھر وہ دونوں باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ گاڑی سیماب چلا رہا تھا۔ ماہی اس کے برابر بیٹھی تھی۔

"مہر کے گھر کا پتا ٹھیک طرح سے معلوم ہے نا۔" صولت نے جب تیسری بار یہی سوال دہرایا تو وہ چڑ گئی۔ گاڑی مین روڈ پر رواں دواں تھی۔

"آپا۔ اب اگر آپ نے مجھ سے مزید ایک اور بار یہ سوال پوچھا تو میں سیماب کا سر پھاڑ دوں گی۔" وہ کن انکھیوں سے سیماب کی طرف دیکھ کر بولی۔ سیماب نے یک دم گاڑی کو بریک لگا دیے۔

"تم ہر وقت میرے ہی پیچھے کیوں پڑی رہتی ہو؟ اب اگر آپا اس طرح کے سوالات پوچھ رہی ہیں تو تم میرا سر کیوں پھاڑو گی؟" وہ چلا کر بولا۔ ماہی کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

"آپا کو تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ وہ مجھ سے بڑی ہیں۔ اس لیے تم ہی بچے ہو۔" وہ کندھے اچکا کر بولی۔

"بی بی بھولو مت۔ میں بھی تم سے پورے چار سال بڑا ہوں۔ عزت کیا کرو میری۔" وہ پھر سے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

"لو جی کرلو گل۔ اب اس چھٹانک بھر کے چھوکرے کی بھی عزت کرنی پڑے گی اور وہ بھی میں۔ یعنی ماہ نور یہ کام کرے؟" وہ یوں بولی جیسے وہ کہیں کی راج کماری ہو اور سیماب ادنیٰ سا ملازم۔ "تم مجھے چھ فٹ کے خوبرو بندے کو چھٹانک بھر کا چھوکرا بول رہی ہو؟" وہ صدمے سے بولا۔ "نہیں چلا رہا۔ بیٹھی رہو۔" اس نے کار کو ایک جھٹکے سے روکا اور غصے سے بولا۔

"تو نہ چلاؤ۔ میں نے تمہارے منتیں نہیں کرنی۔" وہ اک شان بے نیازی سے بولی۔ سیماب نے

اس کے اطمینان بھرے انداز کو حیرت سے دیکھا۔ پھر اچانک جیسے اس کی یادداشت واپس آگئی۔ ٹریفک سے بھرے روڈ پر گاڑی روکنے کا مطلب اپنے پیچھے چلتے جم غفیر کی بنا سنسر کی ہوئی گالیاں سننا اور کانسٹیبل کی جیب بھی بھرنا تھا۔ وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا چپ چاپ کار اسٹارٹ کرنے لگا' ماہی کا دل چاہا قہقہہ لگا کر ہنس پڑے اور اس نے ایسا ہی کیا۔ سیماب بڑبڑانے لگا۔

"آپا... آپ کیوں اتنی خاموش اور گم صم ہیں؟" اسے اپنی شرارتوں سے فرصت ملی تو محسوس ہوا کہ صولت آپا اتنی دیر سے بالکل چپ بیٹھی ہیں۔ سیماب کو بھی تشویش ہوئی۔ ان کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا تو اس نے پھر پکارا... "آں... کیا ہوا؟" وہ جیسے کسی گہرے خیال سے چونکیں۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" وہ تشویش سے بولی۔ صولت زبردستی مسکرائی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس اونگھ سی آگئی تھی۔ رات کو ٹھیک طرح سو نہیں پائی' میں اس لیے تھکن سی ہو رہی ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولیں۔ لہجہ واقعی تھکن زدہ تھا۔

"مگر آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تو ہم نہیں جاتے۔ پھر کسی دن چلے جائیں گے۔ ویسے بھی یہ فیسٹیول ابھی کافی دن چلے گا۔" ماہی نے فوراً" کہا۔

"بالکل بھی نہیں۔ مہر کا گھر بس آنے والا ہے اور وہ بے چاری پچھلے کئی گھنٹوں سے تمہارا انتظار کر رہی ہے اور میری طبیعت بالکل ٹھیک ٹھاک ہے اور کتابیں دیکھ کر کچھ اور بھی فریش ہو جاؤں گی۔" وہ مصنوعی بشاشت سے بولیں۔ ماہی مطمئن سی ہو کر سیدھی ہو گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مہر کے بنگلے کے باہر تھے۔

"ماہی... تم اندر چلی جاؤ۔ اگر ہم دونوں بھی گئے تو مہر کی ممی تکلفات میں پڑ جائیں گی۔" ماہی اثبات میں گردن ہلاتی دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ اس کے جاتے ہی سیماب سنجیدگی سے صولت کی جانب مڑا۔

"کیا بات ہے؟ چہرہ اس قدر زرد کیوں ہو رہا ہے؟" وہ ان کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"بتایا تو کہ تھکن ہو رہی ہے اور بس..." وہ جھنجلا کر بولیں۔

"مجھ سے جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ بہت پریشان اور گھبرائی ہوئی ہیں' یہ آپ کے چہرے سے ظاہر ہے' اس لیے جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وجہ بتا دیں مجھے۔" وہ بے حد سنجیدہ لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"وہ... رات کو جب میں ابو کے پاس بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھی تو... انہیں ایک فون آیا... اور جانتے ہو کہ وہ فون کس کا تھا؟ شاہ نواز انکل کا۔" صولت کی بات سن کر وہ جہاں تھا وہیں تھم کر رہ گیا۔

"ایسا کیسے ممکن ہے؟ شاہ نواز انکل... کیسے..." وہ بری طرح حیران تھا۔ صولت کا دل چاہ رہا تھا زارو قطار روئے مگر ماہی کسی بھی وقت آسکتی تھی۔ اسی لیے وہ خود پر ضبط کیے بیٹھی تھیں۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ اتنی آسانی سے کیسے؟" وہ اسٹیئرنگ پر مکا مارتے ہوئے غصے سے بولا۔

"ایسا ہو چکا ہے سیماب... ابو بہت زیادہ پریشان ہیں اور امی کو تو اس بات کی خبر بھی نہیں۔ اگر شاہ نواز انکل نے ماہی کو..." وہ جملہ مکمل ہی نہ کر پائیں۔

"ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ ہمارے ہوتے ہوئے ماہی کو وہ چھو بھی نہیں سکتا۔ آپ پریشان مت ہوں... پلیز..." وہ خود بری طرح پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔ مگر اسے تسلی دینے لگا۔ صولت نے تھک کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی۔ اگلے دو منٹ بعد ماہی اور مہر دروازے سے باہر آتی دکھائی دیں۔

"السلام علیکم!" گاڑی میں بیٹھتے ہی مہر نے سلام کیا۔ صولت اور سیماب نے جواب دیا۔ سیماب لب بھینچے ڈرائیو کرنے لگا۔ ماہی' صولت اور مہر کا اب باقاعدہ تعارف کروا رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے پہلی مرتبہ مل رہی تھیں' مگر غائبانہ طور پر وہ ایک دوسرے کے بارے میں کافی کچھ جانتی تھیں صولت اور وہ ہلکی پھلکی گفتگو کرنے لگیں۔ ماہی بھی کوئی نہ

کوئی لقمہ دے رہی تھی۔ اسے اس بات پر حیران ہو رہی تھی کہ سیماب کیوں خاموش ہو گیا تھا۔ اس نے سلام کا جواب دینے کے بعد ایک بار بھی زبان نہیں کھولی تھی۔ بیس منٹ بعد ہی وہ ایکسپو کے سامنے تھے۔ سیماب، صولت اور مہر آگے چل رہی تھیں، جب اس نے رک کر سیماب کو پکارا۔ سیماب نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"پرابلم کیا ہے؟ پہلے صولت آپا خاموش تھیں اور اب اچانک سے تم خاموش ہو گئے۔ کچھ ہوا ہے کیا؟" وہ کھوجتی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ "تم نے ہی تو مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہاری فرینڈ کے سامنے اپنی چونچ بند رکھوں تو میں نے تمہارے حکم پر ہی سر جھکا دیا تھا اور چپ بیٹھا رہا تھا۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"وہ... اچھا... میری دوست کے سامنے سنجیدہ بننے کا ڈراما اس لیے کیا جا رہا تھا کہ وہ تم سے امپریس ہو جائے... ہے نا...؟" وہ بہت دور کی کوڑی لائی تھی۔

"مجھے کسی کو امپریس کرنے کے لیے ڈرامے کرنے کی ضرورت نہیں۔ مابدولت ہیں ہی اتنے ہینڈسم کہ کوئی بھی لڑکی صرف ایک نظر میں ہی امپریس ہو جائے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی اندر لے گئی۔ کسی کی دو گہری آنکھوں نے یہ منظر بہت غور سے دیکھا تھا

☼ ☼ ☼

وہ اپنے کمرے میں تنہا تھے۔ عافیہ پڑوس میں گئی ہوئی تھیں اور انہوں نے پہلی دفعہ ان کی غیر موجودگی پر شکر ادا کیا تھا۔ شاہ نواز کی اچانک آمد نے ان کے دل اور دماغ جھنجوڑ ڈالے تھے۔ انہیں نہ جانے کیوں لگ رہا تھا کہ تاریخ دہرائی جائے گی اور انہیں تاریخ کے دہرائے جانے سے ہی خوف محسوس ہوتا تھا۔ بے چینی نے کچھ اس سرعت سے ان کے وجود کو گھیرا کہ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ شاہ نواز کے ایک فون نے ان کی نیندیں اڑا کر رکھ دی تھیں۔ ابھی بھی وہ اسی بارے میں سوچ رہے تھے۔ ان کے موبائل کی بپ نے ان کا ارتکاز توڑا تھا۔ موبائل کی چمکتی اسکرین پر دکھائی دیتا نمبر ان کی دھڑکنیں بڑھا گیا۔ انہیں پھر سے شاہ نواز احمد فون کر رہا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی کال ریسیو کرنے پر مجبور تھے۔

"ہیلو..." ان کا لہجہ فوراً" سخت ہو گیا تھا۔

"کیسے ہو سالے صاحب..." شاہ نواز کا چہکتا لہجہ ان کے دل پر برچھی چلا گیا تھا۔ ان کی رگوں میں دوڑتا خون کا دوران یک دم تیز ہوا تھا۔ شاہ نواز کے اس ایک جملے نے ان کے زخموں کے کھرنڈ ادھیڑ کر رکھ دیے تھے۔

"مجھے پھر سے کیوں فون کیا ہے تم نے؟" وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولے۔

"سنا ہے تمہارا بیٹا عالی شان پاکستان واپس آگیا ہے، بمعہ بیوی اور بچی کے ساتھ۔ اپنے سب سے بڑے اور لاڈلے بیٹے کی نافرمانی اور سرکشی دیکھ کر تو دکھ بہت ہوا ہو گا تمہیں بھی اور عافیہ بھرجائی کو بھی..." اس کے لہجے میں تمسخر بھرا تھا۔

"میں نے دیکھا تمہاری پوتی کافی خوب صورت ہے۔ مجھے میری مرحومہ بیوی کی چھاپ بھی دکھائی دی اس میں..." شاہ نواز کے لفظوں کے تیر انہیں بری طرح گھائل کر رہے تھے۔

"بکواس بند کرو اپنی۔" وہ اپنا ضبط کھو کر بری طرح چلائے تھے۔ اسی وقت عافیہ کمرے میں داخل ہوئی تھیں اور حیران کھڑی رہ گئیں۔ آفاق احمد کی پشت دروازے کی طرف تھی، وہ ان کی آمد محسوس کر ہی نہ پائے۔

"خبردار... خبردار جو میرے بیٹے اور بہو کے قریب بھی بھٹکے تم۔ جان لے لوں گا میں تمہاری۔" وہ غیض و غضب سے بولے تھے۔ عافیہ وہیں دل تھام کر رہ گئیں۔

"ایک بات تو تم یاد رکھو شاہ نواز... تم کوئی بھی حربہ کیوں نہ استعمال کر لو۔ کتنی ہی درندگی کیوں نہ دکھا دو۔ نہ تمہیں ماہی ملے گی اور نہ ہی ماہی کی جائیداد، یہ بات

اپنے دماغ میں اچھی طرح بٹھالو اور جو کچھ تمہارے پاس ہے اسی پر قناعت کرو تو بہتر ہے۔" انہوں نے غصے سے کہتے ہوئے اس کی مزید کوئی بات سنے بغیر فون بند کردیا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں گرالیا۔

"آفاق۔۔۔" عافیہ بیگم کے لبوں سے بمشکل ان کا نام ادا ہوا تھا اور پھر وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔ انہیں کمرے میں موجود پاکر آفاق صاحب حواس باختہ ہوگئے تھے اور تیزی سے ان کی طرف دوڑے تھے۔

"عافیہ تم ٹھیک تو ہو نا؟" ان کی زرد رنگت دیکھ کر وہ گھبرا کر بولے۔ پھر انہیں سہارا دے کر بیڈ پر لائے اور پانی پلایا۔ ان کے چہرے کی متغیر رنگت بتا رہی تھی کہ وہ سب سن چکی ہیں۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے آفاق؟ آپ نے تو کہا تھا کہ شاہ نواز کو عمر قید کی سزا ملی ہے۔ وہ باہر نہیں آسکتا۔ پھر وہ۔۔۔ وہ جیل سے رہا کیسے ہو گیا؟ ماہی۔۔۔ ہماری ماہی کا کیا ہو گا؟" وہ بہت بری طرح خوف زدہ اور پریشان ہو گئی تھیں۔ آفاق صاحب کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ انہیں کس طرح تسلی دیں۔ وہ ان کے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے تھامے ان پر سر لگائے رو رہی تھیں۔

"عافیہ۔۔۔ رونے مت اور تسلی سے میری بات سنو۔" انہوں نے ان کا چہرہ اونچا کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں خدا پر بھروسا ہے نا؟" ان کے نرم لہجے پر پوچھنے پر انہوں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"تو وہی خدا شاہ نواز جیسے درندے کو اس کے انجام تک پہنچائے گا اور ایک بات یاد رکھو شاہ نواز، ماہی کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔ وہ خدا کی حفاظت میں ہے اور جسے اللہ محفوظ رکھے اس پر کوئی بری نگاہ بھی نہیں ڈال سکتا اور ایک بات کا خاص خیال رکھنا۔ تمہارے کسی بھی قسم کے رویے سے ماہی کو اندازہ نہیں ہونا چاہیے کہ کچھ ہوا ہے۔ شاہ نواز کی آمد کے بارے میں اسے کسی طور علم نہیں ہونا چاہیے۔ وہ بہت مشکل سے نارمل ہوئی ہے۔ اگر اسے علم ہو گیا تو اس کی حالت پھر سے بگڑ جائے گی اور میں ماہی کو اس پرانی حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔" وہ دکھی لہجے میں بولے۔ وہ ایام یاد کرتے ان کا دل دکھ اور تکلیف سے بھر گیا۔ عافیہ بیگم نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"عالی شان کا ہم سے دور رہنا ٹھیک نہیں۔ عالی شان مرد ہے، سارا دن گھر پر بیٹھ کر تو نہیں گزارے گا۔ گھر میں بیوی، بچی اکیلی، کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے اور دوسری بات وہ دور رہے گا تو ہر دم پریشانی رہے گی۔ میں ابھی عالی شان کو فون کرتا ہوں۔ تم بھی اپنا دل اس کی طرف سے صاف کرنے کی کوشش کرو۔ آج نہیں تو کل اسے معاف کرو گی ہی۔ سو ابھی سے گنجائش پیدا کرنے کی کوشش کرو۔" وہ ان کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے بولے۔ وہ سر جھکا گئیں۔

☆ ☆ ☆

"تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے گھر میں معجزہ ہو گیا بلکہ معجزات ہو رہے ہیں۔" وہ سنسنی خیز لہجے میں بولی۔ مہر نے کتاب میں سے سر نکال کر اسے دیکھا۔ وہ دونوں کالج کے گراؤنڈ میں بیٹھی تھیں۔

"کیسے معجزات؟" وہ حیران سی پوچھنے لگی۔

"پہلا معجزہ یہ ہے کہ ماہی نے اچانک ہی عالی شان بھائی کو معاف کردیا اور انہیں نہ صرف گھر میں بلکہ دل میں بھی جگہ دے دی ہے اور کل وہ اپنی بیگم اور ننھی پری کے ساتھ ہمارے گھر آئیں گے بلکہ اپنے گھر آئیں گے۔" وہ چہکتے ہوئے بولی۔

"بہت مبارک ہو تمہیں۔۔۔ میں نے کہا تھا نا کہ تمہاری ماہی جلد ہی انہیں معاف کردیں گی۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"دوسرا معجزہ تو پہلے معجزے سے بھی بڑا ہے یار۔۔۔ تم پہلے یہ دیکھو۔" اس نے جلدی سے سیاہ بیگ میں سے جرنل نکالا اور اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔

"واقعی معجزہ ہی ہے تم جیسی نکمی لڑکی نے پورا جرنل بنالیا، وہ بھی دو دن کے اندر، واہ بھئی۔۔۔" وہ صفحے پلٹتے ہوئے حیران سے بولی۔ ماہی نے منہ بنالیا۔

"جرنل میں نے نہیں بلکہ سیماب نے بنا کر دیا ہے۔ یہ ساری کی ساری ڈائیگرام اسی کے ہاتھوں ان

صفحوں پر منتقل ہوئی ہیں۔" وہ جرنل کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"ہائیں... یہ کایا پلٹ کیسے؟" وہ جی بھر کر حیران ہوئی تھی۔ ماہی کی زبانی تو اسے سیماب کے کارناموں کا علم ہوتا رہتا تھا مگر اس روز صولت نے بھی سیماب کے کارناموں کی تفصیل اسے سنائی تھی۔ وہ ماہی کے اکثر کام جان بوجھ کر بگاڑ دیا کرتا تھا اور پھر صولت ہی انہیں درست کرتی اور ہلکان ہوتی رہتیں۔ سیماب تخریبی کارروائیوں کو بھول کر اتنا ٹھیک کام کیسے کر سکتا ہے؟

"حیران ہوئیں نا؟ میں بھی حیران ہوں کہ اچانک ایک ہفتے کے اندر وہ اتنا کیسے سدھر گیا۔ اب تو وہ میرے حصے کی چیزوں پر بھی ہاتھ صاف نہیں کرتا اور نہ ہی مجھے تنگ کرتا ہے' بلکہ اگر میں کہوں کہ کوئی کام کر دو تو بلا چوں چراں میرا کام کر دیتا ہے' وہ بھی بغیر کسی انعام کے۔" وہ حیران سی بول رہی تھی۔ مہر ابھی اس پر کوئی تبصرہ کرتی کہ بیل کی آواز پر وہ دونوں بات ادھوری چھوڑ کر سامان سمیٹتی کلاس روم میں بڑھ گئیں۔

☆ ☆ ☆

موسم بدل رہا تھا۔ چاروں طرف خوشگواریت سی چھائی ہوئی تھی۔ اسی لیے مہر نے سوچا کہ چائے لان میں پی جائے' ملازمہ کو چائے لان میں لانے کا کہہ کر وہ عائشہ بیگم کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اپنے کمرے میں اپنے بستر پر بیٹھی تھیں۔ ان کے اردگرد پرانی تصاویر بکھری تھیں۔ ان کے چہرے پر ملال کے رنگ واضح تھے۔ عائشہ بیگم بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ خوشیوں کی چند ساعتیں ہی انہیں نصیب ہوئی تھیں اور بس... اس کے بعد ان کی زندگی نے بھی سفید رنگ اوڑھ لیا تھا اور مہر کی پرورش میں خود کو گم کر لیا۔ ان کی یادیں دل سے لگائے وہ مہر کو پالتی رہیں۔ اس کام میں شاہ دل نے ان کی بہت مدد کی۔ مہر اپنی ماں کی اعلا ظرفی اور شاہ دل کی محبت کی معترف تھی۔ اس نے عائشہ بیگم کا افسردہ چہرہ دیکھا۔

"ممّا..." اس نے انہیں پکارا۔ وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگیں۔

"آج موسم کافی خوشگوار ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ آج لان میں ہی چائے پیتے ہیں۔ میں آپ کو اسی لیے بلانے آئی تھی۔" وہ کھڑی کھڑی انہیں بتانے لگی۔ عائشہ بیگم تصاویر سمیٹنے لگیں۔

"تم چلو... میں آتی ہوں۔" وہ بستر سے اٹھ گئیں تو وہ سرہلاتی باہر نکل آئی۔ عائشہ بیگم نے الماری کھول کر البم اندر رکھا اور پھر لاک لگا کر چابی سائیڈ ٹیبل کی دراز میں ڈال دی۔ اس وقت ان کا دل کس بھنور میں ڈوب ابھر رہا ہے۔ یہ وہی جانتی تھیں' آج شاہ دل کا فون آیا تھا اور اس کا فون آنے کے بعد سے ان کی یہی حالت تھی۔ تنہائی کا ایسا عالم تھا کہ وہ خود سے بھی کچھ کہنے سے قاصر ہو گئی تھیں۔ انہوں نے ایک نگاہ آئینے پر ڈالی۔ دیوار پر لگی تصویر آئینے میں دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس تصویر کو دیکھنے لگیں' دو آنسو ٹوٹ کر ان کے گالوں پر پھسلے تھے۔ انہوں نے اپنے آنسو صاف کیے اور گہری سانس بھر کر خود کو نارمل کیا اور پھر کمرے سے باہر آ گئیں۔ وہ لان میں آئیں تو مہر کو موبائل کے ساتھ مصروف پایا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ ماں کو آتا دیکھ کر بھی اس کی انگلیاں چلتی رہیں۔

"ماہی سے بات کر رہی ہو؟" وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"جی ممی... عالی شان بھائی آ چکے ہیں نا تو خوب رونق لگی ہے گھر میں۔ بس وہی باتیں ہو رہی ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔ عائشہ بیگم چائے پینے لگیں۔ کچھ دیر بعد اس نے سیل ٹیبل پر رکھ دیا۔ "ممی..." چائے کا کپ ہاتھ میں تھامے وہ انہیں پکار بیٹھی۔ "بولو..." وہ اس کی جانب متوجہ ہوئیں۔

"ممی... ہمارا گھر کتنا بڑا ہے' پر آسائش ہے مگر پھر بھی سکون نہیں۔ ایک عجیب سی خاموشی اور وحشت ہے۔ آج کل میرا دل بہت گھبراتا ہے۔" وہ افسردہ سی ہو کر بولی۔

"ماہی بہت خوش قسمت ہے۔ ان کے چھوٹے

سے گھر میں کتنے سارے لوگ رہتے ہیں۔ گھر میں ہر وقت ان کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔ ہنسی، قہقہے، شرارتیں اور ایک ہمارا گھر۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

"ممی۔۔۔ ماہی ہر وقت اپنے گھر کے لوگوں کی باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس کے پاس اتنی باتیں ہوتی ہیں کہ بس۔۔۔ اور ان باتوں میں بھری محبت۔۔۔ اور جب میری باری آئے بولنے کی تو میرے پاس کچھ ہوتا ہی نہیں جتانے کو۔" مہر کچھ زیادہ ہی حساس ہو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اسے سنتی رہیں۔

"ماہی خوش قسمت ہے تو کیا تم بدقسمت ہو؟" وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بولیں۔

"میں نے تو ایسا نہیں کہا۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ ہمارے گھر کا ماحول بھی تو اتنا خوشگواریت اور خوب صورت ہو سکتا ہے نا۔ اب دیکھیں نا ان کے گھر میں ننھی گڑیا بھی ہے۔ ماہی ہر وقت اس کے ساتھ کھیلتی رہتی ہے۔ اگر چاچو کی شادی ہو جاتی تو اس گھر کی تنہائی بھی کم ہوتی۔ چاچو کے بچوں کے ساتھ میں کھیلتی۔ وہ میرے دوست ہوتے اور آپ کو بھی چچی کی وجہ سے دوسراہٹ کا احساس رہتا۔ کتنا مزہ آتا یہاں لان میں، ہر وقت ہنگامہ ہو رہا ہوتا۔" اس کے لہجے میں حسرت ہی حسرت تھی۔

"شاہ دل مانتا ہی نہیں تو میں کیا کروں؟" وہ بے بسی سے بولیں۔ وہ خود اکتا چکی تھیں گھر کے کاٹ کھانے والے ماحول سے۔

"آپ کی ہر بات مانتے ہیں وہ۔ یہ بات بھی کسی طرح منوا لیں۔" وہ ان کا ہاتھ تھام کر بولی۔

"وہ کب تک یوں بھاگتے رہیں گے؟ شادی نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔ تیس سال کے ہو چکے ہیں وہ۔ ایک دو سال کے بعد تو لوگ اپنی بیٹی دیتے ہوئے بھی اعتراض کریں گے۔ آپ کو تو آج کل کی لڑکیوں کا پتا ہے۔ عمروں کا فرق ان کے لیے بہت معنی رکھتا ہے۔ میری مانیں تو آپ لڑکی ڈھونڈنا شروع کر دیں۔" وہ انہیں ڈرانے لگی۔ وہ گہری سوچ میں گم ہو گئیں۔

"ممی۔۔۔ لڑکی ڈھونڈنے کی بھی کیا ضرورت ہے؟ اپنی صولت آپا ہیں نا۔ ہمارے گھر کے لیے وہ بہترین ہوں گی۔ یقین مانیے ممی۔۔۔ وہ بہت اچھی ہیں۔ ان کی تصویریں تو آپ دیکھ چکی ہیں۔ ایک بار میرے ساتھ ان کے گھر چلیں اور مل آئیں۔ ان کی پوری فیملی بہت نائس ہے۔" اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ ابھی اسی وقت دونوں کا نکاح پڑھا دے۔ اس کی جلد بازی پر وہ ہنس پڑیں۔

"شاہ دل سے تو پوچھنے دو۔۔۔" وہ بولیں۔ "ممی آپ ان کی ہاں کے چکر میں صولت آپا کو گنوا دیں گی اور چاچو سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اتنے عرصے سے ان کی ہاں کے چکر میں ان کی شادی نہیں کی اور عمر یہاں تک پہنچ گئی۔ آپ وہاں سے مطمئن ہو کر چاچو سے بات کیجیے گا اور کہہ دیجیے گا کہ آپ نے ہاں بھی کر دی اور آپ کی خاطر وہ چوں چراں بھی نہیں کریں گے۔" وہ سب کچھ پلان کر کے بیٹھی تھی۔ اس کی بات ان کے دل کو لگی۔ اگر وہ شاہ دل پر زبردستی کرتیں تو یقیناً" وہ اپنا انکار واپس لے لیتا مگر انہوں نے اس کی مرضی کو ملحوظ خاطر رکھا تھا اور اسی چکر میں اس کی عمر تیس ہو چکی تھی اور آج بھی وہ انکاری تھا۔ وجہ کچھ نہیں تھی۔ بس اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔ مہر نے انہیں جو تجویز دی تھی اس پر وہ سنجیدگی سے عمل کرنے کا سوچ رہی تھیں۔

"تم ایک کام کرو، ایک دو دن میں ماہی کے گھر جاؤ اور اس سے اطمینان کے لیے پوچھ لو کہ کہیں صولت کا رشتہ طے تو نہیں ہو گیا اور وجہ بھی بتا دو، تاکہ وہ گھر میں بتا دے اور ان کی اجازت سے میں باقاعدہ رشتہ لے کر جاؤں۔" وہ بولیں۔

"مجھے نہیں لگتا کہ صولت آپا کا رشتہ کہیں طے ہوا ہے، اگر ایسا ہوتا تو وہ ذکر تو ضرور کرتی۔ پھر بھی میں کنفرم کر لوں گی اور ان کی بھابھی سے بھی مل لوں گی۔" وہ مسکرا کر بولی۔

✿ ✿ ✿

وہ بے حد انہماک سے ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھی۔ اسی لیے اپنے کمرے میں داخل ہوتی مہر کو نہ دیکھ سکی۔ مہر دبے قدموں اس تک آئی تھی اور اس نے بھاری آواز نکال کر ہاؤ کیا۔ ماہی بری طرح اچھلی اور منہ سے چیخ بھی برآمد کی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اپنے سامنے کھڑی مہر کو دیکھ کر اسے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

"زہے نصیب۔۔۔ آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہیں۔" وہ کھڑی ہو چکی تھی اور اب اس کے گلے لگ رہی تھی۔

"تو یہ کمرہ ہے تمہارا؟" وہ دلچسپی سے کمرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"صرف میرا نہیں صولت آپا کا بھی یہی کمرہ ہے۔" اس نے مہر کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"اسی لیے تو اتنی اچھی حالت میں ہے۔ اگر صرف تمہارا کمرہ ہوتا تو کمرہ کم از کباڑ خانہ زیادہ لگتا۔" وہ اسے چھیڑتے ہوئے بولی تو ماہی نے اسے گھور کر دیکھا۔

"تم بھی طنز کرنا سیکھ گئیں؟" وہ مصنوعی خفگی سے بولی تو مہر مسکرا دی اور کمرے پر نظر دوڑانے لگی۔

"چلو آؤ میں تمہیں اپنا گھر دکھاتی ہوں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی اور کمرے سے باہر لے آئی۔ راستے میں ہی سیماب کا سامنا ہو گیا۔ رسمی سلام دعا کے دوران مہر نے محسوس کیا کہ وہ بہت گہری نگاہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پھر دوبارہ نگاہ اٹھا کر بات نہیں کی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ سیماب مسکراتا ہوا چلا گیا۔ پورا گھر گھما کر ماہی اسے چھت پر لے آئی جہاں تازہ ہوا اٹھلاتی پھر رہی تھی۔ مہر نے اپنے بال سمیٹنے کی کوشش کی جو ہوا کی وجہ سے اڑتے پھر رہے تھے۔ ماہی تو اپنے بال ہمیشہ پونی میں قید کر کے رکھتی تھی۔ اس لیے اب اطمینان سے کھڑی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ آسمان پر پرندوں کے غول کے غول اڑتے پھر رہے تھے۔ یقیناً" تھکے ہارے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

"کتنی ٹھنڈی ہوا ہے نا۔" وہ ہوا کی نرمی محسوس کرتے ہوئے بولی ماہی نے ... گھبراہٹ میں سر ہلایا۔

"مہر چلو نیچے چلتے ہیں۔ چائے تیار ہو گئی ہوگی۔" وہ کچھ دیر بعد مہر سے مخاطب ہوئی۔ "مجھے کچھ دیر یہیں رکنا ہے۔ بہت سکون ہے یہاں۔" وہ آنکھیں بند کر کے جذب سے بولی' ماہی اس کے انداز پر ہنس پڑی۔

"ٹھیک ہے میں چائے اوپر منگوا لیتی ہوں' تم تب تک ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کو انجوائے کرو۔" وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی اور نیچے اتر آئی۔ عائشہ بیگم کے کہنے پر آج وہ ماہی سے نہ صرف ملنے آئی تھی بلکہ ساتھ ہی یہ کنفرم بھی کرنے آئی تھی صولت کا کہیں رشتہ طے تو نہیں؟ مگر اسے یہ بات کہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جیسے ہی ماہی آئے گی وہ سب سے پہلے اس سے یہی بات کرے گی۔ آہٹ محسوس کر کے اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"ماہی۔۔۔ مجھے تم سے کچھ۔۔۔" وہ بولتے بولتے پلٹی تھی اور اس کے منہ کو بریک لگ گیا۔ سامنے سیماب کھڑا تھا۔

"آپ یہاں۔۔۔؟" وہ حیران ہو کر بولی۔ سیماب کی بے تاب نگاہیں اس کا چہرہ چھو رہی تھیں۔ تیز ہوا سے مہر کے بال اڑ رہے تھے۔ وہ چہرے پر سے بال ہٹانے لگی۔ سیماب کی نگاہوں نے اسے کنفیوژ کر دیا تھا۔

"میرے گھر پر میری ہی موجودگی آپ کو حیران کر رہی ہے حیرت ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"نہیں۔۔۔ میرا یہ تو مطلب نہیں تھا؟" وہ بے چاری گھبرا گئی تھی۔

"تو پھر کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ اس کی گھبراہٹ سے حظ اٹھانے لگا۔ آنکھوں میں شرارت سی تھی' "مجھے لگا کہ ماہی آئی ہے۔"

"اور ماہی کی جگہ آپ مجھے یہاں دیکھ کر۔۔۔"

"میں چلتی ہوں۔۔۔ ماہی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔" وہ جلدی سے بولی اور اس کے قریب سے گزرنے لگی۔

"ہو سکتا ہے ماہی کے علاوہ بھی کسی نے آپ کا انتظار کیا ہو۔ کبھی جاننے کی کوشش تو کیجیے۔" سیماب

کے گمبھیر لہجے میں کہا گیا جملہ اس کی سماعتوں میں اترا تو وہ ٹھہری سی گئی۔ وہ اس پر گہری نگاہ ڈال کر چلا گیا۔ وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ حیرت نے اس کے قدم منجمد کر دیے تھے۔ ماہی کب آئی اسے پتا نہ چلا۔

"ارے کیا ہوا؟" ماہی نے اس کا شانہ ہلا کر اسے متوجہ کیا۔ وہ ہڑبڑا گئی۔ ماہی اس کی کیفیت پر حیران تھی۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" ماہی نے اس کا گال چھو کر کہا تو وہ زبردستی مسکرائی۔ دماغ میں گونجتی آواز کو اس نے نظر انداز کیا اور ماہی کی طرف متوجہ ہوئی۔

"نہیں بالکل ٹھیک ہوں۔ لے آئیں چائے۔" وہ ملازمہ کو سامان رکھتے دیکھ کر بولی۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ نارنجی اور ملگجا سا آسمان عجیب ہی کیفیت باندھ رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں زمین کو بوسا دیتے الوداع کہہ رہی تھیں۔ صولت اور ماہی کے ساتھ کریشمنا بھی اوپر آگئی۔ تعارف کے بعد اب باقاعدہ گفتگو ہو رہی تھی۔ ساتھ ساتھ چائے اور دیگر لوازمات سے بھی لطف اٹھایا جا رہا تھا۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ گھر آگئی۔ جس مقصد کے لیے وہ آئی تھی وہ تو پوچھ ہی نہ پائی۔ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں وہ یہ بات نہیں پوچھ پائی تھی۔

وہ جس وقت گھر پہنچی عائشہ بیگم کچن میں مصروف تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ لباس تبدیل کر کے وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ سیماب کی باتیں اس کے دل و دماغ سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ پہلی ملاقات میں تو شاید سیماب نے اسے ایک نظر ہی دیکھا تھا اور آج اس سے اس کی دوسری ملاقات ہوئی تھی۔ ایک سرسری ملاقات نے کیا واقعی اس پر اتنا گہرا اثر چھوڑا کہ سیماب کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے؟ وہ حیران تھی اور پریشان بھی۔

☆ ☆ ☆

"ماہی مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" سیماب کے سنجیدہ مگر گھبرائے لہجے پر اس نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ سیماب کے چہرے پر بے چارگی اور مسکنیت طاری تھی۔ اسے اپنے کمرے میں آتا دیکھ کر وہ یہی سمجھی تھی کہ ضرور ہی وہ اس سے کوئی شرارت کرنے کے موڈ میں ہوگا مگر اس کا یوں بولنا اسے چونکا گیا۔ سیماب اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"ہاں ہاں بولو۔ میں سن رہی ہوں۔" وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بولی کہ کہیں اس کا کوئی نیا ڈرامانہ ہو۔

"وہ۔ وہ تمہاری دوست ہے نا مہر۔" اس کے منہ سے مہر کا نام سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

"ہاں۔ وہ میری دوست ہے۔ کیوں، تمہیں کوئی تکلیف؟" وہ تیکھے تیور لیے اسے گھور رہی تھی۔ سیماب ان لڑکوں میں آتا تھا جو صف نازک کی طرف ذرا کم ہی متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کے منہ سے مہر کا نام سن کر وہ الرٹ ہو گئی تھی اور کچھ روز پہلے مہر کی تصاویر تاڑتے بھی وہ اسے پکڑ چکی تھی۔

"کبھی کسی بات کا جواب ڈھنگ سے بھی دے دیا کرو۔" وہ جھنجلا کر بولا۔

"کیا ہوا مہر کو۔۔۔؟" اب کی بار ذرا وہ سیدھی ہوئی۔

"اسے تو کچھ نہیں ہوا۔ مگر لگتا ہے مجھے ضرور ہی کچھ ہو گیا ہے۔" وہ اداسی سے بولا۔ اس کے انداز اور جملوں نے ماہی کی آنکھیں باہر نکال دیں۔

"کیا مطلب؟ صاف صاف بولو۔" اس کے اندر کھدبد شروع ہو گئی تھی۔

"ماہی پلیز ہیلپ می۔۔۔ ورنہ تمہارا اکلوتا بھیلا مر جائے گا۔" وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر جذباتی لہجے میں بولا، ماہی نے ہاتھ چھڑائے۔

"تم پہلے بتاؤ تو ہوا کیا؟" وہ بے چینی سے بولی۔

"مجھے تمہاری دوست مہر سے محبت ہو گئی ہے۔ میری راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں۔ دن کا قرار لٹ گیا ہے اور میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" سیماب نے آنکھیں بند کر کے ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ ڈالی۔

"کیا۔۔۔" وہ چیخی۔۔۔ سیماب نے آنکھیں کھول دیں۔

"تم سچ کہہ رہے ہو؟" وہ بے یقین تھی۔ اس نے ہاں میں سر ہلایا۔

"وہ تو اس لیے... موصوف میرا اسپل چوری کر کے تصویریں تاڑا کرتے تھے اور جو اتنے دن سے آپ مجھے کالج چھوڑنے اور لے جانے کا کام انجام دے رہے ہیں اس کے پیچھے آپ کی یہ نیت چھپی ہوئی تھی۔" اس نے سیماب کا کان مروڑا۔ سیماب نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس نے ماہی کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔

"تم پلیز میرا ایک کام کرو۔" وہ اس کی گھورتی نظروں کے جواب میں منت بھرے لہجے میں بولا۔

"ہرگز نہیں... میں کوئی بھی فضول کام نہیں کروں گی۔ اگر تم میرے کزن ہو تو وہ بھی میری دوست ہے۔ میں اس سے ایسی کوئی بھی فضول بات نہیں کرنے والی۔" اس نے تبدک کر کہا۔

"ماہی... پہلے پوری بات تو سن لیا کرو۔" وہ اس کے انداز پر جھنجلا گیا۔ ماہی نے منہ بنا کر اسے دیکھا۔

"ماہی... میں چاہتا ہوں کہ تم صرف مہر سے اتنا جاننے کی کوشش کرو کہ وہ کہیں اور کمیٹڈ تو نہیں۔ اگر ایسا کچھ نہیں تو پھر تم امی اور صولت آپا سے بات کرو، تاکہ وہ مہر کے گھر جلد سے جلد رشتہ لے کر جائیں۔" وہ سنجیدہ مگر بے تابانہ لہجے میں بولا۔

"سیماب... میری دوست ہرگز ایسی نہیں کہ شادی سے پہلے کسی اور سے محبت کرے۔" وہ بولی تو اس کا دل چاہا اس کے چھوٹے دماغ پر تھپڑ لگائے۔

"حد ہے بھئی... میں نے تو صرف اطمینان کے لیے کہا تھا اور دوسری بات کہ کیا صرف ایسے ویسے لوگ ہی شادی سے پہلے محبت کرتے ہیں؟" وہ اس کے سر پر چپت لگا کر بولا۔

"میری نظر سے دیکھو تو شادی سے پہلے محبت کرنے والے لوگ تمہیں ایسے ویسے ہی لگیں گے۔" وہ شرارت سے بولی۔

"ویسے میں بہت خوش ہوں، پہلی مرتبہ تم نے عقل مندی کا کام کیا ہے۔ ایک ایسی لڑکی سے محبت کی جو واقعی چاہے جانے کے قابل ہے۔" وہ بہت خوش لگ رہی تھی۔ سیماب مسکرا گیا۔

☆ ☆ ☆

"مہر... تم سے ایک بات پوچھوں؟" یہ بریک ٹائم تھا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ماہی نے اس سے بات کرنے کا سوچا۔

"ہاں پوچھو..." وہ اپنا چہرہ اس کی جانب موڑتے ہوئے بولی۔ "تم نے کسی سے محبت کی ہے؟" ماہی کے سوال پر مہر جوس کے گھونٹ بھر رہی تھی اسے کھانسی لگ گئی۔ "خیریت نا بی بی... آج تمہیں محبت کیسے یاد آ گئی؟" وہ آنکھوں سے بہتا پانی صاف کرتے ہوئے بولی۔ ماہی کو اس طرح کی گفتگو میں ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اسی لیے اس کے اس سوال پر مہر کا حیران ہونا لازمی تھا۔

"بس آ گئی یاد، تم بتاؤ۔ کبھی محبت ہوئی کسی سے؟" وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"کوئی دل کو بھایا؟" اس کے اگلے سوال پر یکایک دماغ کی اسکرین پر ایک تصویر روشن ہوئی تھی۔ مہر بری طرح ہڑبڑا گئی اور شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

"ایگزامز قریب آنے والے ہیں اور ایسے دنوں میں اچانک سے تم محبت محبت کیوں کرنے لگیں۔" وہ خود کو نارمل کرتے ہوئے بولی۔ "کہیں تمہیں بھی تو کسی سے..." مہر نے اسے چھیڑتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ماہی کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدلا تھا۔

"مجھے اپنی فیملی سے بے حد محبت ہے، اس کے علاوہ کسی اور سے محبت کرنا میرے بس میں نہیں۔" اس کے سرد لہجے پر وہ چونک گئی تھی۔

"کیا مطلب ماہی؟" اس کے لہجے کے غیر معمولی پن پر مہر حیران ہو گئی تھی۔

"کوئی مطلب نہیں۔ میری بے سروپا باتوں کے معنی ڈھونڈنے لگو گی تو پاگل ہو جاؤ گی اور میں نہیں چاہتی کہ میری بے حد پیاری اور اکلوتی دوست پاگل کہلائے۔" اس نے شرارت سے کہا۔ مہر ہنس دی۔

"ماہی یاد آیا... مجھے تم سے ضروری بات پوچھنی تھی۔ صولت آپا کا رشتہ تو کہیں طے نہیں ہے نا؟" اسے اچانک سے یاد آگیا تھا اور اس نے فوراً" پوچھ لیا کہ کہیں پھر سے یہ بات رہ نہ جائے۔

"رشتہ... ارے ان کا تو نکاح ہو چکا ہے۔ دو سال پہلے..." وہ عام سے انداز میں بولی۔ مہر کا منہ بن گیا۔

"اے تمہیں کیوں صدمہ لگ گیا؟" وہ اس کی خاموشی محسوس کر کے بولی۔

"تم نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟" اس نے ماہی کے کندھے پر مکا مارا تھا۔ وہ حقیقتاً" صدمے میں تھی۔ ماہی اس کے اس انداز پر حیران پریشان سی اسے دیکھنے لگی۔

"تمہیں پتا ہے 'تصور ہی تصور میں میں انہیں اپنی چچی جان بنا چکی تھی۔ تم نے تو میرے ارمانوں پر اوس ہی ڈال دی۔" وہ صدمے سے بولی۔

"اب مجھے کیا پتا تھا کہ تم میری آپا پر نظریں گاڑے بیٹھی ہو۔ مجھے خبر ہوتی تو میں تمہیں پہلے ہی آگاہ کر دیتی۔ صولت آپا کا تو کب کا نکاح ہو چکا' چند ماہ میں ان کی رخصتی بھی کر دی جائے گی۔ صولت آپا کا غم نہ مناؤ اور اپنے بڈھے چاچو کے لیے لڑکی تلاش کر لو۔ ورنہ یہ نہ ہو کہ وہ ساری عمر کنوارے بیٹھے رہیں۔" اس نے مہر کو چھیڑا تھا۔ جس پر مہر نے اس کی پونی کھینچی تھی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

☆ ☆ ☆
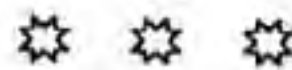
وہ بیڈ کی پشت سے سر ٹکائے گہری سوچ میں گم تھیں۔ آفاق صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو انہیں یوں پریشان بیٹھا دیکھ کر ان کے برابر آبیٹھے۔

"تم کیا سوچ رہی ہو؟" وہ انہیں دیکھتے ہوئے بولے۔ عافیہ ان کی آواز سن کر چونکیں اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

"نہیں... ماہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔" انہوں نے گہری سانس خارج کر کے کہا۔

"ماہی کے بارے میں کیا سوچ رہی تھیں؟"

"یہی کہ شاہ نواز کو جیل سے باہر آئے کافی دن ہو گئے۔ اس نے ماہی سے نہ ملنے کی کوشش کی اور نہ ہی دوبارہ ہمیں پریشان کیا۔ وہ اتنا خاموش اور پرسکون کیوں ہے؟" ان کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات زبان پر آ گئے۔

"حیران تو میں بھی ہوں کہ وہ چپ کیوں ہے؟" وہ بیڈ پر سیدھے ہو کر لیٹتے ہوئے بولے۔

"مجھے تو اس کی خاموشی سے بھی خوف آتا ہے۔ کاش کہ میں سیماب اور ماہی کی شادی کروا سکتی کم از کم..."

"کیا بکواس کر رہی ہو؟ وہ دونوں دودھ شریک بہن بھائی ہیں' کچھ تو خوف خدا کرو۔" وہ یک دم غضب ناک ہو کر بولے۔

"آفاق مجھے دودھ شریک بہن بھائی کے رشتے کی اہمیت کی خبر ہے۔ اگر میں اس وقت سیماب کو فضیلہ کی گود میں نہ ڈالتی تو..."

"جو ہونا تھا ہو چکا... فضیلہ کی ذہنی حالت کو دیکھ کر تم نے اپنی اولاد اسے دی تھی۔ یہ فیصلہ اس وقت کے لحاظ سے بالکل درست تھا۔ اگر تم اس وقت سیماب کو اس کی گود میں نہ ڈالتی تو شاید وہ پاگل ہو جاتی۔" فضیلہ کا بے حال حلیہ' ویران چہرہ ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

"بھلے ہی وہ پاگل ہو جاتی۔ اگر وہ پاگل ہو جاتی تو اس کی موت اتنی اذیت ناک تو نہ ہوتی۔" عافیہ تکلیف سے بولیں۔ انہیں فضیلہ بھولتی ہی نہ تھی۔ اس گھر کا کوئی بھی فرد انہیں بھول ہی نہیں سکتا تھا۔ مگر صرف ماہی کی وجہ سے فضیلہ کا ذکر نہیں کیا جاتا تھا۔ عافیہ اکثر اکیلے میں انہیں یاد کرتی تھیں' پھر ان کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ آج بھی یہی ہوا تھا۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔ آفاق صاحب بھی چپ ہو گئے' نہ جانے کتنے لمحے گزر گئے۔ دروازہ بجنے کی آواز پر وہ دونوں چونکے تھے۔ عافیہ نے تیزی سے اپنے آنسو صاف کیے تھے۔

"آ جاؤ..." آفاق صاحب نے کہا تو دروازہ کھول کر

ماہی اندر داخل ہوئی۔

"میں آجاؤں؟" وہ کمرے میں کھڑی شرارت سے پوچھ رہی تھی' وہ ہنس پڑے۔

"آؤ۔۔۔ آؤ بیٹا۔" وہ خوش دلی سے بولے' تو وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"ماہی۔۔۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ آپ روئی ہیں کیا؟" وہ ان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی بولی۔

"ماموں نے تو آپ کچھ نہیں کہا؟" وہ آفاق صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ارے۔۔۔ ہماری اتنی مجال کہ تمہاری ممانی صاحب کو کچھ کہہ سکیں۔ ان کے سر میں درد ہے۔ بس اسی لیے چہرہ اترا ہوا لگ رہا ہے۔ ابھی دوا کھائی ہے' سو جائیں گی تو ٹھیک ہو جائے گی طبیعت۔" انہوں نے جھوٹ گھڑا۔

"میں آپ کا سر دبا دوں؟"

"ارے نہیں بیٹا اس کی ضرورت نہیں۔ تمہارے ماموں کی تو عادت ہے معمولی باتوں کو بھی ہوا بنا دیتے ہیں۔ آج اتنے دن بعد ہمارے کمرے میں آپ کی آمد کیسے؟" وہ بات بدلتے ہوئے بولیں۔

"یماب کہہ رہا تھا کہ آج راشدہ آنٹی کا فون آیا تھا۔ شادی کی تاریخ کے لیے۔۔۔ مجھے یہ کہنا تھا کہ آپ پلیز شادی کی تاریخ ذرا لیٹ رکھیے گا۔ میرے ایگزامز اگلے مہینے سے شروع ہیں۔ اگر قریب کی تاریخ رکھی تو میں نہ تو انجوائے کر سکوں گی اور نہ ہی پڑھائی ہو پائے گی مجھ سے۔" اس نے مسکین شکل بنا کر کہا۔ وہ مسکرائے۔

"تم مجھے نہ بھی کہتی تو بھی میں تمہارے امتحانات کے ختم ہو جانے کے بعد ہی کی تاریخ دیتا۔ صولت کی بہن بھی تم' سہیلی بھی تم۔ اگر تم ہی انجوائے نہ کر سکو۔ رسموں میں شامل نہ ہو تو یہ تو اچھی بات نہیں نا۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"تھینک یو سو مچ۔۔۔ میں ابھی یماب کو جا کر بتاتی ہوں۔" وہ اچھلتی کودتی کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ اب پھر سے ان کے کمرے میں سناٹا تھا۔

☆ ☆ ☆

"وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اسے کالج میں داخلہ لینا' مہر سے دوستی ہونا کل کی بات لگتی تھی اور اب اس کے امتحانات شروع ہونے کو تھے۔ کالج میں نصاب کی تکمیل کے فوراً" بعد سے ہی ان کے کالج کی چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ مہر اور ماہی دونوں کے دن اور رات پڑھائی میں گزر رہے تھے۔ عافیہ کبھی اس کے لیے دودھ کا گلاس پکڑے اس کے کمرے میں جاتی دکھائی دے رہی ہوتیں' تو کبھی اسے زبردستی بادام کھلا رہی ہوتیں اور کبھی غذائیت سے بھرپور حلوے اس کی خاطر تیار کیے جا رہے ہوتے۔ وہ یہ سب بہت انجوائے بھی کر رہی تھی۔ یماب کو جلانے اور چھیڑنے کا نادر موقع بھی تو اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ عافیہ اسے ماہی کے نام سے بنائی جانے والی کسی بھی چیز کا صفایا نہیں کرنے دے رہی تھیں۔ یماب بے چارہ دل مسوس کر رہ جاتا۔

امتحانات تو سب کے ہوتے تھے مگر جتنی خاطر داری ماہی کی جاتی تھی اور جتنا پروٹوکول اسے ملتا تھا۔ اس گھر کے کسی بچے کو اتنا نہیں ملا تھا۔ عافیہ کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اسے اپنی پلکوں پر بٹھا کر رکھیں۔ سب ہی ان کے جذبات سے آگاہ تھے اور عافیہ کے دل میں موجود ڈر سے بھی وہ سب بخوبی واقف تھے۔ اسی لیے ان کی بے شمار محبتوں اور شدتوں پر بس مسکرایا جاتا تھا۔

"میرے بچے کو نیند آرہی ہے؟" انہوں نے بے حد پیار سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

ان دونوں کے پیپرز بہت اچھے ہوئے تھے۔ آخری پیپر والے دن اس نے ضد کر کے گول گپے اور چاٹ کھائی تھی۔ وہ بھی ٹھیلے پر کھڑے ہو کر۔ مہر اور یماب بھی اس کے ساتھ تھے۔ ان دونوں کو تو کچھ نہیں ہوا' البتہ گھر پہنچتے ہی اس کی طبیعت خراب ہو گئی اور مصیبت یہ کہ صولت کی خالہ ساس اور ان کی فیملی شادی کی تاریخ مانگنے آئے ہوئے تھے۔ وہ کچھ دیر ان کے ساتھ بیٹھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ ابھی اور بیٹھے مگر

پیٹ کی گڑبڑ نے اسے اٹھنے پر مجبور کردیا اور پھر وہ کمرے سے باہر نکل ہی نہ سکی تھی۔ باہر کی چیزوں نے اپنا اثر دکھایا تھا اور وہ بستر پر نڈھال پڑی تھی۔ اس نے سیماب کو ٹیکسٹ کر کے کمرے میں بلایا۔

"کیا ہوا ماہی؟" وہ اندر آیا تو اس کا زرد چہرہ دیکھ کر گھبرا گیا۔

"تم نے کس نیت سے مجھے گول گپے اور چارٹ کھلائی تھی؟ ہضم ہی نہیں ہوئی۔" وہ کراہتے ہوئے بولی۔

"الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ زبردستی یہ چیزیں کھائی ہیں تم نے۔ میں نے منع بھی کیا تھا کہ گرمی کا موسم ہے، تمہارا معدہ کمزور ہے مگر نہیں۔ اب اٹھو اور چلو ڈاکٹر کے پاس۔" وہ ناراض لہجے میں بولا۔

"کیوں مجھے بے موت مروانا چاہتے ہو۔ ماں کو پتا چلا تو میری بہت کلاس لیں گی وہ۔ تم میرے لیے میڈیسن لے آؤ نا۔ باہر مہمان ہیں۔ اگر گھر والوں کو پتا چلا تو وہ مہمانوں کو چھوڑ کر میری خاطرداری میں لگ جائیں گے اور پھر راشدہ آنٹی جل جل کر رہ جائیں گی۔" وہ شرارتی لہجے میں بولی۔ بات تو ٹھیک تھی اس کی سیماب چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں دواؤں کا چھوٹا سا شاپر تھا۔

"اگر ان دواؤں سے آرام نہ آیا تو پھر شرافت سے میرے ساتھ چلنا۔" وہ اسے گولیاں اور پانی پکڑاتے ہوئے بولا۔ اس نے جھٹ اثبات میں سر ہلایا۔

"سیماب... میں سو رہی ہوں۔ تم لائٹ آف کردو۔" وہ بے حد تھکی ہوئی تھی۔ وہ باہر آیا تو ماہی کی غیر موجودگی کا سب نے نوٹس لیا۔

"آج ہی تو اس کے پیپرز ختم ہوئے ہیں۔ بہت تھک گئی تھی وہ، میں نے ہی اسے زبردستی سونے کو کہا۔" وہ نارمل لہجے میں بولا۔

"ماہی اور رات بھر جاگے ناممکن..." راشدہ نے کہا تھا۔

"ماہی نہ صرف رات بھر جاگی ہے بلکہ خوب دل لگا کر پڑھائی بھی کی ہے۔ یقیناً بہترین نمبرز آئیں گے اس کے۔" عافیہ محبت سے بولی تھیں۔ تب ہی صولت نے آکر کہا۔

"میں نے کھانا لگا دیا ہے۔ آپ سب آجائیں۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا، سب اپنی اپنی نشستوں سے اٹھنے لگے۔

☆ ☆ ☆

شادی کی تاریخ کیا طے ہوئی، گھر بھر میں ہنگامے جاگ اٹھے۔ یہ پندرہ دن، دن رات بازاروں کے چکر، سامان کی خریداری میں گزر گئے۔ باقی کے پانچ دن رہ گئے تھے۔ سیماب ہر روز ماہی کے کان کھاتا۔ جس دن شادی کے کارڈز چھپ کر آئے اسی روز ماہی، عافیہ کے پاس آئی۔ "ماں مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔" وہ ان کے پاس آکر سیدھے لہجے میں بولی۔ وہ گھما پھرا کر بات نہیں کرسکتی تھی۔ صاف سیدھے چند لفظوں میں بات بیان کردی۔ عافیہ اسے دیکھ کر مسکرائیں۔

"بولو..." وہ اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولیں۔

"ماں... مجھے یہ کہنا تھا کہ سیماب کی خواہش ہے کہ میری دوست مہر اس کی زندگی میں شامل ہوجائے۔ وہ مہر کی محبت میں مبتلا ہوچکا ہے اور چاہتا ہے کہ آپ جلد از جلد اسے سیماب کے نام کی انگوٹھی پہنادیں۔ پچھلے ایک مہینے سے وہ میرے کان کھا رہا ہے کہ میں آپ سے بات کروں مگر مصروفیت اتنی تھی کہ بات ہو ہی نہیں پائی۔" اس نے اتنی بڑی بات ان سے یوں کہہ دی جیسے وہ موسم کا حال بیان کررہی ہو۔ اس کی بات اتنی غیر متوقع تھی کہ عافیہ بہت دیر تک کچھ بول ہی نہ پائیں۔ ان کی خاموشی نے ماہی کو پریشان کردیا۔

"کیا ہوا ماں؟ آپ کو مہر پسند نہیں کیا؟" وہ ڈرتے دل سے بولی۔

"مہر کو کوئی بے وقوف ہی ناپسند کرے گا۔" وہ مسکرا کر بولیں۔

"پھر آپ اچانک چپ کیوں ہوگئیں؟" وہ ان کی

مسکراہٹ دیکھ کر کچھ پرسکون ہو کر بولی۔
"تم نے بغیر کسی تمہید 'اشارے کے سب کہہ دیا' مجھے حیران تو ہونا ہی تھا۔ میں ایسی کسی بات کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھی۔ مہر بہت اچھی لڑکی ہے۔ سیماب کا بھی آخری سال چل رہا ہے۔ ان کی منگنی کر دینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ تمہارے ماموں سے بات کرتی ہوں۔ مہر کے گھر والے راضی ہو جائیں گے۔ ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں۔" وہ پرسکون لہجے میں بولیں۔ ماہی ہاں میں جواب پا کر اندر تک سرشار ہو گئی تھی۔
"میں ابھی یہ خوش خبری سیماب کو سنا کر آتی ہوں۔" وہ کھلکھلاتی ہوئی کمرے سے باہر بھاگی۔ وہ اس کی معصومیت پر مسکرا اٹھیں۔ لمحے بھر میں ان کی نگاہوں کے سامنے کسی کا چہرہ چمکا تھا۔ وہ بھی تو ایسی ہی تھی' زندگی سے بھرپور' ہاں مگر اس کے دل میں کوئی خوف نہیں ہوا کرتا تھا۔ وہ ہر طرح سے آزاد تھی۔ ان کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

مشاورت کے بعد یہ طے پایا گیا کہ کارڈ دینے کے بہانے مہر کی فیملی سے مل لیا جائے گا اور مزید ایک دو ملاقاتوں کے بعد رشتے کی بات کی جائے گی۔ اگلے ہی دن ماہی نے اسے فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ عافیہ' ماہی اور سیماب کا جانا طے ہوا تھا۔ ماہی تیار ہو کر سیماب کے کمرے میں آگئی۔ وہ اس کی تیاری دیکھتے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اس کی موجودگی میں وہ پانچ بار بال بنا چکا تھا۔ اس کے ہنسنے پر وہ خائف ہو گیا۔
"تم کیوں کھی کھی کر رہی ہو؟" وہ جل کر بولا۔
"تم تو لڑکیوں سے بھی چار ہاتھ آگے ہو۔ یوں تیار ہو رہے ہو جیسے آج تمہارا بر دکھوا ہے۔" وہ اسے چھیڑنے لگی۔
"تو بر دکھوا ہی سمجھو لو۔ میری ہونے والی ساس آج مجھ سے پہلی بار ملاقات کریں گی اور تمہیں تو پتا ہے کہ پہلا امپریشن کس قدر اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔" وہ اس کی پیاری سی ناک دبا کر بولا۔ آخری بار آئینے میں خود کو دیکھا۔ ماہی نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا۔ اندرونی خوشی کے باعث سیماب کا چہرہ دمک رہا تھا۔ دونوں کمرے سے باہر آئے۔ سیماب کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی تھی۔ انداز میں سرشاری۔ عافیہ نے اس کے تیور ملاحظہ کیے تو اپنی مسکراہٹ قابو نہ کر سکیں۔ وہ انہیں دیکھ کر جھینپ گیا۔ ماہی مسلسل اس کے ساتھ چپکی اس کے کان میں بولے جا رہی تھی۔ سیماب عافیہ کی موجودگی کے باعث چپ تھا۔ ورنہ ماہی کا بولنا برداشت نہ کرتا۔ سارا راستہ وہ اس کے ضبط کا امتحان لیتی رہی۔
وہ ان کے گھر پہنچے تو مہر کو اپنا منتظر پایا۔ گلابی رنگ کے لباس میں ملبوس سادہ سا چہرہ لیے وہ گزرتی شام کا حصہ لگ رہی تھی۔ سیماب کی نگاہیں اس پر ٹھہریں سی تھیں۔ وہ ان کے قریب آگئی۔
"السلام علیکم!" اس نے سلام میں پہل کیا۔ عافیہ نے اسے گلے لگا کر پیار کیا۔ سیماب کی موجودگی کے باعث وہ جھینپ گئی تھی۔ مہر کو یوں دیکھتا پا کر ماہی نے اسے زور کا ٹھوکا دیا۔ سیماب نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ اس کی ہمراہی میں وہ اندر آگئے۔
"میں امی کو بلا کر لاتی ہوں۔" وہ انہیں لاؤنج میں بٹھا کر اندر غائب ہو گئی۔ چند ہی منٹ میں عائشہ بیگم بھی آگئیں۔ کافی گرم جوشی سے اور محبت سے ملیں۔ عافیہ کو پہلی نظر میں ہی گھر والے بھا گئے اور عائشہ بیگم کا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا۔ مہر ماں کے برابر چپکی بیٹھی تھی۔ سیماب کی وجہ سے وہ چپ بیٹھی تھی۔ ماہی اسے پریشان دیکھ کر سیماب کی طرف مڑی۔
"بدتمیز انسان..... میری دوست کو ذرا کم گھورو۔ ورنہ میں تمہاری شکایت کروں گی۔ بے چاری کو کنفیوز کر دیا ہے۔" وہ دھیمے مگر غراتے لہجے میں بولی اور ایک بار پھر اس کے بازو پر چٹکی کاٹی' وہ بلبلا گیا۔
"تم آج گھر پہنچو' سارے بدلے لوں گا۔" وہ بھی اسے دھمکانے لگا۔ مہر کی ممانے مہر کو اشارہ کیا تو وہ اٹھ کر چلی گئی۔ ماہی بور ہونے لگی۔ دونوں خواتین نہ جانے کون سی کہانیاں ایک دوسرے کو سنانے میں مگن

تھیں۔ وہ بھی سننے لگی کہ اسے اپنے پیروں پر نرم سا احساس ہوا جیسے ریشم چھو گیا ہو۔ وہ چونک گئی اور اپنے پاؤں دیکھے' جہاں ایک بے حد خوب صورت سفید رنگ کی بلی موجود تھی اور اس کے پاؤں پر اپنا وجود رگڑ رہی تھی۔

"ارے..... اتنی پیاری بلی کس کی ہے؟" اس نے فوراً" ہی جھک کر اسے اٹھایا تھا اور پیار کرنے لگی تھی۔

"یہ ریٹا ہے۔ شاہ دل کی بلی ہے۔" عائشہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔

"یہ تو بہت کیوٹ ہے۔" وہ اس کے ریشم بالوں پر پیار کرتے ہوئے بولی۔ ماہی بلی کے ساتھ مصروف ہوگئی۔ دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگی۔ اسے بلیاں خود بہت پسند تھیں مگر صولت بلیوں سے بہت ڈرتی تھی۔ بلی دیکھتے ہی اس کا سانس رک جاتا۔ ان کی وجہ سے اس نے کبھی بھی بلی پالنے کی ضد نہیں کی۔ اتنی خوب صورت نیلی آنکھوں والی بلی پر اسے بہت پیار آرہا تھا۔ مہر کچن میں مصروف تھی۔

"آنٹی..... میں ذرا لان کی سیر کر آتی ہوں۔" وہ کھڑی ہوگئی۔ عافیہ نے بھی اسے نہ ٹوکا۔ ہماری ماہی کو بلیاں بہت پسند ہیں۔" عافیہ نے اسے باہر جاتا دیکھ کر کہا۔

"ہمارے شاہ دل کو بھی بہت لگاؤ ہے جانوروں سے۔" وہ بھی بتانے لگیں۔ ماہی لان میں آگئی۔ بڑے بڑے پول روشن کردیے گئے تھے۔ سورج ڈوبنے کا وقت اسے بہت پسند تھا۔ جب اندھیرا نیلے آسمان پر دھبوں کی مانند نمایاں ہورہا ہوتا اور آہستہ آہستہ یہ دھبے پورے آسمان پر چھا جاتے۔ وہ اسے ہاتھوں میں تھام کر آسمان تکنے لگی' پھر لان میں گھومتے گھومتے دوسری طرف آگئی اور سبز فرش پر بیٹھ گئی۔ ریٹا بھی لحہ بھر میں اس سے مانوس ہوگئی تھی۔ وہ ارد گرد سے بے نیاز اس میں مگن تھی۔ اس بات سے انجان کہ کسی کی آنکھوں نے اس کی معصوم اداؤں کو ہمیشہ کے لیے اپنی نگاہوں میں ثبت کرلیا ہے۔

☆ ☆ ☆

شاہ دل کی اداس نگاہیں اپنے کمرے کی دیوار پر جمی تھیں جہاں ایک فل سائز تصویر سجی تھی۔ اس تصویر میں وہ تھا' اس کی ماں جیسی بھابھی عائشہ تھیں۔ اس کی بیٹیوں جیسی بھتیجی گل مہر تھی اور جان سے عزیز بھائی دلاور' جن کی جادوگر شخصیت اب مٹی میں مل چکی تھی۔ ان سب کے چہروں پر خوشیوں بھری مسکراہٹ تھی۔ وہ چاروں ساتھ تھے۔ بہت خوش تھے' منظر مکمل تھا۔ زندگی سے بھرپور مسکراہٹ' چمکتی آنکھیں اور نرم تاثر' سب خواب ہوچکا تھا۔ اس ایک شخص کے جانے سے زندگی کے معنی بدل گئے تھے۔ مہر یتیم ہوگئی۔ عائشہ بیگم سہاگن سے بیوہ اور وہ..... وہ بھی جیسے معذور ہوگیا تھا۔ اس ایک انسان سے کتنے رشتے جڑے تھے ان کے جانے کے بعد سے وہ زندہ تو تھے مگر جینا بھول گئے تھے۔ وقت نے گزرتے گزرتے ان کا درد کم کردیا تھا مگر آج بھی ان کی یاد انہیں آبدیدہ کردیتی تھی۔

مگر آج تو اسے وہی اذیت ہورہی تھی' وہی تکلیف محسوس ہورہی تھی جو دلاور کی موت کے وقت ہوئی تھی۔ شاہ دل کی آنکھیں لہو ہوگئی تھیں اور دل جیسے شدت غم سے پھٹنے کو تھا۔ بدلے کی آگ میں وہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کا وجود جھلس رہا تھا۔ یہ جلن تو برسوں سے اسے بے چین کررہی تھی۔ دلاور کا قاتل پھر سے آزادی سے گھوم رہا تھا اور وہ اب تک اس کا کچھ بگاڑ نہیں پایا تھا۔ پیسہ' طاقت' سورس ہوتے ہوئے بھی وہ اب تک بدلہ نہیں لے پایا تھا۔ عجیب احساس بے بسی تھا۔ وہ بے چین ہوکر دریچے میں آکر کھڑا ہوگیا۔ شام کے سائے گہرے ہورہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا نے اس کے چہرے کو چھوا تو کچھ سکون کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ سر درد سے پھٹا جارہا تھا۔ وہ خود کو ریلیکس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ تب ہی اس کی کانوں میں کسی کی کھلکھلاہٹ گونجی' آواز مہر کی نہیں تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور حیرانی سے لان میں دیکھنے لگا۔ وہ جو کوئی بھی تھی صبح کی پہلی کرن جیسی چمکیلی اور روشن تھی۔ لان میں لگی

لائٹس کی روشنی کی وجہ سے وہ بالکل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ننھی سی گیند تھی جسے وہ اچھالتی اور شاہ دل کی لاڈلی بلی گیند کے پیچھے بھاگتی۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" وہ حیران سا ہوا۔ اس کے انداز سے اتنا تو معلوم ہو ہی گیا تھا کہ وہ اس گھر کے لوگوں سے نا صرف اچھی طرح واقف تھی بلکہ بے تکلف بھی تھی' اسی لیے تو رِیٹا کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھی۔ شاہ دل بے اختیار اسے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر پہلے کا درد' جلن یک دم غائب ہو گیا تھا۔ اس کی کھلکھلاہٹ اسے کانوں کو تراوٹ بخش رہی تھی اور اس انجان لڑکی کے چہرے پر پھیلی معصومیت اور خوشی اس کی آنکھوں کو سکون دے رہی تھی۔ وہ مبہوت سے اسے دیکھتا رہا۔ چونکا تب جب کسی نے اس کے چوڑے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "شاہ چاچو۔۔۔" مہر کی حیران آواز اس کی سماعتوں میں ملتی ہی تو وہ ہڑبڑا گیا۔ وہ چند منٹ پہلے ان کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ عام حالات میں تو دروازہ کھلنے کی آواز سے ہی وہ نیند سے بھی جاگ جایا کرتے تھے مگر آج وہ دریچے سے لگے کس نظارے میں محو تھے کہ مہر کے آواز دینے پر بھی وہ متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ مہر نے ان کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ ماہی مصروف تھی اور وہ اسے دیکھنے میں مصروف۔ اس بات نے اسے ٹھیک ٹھاک شاک پہنچایا تھا۔ شاہ دل کا مزاج ہی ایسا تھا کہ وہ صنف نازک کی طرف کم ہی متوجہ ہوا کرتا تھا۔ ایسے میں یوں اس کا مبہوت ہو جانا مہر کو حیران ہی کرتا۔

"چاچو۔۔۔ نیچے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ امی آپ کو بلا رہی ہیں کہ آپ آئیں اور مل لیں۔" اس نے عام سے لہجے میں کہا اور ظاہر نہ کیا کہ وہ اس کی چوری پکڑ چکی ہے۔

"کون مہمان؟" اس نے آخری نگاہ باہر ڈالی اور پلٹ کر پوچھا۔

"میری فرینڈ اور اس کی فیملی۔۔۔" وہ بتانے لگی۔

"تم چلو۔۔۔ میں بس آتا ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ مہر بنا کوئی تاثر دیے چلی گئی۔ اس نے پھر سے لان کی طرف دیکھا۔ لان میں اب کوئی نہیں تھا۔ اس نے گہری سانس بھری۔۔۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال سنوارے اور کمرے سے باہر آ گیا۔ لاؤنج میں آیا تو وہاں وہ موجود تھی اور اب بھی رِیٹا کے ساتھ ہی مصروف تھی۔ "السلام علیکم۔۔۔!" اس کی بھاری مردانہ آواز پر سب ہی اس کی سمت متوجہ ہو گئے تھے۔ ماہی نے بھی سر اٹھا کر اسے دیکھا اور زیر لب جواب دے کر پھر سے گزشتہ مشغلے میں مصروف ہو گئی۔

"ماہی اب اس معصوم کی جان بخش بھی دو اور چائے پی لو۔ بالکل ٹھنڈی ہو گئی ہے۔" سیماب نے بھنویں چڑھا کر کہا۔

"سیماب۔۔۔ یہ کتنی پیاری ہے نا۔۔۔ دل کر رہا ہے اسے ساتھ ہی لے جاؤں۔" وہ ذرا دھیمی آواز میں بولی۔

"بہت ہی بھوکی لڑکی ہو تم۔" وہ دانت کچکچا کر بولا۔

"آپ لے جائیں اسے اپنے ساتھ۔" شاہ دل کے کان اسی کی طرف لگے ہوئے تھے۔ ان کی باتیں اسے سنائی دے رہی تھیں۔ ماہی نے حیرت اور خوشی سے اس کی طرف دیکھا۔ عافیہ گڑبڑا گئیں۔

"ارے نہیں۔۔۔ شادی والا گھر ہے اور پھر صولت کے بعد اس کے پاس وقت ہی کہاں ہو گا۔" وہ بظاہر مسکرا رہی تھیں۔ ماہی کو نظر بچا کر گھورا۔ اس نے اداسی سے بلی چھوڑ دی مگر وہ جانے کے بجائے اس کے قدموں میں لیٹ گئی۔ ماہی نے پھر سے اسے اٹھا لیا۔

"آپ کی چائے۔۔۔" ماہی کا انتظار کرتے چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی تو مہر دوسری چائے بنا کر لے آئی۔ لمحے بھر کے لیے دونوں کی نگاہوں کا تصادم ہوا تھا۔ سیماب کی آنکھوں کے روشن دیے مہر کو نگاہیں جھکانے پر مجبور کر گئے۔ سیماب نے گہری بے قرار نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کپ تھام لیا۔ ماہی نے کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھا۔ مہر سرخ چہرہ لیے بیٹھ گئی تھی۔ سیماب چور نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بے اختیار مسکرائی۔ ماہی کی توجہ کا مرکز یا تو

سیماب اور مہر تھے یا پھر رشا۔ اس کے علاوہ اس نے اردگرد دیکھنے کی زحمت ہی نہ کی تھی۔ حتیٰ کہ شاہ دل پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالنے کے بعد اس نے اس کی طرف دوبارہ دیکھا ہی نہ تھا اور اس کی یہ بے نیازی شاہ دل کو بہت بھائی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف متوجہ تھا۔ اس کی ایک ایک ادا' ایک ایک جنبش پر اس کی نگاہ تھی۔ ماہی کی نگاہوں میں مچلتی شرارت اور ہونٹوں میں قید مسکان کی وجہ تو اسے معلوم نہیں تھی۔ اگر وہ ذرا بھی اپنے اطراف دیکھ لیتا تو وجہ جان جاتا مگر اسے اس کے دیکھنے سے فرصت ملتی تو تب۔ عائشہ بیگم نے بھی اس کی توجہ محسوس کی تھی۔ وہ بہت محتاط انسان تھا۔ آج ساری احتیاطیں نہ جانے کہاں چلی گئی تھیں۔

"اب ہمیں چلنا چاہیے۔" عافیہ بیگم کے اس جملے پر وہ ان کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"اتنی جلدی کیوں؟" عائشہ بیگم نے جلدی سے کہا۔

"ارے بہت دیر ہو گئی ہے اور پھر شادی والا گھر ہے' سو کام ہوتے ہیں۔ آپ سب شادی میں ضرور شرکت کیجیے گا۔" وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔ ماہی بھی فوراً" اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے میرے پاس' بس کچھ دن انتظار کرو۔" وہ مہر کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ ماہی کی معنی خیزی اسے بہت کچھ سمجھا گئی مگر وہ پھر بھی حیران تھی۔ سب سے مل کر وہ رخصت ہوئے۔

"چاچو آپ کو معلوم ہے کہ یہ ان ہی کی شادی کا کارڈ ہے جنہیں ممی نے آپ کے لیے پسند کیا تھا۔" وہ رشا کو لیے بیٹھا۔ مہر کی آواز پر سیدھا ہوا اور مسکرایا۔

"پتا نہیں۔۔۔ تمہاری شادی کا کارڈ کب چھپے گا؟" وہ افسردگی سے بولیں۔ "جب آپ لڑکی ڈھونڈیں گی تب۔" مہر نے فوراً" کہا۔

"میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے؟" وہ پرسوچ انداز میں بولیں۔ مہر جو برتن سمیٹ رہی تھی ہاتھ روک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"صولت نہ سہی۔ اگر ماہی کا رشتہ شاہ دل کے لیے مانگ لیا جائے تو کیسا رہے گا؟" وہ لہجہ سرسری رکھتے ہوئے بولیں' شاہ دل کا دل دھڑک اٹھا۔

"توبہ کریں امی۔۔۔ ماہی میری عمر کی ہے۔ اٹھارہ کی بھی پوری نہیں ہوئی اور اس میں بچپنا بہت ہے جبکہ چاچو کی عمر ٹھیک ٹھاک ہے اور ماہی کا مزاج چاچو کے مزاج سے بالکل الگ ہے۔ ایسا سوچیے گا بھی نہیں۔" وہ یوں بولی جیسے انہوں نے ماہی کا نام لے کر گناہ کر دیا ہو۔ شاہ دل بلبلا گیا۔

"تم نے کیا عمر کی رٹ لگا رکھی ہے۔ ابھی تیس کا ہی ہوا ہوں اور آج کل کے دور میں تو اتنا فرق آئیڈیل سمجھا جاتا ہے۔" وہ بالکل بے اختیاری سے بولا تھا مہر کا قہقہہ سن کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔ عائشہ بیگم بھی بھرپور انداز میں مسکرائیں۔

"میرا مطلب تھا کہ۔۔۔" وہ بری طرح شرمندہ ہو گیا۔

"آپ کے سارے مطلب مجھے اچھی طرح سے معلوم ہیں۔ جب میں آپ کو بلانے گئی تو آپ کھڑکی میں کھڑے ماہی پر نگاہیں فکس کیے بیٹھے تھے اور جب نیچے آئے تب بھی آپ کی ساری توجہ اسی پر تھی۔" مہر کی صاف گوئی پہلی بار اسے بری لگی۔

"بس کرو مہر۔۔۔ مت تنگ کرو اسے۔ صولت کی شادی میں ہی میں ان سے بات کرتی ہوں۔" انہوں نے اسے تسلی دی۔ اپنے کمرے میں آکر وہ پھر سے دریچے سے لگ گیا۔ جیسے لان میں اب بھی وہ موجود ہو۔ ماہی پہلی لڑکی تھی جس نے نہ صرف اس کے دل کو چھوا تھا بلکہ محبت کا میٹھا درد بھی جگا گئی تھی۔ آج سے پہلے اس نے کبھی کسی لڑکی کو نہیں سوچا تھا کہ' کبھی کسی کو ہر لمحہ اپنے سامنے دیکھنے کی خواہش نہ ہوئی تھی مگر اب اس کا دل چاہ رہا تھا ماہی اس کے سامنے ہو اور وہ اسے دیکھتا رہے۔

☆ ☆ ☆

کرسٹینا اور صولت شام کی چائے کی تیاری کر رہی

تھیں۔ آفاق، ماہی، علی شان اور سیماب لاؤنج میں بیٹھے چائے کا انتظار کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ شادی کے حوالے سے گفتگو بھی جاری تھی کہ لاؤنج میں رکھے فون کی بیل بجی۔ ماہی فون کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اس نے جوں ہی فون اٹھایا۔ سیماب نے تیزی سے اس کے ہاتھ سے ریسیور چھین لیا۔ ماہی کو اس کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری۔ اسے لگا تھا کہ ماموں اس کی اس حرکت پر ضرور ہی اس کی کلاس لیں گے مگر حیرت انگیز طور پر وہ چپ رہے۔ فون صولت کے سسرال کی طرف سے تھا۔ سیماب نے فون عافیہ بیگم کو پکڑا دیا۔ وہ بات کرنے لگیں اور پھر کچھ دیر بعد فون رکھ دیا۔ صولت اور کرسٹینا ایک ساتھ۔۔۔۔ لاؤنج میں آئیں۔

"کیا کہہ رہی تھیں راشدہ؟" آفاق صاحب نے صولت کے ہاتھوں چائے کا کپ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ جو لہنگا لے کر آئی ہیں فراز کو پسند نہیں آیا۔ فراز کا کہنا ہے کہ صولت کی پسند کا لہنگا ہونا چاہیے۔ تو وہ یہ کہہ رہی تھیں کہ کل وہ صولت کو بازار لے کر جانا چاہتی ہیں۔" انہیں ان کی اس فرمائش پر غصہ آرہا تھا۔

"یہ کوئی بات تو نہیں ہوئی۔ اتنے دن پہلے کیا وہ سو رہے تھے۔ کل صولت آپا کی مہندی ہے۔ مہندی والے دن کون لہنگے پسند کرنے جاتا ہے۔" سیماب غصے سے بولا۔

"زنانیوں والی باتیں کرنے میں تو تم ماہر ہو۔" ماہی نے اس کے کان میں گھس کر کہا۔ سیماب نے اسے گھورا۔ وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

"ہر بات میں جذباتیت اچھی نہیں ہوتی۔ صولت کی وہ صرف ساس نہیں سگی خالہ بھی ہیں۔ اگر لے جانا چاہتی ہیں تو اس میں کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں۔ یہ قرآن میں تو درج نہیں کہ دلہن مہندی کے روز بازار نہیں جاسکتی۔" آفاق صاحب نے تحمل سے سمجھایا تو وہ چپ ہو گیا۔

"نانی۔۔۔ صولت آپا کے سسرالی تو انہیں کل لہنگا دلائیں گے۔ آپ اپنی بہو کا لہنگا کب خریدیں گی؟؟" اس نے اچانک سے کہا۔ سب رک کر اس کی شکل دیکھنے لگے۔

"کیا مطلب۔۔۔" وہ نا سمجھی سے بولیں۔

"مطلب کی کیا بات ہے؟" قریبی رشتہ داروں اور محلے والوں کو ہی عالی شان کی شادی کی خبر ہے۔ ماموں کے دوست احباب جب عالی شان بھائی کی گود میں منی دیکھیں گے تو کیا کہیں گے کہ بڑے بیٹے کی دعوت ولیمہ تک نہ کھلائی۔ سب ناراض ہوں گے۔ طرح طرح کی باتیں کریں گے کہ گھر والوں کی ہی آپس میں ناراضی ہے۔ بس دنیا دکھاوے کو بیٹا گھر بلالیا۔" وہ خالص بزرگانہ انداز میں بولی۔

"تمہیں بڑوں کی باتوں میں دخل اندازی کا کس نے کہہ دیا؟ لوگ باتیں بنائیں یا کچھ اور تمہیں ان باتوں پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں۔ تم بس شادی انجوائے کرو لوگوں کو ہینڈل کرنا ہمارا کام۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولیں۔ ماہی کی ساری شوخی شرارت بھک سے اڑ گئی۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر چلی گئی۔

"ذرا نرم لہجے میں بات کرو۔ رلا دیا نا اسے۔" آفاق صاحب نے کہا۔

"ماہی کو کس نے کہا ہے کہ دوسروں کی باتوں پر کان دھر کے خوا مخواہ کی باتوں میں الجھے۔ اس کی عمر نہیں ان باتوں کی طرف توجہ دینے کی۔ اپنے چسکوں کے لیے دوسروں کے کندھوں پر بندوق رکھ کے چلانے کا ہنر کوئی ان سے سیکھے۔" وہ بے تحاشا غصے میں تھیں۔ اٹھ کر چلی گئیں۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

وہ کمرے میں آگئی تھی اور تب سے سر تکیے میں دیے روئے چلی جارہی تھی۔ عافیہ بیگم لاؤنج سے اٹھ کر سیدھا اس کے پاس آئی تھیں۔ اسے یوں بلکتا دیکھ کر ان کے دل کو کچھ ہوا۔ اسے تو وہ ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھتی تھیں مگر عالی شان کے بنا بتائے شادی کرنے نے انہیں بے تحاشا تکلیف دی تھی، وہ چاہ کر بھی اپنے اندر کے اس دکھ کو کم نہیں کر پارہی تھیں کرسٹینا کے ساتھ ان کا رویہ بالکل ٹھیک تھا مگر عالی شان کو دیکھتے ہی

ان کا دکھ جاگ جاتا۔ عالی شان نے ان کا مان' ان کا بھروسا توڑ دیا تھا اور یہ ان سے برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ ماہی کی کوئی بات نہیں ٹالتی تھیں مگر عالی شان کے ولیمے کی بات نے انہیں بے تحاشا غصہ دلا دیا تھا اور بنا لحاظ کیے انہوں نے اسے ڈانٹ دیا۔ وہ دھیرے سے اس کے قریب بیٹھ گئیں اور آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ ان کے لمس سے وہ پہچان گئی کہ کون اس کے پاس ہے۔ ماہی کے اندر شرمندگی سر اٹھا رہی تھی۔ اس نے تکیے سے منہ نکالا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"آئی ایم سوری ماما!" اس نے ان کے ہاتھ تھام کر کہا تو وہ حیران سی اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ وہ تو اسے منانے کے لیے آئی تھیں اور وہ خود ان سے معافی مانگ رہی تھی۔

"اس وقت مجھے احساس نہیں ہوا کہ میں نے کیا کہہ دیا ہے' میں جانتی ہوں کہ عالی شان بھائی کے شادی کے تذکرے سے آپ بہت ہرٹ ہو جاتی ہیں۔ پھر بھی میں نے یہ سب کہہ دیا اور آپ کو دکھی کر دیا۔ آئی ایم ریئلی سوری۔" وہ سوں سوں کرتی بول رہی تھی۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہیں اور پھر بے اختیار ہو کر اسے خود میں بھینچا تھا۔ اس کا ہر رنگ' ہر روپ انہیں ماضی میں دھکیل دیتا تھا۔ وہ پوری کی پوری **فضیلہ** تھی۔ وہی نین نقش' وہی معصومیت' وہی سادگی....

☼ ☼ ☼
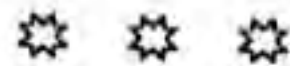
اگلی صبح راشدہ ان کے دروازے پر موجود تھیں۔ صولت اکیلے جاتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ اس نے ماہی کو ساتھ چلنے کو کہا۔ ماہی جانتی تھی کہ راشدہ آنٹی کو اس کی موجودگی سے پریشانی ہوتی ہے۔ اس نے انکار کرنے کا سوچا مگر راشدہ آنٹی نہ جانے کس موڈ میں تھیں' اسے اپنے ساتھ خوشی خوشی لے جانے کے لیے راضی ہو گئیں۔ عافیہ بھی نہ جانے کیا سوچ کر ان

کے ساتھ چل پڑیں۔ سیماب اور عالی شان بے حد مصروف تھے۔ شادی کی ساری ذمہ داری ان دونوں کے کاندھوں پر تھی تو ایک پاؤں گھر میں تو دوسرا پاؤں باہر۔ گھر میں صرف کرشمنا اور آفاق صاحب تھے۔ وہ بیٹی کو سلا کر کچن میں مصروف تھی۔ کرشمنا بلاشبہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ دروازہ بجنے کی آواز پر وہ دروازہ کھولنے گئی تھی۔ وہ یہی سمجھی کہ ان دونوں میں سے کوئی ہو گا مگر سامنے کھڑے انجان شخص کو دیکھ کر وہ کچھ جھجک گئی۔ وہ شخص جو بھی تھا۔ اس نے کرشمنا کو دیکھتے ہی اس سے انگریزی میں بات کی تھی اور اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سر پر ہاتھ رکھنے کا مطلب عزت ہوتا ہے۔ وہ اس کے اس عمل پر بہت خوش ہوئی تھی۔

پھر اس شخص نے آفاق سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ اخلاقیات نبھاتے اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ اس نے اس گھر میں مہمانوں کی تواضع کا جو طریقہ دیکھا تھا وہ اسی کے مطابق عمل کر رہی تھی۔ اس نے آفاق صاحب کو مہمان کی آمد کی خبر دی اور ان کے لیے جوس بنانے لگی۔ وہ جس وقت جوس کے گلاس لے کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ اندر کا منظر اسے سمجھ نہیں آیا۔ آفاق صاحب شدید غصے میں دکھائی دے رہے تھے۔ وہ حیران کھڑی رہ گئی۔ اسے سامنے دیکھ کر وہ بالکل چپ ہو گئے۔

"بیٹا.... آپ یہ لے جائیں.... اس کی ضرورت نہیں۔" انہوں نے نرمی سے کہا تھا' ان کے انداز میں کچھ تو ایسا تھا کہ وہ ٹھٹک گئی اور فوراً" باہر نکلی تھی۔

"تمہاری بہو تو بہت سگھڑ اور آداب والی ہے۔" وہ اسے جاتا دیکھ کر بولا۔

"شاہ نواز! میرے گھر کے معاملات میں دخل اندازی یا کسی بھی طرح کے کمنٹس کرنے کا حق تمہیں نہیں۔ یہاں سے دفع ہو جاؤ ابھی اور اسی وقت۔" وہ دبے لہجے میں بولے۔ انہوں نے لاکھ شکر ادا کیا تھا کہ ماہی اس وقت موجود نہیں تھی۔

"میں یہاں اپنی بیٹی سے ملنے آیا ہوں اور اس سے

ملے بغیر ہرگز نہیں جاؤں گا۔" وہ صوفے پر پھیلتے ہوئے بولا۔ ان کا بس نہ چلتا تھا کہ اسے شوٹ کردیں۔

"تم آخر کیا چاہتے ہو؟ کیوں ماہی کی زندگی برباد کرنا چاہتے ہو۔" وہ جیسے تھک کر بولے تھے۔

"میں ماہی کا باپ ہوں' ماہی کی زندگی برباد کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ میری بیٹی ہے' اسے میرے پاس رہنا چاہیے۔ اپنے حقیقی باپ کے پاس۔" وہ اپنی طرف اشارہ کرکے بولا۔

"تم اور تمہاری محبت محض ماہی کے نام کی گئی دولت سے مشروط ہے۔ سانپ کی فطرت ہے تمہاری۔ ڈسنا تمہاری فطرت ہے' پھر چاہے سامنے تمہاری سگی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔" وہ نفرت سے بولے۔ شاہ نواز ہنس دیا۔

"جب تم ساری حقیقت سے واقف ہو تو ڈرامہ بازی بند کرو اور میری بیٹی کو میرے حوالے کردو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یقین مانو تمہارا پورا خاندان میرا زہر برداشت نہیں کرپائے گا۔ مجھے تو جو چاہیے وہ میں حاصل کرکے رہوں گا۔ گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلا تو انگلی ٹیڑھی کرنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ عقل مند ہو تم۔۔۔ سمجھ جاؤ۔" وہ تحمل سے بول رہا تھا۔

تب ہی اس کا موبائل بجا۔

"ہیلو۔۔۔ ہاں ٹھیک ہے۔ تین دن ۔۔۔ بعد کی سیٹ کیوں کنفرم کروائی ہے؟" وہ دھاڑ کر بولا تھا اور مغلظات کا طوفان اس کے منہ سے ابلنے لگا۔ آفاق اسے دیکھتے رہے۔ بظاہر کتنی دلکش شخصیت تھی اس کی اور اس کا انداز۔۔۔ انہیں اس سے گھن آنے لگی۔

اس نے کچھ دیر بعد فون بند کردیا۔

"میں اپنی بیوی کے ساتھ ہنی مون پر جارہا ہوں۔ واپس آتے ہی میں ماہی کو یہاں سے لے جاؤں گا۔ جتنے بند باندھنے ہیں باندھ لو۔ خدا حافظ۔" اس کے موبائل پر پھر سے کال آنے لگی تھی۔ وہ اٹھ کر چلا گیا۔ ہنی مون کی بابت صرف اس لیے بتایا تاکہ آفاق صاحب کو مزید تکلیف کا سامنا کرنا پڑے۔ وہ مسکراتے ہوئے چلا گیا۔ آفاق سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

☆ ☆ ☆

سجے ہوئے اسٹیج پر صولت دلہن بنی بیٹھی تھی۔ ہر وقت سادہ رہنے والی صولت خوب ہار سنگھار کیے بے حد حسین لگ رہی تھی۔ نکاح کا فریضہ ادا کیا جاچکا تھا۔ فراز اس کے برابر بیٹھا تھا۔ دونوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہیں۔ سنجیدہ اور شرمیلے سے۔ ان کے برابر کرسٹینا اور عالی شان پھر سے دولہا' دلہن کے روپ میں سجے بیٹھے تھے۔ عافیہ نے ان کے ولیمہ کے لیے ہاں کردی تھی اور یہ ہاں صرف اور صرف ماہی کی وجہ سے اس کی خوشی کے لیے کی گئی تھی۔ عالی شان کی بیٹی عافیہ کی گود میں تھی۔ فوٹو سیشن کے بعد عالی شان اسٹیج سے نیچے اتر آیا۔ ماہی کالے رنگ کے لباس میں بال کھولے لائٹ سا میک اپ کیے بہت پیاری لگ رہی تھی۔ ماہی اور مہر دونوں نے ایک رنگ کا لباس پہنا تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ تھیں۔ کھانے سے فارغ ہوکر ماہی سیماب کو پکڑ لائی کہ وہ دونوں کی تصاویر بنائے۔ مہر اس کی اس حرکت پر گھبرا گئی تھی مگر ماہی نے پروانہ کی۔ سیماب کی تو عید ہی ہوگئی تھی۔ سیماب کو فری ہوتے دیکھ کر ماہی نے اسے بھگا دیا۔ بے چارہ منہ بنا کر چلا گیا۔ ماہی کو خبر نہیں تھی کہ عائشہ بیگم اور عافیہ آپس میں کیا گفتگو کررہی ہیں۔ اس کی توجہ بس صولت پر تھی۔ بظاہر وہ مسکراتی یہاں وہاں اٹھلاتی پھر رہی تھی مگر اس کا دل بار بار بھر رہا تھا۔

شادی میں شاہ دل بھی شریک تھا۔ ماہی نے بس سلام اور ہلکی پھلکی بات چیت کے بعد اس کی طرف دیکھا ہی نہیں تھا اور شاہ دل پہلی ملاقات کی طرح آج بھی اسے دیکھنے میں محو تھا۔ مہر شاہ دل کی حرکت پر مسکرا اٹھی تھی اور ماہی کی بے نیازی پر اسے بہت پیار آیا تھا۔ پھر وہ وقت بھی آن پہنچا جب صولت کو رخصت کیا جارہا تھا۔ قرآن کے سائے میں آج ایک اور بیٹی' ماں باپ کے جگر کا ٹکڑا ان سے دور جارہی تھی۔ پرائی ہورہی تھی۔ ماہی کا تو برا حال تھا۔ بچپن

سے وہ صولت سے بہت قریب تھی۔ اتنے سالوں کا ساتھ' سونا' جاگنا' ہنسنا' رونا ہر ہر لمحہ ساتھ گزرا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی وہ آئندہ کی زندگی اکیلے کیسے گزارے گی۔

صولت کی جگہ تو کوئی نہیں لے سکتا تھا۔ رخصت ہوتے وقت جب وہ ماہی کے گلے لگی تو جدائی کا احساس کچھ اور شدید ہوا تھا۔ عافیہ لاکھ ضبط کرتیں آنسو تو ان کے بھی چھلکے تھے۔ ماں کی دعاؤں' باپ کے سائے اور بھائیوں کے مان تلے بالآخر وہ رخصت ہوگئی۔ ماہی گھر آتے تک روتی رہی۔ سیماب کیا پورا گھر دکھی تھا۔ وہ اسے سمجھاتا رہا' دلاسے دیتا رہا۔

آج کی رات اس کی زندگی کی خوب صورت راتوں میں سے ایک تھی۔ آج اس نے پہلی بار ماہی کو سنورے دیکھا تھا۔ کبھی کبھی اسے خود پر غصہ بھی آتا کہ اتنے سال یوں ہی گزارنے کے بعد اسے محبت ہوئی بھی تو ایک بے حد کم عمر لڑکی سے۔ یہ بات اسے شرمندہ بھی کردیا کرتی تھی مگر محبت پر کسی کا بس تو نہیں اور یہی وہ ایک لفظ تھا جہاں وہ بے بس ہوجایا کرتا تھا۔ ہال سے روانگی سے لے کر گھر پہنچنے تک اور اب اپنے کمرے میں موجود ہوتے ہوئے بھی اس پر سرشاری طاری تھا۔ نکھری نکھری سجی سنوری ماہی کی تشبیہ اس کی پلکوں پر لرز رہی تھی۔ ماہی کو سوچنا تو جیسے اس کی عادت بن گئی تھی اور اسے یہ عادت بہت عزیز ہوگئی تھی۔ ماہی وہ پہلی لڑکی تھی۔ جسے دیکھ کر اس کا دل نئی لے پر دھڑکا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر ہی کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ جیسے ماہی لان میں موجود ہو۔ وہ اپنی اس حرکت پر ہنس پڑا اور اپنے سر پر ہاتھ مارتا وہاں سے ہٹ گیا۔

بیڈ پر لیٹ کر اس نے گہری سانس بھری۔ پہلی ملاقات میں ہی وہ اس پر دل ہار بیٹھا تھا۔ دوسری ملاقات میں وہ اسے پہلے سے کہیں زیادہ قریب محسوس ہوئی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں تیسری ملاقات میں اسے عشق ہی نہ ہوجائے۔ وہ عشق جو انسان سے اس کے حواس چھین لیتا ہے۔ شاہ دل نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے موبائل کو اٹھایا جو سارا وقت مہر کے ہاتھ میں دبا رہا تھا' تاکہ وہ ماہی کی تصاویر بنا سکے۔ شاہ دل کی چھپی خواہش کو مہر نے کتنی آسانی سے سمجھ لیا تھا۔ اسے مہر پر خوب پیار آیا۔

دولہا' دلہن کی تصاویر کے بعد سب سے زیادہ تصاویر ماہی کی ہی تھیں۔ اس کی ہر تصویر ہی خوب صورت تھی مگر ایک پر اس کی نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ اس کی انگلیاں اس کی زلفوں میں اٹکی تھیں کہ اور وہ چہرہ ذرا سا نیچے کیے شرارتی انداز میں مسکرا رہی تھی۔ ایک بے حد حسین منظر کیمرے میں قید ہوگیا تھا اور اب وہ منظر اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں قید ہو رہا تھا۔ وہ اس کی تصویر کو یک ٹک دیکھتا رہا۔ بہت دیر گزر گئی مگر اس کی نگاہیں ہٹنے سے انکاری تھیں۔

ماہی بہت زیادہ حسین لڑکی نہیں تھی مگر جب سے وہ اس کی محبت میں مبتلا ہوا تھا۔ اس سے زیادہ حسین اسے کوئی دوسرا لگتا ہی نہ تھا۔ اس نے بہت مشکل سے اپنی نگاہوں کو قابو کیا اور موبائل سائیڈ پر رکھ دیا۔ وہ اپنی بے اختیاری پر جھنجلا نہیں رہا تھا بلکہ وہ ان جذبات کی تازگی اور شگفتگی اپنے اندر سمو رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے نرمی سے آنکھیں بند کرلیں۔ بند پلکوں کے پار وہ دونوں ایک دوسرے کے ہمراہ تھے۔

☼ ☼ ☼

فرض احسن طریقے سے ادا ہوگیا تھا۔ وہ گھر لوٹے سب ہی بے تحاشا تھکن سے نڈھال تھے۔ ماہی تو کچھ زیادہ ہی بے حال تھی۔ اس نے بمشکل کپڑے تبدیل کیے تھے۔ ابھی وہ بستر پر لیٹی ہی تھی کہ عافیہ اس کے کمرے میں آگئیں۔ وہ بھی بے حد تھکی اور نڈھال لگ رہی تھیں۔ ادھر ہال میں تو انہوں نے خود پر ضبط کرلیا تھا مگر گھر آکر وہ خوب روئی تھیں۔ رونے کی وجہ سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ماہی انہیں دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا امی۔" وہ ان کے چہرے کو تکتے ہوئے بولی۔

"میں تمہارے پاس سونے آئی ہوں۔ اب صولت تو ہے نہیں اور تمہیں اکیلے نیند نہیں آئے گی۔" وہ زبردستی مسکرا کر بولیں۔ اس نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے ان کی کمی تو محسوس ہوگی مگر اب تو عادت ڈالنی ہی پڑے گی نا۔" وہ نرمی سے مسکرائی۔

"تم اکیلے میں ڈر جاتی ہو۔ اگر ڈر گئیں۔۔۔ پھر۔۔۔"

"ارے آپ بالکل پریشان مت ہوں۔ ماہی اب بڑی ہو گئی ہے۔ اسے بالکل بھی ڈر نہیں لگے گا۔ آپ بے فکر ہو کر سو جائیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لیکن ماہی۔۔۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ امی میں بڑی ہو گئی ہوں' آپ کو پتا ہے مہرا اپنے کمرے میں اکیلی سوتی ہے۔ میں اس سے زیادہ بہادر ہوں۔ بالکل نہیں ڈروں گی میں' آپ جائیں اور اگر ڈر لگ بھی گیا تو میں آپ کو بلالوں گی۔ جا کر آرام کریں۔" وہ اپنے دھڑکتے دل کو سنبھالتے ہوئے بظاہر بے فکری سے بولی تو وہ قائل ہو گئیں اور اٹھ کر چلی گئیں۔

"امی کو تو بھیج دیا تو نے ماہی۔ اب کیا کرے گی؟" وہ بزدل نہیں تھی مگر حالات نے اسے ایسا کر دیا تھا۔ وہ بہت تھکی ہوئی تھی مگر اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے کروٹ لے کر اپنا پہلو دیکھا' آج وہ خالی تھا۔ یہاں صولت موجود ہوتی تھی۔ اس نے بستر پر ہاتھ پھیر کر اس کی موجودگی کو محسوس کیا۔ تنہائی کا احساس اس نے خود پر غالب نہ آنے دیا۔ اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ وہ ویسی بن جائے گی جیسا کہ صولت چاہتی تھی یا گھر والے جس طرح اسے دیکھنا چاہتے تھے۔ مجھے اپنے اندر سے سارے خوف' سارے ڈر نکالنے ہیں۔ صرف اللہ سے ڈرنا اور اسی پر بھروسا کرنا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے خود کو باور کروایا تھا۔ آنکھیں بند کرتے اسے گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ اسی گھٹن سے تو وہ خوف زدہ رہتی تھی۔ وہ ہاتھ اسے اپنی گردن پر محسوس ہونے لگے تو اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی سانسیں اتھل پتھل ہونے لگی تھیں۔ اس نے بھیگی آنکھوں کو صاف کیا اور سائیڈ ٹیبل پر رکھے گلاس کو اٹھا کر پانی پی کر اپنے حواس بحال کیے۔

"ماہی۔۔۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔ سب تیرے اپنے ہیں۔ تجھ سے نفرت کرنے والا' تیری جان کا دشمن جیل میں سڑ رہا ہے۔ تیرے اوپر تیرے خدا کا سایہ ہے۔ اس کی رحمت ہے۔ تو ان دو ظالم ہاتھوں سے بہت دور ہے۔" وہ خود کو سمجھانے لگی تھی۔ اس نے ٹھان لیا تھا کہ وہ اپنے اندر سے اس خوف کو نکال باہر کرلے گی۔ صولت کے جانے کے بعد ہی اسے احساس ہوا تھا کہ زندگی میں جو لوگ موجود ہیں ضروری نہیں کہ ہمیشہ ساتھ رہیں۔ ساری عمر ڈرتے روتے ہوئے تو نہیں گزارنی۔ خود پر گزرے ظلم کو خود پر حاوی نہیں ہونے دینا۔ وہ آنکھیں موندے ان ہی باتوں کو سوچ رہی تھی۔ اس نے اپنے اندر یقین کو اترتے محسوس کیا تھا کہ وہ جو چاہے کر سکتی ہے۔ خوف کو شکست دے سکتی ہے۔ اس کی گھٹن کم ہونے لگی تھی۔ وہ دو سیاہ ہاتھ جیسے دور کہیں کسی مضبوط رسی سے بندھ گئے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے نیند کی وادی میں اترنے لگی۔

اس کی آنکھ عجیب سے احساس سے کھلی تھی۔ اس نے مندی مندی آنکھوں سے یہاں وہاں دیکھا اور اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں مگر اگلے ہی لمحے جیسے اس کے حواس بے دار ہو گئے تھے اور خود پر جھکتے وجود کو اس نے پوری شدت سے محسوس کیا تھا۔ اسے خود نہیں معلوم تھا کہ اس کے اندر اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔ اس نے اپنی پوری جان لگا کر زوردار لاتیں اس شخص کو رسید کی تھیں۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا تھا۔ نیم ملگجے اندھیرے میں اسے صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے تیر کی سی تیزی سے بیڈ سے چھلانگ لگائی تھی اور دروازے کی سمت دوڑی تھی۔ ابھی اس

نے کنڈی کھولی ہی تھی کہ وہ پھر سے اس کے قریب موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں رومال تھا۔ ماہی اپنا وجود اس شخص سے آزاد کروا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ شدت سے چلا بھی رہی تھی۔ جب اسے قدموں کی آواز سنائی دی تو وہ ماہی کو چھوڑ کر کھڑکی کی سمت دوڑ گیا۔ لمحے بھر میں کسی چھلاوے کی طرح غائب ہوا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ خوف کے مارے اس کے پورے وجود پر چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں۔

چیخنے کی آواز پر سب سے پہلے سیماب جاگا تھا۔ وہ تیزی سے اس کے کمرے کی طرف بھاگا تھا۔ سب ہی اس شور سے جاگ گئے تھے۔ سیماب اس کے کمرے میں پہنچا تو اسے زمین پر بیٹھے دیکھا۔ "ماہی... ماہی کیا ہوا..." اس کا اڑا رنگ ڈر کے مارے پیلا پڑتا چہرہ دیکھ کر وہ گھبرا گیا تھا۔ ماہی اسے دیکھتے ہی اس کے سینے سے لگ گئی اور زور زور سے رونے لگی۔ اس کا دوپٹا اس سے کچھ فاصلے پر گرا تھا اور بیڈ کی چادر پر بے تحاشا شکنیں تھیں۔ وہ کچھ اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا۔ عافیہ اور آفاق بھی دوڑتے آئے تھے ان کے پیچھے عالی شان کرسٹینا۔ سامنے کا منظر حیران کن کم اور پریشان کن زیادہ تھا۔ وہ اسے دلاسا دے رہا تھا۔ وہ اتنی سہمی ہوئی تھی کہ سیماب نے اس سے کچھ پوچھا ہی نہیں تھا۔ عافیہ تیزی سے اس کے پاس آئی تھیں۔

"ماہی... بیٹا کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو؟" وہ اس کا چہرہ تھام کر بولیں۔ وہ اور زیادہ رونے لگی۔ "پلیز بتاؤ نا کیا ہوا۔ کیوں اس طرح رو رہی ہو۔" وہ اس کے یوں رونے پر بہت گھبرا گئی تھیں اور پھر ماہی نے روتے ہوئے انہیں ساری بات بتا دی۔ کچھ دیر کے لیے تو سب ہی ساکت صامت رہ گئے تھے۔ وہ اب تک یہی سمجھے تھے کہ ہمیشہ کی طرح ماہی گزرے پل خواب میں دیکھ کر وحشت زدہ ہو کر چلانے لگی تھی مگر حقیقت جان کر تو ان سب کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔

"اگر میری آنکھ نہ کھلتی تو..." اس سے آگے کا سوچ کر ہی ان سب پر لرزہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ماہی نے اسے خود میں بھینچ لیا۔

"میری بچی کے ساتھ کوئی کچھ برا نہیں کر سکتا کوئی بھی نہیں۔" وہ اسے دلاسا دیتے ہوئے بولی تھیں۔

"عافیہ اسے اپنے کمرے میں لے جاؤ۔" آفاق خود پر ضبط کرتے ہوئے بولے تھے۔ عافیہ نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ کرسٹینا بھی ان کے ساتھ ہی باہر نکل آئی۔

"یہ حرکت یقیناً شاہنواز نے ہی کی ہوگی۔ وہ بہت گھٹیا انسان ہے۔" ماہی کے جاتے ہی وہ غصے سے بولا تھا۔ سیماب کو بھی عالی شان کا اندازہ بالکل درست لگا تھا۔ جبکہ آفاق بنا کچھ کہے فون ملانے لگے۔ کچھ دیر بعد فون اٹھا لیا گیا تھا۔

"شرم سے ڈوب مرو تم۔ کیوں اس معصوم کی زندگی تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ خود لندن میں بڑے عیاشیاں کر رہے ہو اور یہاں اپنے کارندوں کو بھیج کر ماہی کو اغوا کروانے کی کوششیں کر رہے ہو؟ کیسے مرد ہو تم؟ تمہاری غیرت آخر کہاں جا سوئی ہے؟" وہ ہر لحاظ بھول کر شدید غصے میں شاہنواز کو سنا رہے تھے جبکہ شاہنواز ہکا بکا ان کی بات سن رہا تھا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" "میں اپنی غیر موجودگی میں ماہی کو کیوں تمہارے گھر سے غائب کروانے لگا۔" اس کی آواز میں شدید حیرت تھی۔ شاہنواز چاہے ماہی کی جان کا دشمن تھا مگر وہ اپنی بیٹی کی عزت سے کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس معاملے میں اپنے قریبی ملازموں تک پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ ماہی کی رگوں میں بہرحال شاہنواز کا ہی خون دوڑ رہا تھا۔ اس لحاظ سے وہ کوئی کوتاہی کرنے کا متحمل نہیں تھا۔

"اچھا... تو راتوں رات ماہی کا کوئی اور دشمن کیسے پیدا ہو گیا؟ تمہارے علاوہ تو ماہی کا کوئی دشمن نہیں پھر یہ گھٹیا بزدلانہ حرکت اور کون کروا سکتا ہے۔" آفاق صاحب گرج کر بولے تھے جبکہ وہ حیران رہ گیا تھا۔ اسی حیرت میں اس نے فون کاٹ دیا تھا۔ وہ اس تیسرے شخص کا نام سوچ رہا تھا۔ کون ہو سکتا تھا جو ماہی کو اغوا کروانے کی جرات کرے گا؟ تبھی اس کے موبائل پر

ذوالفقار کا فون آنے لگا۔ اس نے غائب دماغی سے اس کا فون اٹھایا تھا۔

"تمہاری بیٹی تو بہت بہادر ہے۔ میرے بندے کو ایسی لاتیں ماریں کہ وہ پیٹ پکڑ کر اب تک کراہ رہا ہے۔" اس کے اس جملے نے شاہنواز کے تن بدن میں آگ لگادی تھی۔

"تمہاری اتنی ہمت کہ۔۔۔"

"ہمت کی بات مت کرو شاہنواز۔" وہ ہنس کے بولا تھا "اور ویسے بھی اس میں غصہ کرنے والی تو کوئی بات نہیں۔ تم نے بھی تو اسے اغوا کروانا ہی ہے۔ پھر یہ کام اس کے ہونے والا شوہر کروالے گا تو کیا ہو جائے گا؟" وہ اطمینان سے بول رہا تھا اور شاہنواز غصے سے پاگل ہونے لگا۔

"اتنا حق تو بنتا ہی ہے۔" وہ مکروہ ہنسی کے ساتھ بولا۔ دوسروں کی عزت پر نگاہ رکھنے والے سے آج اپنی بے عزتی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ ماہی کے نام کے ساتھ اس کا نام جڑا تھا۔ اسی لیے وہ آگ بگولا ہو گیا تھا۔ اسے ماہی سے دلچسپی نہیں تھی۔ اسے شاہنواز کے نام سے دلچسپی تھی۔ اس نے غصے میں فون کاٹ دیا۔

☼ ☼ ☼

آج رات ولیمہ تھا۔ ماہی کو عافیہ نے خود تیار کیا تھا۔ اس کا میک اپ ذرا گہرا کر دیا تھا تاکہ اس کے چہرے کی اداسی اس میں چھپ جائے مگر آنکھوں کی اداسی کا وہ کچھ بگاڑ نہیں سکیں۔

"ماہی۔ خود کو بالکل نارمل ظاہر کرو۔ اس طرح کہ گزری رات کا شائبہ تک تمہارے چہرے پر نہ رہے۔ صولت پرائی ہو گئی ہے۔ اب اس کا فرض بدل گیا ہے۔ تمہیں اب اس سے اپنے سارے مسائل شیئر نہیں کرنے۔ اس کی نئی زندگی شروع ہوئی ہے۔ اسے نئی زندگی کی خوشیاں محسوس کرنے دینا۔ اسے دیکھ کر رونا مت۔ وہ تمہاری اداسی بھانپ لے گی۔ تم اسے حقیقت مت بتانا۔ تم سمجھ رہی ہو نا؟" وہ اس کے بالوں کو سلجھا رہی تھیں حقیقتوں سے آگاہ کر رہی تھیں اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

"آج میں عائشہ بیگم سے مہر کے رشتے کی بات کروں گی۔ دعا کرنا کہ وہ لوگ مان جائیں۔" اس کی گردن میں ہار پہناتے ہوئے انہوں نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے کہا تھا۔ ماہی کے چہرے پر فوراً مسکراہٹ اڑ آئی تھی۔

"اب چلو۔ باہر سیماب تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہتے انہوں نے اسے کہا تو وہ باہر آگئی۔ وہ اور سیماب بائیک پر جاتے جبکہ وہ چاروں گاڑی میں، وہ سیماب کے ساتھ باہر آگئی۔

"آج تو لوگ بہت چمک رہے ہیں۔" اسے دیکھ کر سیماب نے اسے چھیڑا تھا۔ ماہی مسکرا دی۔ "آج تو کچھ اور لوگوں کی چمک دیکھ کر آپ اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہونے والے ہیں۔" اس نے اسے چھیڑا تھا سیماب ہنس پڑا۔ تبھی ان کے قریب گاڑی آکر رکی تھی۔

"اف۔ کیوں یاد دلا دیا تم نے۔" وہ آہ بھر کر بولا۔ ماہی کھلکھلا اٹھی۔ اس سے پہلے کہ وہ بائیک اسٹارٹ کرتا۔ ان کے قریب ایک آدمی آن رکا۔

"سنئے۔" اس نے سیماب کو متوجہ کرنے کے لیے کہا جبکہ اب اس شخص کی نگاہیں ماہی سے چپک گئی تھیں۔ ماہی نے ایک نگاہ کے بعد اس کی طرف دیکھا ہی نہیں تھا یہ اس کی عادت تھی۔

"آپ بتا دیں گے کہ یہ پتا کس طرف ہے؟" اس لمبے تڑنگے آدمی نے ایک پرچی سیماب کے ہاتھ میں تھمائی۔ سیماب اسے پتا سمجھانے لگا۔

"شکریہ۔" اس نے مسکرا کر کہا اور آخری نظر ماہی پر ڈالتا اپنی گاڑی کی سمت بڑھ گیا سیماب بائیک اڑا کر لے گیا۔

"شاہنواز۔ دو مہینے کا انتظار تو بہت طویل ہونے لگا ہے۔ تصور میں تو یہ کچھ بھی نہیں لگتی اف۔۔۔ یہ دو مہینے کیسے کٹیں گے؟" وہ مسکراتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔

ماہی تقریب کے دوران ہنستی مسکراتی رہی تھی۔

صولت کے شکوے کو اس نے ہنستے ہوئے چٹکیوں میں اڑا دیا تھا۔ عافیہ بیگم اسے دیکھ کر حیران تھیں وہ ایک رات میں کتنی بدل گئی تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا ہی نہ تھا کہ رات اس کے ساتھ کتنا بڑا حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا ہے۔ عافیہ نے عائشہ بیگم اور ان کی فیملی کو بھی ولیمہ میں مدعو کیا تھا۔ کچھ دیر صولت کے پاس گزار کر ماہی نیچے آگئی تھی۔ وہ ذرا لیٹ آئے تھے اسی لیے ماہی ان سے اب مل رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے شاہ دل کو ذرہ برابر توجہ سے نہیں نوازا تھا۔ شاہ دل سیماب کے ساتھ بیٹھا ہلکی پھلکی گفتگو کر رہا تھا۔ آفاق صاحب اور عالی شان بھی وہاں موجود تھے۔

"مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" عائشہ بیگم نے یہاں وہاں کی باتوں کے بعد تمہید باندھی۔

"جی کہیے۔" ان کے لہجے پر وہ کچھ چونک گئی تھیں۔

"اصل میں... ہم شاہ دل کا رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ پہلے تو میرے دل میں صولت کا خیال آیا تھا پھر پتا چلا کہ اس کا تو نکاح ہو چکا ہے۔ اب میری 'مہر خصوصاً' شاہ دل کی خواہش ہے کہ ماہی اس کی زندگی میں شامل ہو جائے۔ اگر آپ لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو میں باقاعدہ رشتے لے کر آنا چاہتی ہوں۔" انہوں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ عافیہ کتنی دیر کچھ بول ہی نہ پائیں۔ عائشہ کو لگا کہ وہ برا مان گئی ہیں۔

"میں جانتی ہوں کہ ماہی کم عمر ہے اور شاہ دل اور اس کی عمر کے درمیان کافی فرق ہے... یقین مانیے میرا شاہ دل بہت سلجھا ہوا باکردار ہے۔ ماہی اس کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔" وہ ان کا ہاتھ تھام کر مزید بولیں۔ عافیہ نے گہری سانس بھری۔

"ایسی کوئی بات نہیں جو آپ سمجھ رہی ہیں۔ حقیقت کچھ اور ہے۔ جس نے مجھے خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا ہے۔ یقیناً" شاہ دل ماہی کے لیے مضبوط سہارا بنے گا اگر وہ دونوں میاں بیوی کے رشتے میں بندھے تو۔" انہوں نے تمہید باندھی۔

"کیا مطلب؟ آپ ذرا کھل کر بات کریں۔" انہوں نے فوراً" کہا تھا۔

"بات یہ ہے کہ اگر عام حالات ہوتے تو میں کبھی بھی یہ حقیقت آپ کے سامنے بیان نہ کرتی۔ بہت سی باتیں انسان خود سے کہتے ہوئے بھی جھجکتا ہے۔ مگر چوں کہ آپ رشتہ داری کے خواہش مند ہیں۔ مگر اس سے پہلے میں آپ کو بہت کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ جیسے آپ لوگوں کی خواہش ہے ماہی کو اپنے گھر کی بہو بنانا ویسے ہی میری بھی یہی خواہش ہے کہ مہر میرے گھر کی بہو بنے اور اس ناطے میں آپ کو ماہی کے بارے میں سب بتانا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد آپ کا جو فیصلہ ہو گا مجھے وہ منظور ہو گا۔" انہوں نے تفصیل سے کہا تو وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگیں۔ ایسا بھی کیا تھا جو ماہی کی ذات سے منسلک تھا؟

☆ ☆ ☆

شاہنواز' آفاق کا کلاس فیلو تھا۔ بے حد وجیہہ' دولت مند مگر اس کے باوجود وہ سب سے انکساری سے ملا کرتا تھا۔ زمیندارانہ بیک گراؤنڈ ہونے کے باوجود وہ بالکل مختلف دکھائی دیتا تھا۔ غریبوں کی مدد کرنا' حسن سلوک اور ایسی بہت سی نیک خصلتیں اس میں موجود تھیں۔ وہ چار سال تک کلاس فیلو رہے مگر ان کے درمیان محض سلام دعا ہی رہی تھی۔ چوتھے سال کے آخر میں شاہنواز نے خود ہی اس سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ آفاق اسے پسند کرتے تھے۔ انہیں لگا تھا کہ وہ واقعی ان کا بہترین دوست بن سکتا ہے۔ مگر اس دوستی کے پیچھے چھپی وجہ انہیں معلوم نہیں ہو سکی تھی۔

شاہنواز کی ظاہری شخصیت اور پھر اس پر چڑھا نیکی کا غلاف اسے بے حد بہترین انسان کے روپ میں پیش کرتا تھا۔ تعلیم گاہ کے اندر شاید اس سے زیادہ بہترین اسٹوڈنٹ' بہترین دوست کوئی نہیں تھا۔ ہزاروں لڑکیاں اس پر مرتی تھیں مگر اس نے کبھی ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اسے ان لڑکیوں میں سے کوئی بھی اپنے معیار کی نہ لگتی تھی۔

رہی دل بہلانے کی بات تو اس کے پاس اور بہت سے ذرائع تھے جس سے وہ اپنی زندگی رنگین رکھے ہوئے تھا۔ پھر وہ ان ناپسندیدہ لڑکیوں کی طرف توجہ دے کر اپنی نیک نامی کو کیوں خراب کرتا؟ اس نیک نامی کا بھی اسے الگ ہی مزا ملتا تھا اور وہ اپنے ساتھیوں اور اساتذہ کو بے وقوف بنا دیکھ دل ہی دل میں خوب ہنستا۔

آفاق سے دوستی کی وجہ فضیلہ تھی۔ وہ مارکیٹ آیا تھا اپنے لیے کچھ خریدنے وہاں اس نے آفاق کے ساتھ فضیلہ کو دیکھا تھا۔ بے حد معصوم چہرہ' بڑی بڑی آنکھیں۔ چادر سے چھپے وجود سے بھی کرنیں پھوٹتی لگتی تھیں۔ لمحے بھر کے لیے وہ مبہوت ہو کر رہ گیا تھا۔ اس میں اسے عجیب سی کشش محسوس ہوئی تھی اور وہ غیر ارادی طور پر اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ آفاق اسے دیکھ کر خوش دلی سے ملا تھا جبکہ فضیلہ فوراً" ہی وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ اس کے اس گریز نے اسے کچھ اور اپنی سمت کھینچا تھا۔

اگلے بہت سے دن وہ اسی کے متعلق سوچتا رہا تھا۔ وہ لڑکی اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی اور اب اسے وہ اپنی زندگی میں چاہیے تھی۔ اس نے آفاق سے راہ و رسم بڑھائے۔ ان کے گھر آنے جانے لگا مگر فضیلہ کی ایک جھلک بھی اسے دکھائی نہ دی۔ وہ تڑپ اٹھتا تھا۔ اپنی بے قراری اسے سمجھ نہ آئی تھی۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ وہ صنف نازک کی محبت میں کبھی بھی مبتلا نہیں ہو سکتا۔ جو چیز اسے اپنی دسترس سے دور لگے وہ اس کے لیے یونہی دیوانہ ہو جایا کرتا تھا فضیلہ اس کی پہنچ سے کوسوں دور تھی۔

امتحانات ختم ہونے کے بعد وہ حویلی گیا تو اس کی ایک ہی ضد تھی کہ فضیلہ کو اس گھر کی بہو بنایا جائے۔ شاہنواز کے والد اقبال یہی سمجھے تھے کہ یقیناً" کوئی آوارہ لڑکی ہی اسے پسند آئی ہو گی مگر اپنے سر چڑھے بیٹے کی خواہش تو انہیں پوری کرنی ہی تھی ہر صورت۔ شاہنواز کے ہمراہ جب وہ آفاق اور ان کے والدین سے ملے تو حیران رہ گئے۔ شاہنواز کی پسند ایسا خاندان ہو گا وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

اقبال صاحب کی سوچ بہت مختلف تھی۔ وہ شاہنواز کو اپنے جیسا بنانا چاہتے تھے مگر ان کی جاہل بیوی اور ان کے فخر و غرور میں ڈوبے والد نے اس کی تربیت خوب ہی کی تھی۔ وہ اکثر مصروف رہتے تھے۔ شاہنواز کی طرف ان کی توجہ ذرا کم ہی رہی اور جب انہیں ہوش آیا تو پانی سر پر سے گزر گیا تھا۔ وہ بالکل ان کے باپ جیسا تھا۔ ظالم اور خود سر۔

وہ اس کی دوغلی شخصیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ بے حد ذہین تھا مگر اس کی ذہانت منفی رجحانات کی طرف مائل تھی۔ وہ کوشش کے باوجود اسے راہ راست پر نہیں لا سکے تھے اور اب ان کے دل میں امید کی کرن جاگی تھی۔ فضیلہ کی صورت۔

رشتے کی خواہش سن کر انہیں تو حیران ہونا ہی تھا۔ کہاں وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے اور کہاں وہ جدی پشتی جاگیردار۔ مگر ان کا بڑھتا اصرار ان کے سارے اعتراضات بہالے گیا۔ شاہنواز کی شخصیت جادوگر تھی۔ سب ہی اس کے سحر میں ڈوبے تھے۔ آفاق کو لگتا تھا کہ فضیلہ جیسی لڑکی کے لیے شاہنواز ہی بہترین شوہر ثابت ہو گا اور اسی غلط خیال نے انہیں ہاں پر مجبور کر دیا۔

فضیلہ شاہنواز' آفاق اور عافیہ کی شادیاں ایک ساتھ ہوئی تھیں۔ عافیہ ان کے والد کے دوست کی بیٹی تھی۔ ایک بیٹی رخصت ہوئی تو دوسری آ گئی۔ فضیلہ اور عافیہ بچپن کی سہیلیاں بھی تھیں۔

یوں لگتا تھا گویا زندگی میں بس یہی خوشی کے رنگ بھرتے رہیں گے۔ یہ خوشیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ وقت یوں ہی سبک رفتاری سے سہل انداز سے گزرتا چلا جائے گا مگر ایسا کبھی ممکن ہوا ہے؟ زندگی کی پہیلیاں اور مصلحتیں آج تک کوئی نہیں سمجھ پایا۔ سمجھنا ضروری بھی نہیں بس قبول کرنا ضروری ہے اور قبولیت کے مراحل کس قدر تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتے ہیں یہ وہی جانتا ہے جس پر زندگی نے سانسیں حرام کی ہوں۔

شادی کے بس چند دن ہی سکھ اور چین سے

کررہے تھے۔ دھیرے دھیرے وہ اپنی اصلیت دکھانے لگا۔ محض چند ماہ میں ہی اس کی دلچسپی فضیلہ میں سے ختم ہوگئی تھی۔ البتہ اس نے اسے گھر بدر نہیں کیا تھا کچھ بھی تھا اس کے گھر کو اس کے والد کو وہ سنبھال رہی تھی۔ اسے ایک بیوی تو چاہیے ہی تھی اور فضیلہ سے زیادہ اچھی عورت اسے مل نہیں سکتی تھی۔

اگر فضیلہ چپ چاپ اس کی بدکاری 'حرام خوری اور ایسی بہت سی برائیاں برداشت کرتی رہتی تو وہ یقیناً" زندہ رہ لیتی۔ مگر اس کی سرشت میں ظلم برداشت کرنا نہیں تھا۔ اسے پہلا تھپڑ تب پڑا تھا جب اس نے شاہنواز کو نماز ادا کرنے کا کہا تھا اور پھر اس کے بعد جب جب وہ احتجاج کرتی 'وہ اس پر بے دریغ ہاتھ اٹھاتا۔ کئی بار اس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیا مگر شاہنواز کی دھمکیاں اسے خاموش ہوجانے پر مجبور کردیتیں۔ اس کی وجہ سے اس کے بھائی کی زندگی خراب ہو۔ ماں باپ پر برا اثر پڑے۔ وہ یہ سب نہیں چاہتی تھی۔ وہ دن رات دعائیں مانگتی کہ شاہنواز بدل جائے۔

شادی کو ایک سال ہوگیا تھا۔ عافیہ کی گود میں عالی شان آچکا تھا اور وہ اب تک اس نعمت سے محروم تھی۔ آفاق کی اولاد دیکھ کر شاہنواز کو بھی باپ بننے کی خواہش بے چین کرنے لگی۔ فضیلہ قدرت کی طرف سے منتظر تھی اور شاہنواز اس ذرا سی دیر کو بھی اسی کے کھاتے میں ڈالتا۔ اقبال اسے لاکھ سمجھاتے مگر دولت 'اقتدار کا نشہ اسے کچھ بھی سوچنے سے پرے ہی رکھتا تھا۔

فضیلہ کی دعائیں رنگ لائیں۔ وہ بھی امید سے ہوگئی۔ یہ خبر سن کر شاہنواز بہت خوش ہوا تھا۔ اس کا خیال رکھنے لگا۔ اس کے دل میں امید جاگی تھی کہ شاید اولاد دیکھ کر وہ بدل جائے مگر ایسا نہیں ہوا۔ آفاق کے گھر صولت پیدا ہوئی اور اس کے ایک ہفتے بعد فضیلہ نے ایک مرے ہوئے بیٹے کو جنم دیا۔ شاہنواز کئی دن افسردہ رہا۔ نہ اس نے کوئی جھگڑا کیا اور نہ ہی کوئی عیاشی۔ اس کا وارث مرگیا تھا۔ کچھ دن وہ غم منا کر پھر سے پرانا شاہنواز بن گیا۔

دوسری مرتبہ فضیلہ نے جڑواں بچوں کو جنم دیا۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ مگر گھنٹے بھر کے بعد ہی نجانے کیا ہوا تھا کہ اس کے نوزائیدہ بیٹے کا سانس رک گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے لمحے بھر میں وہ ننھا وجود مردہ ہوگیا تھا۔ وہ پتھرائی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی تھی۔

شاہنواز اسی وقت اندر آیا تھا۔ وہ زمینوں سے لوٹا تھا۔ فون پر ہی اسے بچوں کی پیدائش کی خبر ملی تھی اور جب وہ بے تحاشا خوشی سے چلاتا ہوا پہنچا تو سامنے کا منظر اس کے حواس چھیننے کے لیے کافی تھا۔

سارے نوکر مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے۔ شاہنواز یہ ماننے سے انکاری تھا کہ اس کا بیٹا خدا کی رضا سے مرا ہے۔ اسے یہ سب ایک سازش لگی تھی۔ ساکت بیٹھی فضیلہ کو اس نے دیکھا اس کی گود میں معصوم سی گڑیا تھی۔ فضیلہ کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔

"او تو اب سمجھ میں آیا تم نے مجھے شکست دینے کے لیے اپنے ہی بیٹے کو قتل کردیا۔" اس کا الزام سن کر فضیلہ کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے وجود کو کانٹوں پر گھسیٹ لیا ہو؟ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ لائن سے کھڑے ملازم بھی منہ کھولے اسے دیکھنے لگے۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ بی بی نے کچھ نہیں کیا۔ میرے سامنے بچے نے دم توڑا ہے۔ بی بی کی کوئی غلطی نہیں۔" وہ اس گھر کی پرانی نوکرانی تھی اسی کے ہاتھوں بچوں کا جنم ہوا تھا۔ فضیلہ کے منہ سے آواز ہی نہیں نکلی۔ وہ اتنی شاکڈ تھی کہ اپنے قریب آتے شاہنواز کو بھی نہ دیکھ پائی۔ ایک ماں اپنی اولاد کو کیسے قتل کرسکتی ہے؟ شاہنواز کی اس گھٹیا ترین بات نے اس کا دماغ ماؤف کردیا تھا۔ شاہنواز نے اس کی گود میں لیٹی بچی کو اٹھایا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتی جو ہوا اس نے زمین و آسمان ہلا کر رکھ دیے تھے۔ شاہنواز نے اس معصوم کی گردن پر اپنے ہاتھوں کا دباؤ ڈالا تھا۔ ہر شے جیسے ساکت رہ گئی تھی۔ شاہنواز کی سفاکی پر آسمان بھی

ترتیب ترتیب کر رویا تھا۔ وہ رات بہت بھیانک تھی۔ اس کی تاریکی نے فضیلہ کے وجود کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اور جب اسے ہوش آیا تو وہ خرد کھو چکی تھی۔ اس کی اس حالت کی اصل وجہ چھپادی گئی تھی۔ سب کو یہی کہا گیا کہ دونوں بچوں کی موت نے اس کے دماغ پر برا اثر ڈالا ہے۔ شاہنواز کی اجازت سے وہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ شاہنواز کے والد بھی اس حقیقت سے انجان تھے۔ اگر انہیں خبر ہوتی تو شاہنواز کا یہ گناہ وہ کبھی معاف نہ کرتے۔

فضیلہ کا علاج شروع کروایا گیا۔ علاج کے ابتدائی دنوں میں ہی عافیہ کے ہاں سیماب کی پیدائش ہوئی۔ عافیہ نے نجانے کیا سوچ کر سیماب کو اس کی گود میں ڈالا تھا مگر سیماب کو وہ اپنا بچہ سمجھی تھی۔ ڈاکٹرز کے بہترین علاج، گھر والوں کی محبت اور سیماب کے ننھے وجود کی وجہ سے وہ بہت تیزی سے صحت یاب ہوئی تھی اور چند ماہ میں وہ بالکل بدل گئی تھی۔ وہ کچھ بھی نہیں بھولی تھی۔ سارا ظلم اسے اچھی طرح یاد تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ شاہنواز کو نہیں چھوڑے گی۔ مگر مقابل بھی شاہنواز تھا۔

فضیلہ نے فی الحال کوئی بھی بات اپنے گھر والوں کو نہیں بتائی تھی کیونکہ اسے علم تھا کہ وہ اسے دوبارہ حویلی نہ جانے دیتے اور شاہنواز پر کیس کر دیتے۔ شاہنواز ٹھہرا زمیندار اور اثر و رسوخ والا آدمی۔ دشمنی میں وہ کسی بھی حد تک جا سکتا تھا اور فضیلہ کو ایک مضبوط سہارے کی ضرورت تھی اور وہ اقبال صاحب کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں تھا۔ شاہنواز فضیلہ کی خاموشی سے بہت کچھ اخذ کر چکا تھا۔ اس کے پاس فضیلہ کو روکنے اور خاموش کروانے کا حل بھی موجود تھا۔ سیماب کی صورت۔ سیماب کو قتل کر دینے کی دھمکی نے فضیلہ کو منہ بند کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ ایک بار پھر بے زبان جانور بن گئی۔

ماہی کے پیدا ہوتے ہی فضیلہ نے سیماب کو واپس کر دیا۔ شاہنواز کو ماہی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی اپنی الگ دنیا تھی وہ وہیں مگن رہتا تھا۔ فضیلہ کو نہیں معلوم تھا کہ اس کے علاوہ شاہنواز کی اور کتنی بیویاں ہیں مگر وہ ان میں سے کسی ایک کو بھی حویلی نہیں لایا تھا البتہ کئی بار اس نے کہا ضرور تھا کہ وہ نکاح کر چکا ہے۔

سالوں پر سال گزرتے چلے گئے۔ فضیلہ نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ بالکل بے بس ہو گئی تھی۔ اقبال صاحب کی زندگی کا محور ماہی تھی۔ وہ اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی وہ اسے۔ فضیلہ پر انہیں بہت ترس آتا تھا۔ انہیں کبھی کبھی اس کے صبر پر حیرت ہوتی اور ایک روز انہیں اس کی خاموشی کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔

شاہنواز بہت دن بعد گھر آیا تھا اور نجانے کس موڈ میں تھا کہ ماہی کو گود میں بھر لیا اور پیار کرنے لگا۔ ماہی حیرت بھری نگاہوں سے اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی۔ فضیلہ نے اسے ماہی کو اٹھاتے دیکھا تو چیل کی طرح اس پر جھپٹی تھی۔ کمرے سے نکلتے اقبال صاحب نے حیرت سے فضیلہ کی یہ حرکت دیکھی تھی۔ اس نے شاہنواز سے ماہی کو چھین لیا تھا۔

"خبردار جو میری بیٹی کو ہاتھ لگایا تو؟" وہ ماہی کو سینے سے لگائے ہذیانی انداز میں بولی تھی۔ بہت سال پہلے کا منظر اس کی آنکھوں میں ناچ رہا تھا وہ جیسے پاگل ہو گئی تھی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟ یہ صرف تمہاری بیٹی نہیں ہے۔ اپنی اوقات میں رہو اور ماہی کو مجھے دو۔" وہ غصے سے اس کے قریب بڑھا تھا۔

"آگے مت بڑھنا۔ ماہی سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ تم جیسا درندہ اور وحشی میری ماہی کا کچھ نہیں لگتا۔" وہ اسے سینے سے چمٹائے چلا رہی تھی۔

"بکواس بند کرو گھٹیا عورت۔" وہ دھاڑا تھا۔

"تمہارا کیا بھروسہ جیسے پہلی بیٹی کا گلا دبا کر قتل کر دیا تم اسے بھی قتل کر دو۔ میں تمہیں ماہی کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دوں گی چاہے تم کچھ بھی کرو۔" اتنی پرانی بات اس کے منہ سے ادا ہو گئی تھی۔ اقبال صاحب کو

لگا تھا کہ زمین ان کے پیروں سے سرک گئی ہے اور شاہنواز کا سارا ضبط ختم ہو گیا تھا اس سے پہلے کہ وہ اسے اذیت کا نشانہ بناتا۔

اقبال صاحب کی گرج دار آواز نے اسے رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ انہوں نے زندگی میں پہلی بار شاہنواز پر ہاتھ اٹھایا تھا اور پھر ان کا ہاتھ رکا نہیں تھا۔ پوری حویلی نے یہ تماشا دیکھا تھا۔ شاہنواز نے ایک خونخوار نگاہ فضیلہ پر ڈالی تھی اور حویلی سے نکل گیا تھا۔ اقبال صاحب وہیں زمین پر بیٹھ کے رونے لگے۔

☆ ☆ ☆

اقبال صاحب نے جو فیصلہ کیا تھا اس پر سب حق دق رہ گئے تھے۔ انہوں نے اپنی تمام جائیداد فضیلہ کے نام کر دی تھی۔ شاہنواز کو جب اس کی خبر ملی تو وہ بھوکا شیر بن گیا۔

"مجھے یہ کام بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ میری خاموشی، مصلحت پسندی کو بزدلی سمجھ بیٹھے تھے تم تمہارے پاس تمہاری ماں کی جائیداد ہے اس جائیداد کے ساتھ جو جی میں آئے کرو۔ یہ حویلی اب فضیلہ کی ہے اور وہ تمہیں اس حویلی میں برداشت نہیں کرے گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ سامان اٹھاؤ اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ دوسری صورت میں میں تم پر کیس کر دوں گا۔ سوچ لو کہ کیا حشر ہو گا تمہارا۔" انہوں نے تحمل سے کہا تھا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہ پاگل ہو گیا تھا۔ بالکل پاگل۔ فضیلہ جو اس کی آمد سے بے خبر اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ ماہی بھی اس کے قریب سوئی تھی۔ شاہنواز کی دھاڑ پر وہ دونوں بری طرح ہڑبڑا کر جاگی تھیں۔

"تم یہاں؟" وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

"جائیداد کے پیپرز ابھی اور اسی وقت میرے حوالے کر دو۔" وہ اس کے سر پر کھڑا جیسے کوئی بہت ہی معمولی شے طلب کر رہا تھا۔ فضیلہ کو اس کی موجودگی کی وجہ سمجھ آ گئی۔

"پیپرز بابا کے پاس ہیں۔ میرے پاس نہیں۔" اس نے مطمئن انداز میں جواب دیا تھا اور پھر سے لیٹ گئی اس کی یہ بے نیازی شاہنواز پر بری طرح اثر انداز ہوئی تھی۔ اس نے اس کا بازو پکڑ کر اسے کھینچا تھا۔ وہ درد سے کراہتے ہوئے اٹھ گئی۔

"مجھے ابھی اور اسی وقت پیپرز چاہیے ورنہ دوسری صورت میں تمہارے لیے بہت برا ہو جائے گا۔" وہ اس کو جھٹکا دے کر بولا۔ فضیلہ نے اس سے اپنا آپ چھڑایا۔

"تمہیں جو جی میں آئے وہ کرو۔ پیپرز تو میں تمہیں کسی صورت نہیں دوں گی۔" اس نے بے خوفی سے کہا تھا۔

"دیکھتا ہوں کہ تم کیسے وہ پیپرز نہیں دو گی۔" وہ اپنی سرخ آنکھوں سے اسے گھورتا ہوا بولا۔ اور پھر اس نے اس کے بال اپنی مٹھیوں میں جکڑ لیے تھے۔ ماہی یہ سارے مناظر بہت عرصے سے دیکھتی آ رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح خوف سے وہ زرد ہو گئی تھی۔ فضیلہ کی چیخیں پوری حویلی میں گونجنے لگی تھیں۔ شاہنواز اسے گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لے آیا۔

ماہی ماں کو بچانے کے لیے شاہنواز کے پیچھے دوڑی تھی۔ شور شرابے سے حویلی کے سارے ملازم اکٹھے ہو گئے تھے۔ ایک ملازم دوڑ کر اقبال صاحب کو بلا لایا۔ وہ تو یہی سمجھے تھے کہ شاہنواز غصے سے باہر نکل گیا ہو گا جیسا کہ اس کی عادت تھی۔ مگر وہ سارے حساب آج ہی بے باق کر لے گا اس کا انہیں اندازہ نہیں تھا۔

شاہنواز وحشیوں کی طرح اسے پیٹ رہا تھا۔ اقبال صاحب اسے بچانے کے لیے آئے تھے مگر شاہنواز نے انہیں بھی دھکا دے دیا۔ ان کا بوڑھا وجود لڑکھڑا کر نیچے جا گرا۔ ماہی دوڑ کر ان سے لپٹ گئی تھی۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ شاہنواز کو روک سکے۔ کوئی آگے نہیں بڑھا تھا۔ جو لوگ ظلم ہوتا دیکھ کر بھی خاموش رہیں۔ ان کی بے حسی کا خوف ان پر اسی طرح کے حکمران مسلط رکھتا ہے۔

شاہنواز جانتا تھا کہ اگر وہ پیپرز حاصل کر بھی لے تو بھی اس کے والد جائیداد کو اس کے نام منتقل نہیں

ہونے دیں گے اور بچے کے قتل کا پول بھی کھل چکا تھا۔ فضیلہ کے نام جائیداد کرنے کا مطلب تھا اسے طاقت ور بنانا اور فضیلہ کسی صورت اسے معاف نہ کرتی جائیداد ہتھیانے اور قتل کے کیس سے بچنے کے لیے اس کے پاس ایک ہی راستہ تھا اور اس نے وہ راستہ اپنا لیا تھا۔

☆ ☆ ☆
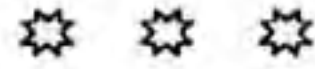
"میں نے ساری بات عائشہ بیگم کو بتا دی ہے اور انہیں ماہی کے ماضی سے یا پھر اب جو کچھ ہو رہا ہے ان سب باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ تو اس بات سے بے حد خوش ہوئیں کہ ہم نے ان پر اتنا بھروسہ کیا اور ساری سچائی بتا دی۔ وہ ماہی کو ہر صورت اس گھر کی بہو بنانا چاہتی ہیں ساتھ ہی ساتھ انہیں مہر اور سیماب کے رشتے پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ بس رسمی سی اجازت چاہیے شاہ دل سے۔" وہ آفاق صاحب کو تفصیل بتا رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر بہت عرصے بعد اطمینان دکھائی دیا تھا۔ آفاق صاحب ان کے چہرے کی چمک دیکھ کر مسکرائے۔

"عافیہ بیگم شاہ دل اور اس کی فیملی کے لوگ واقعی بڑے دل کے مالک ہیں۔ انہیں بھلے کوئی اعتراض نہ ہو مگر... ماہی... ماہی کو کیسے راضی کریں گی آپ...؟ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ وہ شادی کی بات سن کر کس طرح کا رویہ ظاہر کرے گی۔ اسے منانا مشکل ترین امر ہے اور میں اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر پاؤں گا۔ جو بھی کرنا ہے آپ کو اکیلے کرنا ہے۔ ماہی کے آنسو، اس کا رونا دھونا میں برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ انکار کرے گی تو میں کبھی بھی اس رشتے کے لیے ہاں نہیں کر پاؤں گا اسی لیے بہتر ہو گا آپ اسے مجھ تک پہنچنے ہی نہ دیں اور اسے اپنے طریقے سے سمجھائیں اور اس رشتے کے لیے راضی کریں۔" انہوں نے اپنی بات مکمل کی عافیہ کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ یہ مرحلہ بے حد مشکل ہے۔ ماہی کو منانا بہت مشکل ہے لیکن جہاں اس پاک ذات نے شاہ دل کی صورت انہیں بہترین اور سیدھا راستہ دکھایا وہیں وہ ماہی کے دل کو بھی نرم کرے گا اس بات پر انہیں پورا یقین تھا۔ مگر انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کے کچھ الفاظ ماہی کو ایک ہی رات میں اقرار کرنے پر مجبور کر دیں گے اور وہ شاہ دل کی زندگی میں کسی خواب کی طرح شامل ہو جائے گی۔

اگلے روز وہ سارا وقت الفاظ ترتیب دیتی رہیں کہ کس طرح ماہی کے سامنے یہ بات رکھی جائے اور جب وہ ماہی کے پاس آ کر بیٹھیں تو ترتیب دیے گئے جملے بھک سے اڑ گئے۔ وہ بے چارگی سے ماہی کی شکل دیکھنے لگیں۔

"ماہی کیا بات ہے۔ ایسی پریشان صورت بنا کر کیوں بیٹھی ہیں۔" وہ ان کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے بولی۔

"مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے ماہی۔" انہوں نے بالآخر ہمت کر ہی لی۔

"جی کہیے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ عافیہ نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"ماہی میں جو کہہ رہی ہوں اسے بہت غور سے سننا اور تحمل سے سوچ بچار کے بعد مجھے جواب دینا۔" وہ تمہید باندھنے لگیں ماہی الجھ کر انہیں دیکھنے لگی۔

"ماہی، صاف صاف بتائیں کہ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟" وہ پریشان سی ہو گئی۔ انہوں نے گہری سانس بھری۔

"ولیمہ والے روز میں نے مہر کے رشتے کی بات کرنا چاہی تھی مگر عائشہ بیگم نے مجھ سے پہلے ہی مجھ سے کچھ مانگ لیا۔" وہ ماہی کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولیں وہ مزید الجھ گئی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ..." انہوں نے ساری بات اس کے گوش گزار کر دی اور ماہی... ماہی تو یہ سب سنتے ہی سنتے سے اکھڑ گئی۔ اسے شدید غصہ آرہا تھا۔ اس نے جھٹکے سے اپنے دونوں ہاتھ ان کے ہاتھوں سے چھڑائے تھے اور بیڈ پر سے اٹھ گئی۔ عافیہ بیگم اسے

دیکھنے لگیں۔

"ان کی ہمت کیسے ہوئی میرا نام لینے کی؟ اور آپ... آپ مجھے یہ ساری باتیں کیوں بتا رہی ہیں؟ آپ نے اسی وقت انہیں انکار کیوں نہیں کر دیا؟" وہ غصے سے بے قابو ہو کر چلا رہی تھی۔ عافیہ بیگم بھی کھڑی ہو گئیں۔

"ماہی تمہارا دماغ تو اپنی جگہ پر ہے ناں؟ تم اتنی سی بات پر اس طرح کیوں چلا رہی ہو؟" وہ اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں پر نگاہیں جمائے بول رہی تھیں ماہی کا فشار خون تیزی سے بلند ہو رہا تھا۔

"کیوں نہ چلاؤں میں؟ وہ لوگ ہوتے کون ہیں میرا نام لینے والے؟" وہ پھر چیخی تھی۔

"جب تم سیماب کے لیے مہر کا رشتہ مانگنے کا کہہ سکتی ہو تو کیا تمہارا ہاتھ کوئی نہیں مانگ سکتا؟ جہاں بیری ہے وہاں پتھر تو آئیں گے۔ اور ایک نہ ایک دن تمہاری شادی کرنی ہی ہے۔ اور شاہ ول اس لحاظ سے بالکل مناسب ہے۔" وہ ماہی کے برعکس بہت پر سکون انداز میں بولی تھیں مگر یہ سکون صرف دکھاوے کا تھا اندر ہی اندر وہ اس کے شدید رویے سے خائف اور پریشان ہو رہی تھیں۔ ماہی ان کی بات پر صدمے سے گنگ ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

"مامی..." اس کی آواز میں حیرت، دکھ نجانے کیا کیا تھا۔

"ماہی... تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ صولت کی بھی تو شادی کی ہے ہم نے۔ وہ تو تمہاری طرح نہ چیخی نہ چلائی۔ نہ روئی دھوئی۔ پھر تم کیوں اس طرح سے کر رہی ہو؟" وہ یوں بولیں جیسے انہیں کچھ خبر ہی نہ ہو کہ اس کے اس رویے کے پیچھے کیا عوامل کارفرما ہیں ماہی بہت کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"مجھے شادی نہیں کرنی نہ آج نہ کل۔" وہ قطعیت سے بولی۔ بہت سے بے قرار آنسو اس کے چہرے پر پھسلنے لگے تھے۔

"شادی نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔ کہیں تم اپنی ماں کی وجہ سے تو..." ان کا اتنا کہنا تھا کہ اس کے رونے کی شدت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ وہ اس کے قریب آ گئیں اور اسے اپنے ساتھ لگائے بیڈ پر بٹھانے لگیں پھر اس کے چہرے کو اپنی انگلیوں سے صاف کیا۔

"ماہی شاہ ول ایسا ہرگز نہیں جیسا تم سوچ رہی ہو۔" وہ اس کی ٹھوڑی چھو کر بولیں۔

"جب ماموں نے امی کا رشتہ طے کیا تھا تب وہ شخص بھی ماموں کو بہت نیک لگا تھا۔" اس نے گہرے دکھ بھرے لہجے میں کہا... "اور پھر... پھر کیسا شخص نکلا؟ سب کچھ تباہ و برباد کر دیا اس نے میں... میں بھی شادی نہیں کروں گی۔ مجھے اتنی اذیت ناک موت نہیں مرنا۔" وہ بری طرح خوف زدہ ہو گئی تھی۔ انہوں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور تھپکنے لگیں۔

"ہر مرد شاہنواز جیسا نہیں ہوتا۔ تمہارے ماموں بھی تو ہیں میرا کتنا خیال رکھتے ہیں عالی شان اپنی بیوی اور بچی پر جان چھڑکتا ہے اور سیماب... وہ بھی تو مہر کی محبت میں مبتلا ہے۔ تم ان لوگوں کو کیوں نہیں دیکھتیں ان کی اچھائی اور محبت کو کیوں نہیں محسوس کرتیں؟" وہ نرمی اور پیار سے سمجھانے لگیں وہ ان سے نرمی سے الگ ہوئی۔

"مامی، میں ان تین مردوں کے علاوہ کسی چوتھے پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔ سب کہتے ہیں کہ بیٹیاں ماؤں کی قسمت چراتی ہیں اور میں میری تو شکل بھی امی جیسی ہے۔ میری قسمت بھی ان جیسی ہی ہو گی۔ مامی پلیز مجھ پر رحم کریں۔ مجھے جینے دیں۔" وہ ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر بولی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہیں۔ اسے یوں روتا دیکھ کر ان کے دل پر کیا گزر رہی تھی۔ یہ وہی جانتی تھیں۔ اپنا دل قابو کیے وہ اسے بلکتا دیکھتی رہیں۔

"ماہی تم جانتی ہو کہ میں نے تمہیں شاہ ول کے رشتے کے متعلق کیوں بتایا؟ میں کیوں چاہتی ہوں کہ تم اس رشتے کے لیے ہاں کرو۔" وہ پر سوچ لہجے میں بول رہی تھیں ماہی نے بھیگا چہرہ اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"کیونکہ تم اٹھارہ سال کی ہونے والی ہو۔" انہوں نے آہستگی سے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے اٹھارہ سال کے ہوتے ہی ساری جائیداد اور وہ حویلی تمہارے نام ہو جائے گی۔"

"جی معلوم ہے مجھے مگر اس بات کا یہاں کیا ذکر؟" اسے سمجھ نہیں آئی تھی۔

"اسی بات کا ہی تو ذکر ہے۔ ہم نے تم سے یہ بات چھپائی مگر اب وقت آگیا ہے کہ میں تمہیں ساری حقیقت سے آشنا کردوں۔ تاکہ تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ پھر بھی اگر تمہیں اس رشتے سے انکار کرنا ہوا تو ہم تم پر زور زبردستی نہیں کریں گے۔"

"ماں پلیز۔ صاف صاف بتائیں۔ پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہیں۔" اس کا دل عجیب گھبراہٹ میں مبتلا ہونے لگا تھا۔ ان کا ضرورت سے زیادہ سنجیدہ اور محتاط انداز اسے چونکا رہا تھا۔

"تو پھر سنو۔ شاہنواز جیل سے رہا ہو کر آچکا ہے۔" انہوں نے بالآخر اسے حقیقت بتا ہی دی۔ ماہی کی چلتی سانسیں کچھ لمحوں کے لیے رک گئی تھیں۔ وہ اس قدر شاک تھی کہ بہت دیر تک اس کی آواز بند رہی۔ ماں اس کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"ماہی بی ریلیکس۔" انہوں نے اسے خود سے لگاتے ہوئے کہا۔ وہ ان سے سختی سے لپٹ گئی بہت سے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگے تھے۔ اس کے لبوں سے سسکیاں نکلنے لگیں۔

"ماہی... رو مت بیٹا۔" وہ اسے سنبھالنے لگیں۔ وہ بہت دیر تک روتی رہی۔

"رونے سے کچھ نہیں ہونے والا۔ تمہارے ماموں تمہارے لیے بہت فکرمند ہیں مگر تم اچھی طرح جانتی ہو کہ شاہنواز کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اس کے پاس پیسے کی طاقت ہے اور ہم .... ہم ہر طرح کی کوشش بھی کرلیں تو بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ بہت دن سے تمہارے ماموں کو دھمکیاں دے رہا ہے۔ اس رات جو شخص تمہارے کمرے میں آیا تھا وہ بھی شاہنواز کا بھیجا ہوا تھا۔" وہ دھیرے دھیرے حقیقتوں سے پردے اٹھا رہی تھیں۔ ماہی سانس روکے سب سن رہی تھی۔

"شاہنواز نے یہ تک کہا ہے کہ اگر ہم نے تمہیں اس کے حوالے نہ کیا تو وہ ہمارا پورا گھر جلا کر راکھ کر دے گا۔ میرے دونوں بیٹوں کو اس طرح سے غائب کر لے گا کہ ہم ڈھونڈ بھی نہیں پائیں گے ان سب دھمکیوں کے باوجود تمہارے ماموں نے، میں نے، تمہارے بھائیوں نے تمہیں خود سے الگ نہیں کیا۔ اب جب خدا نے ہماری مدد کا فیصلہ کرلیا ہے اور شاہ دل کی صورت ایک طاقت ور محافظ کو تمہارے لیے چن لیا ہے تو تم انکار کر کے ہمیں اسی مشکل میں پھر سے دھکیل دو۔ میں تم سے کوئی شکایت نہیں کروں گی۔

شاہنواز اپنے ارادے میں کامیاب ہو کہ نہ ہو مجھے نہیں معلوم مگر ہمارے جیتے جی تم اس کی دسترس میں کبھی نہیں جاؤ گی۔

میں نے عائشہ بیگم کو ساری حقیقت سے آگاہ کردیا تھا اور انہیں ان سب مسائل سے کوئی پریشانی نہیں بلکہ وہ تو ناراض ہو رہی تھیں کہ یہ بات انہیں پہلے کیوں نہیں بتائی گئی۔ جہاں تک شاہ دل کی بات ہے تو وہ تمہارا طالب ہے۔ تم سے محبت کرتا ہے اور اسی کے ایما پر تمہارا ہاتھ مانگا گیا ہے۔

اب یہ تمہاری مرضی کہ تم خدا پر بھروسہ کر کے اس رشتے کے لیے ہاں کرتی ہو یا پھر انکار تمہارا جو فیصلہ ہو گا وہ ہمیں منظور ہو گا۔ پھر بھلے ہی ہمیں اس فیصلے کی بھاری قیمت ہی کیوں نہ چکانی پڑے۔" وہ بات ختم کرتے ہوئے بولیں۔ اس دوران ماہی بالکل چپ رہی تھی۔ سب کچھ سر جھکائے سنتی رہی۔ عافیہ کو اس کے چہرے کے تاثرات سے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ ان کی باتوں نے اس پر کس طرح اثر کیا ہے۔ اس کے چہرے پر ناقابل فہم تاثرات تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے جھکا سر اٹھایا۔

"ماں، میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے بمشکل یہ چند لفظ ادا کیے تھے اس کے دل کے حال سے وہ باخبر تھیں۔ انہوں نے جاتے ہوئے اس کا ماتھا

چوما اور لائٹ آف کر کے چلی گئیں۔ ماہی بیڈ پر گر سی گئی۔

"امی۔" وہ سسکنے لگی۔

☆ ☆ ☆

دوسری طرف عائشہ بیگم یہ جان کر شدید حیران تھیں کہ ماہی شاہنواز کی بیٹی ہے۔ ان کے سہاگ کے قاتل کی بیٹی۔ اس وقت عافیہ بیگم کے سامنے تو انہوں نے خود پر قابو رکھا تھا اور اپنی حیرت ظاہر نہیں ہونے دی تھی مگر تب سے لے کر وہ اب تک بس یہی ایک بات سوچے جارہی تھیں۔ ماہی شاہنواز کی بیٹی ہے اس میں اس کا تو کوئی قصور نہیں تھا اور جو کچھ شاہنواز نے ماہی اور اس کی ماں کے ساتھ کیا سن کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

کیا کوئی شخص اس حد تک ظالم ہو سکتا ہے؟ وہ سوچتی اور ماہی کے لیے ان کے دل میں موجود محبت بڑھ جاتی۔ وہ آج بھی ماہی کو شاہ دل کی بیوی بنانا چاہتی تھیں مگر۔۔۔۔

شاہ دل اگر حقیقت جان لیتا تو دوبارہ کبھی نہ ماہی کی صورت دیکھتا اور نہ ہی اس خاندان سے کوئی تعلق رکھتا۔ اسے شاہنواز سے اور اس سے منسلک ہر ہر چیز سے شدید ترین نفرت تھی۔ وہ جذبات کے معاملے میں شدت پسند تھا۔ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ شاہ دل کو کیسے حقیقت بتائیں؟ نفرت میں وہ اس قدر آگے بڑھ چکا تھا کہ اپنی محبت کا بھی خیال نہ کرتا اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ایسا کچھ بھی ہو۔ وہ خود کو برباد کرے اور ان کے دل نے انہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ شاہ دل سے اس حقیقت کو مخفی رکھیں۔

☆ ☆ ☆

پھر سب کچھ بہت تیزی سے طے ہوا تھا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر تمام ضروری شاپنگ کرلی گئی تھی۔ اس نکاح کی خبر صرف قریبی لوگوں کو تھی۔ شاہ دل اور ماہی مہر اور سیماب کا نکاح ہال میں منعقد کیا گیا تھا۔ یہ طے ہوا تھا کہ ماہی کی رخصتی کر دی جائے گی مگر آفاق صاحب کے دل میں نجانے کیا سمائی کہ انہوں نے مہر کی رخصتی کی بھی بات رکھ دی۔ جو کچھ پس و پیش کے بعد قبول کرلی گئی تھی۔

روایتی طریقے سے یہ کام بھی انجام دے دیا گیا۔ مہر خوش رنگ سپنے لیے پیا دیس سدھاری جبکہ ماہی دل میں ہزاروں خوف، ہزاروں درد لیے شاہ دل کے سنگ اس کی گاڑی میں بیٹھی۔ ڈرائیور کار ڈرائیو کرنے لگا۔ ماہی کو اپنے اردگرد کا کچھ ہوش نہیں تھا وہ چونکی اس وقت جب اسے اپنے مہندی سے سجے ہاتھوں پر لمس محسوس ہوا۔ اس نے چونک کر اپنے برابر بیٹھے شاہ دل کو دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا ماہی نے سر جھکا لیا۔ اس کی مسکراہٹ نے بھی ماہی کے دل میں پھول نہیں کھلائے تھے۔ آنے والے لمحوں کا خوف اس پر مسلط تھا۔ ماضی اس کے دماغ سے چپکا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ سوچ سوچ کر پاگل ہو جائے گی اس نے تھک کر سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔

وسیع و عریض کمرہ پھولوں سے سجا تھا۔ کمرے کی آرائش میں سرخ گلاب اور موتیے کے پھول استعمال کیے گئے تھے۔ وہ اپنے چاروں اطراف دیکھنے لگی۔ ڈبل بیڈ جس پر وہ براجمان تھی۔ پورا کا پورا سرخ پھول کی پتیوں سے بھر دیا گیا تھا۔ بیڈ کے چاروں اطراف موتیے کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ بیڈ کے دونوں اطراف رکھے سائیڈ ٹیبلز پر رکھے خوب صورت لیمپس سے بھی موتیے کی لڑیاں لپٹی تھیں۔ مہر نے اسے بتایا تھا کہ کمرے کی سجاوٹ شاہ دل نے اپنے ہاتھوں سے کی ہے۔ مگر اس کے دل میں کوئی خوش کن احساس نہیں جاگا۔ اس بات نے بھی اس کے دل میں پھول نہیں کھلائے کہ وہ ایسے شخص کی بیوی بن چکی ہے۔ جو اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کی بیوی کے درجے پر فائز ہونے سے پہلے ہی وہ اس کے دل میں جگہ بنا چکی ہے لہٰذا اسے اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ اس کے چاروں اطراف جیسے گہرا سناٹا تھا۔

وہ بہت دیر سے ایک ہی پوزیشن پر بیٹھی تھی۔ وہ شاہ دل کا انتظار نہیں کر رہی تھی مگر یہاں بیٹھے رہنا اس

[illegible] تو وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر لیٹ گئی۔ اس کی نگاہ اپنے مہندی سے سجے ہاتھوں پر پڑی کس قدر خوب صورت لگ رہے تھے اس کے ہاتھ گندمی کلائیوں میں گہرے میرون رنگ کی چوڑیاں ان چوڑیوں پر نگاہیں جمائے کب اس کی آنکھ لگ گئی اسے خبر نہ ہوئی۔

اس کی آنکھ تکلیف کے شدید احساس سے کھلی تھی۔ اس نے اپنے سامنے دیکھا۔ شاہ دل اس کے پاس بیٹھا تھا۔ چوڑیوں سے سجی کلائی اس کی سخت اور بے رحم گرفت میں تھی۔ اس کی سختی کے باعث چوڑی ٹوٹ کر اس کی کلائی میں ہی کھب گئی تھی۔ وہ حیران ہو کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اسے اپنی نئی زندگی سے کوئی اچھی امید وابستہ نہیں تھی مگر اسے اتنے برے آغاز کی سوچ تک نہیں آئی تھی۔ شاہ دل کی نفرت سے بھری آنکھیں اس پر جمی تھیں۔ وہ بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر آواز جیسے گھٹ گئی۔ وہ اپنی کلائی چھڑوانے لگی۔ درد ناقابل برداشت تھا۔

"چھوڑیئے مجھے۔" کوشش کی بعد ناکام ہو کر وہ غصے سے چلا اٹھی۔ آنسو چہرے پر تیزی سے پھیلنے لگے۔ وہ اس کی کلائی چھوڑے بنا بستر سے اٹھ گیا اور اسے کھینچا۔ ماہی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ شاہ دل کا غصہ، اس کی نفرت وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ اسے گھسیٹتا آگے بڑھنے لگا۔

"ہاتھ چھوڑیں میرا۔ کہاں لے کر جا رہے ہیں مجھے آپ؟" وہ ایک بار پھر چلائی تھی۔ شاہ دل نے کمرے کا دروازہ کھولا اور جھٹکے سے اس کی کلائی چھوڑی۔ وہ لڑکھڑا گئی۔

"جہاں تمہاری جگہ ہے۔ تم اس کمرے کے اور میرے لائق نہیں۔" اس نے بس اتنا کہا اور دروازہ زور سے بند کر دیا۔ وہ حیرت اور دکھ سے جیسے پتھر ہو گئی تھی۔ وہ بند دروازے کو دھندلی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

عائشہ بیگم اپنے کمرے میں گہری نیند میں تھیں۔ نوکر اپنے کوارٹر میں وہ رات کے اس پہر اس بڑے [illegible] اس کا دماغ کچھ دیر کے لیے سن کر دیا تھا۔ کھڑے ہو ہو کر اس کی ٹانگیں شل ہونے لگیں۔ کلائی کی تکلیف بھی شدید تھی۔ اس نے اپنے اردگرد دیکھا چاروں طرف اندھیرا تھا۔ کوریڈور کی تمام لائٹس آف تھیں۔ در کے احساس کے ساتھ اب خوف کا احساس بھی اس پر غالب آنے لگا۔ وہ روتے روتے نیچے بیٹھ گئی۔ شدید خوف کے اثر سے گھبرا کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

☆ ☆ ☆

کمرے کا دروازہ بند کرتے ہی وہ پلٹا اور پھر تھم کر رہ گیا۔ کتنے ارمانوں سے اس نے یہ کمرہ اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کی دھند چھانے لگی تھی۔ وہ بیڈ کے قریب آگیا اور ایک وحشت کے عالم میں اس نے بیڈ پر پڑے سارے پھول مسل کر رکھ دیے۔ پھولوں کی لڑیاں اپنے پیروں میں روند دیں۔ ڈریسنگ ٹیبل پر سجے تمام لوازمات اور پرفیومز کو اس نے غصے سے پھینکا اور پھر وہیں بیٹھ کر رونے لگا۔ پہلی بار وہ تب رویا تھا جب اس کے بھائی کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا اور آج اس کے ارمان قتل ہو گئے تھے۔ جس لڑکی کو اس نے خود سے بھی زیادہ چاہا اس کی اصلیت کیا نکلی؟

اس کے ساتھ اتنا بڑا دھوکا ہو گیا تھا۔ جس لڑکی کو اس نے دن رات چاہا وہ تو اس کی نفرت کے قابل بھی نہیں تھی۔ پھر وہ اس سے محبت کیسے کر سکتا تھا۔ وہ اسے اپنی بیوی کا درجہ کیسے دے سکتا تھا؟

شاہ دل کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ ہر چیز کو آگ لگا دے۔ ماہی سمیت ہر شے کو تہس نہس کر دے۔ ماہی کی آنکھوں میں موجود، حیرت اور پھر شدید دکھ، دکھ کی شدت سے بہتے آنسو کچھ بھی تو اس پر اثر نہ کیا تھا۔ اس پر صرف ایک ہی بات کا اثر تھا جو سب سے گہرا تھا۔ ماہی اس کے بھائی کے قاتل کی بیٹی تھی۔

وہ یونہی بیٹھا رہا۔ کتنا وقت گزرا اسے خبر نہیں تھی۔ سوچیں منجمد ہو گئی تھیں۔ اذانوں کی صدا بلند ہوئی تو وہ چونکا۔ اللہ اکبر کی صدا پر اس کے دل سے بے اختیار شکوہ نکلا تھا۔ وہ کچھ دیر بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ پھر کسی خیال کے آتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو ماہی اسے دیوار کے ساتھ ٹکی ہوئی دکھائی دی۔ دونوں بازو اپنے گرد لپیٹے چہرہ گھٹنوں میں چھپائے۔

"ماہی" اس نے بمشکل اس کا نام پکارا۔ لہجہ بے حد سرد تھا۔ ماہی نے اس کی پکار کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"ماہی۔" اب کی بار آواز پہلے سے کافی بلند تھی۔ اور سخت بھی مگر وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ شاہ دل گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کا کندھا دوبار ہلایا۔ تب جا کر وہ ہڑبڑائی روتے روتے کب وہ سو گئی اسے خبر نہیں ہوئی۔ ماہی نے اپنی سرخ آنکھوں سے اپنے سے چند انچ کے فاصلے پر بیٹھے اپنے مجازی خدا کو دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں اجنبیت تھی۔ ماہی نے چہرہ موڑ لیا۔ لاکھ ضبط کے باوجود اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اسے روتا دیکھ کر اسے شدید کوفت نے گھیر لیا۔

"یہ ڈرامے بازی بند کرو۔ مجھ پر ان آنسوؤں کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ اسی لیے انہیں نہ بہاؤ تو بہتر ہو گا۔ اٹھو یہاں سے اور کمرے میں چلو" اس کے حکم پر ماہی نے غصے سے اسے دیکھا" رات آپ نے ہی مجھے اس کمرے سے نکالا تھا۔ میں اب اس کمرے میں دوبارہ قدم نہیں رکھوں گی۔ مجھے اپنے گھر جانا ہے۔ اور بس ۔" وہ ضدی مگر فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"میں نے تم سے تمہاری مرضی نہیں پوچھی چپ چاپ اندر چلو ورنہ۔۔۔" وہ غراتے ہوئے بولا۔

"ورنہ کیا۔ کیا کریں گے آپ۔۔۔ مجھے ماریں گے؟" وہ چلا کر بولی۔ شاہ دل نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے زبردستی گھسیٹتے ہوئے اندر لے آیا۔ ماہی پوری طاقت لگا کر بھی اپنا آپ چھڑا نہ سکی۔ کمرے میں آکر اس نے اسے خود سے دور کیا اور دروازہ لاک کر دیا۔

"کیوں کر رہے ہیں میرے ساتھ یہ سب؟" وہ روتے ہوئے بولی۔

"کیونکہ تم اسی لائق ہو۔ تمہارے ساتھ یہی سب ہونا چاہیے۔" وہ بولا۔

"اگر اتنی ہی نفرت تھی تو مجھ سے تو کیوں مجھ سے شادی کی؟" دماغ میں کلبلاتا سوال لبوں پر آگیا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم شاہنواز کی بیٹی ہو تو میں تم پر تھوکتا بھی نہیں کجا کہ تم سے شادی کرتا۔ جتنی نفرت مجھے شاہنواز سے ہے اتنی ہی نفرت مجھے تم سے ہے۔ سنا تم نے۔۔۔ اور ایک بات اپنے دماغ میں بٹھالو۔ میرے اور اپنے اس تعلق کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھنا۔ اگر کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو بہت برا ہو جائے گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم لوگ اس گھٹیا شخص کے رشتہ دار ہو۔ اگر ذرا بھی خبر ہوتی تو میں اپنی مہر کا ہاتھ اس سیماب کے ہاتھ میں کبھی نہ دیتا۔ مگر اب دیر ہو چکی ہے۔" وہ سخت افسوس میں مبتلا تھا۔ ماہی چپ چاپ اسے سنتی رہی۔

"مہر کا گھر بسا رہے اسی میں بھلائی ہے۔ اگر تم نے منہ کھولا تو یاد رکھو تمہارے پورے خاندان کو برباد کر دوں گا میں۔" اس کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

"اور رہی تمہاری بات۔ تمہارے باپ سے میں نمٹ لوں پھر تمہارا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔" اس کی سفاکی پر وہ دہل کر رہ گئی تھی۔

"اپنا حلیہ ٹھیک کرو اور اپنے اس زخم پر پٹی باندھو۔ اور اپنے اس معصوم چہرے پر مسکراہٹ سجالو۔ تمہیں ہر حال میں میرا حکم ماننا ہے۔ اور یہ بات جتنی جلدی سمجھ لو اتنا بہتر ہے۔" وہ اپنی کہہ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ اسے اصل وجہ معلوم نہ تھی یقیناً "شاہنواز نے ان کا ناقابل تلافی نقصان کیا تھا اسی لیے وہ اتنی شدید نفرت میں مبتلا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔

"ماہی نے تو کہا تھا کہ وہ ساری حقیقت بتا چکی ہیں

اگر وہ سب کچھ جانتا تھا تو پھر اس نے کیوں اسے اپنے نکاح میں قبول کیا؟ مہر اور سیماب کی شادی کیوں ہونے دی؟"

"کیا عائشہ بیگم نے ساری حقیقت چھپائی؟ اگر ایسا تھا تو کیوں انہوں نے شاہ دل کو اندھیرے میں رکھا؟" وہ جتنا سوچتی اتنا الجھتی۔ وہ چکرا کر رہ گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ بے ہوش ہو جائے گی۔ سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اسے اپنے نصیب پر رونا آیا۔ شاہ دل باتھ روم سے نکلا تو اسے ساکت بیٹھے پایا۔

"اب اٹھ جاؤ۔ ماتم منانے کے لیے پوری عمر پڑی ہے تمہارے پاس۔" وہ طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔ وہ اس کی طرف دیکھے بنا اٹھ کھڑی ہوئی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔ آئینے میں دکھائی دیتا عکس اسی کا تھا۔ سرخ سوجی ہوئی آنکھیں، بے رنگ چہرہ.... وہ ایک ایک کر کے زیور اتارنے لگی۔ اسے عافیہ کی ساری باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اسے ان کی خوش گمانی پر ترس آنے لگا تھا۔ اس کا جی چاہا وہ قہقہہ لگا کر ہنسے اور انہیں بتائے کہ ایک شاہ نواز کے خوف سے وہ لوگ اسے دوسرے شاہنواز کے سپرد کر چکے تھے۔ انہیں بتائے کہ وہ چہرے سے ہی نہیں نصیب میں بھی اپنی ماں جیسی تھی۔

☼ ☼ ☼
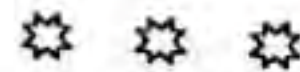
وہ نہا کر باہر آئی تو کمرہ خالی تھا۔ وہ چلتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے پاس آ گئی اور دراز میں سے فرسٹ ایڈ باکس نکال کر اپنے ہاتھ پر دوا لگانے لگی۔ اسے بخار بھی محسوس ہو رہا تھا۔ بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ جیسے تیسے پٹی کر کے اس نے درد کی گولی کھائی اور اپنے چکراتے سر کو تھامے بستر پر گر سی گئی۔ ذہنی اذیت، تھکن اور درد سے وہ نڈھال تھی۔ دوائی کے اثر سے وہ کچھ ہی دیر میں غافل ہو گئی۔

کتنا وقت گزرا اسے احساس نہیں تھا۔ اس کی آنکھ مہربان سی آواز سن کر کھلی تھی اس نے زبردستی آنکھیں کھول کر دیکھا اس کے قریب عائشہ بیگم بیٹھی تھیں اور سر پر شاہ دل کھڑا تھا۔ اس نے شاہ دل کو نہیں دیکھا تھا۔

"ماہی بیٹا کیا ہوا؟ تمہاری طبیعت کیوں خراب ہو گئی؟" وہ پریشانی سے پوچھ رہی تھیں ماہی بمشکل اٹھ کر بیٹھی۔ بخار کی وجہ سے چہرہ تمتما رہا تھا۔

"آنٹی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس تھکن ہو گئی۔" وہ نقاہت زدہ آواز میں بولی۔

"اور یہ کلائی.... کلائی کو کیا ہوا؟" ان کی نگاہ شاید ابھی پڑی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا۔ چوڑیاں اتارتے وقت چوڑی ٹوٹ کر چبھ گئی تو انہوں نے پٹی باندھ دی۔ آپ بے وجہ پریشان ہو رہی ہیں۔" اس نے زبردستی مسکرا کر کہا تھا۔ عائشہ بیگم نے شاہ دل کو دیکھا وہ اس کے جھوٹ پر اسے دیکھنے میں مگن تھا۔ وہ مسکرائیں۔

"اچھا چلو اب اٹھو اور ناشتا کر لو۔ پھر دوا کھا کر سو جانا۔ شاہ دل تم ماہی کو نیچے لے آؤ تب تک میں ناشتا لگوا لوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ ماہی اس کی موجودگی سے بے خبر تھی اس نے چونک کر دیکھا اور پھر سر جھکا دیا۔ شاہ دل اسے گھور رہا تھا۔

اس سے ٹھیک طرح سے ناشتا بھی نہیں کیا گیا تھا۔ وہ معذرت کرتی کمرے میں آ گئی جبکہ شاہ دل کام کا بہانہ کر کے وہاں سے جا چکا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں ماہی نے عائشہ بیگم کو سچ نہیں بتا تا وہ اس متعلق بالکل مطمئن تھا۔ اس نے اپنے کل کے جارحانہ رویے کے متعلق ایک بار بھی نہیں سوچا تھا۔ اس کے ذہن میں تو بس وہ فون کال گونج رہی تھی جس کے ذریعے وہ اس بات سے باخبر ہوا تھا کہ ماہی شاہنواز کی بیٹی ہے۔ گزشتہ رات کیا ہوا تھا؟ دوران ڈرائیونگ اسے پھر سے سب یاد آنے لگا۔

عائشہ بیگم نے اسے کنگن تھمائے تھے۔ جو منہ دکھائی کے طور پر ماہی کو ملنے تھے۔ وہ کنگن تھامے بہت سرشار سا سیڑھیاں چڑھتا اوپر آ رہا تھا کہ اس کا موبائل بجا اس وقت اسے کون فون کر سکتا تھا۔ وہ جیب سے موبائل نکالنے لگا۔ انجان نمبر سے فون تھا۔ اس نے

فون اٹھالیا۔

"ہیلو؟" اس کا ہیلو ہی سوالیہ تھا۔

"تمہیں تو میں بہت غیرت مند مرد سمجھتا تھا شاہ دل تم اتنے بے غیرت نکلو گے کہ اپنے دشمن کی بیٹی کو اپنی بیوی بنالو گے یہ میں نے تو کیا شاہنواز نے بھی نہیں سوچا ہو گا۔" وہ جو کوئی بھی تھا شاہ دل اس کی بات سن کر سن ہو کر رہ گیا تھا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" وہ دھاڑ کر بولا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔ ایک طرف تو تم شاہنواز کی بو سونگھتے پھر رہے ہو اور پھر بھی وہ تمہارے ہاتھ نہیں آرہا اور دوسری طرف اس کی بیٹی سے شادی رچالی۔۔۔واہ۔" مقابل کا لہجہ تمسخر میں ڈوبا تھا۔ شاہ دل کے اردگرد کھڑے در و دیوار گھومنے لگے تھے۔ وہ اور بھی نجانے کیا کچھ کہہ رہا تھا اس کے کانوں نے کسی بھی آواز کو سننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے اردگرد بس ایک ہی آواز گونج رہی تھی کہ شاہنواز کی بیٹی ماہی اس کی منکوحہ ہے۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ایسا کیسے ہو گیا اور بنا سوچے سمجھے اس نے ماہی کے ساتھ وہ سلوک رواں رکھا تھا۔ جو سوالات ماہی کے ذہن میں تھے وہی سوالات شاہ دل کے دماغ میں بھی گونج رہے تھے۔ اس نے تھک کر ایک جگہ گاڑی روک لی اور سر اسٹیرنگ سے ٹکا دیا۔

ایک معمولی سی بات پر شاہنواز نے اس کے بھائی کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا تھا۔ بات بظاہر کچھ بھی نہیں تھی۔ شاہ دل کے بڑے بھائی نے کسی شخص سے زمین خریدنے کا فیصلہ کیا تھا۔ شاہنواز کی نظر بھی اسی زمین کے ٹکڑے پر تھی مگر زمین کا مالک وہ زمین شاہنواز کو نہیں بیچنا چاہتا تھا۔ اس شخص نے زمین ان کے نام فروخت کر دی۔ اس بات سے وہ بالکل بے قابو ہو گیا تھا۔ نہ صرف زمین کے مالک بلکہ انہیں بھی قتل کر دیا صرف اور صرف اس لیے کہ شاہنواز کی اندر غصہ برداشت کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ ایسے وحشی انسان کی بیٹی اس کی بیوی تھی اور اس کا دماغ یہ بات قبول نہیں کر پا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ماہی کمرے میں آکر لیٹ گئی تھی۔ درد اتنا تھا کہ آنکھیں بہنے لگی تھیں۔ وہ رو رہی تھی جب اس کا موبائل بجا تھا۔ عافیہ بیگم کا فون تھا وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی جلدی جلدی سے آنسو صاف کیے اور کال ریسیو کی۔ وہ اس سے اس کی خیریت دریافت کر رہی تھیں۔ اس سے پوچھ رہی تھیں کہ وہ خوش ہے کہ نہیں۔ اس کا جی چاہا وہ سب سچ بتا دے مگر مہر اور سیماب کے چہرے اس کی آنکھوں میں اترے تو اس کے ہونٹوں پر قفل لگ گیا۔ وہ بہت خوش ہے۔ شاہ دل کا رویہ اس سے بہت محبت بھرا ہے اسی قسم کے جملے وہ بول رہی تھی تاکہ وہ مطمئن ہو جائیں اور وہ مطمئن ہو بھی گئی تھیں کچھ دیر مزید بات کر کے اس نے کال کاٹ دی اور بلک بلک کر رونے لگی۔

موبائل ایک بار پھر بج رہا تھا۔ اس نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر دیکھا سائیڈ ٹیبل پر ایک موبائل پڑا تھا۔ وہ موبائل پہچان گئی یہ وہ موبائل تھا جو شادی کے دوران مہر کے پاس تھا اور مہر نے اس کی بہت ساری تصاویر اتاری تھیں۔ فون مسلسل بج رہا تھا اس نے کال ریسیو کرلی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی۔ فون کرنے والا بولنا شروع کر چکا تھا۔

"دیکھو شاہ دل۔ رات کی طرح فون مت کاٹ دینا۔ تم غلطی کر چکے ہو اور یقین جانو شاہنواز تمہارے اس قدم پر بہت خوش ہے کہ تم جو اس سے اتنی نفرت کرتے ہو اس کی بیٹی کی محبت میں مبتلا ہو کر اسے اپنا چکے ہو۔ اسے شکست دینے کا بس ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے کہ تم ماہی کو چھوڑ دو۔" ماہی کو لگا تھا اس کے کانوں میں کسی نے سیسہ انڈیل دیا ہو۔

"یہ بات میرے اور شاہنواز کے درمیان ہے مگر میں تمہیں بھی اس کا راز دار بنا رہا ہوں۔ شاہنواز کو ماہی سے دلچسپی ہے مگر اس سے کہیں زیادہ دلچسپی اس کی جائیداد سے ہے۔ شاہنواز کا باپ بہت چالاک تھا جو اس نے یہ وصیت کی کہ اگر ماہی زندگی کے کسی بھی

حصے کسی بھی عمر میں پہنچ کر بھی جائیداد شاہنواز کے نام کرنا چاہے گی تو جائیداد کسی ٹرسٹ کو مل جائے گی مگر اسے نہیں۔ جائیداد اپنے نام کروانے کے لیے اس نے میری مدد چاہی۔ ماہی کی شادی اگر مجھ سے ہو جاتی تو میں جائیداد اپنے نام منتقل کرتا پھر شاہنواز کے نام۔ ماہی کی جائیداد کا تیس فیصد مجھے ملتا اور باقی اسے۔

لیکن تم نے شادی کر کے میرے حصے کو آگ لگا دی۔ جبکہ شاہنواز وہ جائیداد ہاتھ سے نکلنے پر دکھی نہیں۔ البتہ اس بات پر بہت خوش ہے کہ تم جو اسے دشمن سمجھتے ہو اسی دشمن کے خون کو اپنے گھر لے آئے ہو۔ اس کا غرور اسی وقت ملیامیٹ ہو سکتا ہے جب تم میرا ساتھ دو۔" وہ شاہ دل کے فون بند کر دینے کے ڈر سے جلدی جلدی بول رہا تھا اور اس کی خاموشی کو اقرار میں بدلتا سمجھ رہا تھا۔ ذوالفقار بہت جلد باز تھا اور اس کی یہ جلد بازی کسی کی زندگی میں ڈھیروں خوشیاں لانے والی تھی۔

وہ ساکن ہو کر سن رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں بے جان ہونے لگی تھیں۔

"تم شاہنواز سے بدلا لینا چاہتے ہو ناں مگر وہ تمہارے ہاتھ نہیں آ رہا۔ پہلی بات اپنا ماضی یاد کر لو۔ ماضی میں بھی تم اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہیں بھیج سکے تھے۔ کیونکہ تمہارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا یہ الگ بات کہ شاہنواز اپنے دوسرے بہت سے کارناموں کے باعث جیل کی ہوا کھا کر آیا ہے۔ تم اکیلے اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے... شاہنواز سے تمہیں بدلہ لینا ہے تو آؤ ہم ایک ڈیل کر لیتے ہیں۔

ماہی کو طلاق دے دو اور اس کا نکاح مجھ سے کروا دو۔ ماہی جائیداد سمیت میری ہو جائے گی اور میں تمہیں شاہنواز دے دوں گا۔ اب تم اتنے غیرت مند تو ہو گے ہی کہ ایک عورت کو وہ بھی جو تمہارے دشمن کی بیٹی ہے۔ اسے قربان کر کے اپنے بھائی کی محبتوں کا قرض اتار دو۔ شاہنواز کو ختم کر کے اپنے بھائی کی روح کو اور خود اپنے آپ کو بھی سکون پہنچاؤ۔ یہ ایک ڈیل ہے جس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں۔ لیکن اگر تم نے میری بات نہ مانی تو بہت خسارا ہو جائے گا۔ سوچنا ضرور۔" وہ اپنی بکواس کہہ کر فون کاٹ چکا تھا ماہی زمین پر ڈھے گئی۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ جب وہ گھر آئے گا تو ایک بڑی قیامت اس کی منتظر ہو گی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اسے عجیب سا سناٹا محسوس ہوا تھا۔ اس نے عائشہ کے کمرے میں جھانکا وہ وہاں موجود نہیں تھیں۔ چاروں طرف عجیب سی خاموشی تھی وہ فوراً" ماہی کے کمرے کی طرف لپکا تھا اندر داخل ہوتے ہی سامنے کا منظر حیران کن تھا۔ ماہی بیڈ پر آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ اس کے پاس عائشہ بیگم بیٹھی روئے جا رہی تھیں۔ وہ گھبرا کر ان کے قریب آیا تھا۔

"بھابھی کیا ہوا۔ آپ اس طرح کیوں رو رہی ہیں؟ اور ماہی اسے کیا ہوا؟" ماہی کا زرد چہرہ اور عائشہ بیگم کا رونا ساری نفرت کہیں دور جا سوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔

"میں کمرے میں آئی تو ماہی زمین پر پڑی تھی۔ ڈاکٹر کو بلایا تو پتا چلا کہ شدید ذہنی دباؤ کے باعث اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔ اس کا بی پی خطرناک حد تک بڑھ گیا تھا۔ مجھے تو یہی سمجھ نہیں آ رہی کہ آخر ماہی کو کیا ذہنی پریشانی ہے۔ ہم عافیہ کو کیا منہ دکھائیں گے کہ ایک دن میں ہم نے ان کی بیٹی کا یہ حال کر دیا کہ وہ ہوش میں نہیں ہے۔" وہ روتے ہوئے بول رہی تھیں۔ شاہ دل کا سر جھک گیا۔ وہ انہیں کیسے بتاتا کہ کل شدید غصے میں وہ ماہی کے ساتھ کیا کر بیٹھا ہے۔ ماہی کا زرد چہرہ اس کے اندر ملال کے رنگ بھر رہا تھا۔ اس کا غصہ کہیں دور جا سویا تھا۔

"اس بچی کی ساری زندگی ماں باپ کے بغیر گزری۔ بچپن نفرتوں کی نذر ہو گیا۔ عافیہ نے شادی اس لیے کروائی تا کہ ذہنی سکون میسر ہو اسے مگر نجانے اس کے اندر کیا غم پل رہا ہے۔" وہ دکھ کی شدت میں بہہ کر بولتی چلی گئیں۔ ماہی انہیں مہر کی طرح ہی عزیز تھی۔ شاہ دل ان کی بات پر چونک گئی۔

"کیا مطلب بھابھی؟" وہ ان سے وضاحت مانگنے

لگا۔ وہ گڑبڑا گئیں۔ وہ اتنی جلدی سچائی بتانے کے حق میں نہیں تھیں مگر شاہ دل ان کے پیچھے پڑ گیا۔ تو انہوں نے ساری حقیقت بتادی۔

"شاہنواز نے نا صرف فضیلہ کو آگ میں جھونکا بلکہ اس معصوم بچی کو بھی اٹھا کر آگ میں پھینک دیا۔ وہ تو اس کے دادا نے اپنی جان دے کر ماہی کی جان بچائی۔ ایک نوکرانی شاہنواز سے بچ بچا کر اسے ہسپتال میں داخل کروا آئی ورنہ ماں کے ساتھ ساتھ ماہی بھی مرچکی ہوتی۔ پھر شاہنواز پر کیس چلا اور بہت مشکل سے اسے سزا ملی۔

عافیہ اور ان کے گھر والوں کی محبت اور توجہ سے ماہی زندگی کی طرف لوٹی تھی کہ پھر سے شاہنواز نے ماہی کی زندگی حرام کردی۔ عافیہ نے مجھے ہر بات بتائی کوئی بھی بات نہیں چھپائی۔ وہ ماہی کے مستقبل سے خوف زدہ تھے۔ مجھے یہی خوف تھا کہ اگر میں نے تمہیں شادی سے پہلے حقیقت بتادی تو کہیں تم جذبات میں آکر انکار نہ کردو اور مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے وسیلے سے ان کی مشکل آسان کرنے کا فیصلہ کیا تھا میں انکار کرکے ان کی آس ختم کردوں۔

ماہی بہت معصوم ہے۔ بے گناہ ہے۔ باپ کے خوف سے 'اپنے ماموں اور بھائیوں کی زندگیوں کو مزید مشکلات سے بچانے کے لیے اس نے تمہارے رشتے کے لیے ہاں کی۔ تم اس بات کو انا کا مسئلہ مت بنانا کہ تمہاری بیوی شاہنواز کی بیٹی ہے۔ شادی کے بعد بھی ماہی سکون میں نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ شاہنواز کہیں اسے تنگ نہ کررہا ہو۔ اسی لیے وہ ایسی حالت تک پہنچی ہوگی۔ تم جلد از جلد کچھ کرو تاکہ ماہی بھی عام لڑکیوں کی طرح ہر خوف سے آزاد ہوکر اپنی زندگی گزار سکے۔

پلیز! شاہ دل کچھ کرو۔" وہ پھر سے رونے لگی تھیں۔

جبکہ وہ چپ چاپ ماں کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔ اسے اپنا آپ بزدل لگا تھا۔ وہ اپنے اندر کا شور برداشت نہ کرپایا تو اٹھ کر باہر آگیا۔ باہر آتے وہ کارپٹ پر پڑا موبائل اٹھانا نہ بھولا تھا۔ اس نے حیرت سے موبائل کو دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات بہت دیر سے وہ کمرے میں آیا تھا۔ ماہی بیڈ پر آنکھیں موندیں لیٹی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا اور نہایت آہستگی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ماہی نیند میں تھی اسی لیے نہ وہ اس کی موجودگی محسوس کرپائی تھی اور نہ ہی اس کا لمس۔ شاہ دل نے اس کا نازک ہاتھ اپنے لبوں سے لگالیا۔ ماہی گھبرا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ شاہ دل کو اپنے قریب بیٹھے دیکھ کر وہ ڈر گئی۔ سالوں بھی گزر جاتے مگر وہ کل کی رات کو کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ وہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا۔

"وکیسی طبیعت ہے تمہاری؟" اس کے انداز میں بلا کی نرمی تھی۔ ماہی حیرت بھری آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ اس کی طبیعت پوچھ رہا تھا؟

"ماہی۔ مجھے تم سے ضروری بات کہنی ہے۔ کل رات میں نے جو بھی کیا وہ بہت بہت غلط تھا۔ میں تم سے معافی بھی نہیں مانگ سکتا۔ مگر میرے کل کے رویے کے پیچھے بھی تو کوئی وجہ ہی تھی۔ کل اچانک ہی مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ تم شاہنواز کی بیٹی ہو۔ سالوں جس شخص سے میں نے نفرت کی ہے۔ تمہارا اس کی بیٹی ہونا مجھے قبول نہیں ہو رہا تھا۔ وہ لڑکی جسے میں نے بے حساب چاہا وہ اس شخص کی اولاد کیسے ہوسکتی تھی جس شخص سے میں نے پل پل نفرت کی۔" وہ دھیمی آواز میں بول رہا تھا ماہی کے آنسو پھر سے گرنے لگے۔

"میں اپنے اس رویے پر سچے دل سے نادم ہوں۔ اور آج ۔۔۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ تمہاری زندگی کن مشکلات میں گھری ہوئی تھی۔ اگر بھابی مجھے یہ ساری باتیں پہلے بتا دیتیں تو یقین مانو میں تم سے شادی سے کبھی انکار نہ کرتا۔ تم بھی تو اس شخص کی ڈسی ہوئی ہو۔ میں تمہیں ضرور تحفظ دیتا۔

جو ہوچکا وہ ہوچکا۔ ماضی واپس نہیں آسکتا۔ لیکن میں نے تمہیں جتنی اذیت دی اس پر معافی تو مانگ سکتا

ہوں ناں۔ میں نے جو بھی کیا وہ غیر ارادی تھا پلیز مجھے معاف کر دو۔" وہ سخت نادم تھا اور اس نے ماہی کے پیروں کو بھی ہاتھ لگا لیا تھا اس نے گھبرا کر پیر کھینچ لیے تھے۔

"پلیز شاہ دل۔ ایسا مت کریں۔ میں نے آپ کو معاف کیا۔" ماہی کا دل فورا" صاف ہو گیا تھا۔ وہ کھل کر مسکرایا۔

"اور تم جو فون کال سن کر بے ہوش ہوئی تھیں اس بارے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں میں جلد ہی ان سب کا بندوبست کرنے والا ہوں۔ رہی یہ بات کہ مجھے کیسے پتا چلا تو بتاتا چلوں کہ میرے اس فون میں تمام فون کالز ریکارڈ ہو جاتی ہیں۔ کارپٹ پر پڑے موبائل کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یقینا" تمہاری بے ہوشی کا تعلق اسی سے ہے۔ اپنی ساری پریشانیاں مجھے دے دو اور تم آرام کرو۔" اس کے ہاتھ تھام کر اس نے تسلی دی تھی وہ مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

خدا نے اسے کتنا آسان راستہ دکھا دیا تھا۔ ذوالفقار ماہی اور اس کی جائیداد کے حصول کے لیے پاگل ہو رہا تھا اور اسی ہوس میں ڈوب کر اس نے شاہ دل کو فون کر ڈالا تھا۔

وہ جو شاہنواز کو پچھلے کئی مہینوں سے ڈھونڈ رہا تھا اس تک پہنچنے کا اسے آسان راستہ مل گیا تھا۔ وہ ذوالفقار اسے مل چکا تھا اور ماہی کے لیے اس کے دل میں کتنی نفرت ہے۔ اس کا جھوٹا اظہار بھی وہ کر چکا تھا۔ اور ذوالفقار جو کل تک شاہنواز کا ساتھی تھا آج اپنی پارٹی تبدیل کر چکا تھا اور اس بات کی خبر شاہنواز کو نہیں تھی۔

شاہنواز کو تو ماہی کی شادی کا علم تک نہیں تھا وہ اب تک پاکستان سے باہر تھا۔ ذوالفقار نے اسے ماہی کی شادی کی خبر پہنچائی نہیں تھی۔ پیچھے کیا ہو رہا ہے شاہنواز اس سے یکسر بے خبر اپنی نئی بیوی کے ساتھ دنیا گھومنے میں مگن تھا۔

شاہ دل کے کہنے پر ہی ذوالفقار نے اسے فون کر کے جلدی پاکستان آنے کا کہا تھا۔ اور شاہنواز کم ہی اس کی کوئی بات ٹالتا تھا۔ وہ فورا" پاکستان پہنچ گیا اسے نہیں معلوم تھا کہ پاکستان میں قدم رکھتے ہی اس کی زندگی کی بتیاں بجھ جائیں گی۔

"یہ رہا طلاق نامہ۔ اس پر میرے دستخط صرف اسی وقت ہوں گے جس روز تم شاہنواز کو میرے حوالے کرو گے۔" شاہ دل نے طلاق نامے کے پیپرز اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا تھا۔ پیپرز دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"آج شام کی فلائیٹ سے وہ پاکستان آ رہا ہے۔ میں ہی اسے ایئرپورٹ سے لے کر آؤں گا اور اسی جگہ لے جاؤں گا جو جگہ طے کی گئی ہے۔ تم ماہی، طلاق کے پیپرز اور جائیداد کے پیپرز کے ساتھ مجھے وہیں ملنا۔" اس نے بات ختم کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہ دل سے اس نے مصافحہ کیا اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی شاہ دل نے اپنے دوست کو جو پولیس سروس میں تھا فون ملایا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم نے مجھے اتنی ایمرجنسی میں کیوں بلایا ہے؟ اور وہ بھی یوں چھپ چھپا کے؟" گاڑی میں بیٹھتے ہی شاہنواز نے بگڑ کر کہا تھا۔ وہ تو یہی سمجھا تھا کہ یہاں کوئی بہت بڑی مصیبت ہو گئی ہو گی۔ ذوالفقار کے فون سے وہ یہی اندازہ لگا سکتا تھا اور اس نے لگایا بھی۔ فون پر سوال و جواب سے ذوالفقار نے منع کر دیا تھا وہ بھی پہلی فلائیٹ سے پاکستان پہنچ گیا اور اب اس کے چہرے پر پھیلا سکون اسے غصہ دلا رہا تھا۔

"ایمرجنسی تھی اسی لیے ایمرجنسی میں بلایا ہے تمہیں۔ تم چلو تو پھر ساری بات بتاتا ہوں۔" اس نے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری کر لی تھی۔ شاہنواز بھی چپ ہو کر بیٹھ گیا۔ ایک سنسان سی جگہ پر اس نے گاڑی روکی۔

"یہ کون سی جگہ ہے اور تم مجھے یہاں کیوں لے کر

آئے ہو؟" نجانے کیوں وہ اندر سے خوفزدہ ہو گیا تھا اس کی چھٹی حس اسے خبردار کررہی تھی۔

"یہاں تمہاری بیٹی ماہی ہے۔ اور اب مزید سوال مت کرنا اندر چلو۔" ماہی نام سن کر وہ بری طرح چونکا تھا۔

"جب میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ تم میری غیر موجودگی میں اس کے پاس بھی نہیں بھٹکو گے تو تم نے۔۔۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟" وہ خود پر سے قابو کھو چکا تھا۔

اور ذوالفقار پر پل پڑا۔ ذوالفقار نے اس پر پستول تان لی اور ساری کی ساری گولیاں غصے میں اس کے سینے میں اتار دیں۔ اندر کمرے میں بیٹھی ماہی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اسے شاہنواز سے نفرت تھی مگر اس کی رگوں میں بہرحال شاہنواز کا ہی خون دوڑ رہا تھا۔ اور وہ بے اختیار سجدے میں گر پڑی اس کی چیخیں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ تبھی دوڑتے قدموں کی آواز آئی اور شاہ دل پولیس کو لیے اندر داخل ہوا اور کہا۔

"میری بیوی پر بری نظر ڈالنے والوں کا بھی یہی انجام ہوگا۔" شاہ دل مسکرا رہا تھا۔ ذوالفقار کو ساری گیم سمجھ میں آگئی۔ پولیس اسے گھیر چکی تھی۔ وہ شاہ دل کو جاتا دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ کھڑکی کے پاس کھڑی برستی بارش کو دیکھ رہی تھی۔ تب ہی شاہ دل اس کے پیچھے آکھڑا ہوا۔ چاروں طرف گہری خاموشی تھی اور اس خاموشی کو بارش کی آواز توڑتی۔ اس نے ماہی کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ ماہی اس کی طرف مڑی۔

"اب کیسا محسوس کررہی ہو؟" اس نے ماہی کے چہرے پر بکھری لٹ کو اس کے کان کے پیچھے اڑسا۔

"بہت پرسکون محسوس کررہی ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"اذیتوں کے دن ختم ہوئے اور میں اپنے رب کا جتنا شکر بھی ادا کروں وہ کم ہے۔ اب میری زندگی میں کوئی شاہنواز نہیں اور نہ ہی کوئی خوف۔" وہ بہت طمانیت سے کہہ رہی تھی۔ شاہ دل نے دھیرے سے اسے خود سے قریب کیا تھا۔ ماہی نے اپنا سر اس کے کندھے سے ٹکا دیا۔

"آئی لو یو ماہی۔" اس نے بہت جذب سے کہا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے اظہار پر مسکرا رہی ہوگی اب ان کی زندگی نے یوں ہی مسکراتے رہنا تھا۔

☼ ☼

شازیہ ستار نایاب

خواب زندہ ہیں

گیٹ پر گاڑی کا ہارن ہوا اور جس انداز سے ہارن پر ہاتھ رکھا گیا اس سے صاف ظاہر تھا کہ ہارن بجانے والا شدید غصے میں ہے۔ گیٹ کیپر کے گیٹ کھولتے ہی گاڑی تیزی سے اندر داخل ہوئی اور گاڑی رکتے ہی وقار تیزی سے اتر کر گھر میں داخل ہوا اس کے پیچھے پیچھے رمیز تھکے تھکے قدموں سے اندر آیا۔

لاؤنج کے صوفے پر ڈھے جانے والے انداز میں بیٹھ کر وقار نے اپنا سر تھام لیا اور کنپٹیوں کو مسلنے لگا۔ رمیز خاموشی سے دوسرے صوفے پر آکر بیٹھ گیا اور جوتے اتارنے لگا۔ رمشا، دونوں کے لیے پانی لے آئی۔

"کیا ہوا وقار؟" رمشا نے وقار کو پانی کا گلاس تھماتے ہوئے کہا۔

"یہ تم اپنے ہونہار صاحبزادے سے پوچھو۔" وقار نے غصے سے کہا۔ رمشا نے سوالیہ نظروں سے رمیز کی طرف دیکھا۔

"میں نیشنل گیم کے لیے سلیکٹ نہیں ہو سکا ماما۔" رمیز کا لہجہ ہموار تھا۔

"جیسی پرفارمنس تھی تمہاری تم سلیکٹ ہو بھی نہیں سکتے تھے ایسے دیتے ہیں ٹرائل۔" وقار دھاڑا۔

"بابا میں نے اپنی پوری کوشش کی، بہترین پرفارمنس دینے کی مگر نہیں ہو سکا۔" رمیز بے چارگی سے بولا۔

"پوری کوشش... بہترین پرفارمنس... اگر یہی ہے تو پھر تم کبھی انٹرنیشنل کرکٹ نہیں کھیل سکتے۔ تم میں یہ ٹیلنٹ ہی نہیں ہے۔" وقار نے کہا۔

"بابا!" رمیز نے کچھ کہنا چاہا۔

"بیٹ کو آگ لگاؤ، بال کو چولھے میں جھونکو اور کرکٹر بننے کا خواب دیکھنا چھوڑ دو۔" وقار نے غصے سے کہا۔

"بابا میں نے کب کرکٹر بننے کا خواب دیکھا ہے یہ تو آپ کا خواب ہے۔" رمیز نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ہاں ہاں میرا ہی تو دماغ خراب ہوا تھا جو میں نے یہ خواہش پالی کہ میرا کوئی بچہ انٹرنیشنل کرکٹ کھیلے معاف کر دو مجھے" وقار غصہ میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رمیز سر جھکائے لاؤنج میں بیٹھا رہا۔ رمشا نے ایک نظر اپنے بیٹے کے اوپر ڈالی وقار کے کرکٹ کریز کی اس کی دیوانگی کو رمشا سے بہتر کون جان سکتا تھا۔

✡ ✡ ✡

ڈھولک کی تھاپ پر جب مہندی رمشا کے گھر پہنچی، تو جیسے ہر طرف دھنک کے رنگ بکھر گئے۔ وقار اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اس لیے خوب دھوم دھام سے شادی کی گئی اس کی دونوں بہنوں نے بھی جی بھر کر ارمان نکالے بیس سالہ رمشا دلہن بن کر بہت اچھی لگ رہی تھی، وقار بھی نہایت سلجھا ہوا پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ رمشا کو وہ اچھا لگا تو اسے بھی رمشا بہت بھائی۔ اکلوتی ہونے کی وجہ سے بھی وہ بہت سراہی جا رہی تھی۔ یہ پروٹوکول یہ ناز نخرے صرف چار پانچ دن ہی چل سکے۔

شادی کے پانچویں روز جب رمشا اپنے کمرے سے نکل کر باہر آئی تو اسے احساس ہوا کہ گھر میں ہلچل سی مچی ہوئی ہے۔ اس کی ساس کھانا بنا کر فریز کر رہی

تھیں۔ چھوٹی نند حمنٰی کام والی ماسی کے ہمراہ گھر کی تفصیلی صفائی کروانے میں مشغول ہے۔

"آج گھر میں کوئی دعوت ہے کیا۔" رمشا نے حمنٰی سے پوچھا۔

"نہیں بھابھی کرکٹ ورلڈ کپ شروع ہو رہا ہے نا تو اسی کی تیاری کر رہے ہیں۔"

"اوہ آئی سی" رمشا نے کہا اور سب کی تیاریاں دیکھنے لگی۔

رمشا کے گھر والے بھی شوق سے کرکٹ میچز دیکھا کرتے تھے مگر ایسا کریز کبھی دیکھا نہ سنا۔ دولہا صاحب نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کر صرف اور صرف کرکٹ کے ہو رہے۔ سارا دن میچ دیکھا جاتا شام کو اس پر تبصرہ کیے جاتے (پھر پہلی اور شاید آخری مرتبہ اس ورلڈ کپ میں پاکستانی ٹیم کی پرفارمنس بھی بہت اچھی تھی۔) اب رمشا کو یقین آگیا تھا کہ وقار نے چھٹیاں شادی کے لیے نہیں، بلکہ کرکٹ ورلڈ کپ کے لیے لی ہوں گی۔ رمشا چپ چاپ بیٹھی ان لوگوں کو دیکھتی رہتی کہاں کی شادی.... کہاں کا رومانس.... کہاں کا ہنی مون بس دن رات کرکٹ.... کرکٹ.... کرکٹ ساس سسر نند بلکہ وقار کی دادی جان سمیت سب لوگ کرکٹ کے ہو رہے۔

"یہ ورلڈ کپ ختم ہو گا تو جان چھوٹے گی۔" رمشا

سوچی۔

"بس پاکستان یہ ورلڈ کپ جیت جائے پھر ہم ہنی مون پہ چلیں گے۔" وقار نے رمشا کو تسلی دی اور خود قذافی اسٹیڈیم میچ دیکھنے چلا گیا آٹھ نومبر کو تو ورلڈ کپ ختم ہو جائے گا اور مسئلہ حل۔ لیکن پاکستانی قوم کے لیے 4 نومبر کو ہی ورلڈ کپ ختم ہو گیا۔ کیونکہ پاکستان سیمی فائنل میں آسٹریلیا سے ہار گیا۔

رمشا کی ساس روتے روتے بیہوش ہو گئیں۔ سسر کا بی پی شوٹ کر گیا' نندوں کے آنسو تھمتے نہ تھے۔ وقار کی دادی چلا رہی تھیں۔

"ہائے اے سارا قصور سلیم جعفر دا اے۔ تو سانوں ہرا چھڈیا تیرا ککھ نہ روے' بے چارے عمران نوں ہار کے ریٹائر ہونا پیا۔"

وقار کمرے میں بند ہو گیا۔ غرض کوئی سوگ سا سوگ تھا۔ اگر کوئی مطمئن اور پر سکون تھا تو وہ رمشا تھی۔ جو سوچ رہی تھی ورلڈ کپ ختم' بات ختم۔ مگر کہاں جی ورلڈ کپ تو ختم ہوا۔ مگر اب وقار عمران سے ریٹائرمنٹ کا فیصلہ واپس لینے کی اپیلیں کرنے لگا اس کی عمران لورز کمیٹی ہر روز عمران واپس آؤ کی ریلی نکال کھڑی ہوتی۔ وقار صبح آفس جاتا۔ شام کو ریلی کی قیادت کرتا۔ اب رمشا کو احساس ہوا کہ اس کے میاں اور سسرال والوں کو صرف کرکٹیریا ہی نہیں بلکہ عمرانیریا بھی ہے۔ بلکہ ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو سمجھتے ہیں کہ عمرانیات کا تعلق عمران خان سے ہے۔

بالآخر عمران خان نے ریٹائرمنٹ کا فیصلہ واپس لیا اور وقار کے قدموں نے گھر کی راہ لی۔ رمشا نے شکر کا کلمہ پڑھا۔

"سنو رمشا اگر ہمارا بیٹا ہوا تو ہم اس کا نام رکھیں گے عمران یا وسیم یا رمیز یا جاوید۔۔۔" وقار کے پاس کرکٹرز کے ناموں کی لمبی قطار تھی۔

"اور اگر بیٹی ہو گئی تو۔۔۔" رمشا نے سوال کیا۔

"تو اس کا نام عمرانہ اور وسیمہ' سلیمہ اور۔۔۔" وقار نے نام گنوانے شروع کیے۔

"وقار فاروق! بیٹے کا نام آپ رکھ لیجئے گا مگر بیٹی کا نام میں ہرگز یہ نہیں رکھوں گی۔" رمشا نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے بیٹی کا نام تم رکھ لینا مگر میرے سب بچے کرکٹ کھیلیں گے خواہ بیٹا ہو یا بیٹی۔" وقار نے کہا۔

"میں انہیں بہترین کرکٹ اکیڈمیز میں بھیجوں گا وہ انٹرنیشنل کرکٹ کھیلیں گے۔" وقار کے لفظوں میں اس کے ادھورے خواب بول رہے تھے۔"

وقار خود کرکٹ کا بہت اچھا کھلاڑی تھا اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے کھیلتا تھا۔ ڈومیسٹک کرکٹ میں اس کی پرفارمنس بہت اچھی تھی۔ وہ نیوزی لینڈ کے خلاف نیشنل ٹیم کے لیے سلیکٹ بھی ہوا تھا' مگر اسے قسمت کی خرابی بھی کہہ سکتے ہیں کہ ٹورنامنٹ شروع ہونے سے دو دن پہلے اسے ٹائیفائیڈ ہو گیا اور اسے ٹیم سے ڈراپ کر دیا گیا۔ پھر ایک بار اسے ان سترہ کھلاڑیوں میں شامل تو کیا گیا جنہوں نے ایشیا کپ کھیلنا تھا مگر اسے کوئی بھی میچ کھیلنے کا موقع نہ مل سکا۔ اور اس کے بعد سلیکٹرز کی نظر اس پر نہ پڑی۔ شاید یہ سب قسمت کے کھیل ہوتے ہیں جو کبھی منصور اختر اور یونس احمد جیسے کھلاڑیوں کو قومی کرکٹ ٹیم کا حصہ بنا دیتی ہے اور کبھی وسیم حیدر جیسے باصلاحیت کھلاڑی ورلڈ کپ سکواڈ میں شامل ہونے کے باوجود ایک میچ تک کھیلنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔

رمشا نے اس کرکٹ دیوانے پر ایک نظر ڈالی اور دھیرے سے گویا ہوئی۔

"آپ کی خواہش سر آنکھوں پر مگر بچوں کا اپنا انٹرسٹ بھی ہوتا ہے۔"

"آج کل کس بچے کو کرکٹ میں انٹرسٹ نہیں ہو گا۔" وقار نے کہا۔

"کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں۔" رمشا نے کہا۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک بیٹی سے نوازا رمشا نے اس کا نام عریشہ رکھا۔

"نام تو تم نے رکھ لیا لیکن میری بیٹی وومن کرکٹ ٹیم میں جائے گی۔" وقار نے کہا۔

"جی۔" رمشا نے کہا۔ عریشہ نے پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا تو وقار اس کے لیے بیٹ بال لے آیا۔

عریشہ تین سال کی تھی تو اللہ نے انہیں بیٹے سے نوازا' وقار نے اس کا نام عمران رکھا اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ لیکن شاید اللہ کو منظور نہ تھا کہ عمران کرکٹر بنتا اس کی بائیں ٹانگ دائیں ٹانگ سے چھوٹی تھی یا لمبی دونوں ٹانگوں کی لمبائی برابر نہ تھی ایک آپریشن کے بعد دونوں ٹانگوں میں فرق کم تو ہو گیا مگر بالکل ختم نہ ہو سکا۔ جس کی وجہ سے عمران کو بھاگنے میں دشواری ہوتی۔

☼ ☼ ☼
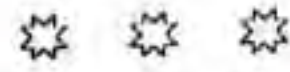
1992ء کا ورلڈ کپ پاکستان نے حیرت انگیز طور پر جیت لیا۔ اس کے بعد عمران خان ہسپتال کے پیچھے لگ گیا اور وقار عمران خان کے پیچھے ہر سال کی زکوۃ ہسپتال کے لیے مختص ہوتی اور بکروں کی کھالیں ہسپتال کے نام ہوتیں۔ وقت کا پہیہ سرکتا رہتا تھا' عریشہ اور وقار کے بعد ہانیہ اور رمیز رمشا کی گود میں آئے۔ وقار کا کرکٹ کا جنون باقی تھا اور اپنے بچوں کو قومی کرکٹ ٹیم کا حصہ دیکھنے کی خواہش ابھی جواں تھی۔

بچپن میں تو بچے کرکٹ کھیلتے رہے۔ مگر جوں جوں بڑے ہوتے گئے تو ان کی اپنی دلچسپیاں سامنے آنے لگیں۔ عریشہ اور عمران کتابی کیڑے پڑھنے کے شوقین دونوں ڈاکٹر بننا چاہتے تھے۔ ہانیہ کی دلچسپی فائن آرٹس میں تھی۔ رہ گیا رمیز جس سے وقار کی تمام تر امیدیں وابستہ تھیں وہ بزنس پڑھنا چاہتا تھا' فٹ بال کھیلنا چاہتا تھا لیکن وقار کے خواب۔۔۔ وہ رمیز کو ہر حال میں قومی کرکٹر ہی دیکھنا چاہتا تھا۔

عمران اور عریشہ ڈاکٹر بن گئے۔ ہانیہ فائن آرٹس پڑھنے لگی۔ ایک روز ہمت کر کے رمیز نے اپنے دل کی بات کہی۔

"بابا میں ایم بی اے کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں! ضرور کرو' میں تمہیں ایم بی اے کرنے کے لیے باہر بھیج دوں گا۔" خلاف توقع وقار نے خوش ہو کر کہا۔

شکر ہے کرکٹ سے جان چھوٹی رمیز نے سوچا لیکن کہا یہ کہ۔

"بابا پھر وہ کرکٹ۔"

"کرکٹ تو تمہیں کھیلنا ہی ہے قومی ٹیم کا حصہ بننا ہے۔ رہا تمہارا ایم بی اے کا شوق تو وہ پورا کرو رمیز راجہ نے بھی تو ایم بی اے کیا ہوا ہے۔ تم بھی تو میرے راجہ جونیئر ہو۔" وقار نے پیار سے کہا۔

"جی بابا۔" رمیز سر جھکا کر بولا۔

عریشہ اور عمران اگرچہ کرکٹ کھیل کر تو ملک کے لیے کچھ نہیں کر سکے تھے۔ مگر ملک کے لیے کچھ کر گزرنے کی خواہش ان کی گھٹی میں پڑی تھی اور اس کے لیے وہ پر عزم تھے اور سرگرداں بھی۔

☼ ☼ ☼

اس روز وہ گھر آئے تو بے حد پر جوش اور خوش تھے۔

"ہم نے "مرکز یقین" بنالیا ہے۔" عریشہ نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ مرکز یقین کیا ہے۔" وقار نے پوچھا۔

"یہاں پر ایک ڈے کیئر سینٹر بنایا ہے ان بچوں کے لیے جن کی مائیں ہمارے گھروں میں جھاڑو پوچا کرتی ہیں برتن اور کپڑے دھوتی ہیں ان کی غیر موجودگی میں ان کے شیر خوار بچوں کو اس ڈے کیئر سینٹر میں بھیجا جائے گا تاکہ وہ بے فکر ہو کر اپنی نوکریاں کر سکیں۔ بڑے بچوں کے لیے ایک سکول ہے اس میں بچوں کو نہ صرف تعلیم دی جائے گی اور ہنر بھی سکھائے جائیں گے جیسے موٹر مکینک' الیکٹریشن' پلمبر وغیرہ' جو بچے تعلیمی لحاظ سے بہتر کارکردگی دکھائیں گے انہیں اعلیٰ تعلیم دلائی جائے گی۔ ایک چھوٹا سا مرکز صحت بھی "مرکز یقین" میں بنایا گیا ہے جہاں ان بچوں اور ان کے والدین کو علاج معالجہ کی سہولت مفت فراہم کی جائے گی۔

مما آپ کو ہم اسکول کا چارج دینا چاہتے ہیں۔

تعلیمی نظم و نسق آپ سنبھالیں گی۔" عمران نے کہا۔
"اور دادی جان آپ کو بھی وہاں چلنا ہو گا۔" عریشہ نے کہا۔
"رمشا تو جائے لیکن میں بوڑھی وہاں جا کر کیا کروں گی۔" دادی گڑبڑا کر بولیں۔
"اتنی بوڑھی نہیں ہیں آپ ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک ہیں اور آپ نے وہاں کرنا کیا ہے ' ڈے کیئر سینٹر کی نگرانی۔ چھوٹے بچوں کو کہانیاں سنائیں گی وہ کہانیاں جو ہماری روایت بھی رہی ہیں اور بچوں کی تربیت میں اہم کردار بھی ادا کرتی ہیں۔" عریشہ نے وضاحت کی۔
"دادا جی مرکز یقین کی ایڈمنسٹریشن آپ کی ذمہ داری۔" عمران نے کہا۔
"بابا کے لیے بھی جلدی وہاں مصروفیت ڈھونڈلی جائے گی۔" عمران نے کہا۔
"بھائی کیا واقعی سب ایسے ہی ہو گا۔" رمیز نے پوچھا۔
"ہاں ان شاء اللہ! ہمارا سارا گروپ اسے سپورٹ کر رہا ہے۔"
"اچھا کام ہے یہ۔ اب رمیز قومی ٹیم میں شامل ہو تو میری سب سے بڑی خواہش پوری ہو جائے گی۔" وقار نے کہا۔
کچھ ہی عرصے میں "مرکز یقین" نے بہت سے صاحب دل لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی جو اپنا وقت دینے پر تیار ہو گئے اور ڈونیشن بھی آنے لگے 'دادا' دادی اور رمشا۔ ان سب کو تو جیسے مقصد حیات مل گیا تھا وہ پھر سے جی اٹھے تھے اب وہ عضو معطل نہیں تھے۔
دادا' دادی کو اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ اب وہ بے کار نہیں تھے بلکہ معاشرے کے لیے اب بھی کچھ کر سکتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

گاڑی کے ہارن نے رمشا کو چونکا دیا وہ ماضی کے سفر سے واپس لوٹی تو رمیز اسی طرح صوفے پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔
"رمیز بیٹا اٹھو چینج کرو جا کر۔" رمشا نے کہا۔
"جی جاتا ہوں۔" رمیز اداس تھا۔
"بیٹا دل برا نہ کرو بابا کی ڈانٹ کا برا بھی نہ مانو۔ انہیں دکھ ہوا ہے ان کی ایک بہت بڑی خواہش تھی کہ تم ایک بڑے کرکٹر بنو ملک کے لیے کچھ کرنا ہے تو ہر فیلڈ میں کیا جا سکتا ہے۔ اب دیکھو نا ان بچوں کا "مرکز یقین" بہت اچھا کام کر رہا ہے۔"
"بس میری خواہش تھی کہ۔۔۔ لیکن نہ میں قومی ٹیم کا حصہ بن سکا اور نہ میری اولاد۔۔۔" وقار کے لہجے میں دکھ بول رہا تھا۔
"رمیز کو میں نے بہترین اکیڈمی جوائن کروائی۔ ہر اچھے کھلاڑی نے جب کوئی ورکشاپ کی میں اس کو لے کر گیا۔ خود اتنے سال سے اس پر محنت کر رہا ہوں اور یہ ٹرائل میں ناکام ہو گیا۔ اسے شوق بھی نہیں کرکٹ کا۔ چند دن پہلے مالی کا بارہ تیرہ سالہ بیٹا اس کو بولنگ کروا رہا تھا اس کا ایکشن اس کا اسٹائل قابل دید تھا جیسے بورن فاسٹ بولر۔"
"بابا آپ رمیز کی بجائے ساجد کی سرپرستی کریں اس ٹیلنٹ کو تلاش کریں جو پورے پاکستان میں بکھرا ہوا ہے لیکن اسے نہ سرپرستی ملتی ہے نہ موقع۔ اس ٹیلنٹ کو تراشیں اور کرکٹ کا چمک دار ہیرا بنا دیں۔" عمران نے کہا۔
عمران ٹھیک کہہ رہا ہے۔ "مرکز یقین" کرکٹ اکیڈمی کا بھی آغاز کر رہا ہے تم وہاں غریب مگر ٹیلنٹڈ بچوں کی رہنمائی کرو۔ وہ یقیناً "مستقبل میں پاکستان کرکٹ کا اثاثہ ثابت ہوں گے۔ اس اکیڈمی کا پہلا کھلاڑی ساجد ہونا چاہیے۔" دادا ابو نے کہا۔
"آپ ٹھیک کہہ رہے ابو۔ ساجد کو موقع ضرور ملنا چاہیے۔" وقار گہری سوچ میں تھا۔
"موقع بھی تمہاری سرپرستی اور ٹریننگ بھی۔" ابو نے کہا۔
ہوں وقار نے ہنکارا بھرا اس کی آنکھیں نئے عزم سے چمک رہی تھیں۔

☼ ☼

اُمِ ایمان قاضی

"مگر میں اتنے دن نوبیہ کو تمہارے گھر کیسے بھیج سکتی ہوں۔ تمہاری بھابھیاں بھی مشکل سے مانیں گی اور میں کب رہ سکتی ہوں اس کے بغیر اتنے سارے دن۔"

اماں جی نے دوسری طرف سے فرحت کا مطالبہ سن کر کہا جو کہ نوبیہ کو اپنی بیٹی کی منگنی کے فنکشن سے پندرہ روز پہلے ہی بلانے کا ارادہ اپنی ماں پر ظاہر کیے بیٹھی تھیں۔

"کیا ہو گیا ہے اماں جی! آپ بھی اپنی بہوؤں کی زبان بولنے اور انہی کے کانوں سے سننے لگی ہیں۔ میں پھپھو ہوں اس کی' میرا بھی حق ہے اس پر کیا نہیں جانتی ہوں کہ کسی کو بھی اس بچی سے ہمدردی وغیرہ نہیں ہے۔ بس اپنی غرض کی چادر میں لپٹے ہیں سارے کے سارے' کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی ہے۔ بھی ایک پورشن میں تو کبھی دوسرے میں' جو وقت بچ جائے وہ آپ کے کام اور آپ کی خدمت گزاریوں میں ہی نکل جاتا ہے بے چاری کا اب ہفتہ دس دن کے لیے اگر میرے پاس آجائے گی تو مجھے بھی وہ سراہٹ مل جائے گی اور اسے بھی تھوڑا آرام مل جائے گا۔"

"اچھا۔ اچھا بات کرتی ہوں تمہاری بھابیوں سے وہ سب اگر غرض میں اسے استعمال کر رہے ہیں تو تم بھی تو اپنے مقصد کے لیے ہی بلا رہی ہو بچی کو۔"

فرحت کی اتنی بڑی تقریر جو کہ سو فیصد سچ پر مشتمل تھی اماں جی کو خاصی ناگوار گزری تھی جبھی ٹوک کر کہا۔

"تو بس ٹھیک ہے کل فرحان آجائے گا اسے لینے' بارہ بجے تک تیار رکھیے گا اسے۔" اس نے ماں کی بات کا جواب دیے بغیر فون بند کر دیا۔ اسید جو پاس والے بیڈ پر اپنے کاغذات پر جھکا ہوا تھا کی سماعتوں تک یہ ساری گفتگو پہنچی تھی۔ ایک تلخ مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی تھی' نجانے کیوں اسی پل تائی نے اماں جی کے کمرے میں قدم دھرا۔

"اچھا ہوا اسید تم ادھر ہی مل گئے۔ ایسا کرو فرح کو ذرا ٹیلر کے پاس جانا ہے ڈرائیور تمہارے ابو کے ساتھ ہے اور کوئی لڑکا ہے نہیں گھر پر' اسے بھی اب یاد آیا ہے کہ صبح کالج میں کوئی فنکشن ہے اور اسے نیا سوٹ پہن کر جانا ہے۔ اور یہ نوبیہ کہاں رہ گئی اماں جی۔ چائے بنا کر لانے کو کہا تھا آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے پتا نہیں کہاں غائب ہے۔"

تائی نے ایک ساتھ بہت سارے لوگوں کو نمٹایا اور خود واپس مڑنے کو تھیں جب اماں جی نے جلدی سے موقع مناسب جانتے ہوئے فرحت کا عندیہ اور ارادہ بتایا جسے سنتے ہی تائی کے منہ کے زاویے بری طرح بگڑ گئے اور جس پل اسید خاموشی سے تائی کی صاحبزادی کو ٹیلر کے پاس لے جانے کے لیے نکل رہا تھا اس نے چچی کو تائی کی تلاش میں سرگرداں دیکھا اور انہیں اماں جی کے کمرے کا پتا دے کر خود آگے بڑھ گیا۔

"یہ بھی خوب رہی اماں جی۔ جب پالنے پوسنے کا وقت تھا سب ہاتھ جھاڑ کر ایک طرف ہو گئے اور اب جب اپنی ضرورت پڑتی ہے وقت بے وقت کے

بلاوے آجاتے ہیں۔ نوبیہ نہ ہوئی بوتل کا جن ہو گیا جو فون کھڑکایا اور نوبیہ حاضر۔ پتا بھی ہے میں بلڈ پریشر کی مریضہ 'بچیاں کالج یونیورسٹی' آپ کو بھی ہمہ وقت کوئی اپنے پاس چاہیے۔ ایک ملازمہ صفائی برتن کرکے یہ جا وہ جا' ایسے میں نوبیہ جا کے فرحت کا گھر سنبھالے گی تو اس گھر کا کیا ہوگا۔" تائی تو جب سے اماں جی نے فرحت کی فرمائش پہنچائی تھی بولے ہی جارہی تھیں۔ چچی نے دروازے میں کھڑے ہو کر بغور ایک ایک لفظ سن کر تمام معاملہ جانچ لیا۔

"تو اور کیا اماں جی! آپ کو تو فرحت کو صاف انکار کر دینا چاہیے تھا۔ اب آپ خود بتائیں ہم تو جیسے تیسے سنبھال بھی لیں باقی مسئلے آپ کو اٹھانا بٹھانا' وضو کرانا' پرہیزی کھانا سب نوبیہ کرتی ہے سوچ لیں۔" وہ بھی تائی کی' جو کہ ان کی بہن بھی تھیں مدد کو آگے آئیں۔ نوبیہ نے چائے آکر تائی کو پکڑائی۔

"اب تو میں فرحت کو کہہ چکی ہوں بھیجوں گی اسے کل فرحان آئے گا لینے' کرلیں گے جیسے تیسے گزارا۔" اماں جی نے دوٹوک کہا کہ مسلسل بیٹی کے خلاف نہیں سن سکتی تھیں۔

"اے نوبیہ!" چچی نے اماں بی کے پاؤں دباتی نوبیہ کو کہا "تم کیوں نہیں انکار کردیتیں جانے سے' ابھی مہینہ بھر پہلے بھی تو فرحت کی طرف سے آرڈر آگیا تھا۔ اب پھر فرحت بی بی کہتی ہیں کہ نوبیہ کو بھیجو نوبیہ کوئی ملازمہ تھوڑی ہے۔" اپنے مطلب کے وقت چچی یونہی نوبیہ کی ڈھال بن جاتی تھیں۔

"مم... میں کیسے چچی..." اس نے ہکلا کر کہا۔ فرحت پھپھو سے وہ ویسے کتراتی تھی کہ وہ زبان کی بہت تیز تھیں اس لیے بھابھیاں بھی براہ راست انکار کرنے سے گھبرا رہی تھیں' پھر کتنے دن ہو گئے تھے فرحان کو دیکھے ہوئے بھی۔

اور نہ چاہتے ہوئے بھی بھابیوں کو' نوبیہ کو فرحت پھپھو کے ہاں بھیجنا ہی تھا آخر کو امیر کبیر خاندان کی بہو تھیں' سو تھیں اکلوتے' خوب صورت اور برسرروزگار بیٹے کی ماں ہونے کا شرف بھی حاصل تھا انہیں اور سونے پر سہاگہ ان کی وہاں ان بن چل رہی تھی جہاں فرحان کا رشتہ طے تھا پہلے۔ اور دونوں بھابھیاں ہی دل سے یہ چاہتی تھیں کہ فرحت پھپھو کی بہو بننے کا شرف ان کی بیٹی حاصل کرے سو پیٹھ پیچھے کتنا ہی کیوں نہ بول لیتیں منہ پر بہت میٹھی بن جایا کرتی تھیں۔

نوبیہ پہنچ چکی تھی پھپھو نے بس کچھ دیر ہی آرام کرنے دیا تھا۔ اسے اور پھر ساتھ لے کر خریداری کے لیے نکل کھڑی ہوئی تھیں نوبیہ کے ذہن پر ابھی تک فرحان سے ہونے والی ملاقات کا خمار طاری تھا "کیا ہے یار نوبیہ کوئی رابطہ نہیں' نہ ملاقات اور کیسی ڈل اور بورنگ لائف ہے تمہاری کہ آج کے جدید دور میں جب بچہ بچہ آئی فون' ٹیبلٹ اپنی جیب میں ڈال کر پھر رہا ہے تمہارے پاس سیل فون ہی نہیں ہے حیرت ہے؟ میں نے تو سنا ہے کہ ماموں نے دور رہ کر بھی تمہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔" اس کی تشویش پر نوبیہ جو خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ تلخی میں بدل گئی۔

"جی ہاں آپ کے ماموں بھیجتے تو ہیں ہر ماہ ہزاروں روپے خرچ کی مد میں' مہنگے مہنگے پرفیومز کاسمیٹکس بھی اور سیل فون بھی مگر دونوں چچیوں اور ان کی اولادوں سے کوئی چیز محفوظ رہ سکتی تب ناں۔ تائی کہتیں اتنی مہنگی چیزیں ہیں سنبھال کر رکھ لوں آخر کو ہمیں ہی تمہیں بیاہنا ہے۔" اور پھر کاشان تھا جو نوبیہ کے ہر اچھے سیل فون پر اپنا حق سمجھتا تھا۔ "ارے بھئی میں نے کئی بار امی کو اشاروں اشاروں میں تمہیں میری دلہن بنانے کا ارادہ ظاہر کرتے سنا ہے۔ کبھی دادی کے سامنے تو کبھی خالہ کے سامنے اب اگر شادی کے بعد میاں بیوی ایک دوسرے کی چیزیں شیئر کرسکتے ہیں تو پہلے کیوں نہیں۔" پہلی بار جب کاشان نے یہ کہہ کر اس کا اچھے والا سیل لیا تھا تو باقی نوجوان پارٹی تو اتنے کھلے اظہار پر کھنکار کر رہ گئی تھی جبکہ نوبیہ خود خالی ذہن لیے بیٹھی رہ گئی تھی۔

کاشان اسے کبھی برا نہ لگا تھا اور وہ خوش ہی ہو جاتی اس کی بات سن کر اگر جو اس کے دل میں فرحان کی تصویر نہ بنی ہوتی مگر نہ تو فرحان نے کبھی کھل کر اس بات کا اظہار کیا تھا کہ وہ اس کی جانب ملتفت ہے نہ ہی پھپھو نے کبھی اشاروں کنایوں میں جتایا تھا۔ ہاں فرحان اس کے ملنے پر اسے بے حد توجہ دیا کرتا تھا یہیں پر آکر وہ اپنے دل کی بات دل میں ہی دبا جاتی تھی۔

اس گھر میں اگر اسے چڑ تھی تو تایا کے بڑے بیٹے اسید سے تھی جو کہ خاندان بھر میں اپنے غصے اور اکھڑ رویے کی وجہ سے مشہور تھا اور اپنی غصیلی طبیعت کے پیش نظر باقی افراد کے ساتھ کبھی کبھار نوبیہ بھی اس کی لپیٹ میں آجاتی تھی ویسے اگر دیکھا جاتا تو اس کے رویے میں گھر والوں کی بد سلوکی کا بھی عمل دخل تھا۔ اس کے اور نوبیہ کے حالات تقریباً" ملتے جلتے تھے اسید تایا ابو کی پہلی بیوی کی اولاد تھا جو کہ اس وقت ایک موذی بیماری کا شکار ہو کر انتقال کر گئیں جب وہ سات آٹھ سال کا تھا دادی نے تایا ابو کی دوسری شادی اپنی بھانجی سے کر دی تھی جن سے فرح اور کاشان پیدا ہوئے تھے۔ چچا کی بیوی بھی تائی کی بہن تھیں جن کے بچوں میں روحیل اور عطیہ تھے اور نوبیہ سب سے چھوٹے چچا کی پہلی اولاد تھی۔

چھوٹے چچا اپنی یونیورسٹی فیلو کو پسند کر کے خود ہی بیاہ لائے تھے کہ دونوں کے گھر والے ہی اس شادی پر تیار نہیں تھے نتیجتاً" انہوں نے سب سے چھپ کر نکاح کر لیا تھا اور پھر چھوٹے چچا اس کو اپنے ساتھ گھر لے کر آئے تھے۔ جہاں ان کی آمد کو نہ صرف ناپسند کیا گیا تھا بلکہ بہت حد تک زیادتیوں کی حد بھی کی گئی تھی جس سے وہ لڑکی سال بھر ہی وہاں رہ سکی تھی اور پھر نوبیہ کو جنم دینے کے بعد اس حد تک حالات سے برگشتہ ہوئی تھی کہ خود ہی طلاق کا مطالبہ کر دیا تھا۔ چھوٹے چچا تب چونکہ بڑے بھائیوں کے دست نگر تھے اس لیے ماں اور بھابیوں کو کچھ کہنے کی بجائے اپنی بیوی کا ہی قصور گردانتے جب وہ ان کے گھر آنے پر اپنی ساس اور جیٹھانی' دیورانی کے رویے کی شکایت کرتیں' محبت کے نام سے شروع کیا گیا زندگی کا یہ سفر ایک سال کا ہونے کے بعد طلاق پر منتج ہوا تھا۔ نوبیہ کی ماں نوبیہ کو ان لوگوں کے پاس ہی چھوڑ گئی تھی جنہوں نے اس پر زندگی کا دائرہ کم کیے رکھا تھا پھر ایسی دلبرداشتہ ہوئی تھی کہ بچی کو بھول بھال کر اپنے پرانے منگیتر سے بیاہ رچا لیا تھا جو اس کا کزن بھی تھا اور اس سے محبت کا دعویدار ہونے کے ساتھ ساتھ اب تک طلبگار بھی۔

چھوٹے چچا کو تایا نے اپنے سالے کے توسط امریکہ بھجوا دیا تھا اور وہ وہیں کے ہو رہے تھے۔ شادی بھی وہیں کی تھیں اور دو بچے بھی تھے۔ اس عرصہ میں پاکستان صرف تین بار ہی چکر لگا تھا ان کا اور آخری دفعہ تب آپائے تھے جب نوبیہ دس سال کی تھی۔

نوبیہ کی زندگی ویسے ہی گزری تھی جیسے عموماً" اس قسم کے بچوں کی گزرتی ہے۔ تائی اور چچی ہزار احسان جتاتیں دادی پر کہ وہ خواہ مخواہ کی ذمہ داری نبھا رہی ہیں وہ بھی اس صورت میں جب نوبیہ کی ماں اور باپ دونوں زندہ ہیں۔ مگر وہ اس ذمہ داری کو سنبھال کر ہرگز بھی نقصان میں نہیں تھیں کہ چھوٹے چچا ان کے بہت احسان مند تھے کہ وہ ان کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کر رکھے ہوئے تھیں پھر خرچ وغیرہ سے بھی ہرگز غافل نہیں تھے ہر ماہ ایک معقول خرچ بھیجتے تھے اور امپورٹڈ اشیاء

الگ۔ نوبیہ کے دیگر کزنز اچھے کالجز اور یونیورسٹیز میں زیر تعلیم تھے جبکہ نوبیہ نے صرف ایف اے کر کے ہی تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا کہ اس کو بچپن سے ہی تائی چچی اور دادی کے کئی کام نبٹانے ہوتے جن میں مصروف رہ کر اسے پڑھنے کا وقت ہی نہ ملتا۔ پھر دادی کرید کرید کر بہوؤں کے بارے میں سوالات کرتیں وہ دادی کی دلچسپی دیکھ کر کچھ حقیقت اور کچھ اپنی طرف سے بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتی۔ کچھ ایسا ہی وہ اس وقت بھی کرتی جب تائی یا چچی کے پاس کسی کام کے لیے گئی ہوئی ہوتی 'ان کے تاثرات' 'ایک دوسرے کی ذات' 'بچوں کی دلچسپیاں' گھریلو سیاستوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتی۔ نوبیہ کی وجہ سے بہت بار بہت معرکے بھی ہوئے پھر اس کام میں اسے اتنا مزا آگیا کہ اگر دادی چچی یا تائی میں سے کوئی فرد دوسرے کے بارے میں کچھ دریافت نہ بھی کرتا تب بھی وہ خود ہی کچھ نہ کچھ ایسا چھیڑ دیتی کہ اس کے نتیجے میں جو گھریلو ناچاقیاں ہوتیں' جو اسے خوب لطف دیتیں پھر اس کا دائرہ کار کزنز تک بھی آپہنچا اور یہی بات اور عمل وہ اسکول میں کالج میں بھی دہراتی اور چھوٹی چھوٹی غلط فہمیوں کے نتیجے میں ہونے والی بڑی لڑائیاں اور جھگڑے اس کی ذات کے اس پہلو کی تسکین کرتے جو پہلے گھر کے بڑوں کے ایک دوسرے کے بارے میں کھوج اور تجسس رکھنے کی عادت نے اس میں پیدا کی تھی پھر اس کی اپنی دلچسپی اور شوق نے اس بری عادت کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیا تھا۔

اسید کا اس سے خار کھانا اس وجہ سے بھی تھا کہ دونوں کے حالات مختلف ہونے کے باعث سوچ میں بہت فرق تھا دونوں کی مائیں نہ ہونے کے سبب دونوں کا ہی دنیا نے غلط استعمال کرنا چاہا تھا نوبیہ تو ایسی بہت سی عادات کا شکار ہو گئی تھی جو اسے مستقبل میں بہت نقصان پہنچانے والی تھیں جبکہ اسید جس کی ماں مرنے کے ساتھ باپ بھی سوتیلا ہو گیا تھا اسے ہی ہر کام کے لیے گھر کا ہر فرد دوڑاتا مگر وہ حکم تو بجالاتا لیکن اپنی پڑھائی کی لگن سے دستبردار ہرگز نہیں ہوا تھا اور رات کو جب وہ اماں جی کے کمرے میں اپنی کتابیں لے کر بیٹھتا تو اس وقت کسی میں ہمت نہ ہوتی کہ اس کو کوئی کام بول سکیں۔ بھلے تایا ہی کیوں نہ ہوتے یہی بات تائی کو چچی کو آگ لگاتی۔

اسید جب جب نوبیہ کو گھریلو سیاستوں میں الوالو دیکھتا اور اس کی تعلیمی حالت دیکھتا اسے خود بخود ہی غصہ آتا تھا کہ اختلافات کے باوجود وہ اس گھر میں اگر کسی سے ہمدردی کا گوشہ رکھتا تھا تو وہ نوبیہ تھی وجہ ان کے ملتے جلتے حالات تھے۔

✡ ✡ ✡

چار دن پھپھو نے خوب مصروف رکھا تھا اسے بازاروں میں گھما گھما کے دماغ ہی گھما ڈالا تھا اس کا حالانکہ صرف منگنی کا فنکشن ہی متوقع تھا ان کی لاڈلی بیٹی کا جبکہ پھپھو کی تیاریاں اور خریداریاں شادی سے بھی بڑھ کر تھیں۔ ہاں بھئی پیسے کے کھیل تھے سارے آج اس کے ذمہ پیکنگ کا سارا کام لگا کر دونوں ماں بیٹی پارلر کے لیے نکل گئی تھیں وہ بے دلی سے کام نپٹا رہی تھی جب فرحان چلا آیا۔

"شکر ہے کزن تمہاری شکل تو دکھائی دی ورنہ تم تو ممی کو پیاری ہو گئی تھیں۔" فلور کشن گھسیٹ کر وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ نوبیہ مسکرا دی تھی بے زاری جیسے کہیں اڑنچھو ہو گئی دل کا موسم بدلنے کی دیر تھی کہ ساری کسلمندی ہوا ہو گئی اور ہاتھ تیز تیز چلنے لگے۔ وہ شاید ملازمہ سے کہہ کر آیا تھا جبھی وہ کافی کے دو کپ اور اسنیکس لے کر چلی آئی۔

"ارے چھوڑو بھئی یہ کام وام لڑکی! تم تھکتی نہیں ہو کیا؟" اس نے اس کے ہاتھ سے شاپر لے کر رکھ دیا۔ نوبیہ بھی اسے متوجہ دیکھ کر خوش ہو گئی پھر ایک دو باتوں کے بعد فرحان نے ادھر ادھر دیکھا اور اس کے ذرا نزدیک ہو گیا۔

"نوبیہ ایک کام تو کرو یار آج!" نوبیہ اپنے دھڑ دھڑ کرتے دل کو سنبھالنے لگ گئی کہ آج شاید وہ موقع آگیا ہے جس کا اس کو انتظار تھا کپکپاتے ہاتھوں میں تھاما کپ اس نے نیچے رکھ دیا۔

"جی کہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"یہ ساتھ والا پورشن میری چچی کا ہے تمہیں پتا تو ہے کئی بار گئی بھی ہوگی۔ آج ذرا جا کر سن گن تو لے آؤ کہ جو مہمان آئے ہیں وہ ان کے ہاں وہ کس سلسلے میں آئے ہوئے ہیں؟ مطلب کس رشتے وشتے کے لیے تو نہیں آئے۔" نوبیہ کے سارے جذبات پر جیسے کسی نے ٹھنڈا پانی انڈیل دیا تھا۔ وہ اس کے منہ سے کچھ اور سننے کی متمنی تھی اب جب موقع بھی تھا دستور بھی تو وہ بےوقت کی راگنی لے کر بیٹھا تھا۔

"کیوں؟ آپ کیوں جاننا چاہ رہے ہیں۔ پھپھو بتا رہی تھیں کہ آپ کی چچی نے فرح کا رشتہ لینے سے انکار کر دیا تھا تب سے ان کا وہاں آنا جانا نہیں ہے اور اچھا ہی ہوا۔ اب دیکھیے ناں فرح کو آپ کے چچا کے خاندان سے زیادہ اچھا خاندان مل گیا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر تمہیں شاید پوری بات کا پتا نہیں ہے چچی یہاں سے بیٹی لینا بھی چاہتی تھیں اور دینا بھی چاہتی تھیں مگر ان کے بیٹے نے جب ہماری بہن سے شادی سے انکار کر دیا ہے تو ان کی بیٹی میں کون سے ہیرے جڑے ہیں جو ہم ان سے رشتہ لیں مگر ہم نے ابھی باضابطہ انکار نہیں کیا کہ ہم بھی رشتہ نہیں لیں گے کیونکہ ابھی ایسا قدم اٹھانے سے جائیداد کی تقسیم کا مرحلہ الجھ سکتا ہے۔ پاپا کی ڈیتھ کے بعد سارا بزنس اور پراپرٹی چچا کے ہولڈ میں ہے۔ وہ سب کچھ اچھے طریقے سے طے ہو جائے تب ہی ہم انکار ان کے منہ پر ماریں گے۔" وہ یہ جانے بغیر کہ نوبیہ کے نازک احساسات جو وہ فرحان کے حوالے سے رکھتی تھی کو کتنی چوٹ پہنچا رہا ہے ایک ایک کر کے اپنے سارے خاندانی پول کھول رہا تھا۔

"مسئلہ یہ ہے کہ ممی نے بےوقت کی ناراضی مول لی ہوئی ہے نہ خود وہاں جا رہی ہیں نہ ہمیں جانے دے رہی ہیں وہ تو آج تیسری دفعہ جن لوگوں کو میں چچا کے ہاں آتے دیکھ رہا ہوں ان سے چچا اور پاپا کے دیرینہ تعلقات تھے۔ امریکہ پلٹ بچے ہیں سارے اب پتا یہ کرنا ہے کہ یہ آمد کوئی رشتوں وغیرہ کے سلسلے میں تو

نہیں ہے اگر ایسا ہے تو ممی کو فی الفور اپنی ناراضی ختم کر کے تجدید تعلقات کر کے یہ ظاہر کرنا چاہیے کہ اگرچہ انہوں نے رشتہ توڑا ہے مگر ہماری طرف سے کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ جب تک جائیداد اور بزنس کی تقسیم نہ ہو جائے۔ تم سمجھ رہی ہو ناں میری بات۔۔۔" اسے گم صم دیکھ کر اب فرحان کو خیال آیا تھا کہ وہ کچھ غائب دماغ سی لگ رہی تھی۔۔۔

"آپ نے پہلے کبھی بتایا ہی نہیں کہ آپ کی بات اپنی کزن سے طے ہے' نہ ہی پھپھو نے۔۔۔" آنکھوں میں آئی نمی کو چھپاتے اس نے دھیرے سے شکوہ کیا۔

"او کم آن یار! یہ بچپن میں کیے گئے فضول فیصلے لازمی نہیں ماننے بھی جائیں بڑوں نے کہہ دیا ہم نے سن لیا دیٹس آل۔۔۔ یہ تو وقت آئے گا تو پتا چلے گا نا اور میں نے تو ممی کو صاف صاف کہہ رکھا ہے کہ میں اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کروں گا۔" اگرچہ اس نے لاپروائی سے کہا تھا مگر پھر بھی نوبیہ کے دل کو سہارا ملا تھا۔

"اور۔۔۔ اور آپ کی پسند کی لڑکی کون ہے؟" وہ جھجک کر پوچھ بیٹھی۔ "بتادوں گا یار۔۔۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ اور تمہیں نہیں بتاؤں گا تو پھر اور کسے بتاؤں گا آخر تم میری سب سے پیاری کزن اور بیسٹ فرینڈ ہو۔"

حالانکہ اس نے یہ بات عام انداز میں کہی تھی اور نوبیہ کے خوش فہم دل نے اس سے ہزاروں معنی خود ہی اخذ کر کے کئی روپہلے خواب اپنی پلکوں پر ٹانک دیے۔ پھر اس نے فی الحال پیکنگ کا سارا کام ایک طرف کر کے پہلا کام یہی کیا تھا کہ پھپھو کا پورشن عبور کر کے ان کی دیورانی کی طرف چلی آئی تھی' جہاں مہمان تو موجود نہیں تھے مگر مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد والی ایک مخصوص ہلچل ضرور مچی تھی۔ ملازمہ ٹیبل سے برتن سمیٹ رہی تھی۔ فرحان کے چچا اسے بیرونی دروازے پر ملے تھے انہیں سلام کر کے اندر آئی تو فرحان کی چچی اور اس کی کزن رانیہ سے سامنا ہوا جو لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے ہوئے باتیں کر رہی تھیں۔

اسے دیکھ کر کچھ دیر کو وہ دونوں چپ ہو گئی تھیں گویا توقع نہ کر رہی ہوں کہ پھپھو کے گھر سے بھی کوئی آسکتا ہے ان کے ہاں' مگر جلد ہی خود کو کمپوز کر کے دونوں اس سے اچھے طریقے سے ملیں۔

"لگتا ہے مہمان آئے تھے۔" اس نے بیٹھنے کے بعد ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی بیٹا! آپ کے انکل کے جاننے والوں کی فیملی تھی۔ آپ بتائیں! کیا لیں گی؟ ٹھنڈا یا گرم؟" چچی نے متانت سے جواب دے کر اس سے پوچھا مگر آگے بھی نوبیہ تھی بات اور حالات تو اپنی مرضی سے موڑ لینے والی اپنی خفیہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر سو جلد ہی اتنی بے تکلف ہو گئی کہ وہ ماں بیٹی بھی اب پوری دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ ملازمہ اس دوران چائے دے کر جا چکی تھی۔

"آپ لوگ آئیں گے نہیں فرح کی منگنی پر اور آپ لوگوں کو شاید پتا نہ ہو پھپھو' فرحان بھائی کی شادی بھی اپنے بھائیوں کے ہاں کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں بلکہ زبانی بات چیت تو ہو ہی چکی ہے بس اعلان کرنا باقی ہے۔" چچی تو اس کی بات سن کر چپ ہو گئیں جبکہ رانیہ کا چہرہ بھی پھیکا پڑ گیا۔ اس کی زیرک نگاہوں سے یہ بات پوشیدہ نہ رہ سکی کہ فرحان بھلے رانیہ میں دلچسپی نہ رکھتا مگر اس لڑکی کے تاثرات فرحان کے رشتے کی بات سن کر رنجیدہ ہو گئے تھے۔

"ویسے آنٹی!" اس نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔ "اگر رافع بھائی' فرح کے رشتہ سے انکار نہ کرتے تو یہ سب نہ ہوتا پھپھو تو بہت غصے میں ہیں اور کہہ رہی تھیں کہ اپنے دونوں بچوں کی شادی اس گھر سے بہتر گھر میں کر کے دکھائیں گی۔" اس کے ساتھ ہی اس نے پھپھو اور فرحان کے ایسے ایسے فرمودات سنائے کہ جو انہوں نے خواب میں بھی نہ سوچے ہوں گے' اچھا آنٹی۔۔۔ میرا نام مت لیجیے گا۔۔۔ پھپھو کو تو پتا بھی نہیں کہ میں آئی ہوں آپ کی طرف اور بیٹی بن کر آپ کو مشورہ دے رہی ہوں کہ وہ ہیں تو میری پھپھو مگر بہت منتقم مزاج خاتون ہیں آپ بھی جانتی ہوں گی' اب

اس سے پہلے کہ وہ فرحان بھائی کا رشتہ کر کے آپ کو نیچا دکھائیں۔ آپ ان سے پہلے ہی رانیہ کی بات کہیں طے کر دیں۔ اتنی پیاری، پڑھی لکھی اور خوب صورت لڑکی سے کون رشتہ جوڑنا پسند نہیں کرے گا۔" اٹھتے اٹھتے اس نے مزید گوہر فشانیاں کیں کہ رانیہ اپنا سر ماں کے کندھے پر رکھ کر رونے لگی۔

"ارے بیٹا! تمہارا بہت شکریہ جو تم نے ہمیں وقت پر بتا دیا ورنہ میں تو بھابھی (پھپھو) کی ناراضی کو، ان کی وقتی ناراضی سمجھ رہی تھی مجھے کیا پتا تھا وہ اتنا زہر اپنے اندر بھرے ہوئے ہیں۔ تم بے فکر ہو جاؤ تمہارا نام بھی نہیں آئے گا اس سارے سلسلے میں۔" آخر میں رخصت ہوتے سے اس نے جب ان کو ایک دفعہ پھر تاکید کی تب وہ آہستہ سے بولی تھیں اور پھپھو کی دیورانی واقعی پھپھو سے بہت مختلف ایک شائستہ اور سلجھے مزاج والی خاتون تھیں واپسی پر نویہ کا چہرا ایسے جگمگا رہا تھا جیسے ہزار واٹ کے بلب جگمگا رہے ہوں فرحان شدت سے اس کا منتظر تھا۔

"آپ کا اندازہ ٹھیک تھا فرحان۔۔۔ وہ لوگ واقعی رانیہ کے ابو کی دوست کی فیملی تھی اور اپنے بیٹے سے رانیہ کی بات طے کرنے آئے تھے۔" فرحان کو جب اس نے بتایا وہ تو اچھل ہی پڑا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پاپا نہیں رہے تو ان کے بعد وہ لوگ ان سے کی گئی ایک ایک کمٹ منٹ بھی توڑتے جا رہے ہیں۔ مجھے رانیہ میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے مگر چچا ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟" ٹہل ٹہل کر وہ اپنا غصہ کم کر رہا تھا۔

"رانیہ کی امی اور رانیہ تو چڑھ بڑھ کر ان کی امارت کے قصے سنا رہی تھیں کہ لڑکا فرحان سے کئی گنا زیادہ امیر، ہینڈسم اور ایجوکیٹڈ ہے۔" اس نے جلتی پر تیل چھڑکا۔ پھپھو کے آنے تک فرحان نے ایک ایک بات غصے میں ان کو بتادی تھی اور نویہ کے جانے کا ذکر کیے بنا کہا تھا کہ اس کو مصدقہ اطلاع ملی ہے کسی ذریعے سے۔ بس جی پھر کیا تھا پھپھو نے اسکائپ پر ماں اور سب بھائیوں اور بھابیوں کی ایمرجنسی میٹنگ کال کر لی۔

"اماں بس میں آپ سے کہے دے رہی ہوں کہ چھوٹے بھائی سے فوراً" رابطہ کریں اور بتائیں کہ میں نویہ کا رشتہ لینے کو تیار ہوں مگر میری بھی ایک شرط ہے کہ اسے فرحان کو اپنے پاس بلوا کر سیٹل کرنا ہوگا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی تو انہوں نے مجھے اشارہ دیا تھا گویا نویہ کو میری بہو بنانا چاہتے ہیں مگر تب فرحان کے ابو اپنی بھتیجی کا سوچ بیٹھے تھے میں کیسے ہاں کہہ سکتی تھی اب آپ انہیں بتا دیں آخر کو اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں۔" کمرے میں موجود حاضرین نے اسکرین پر نظر آتی پھپھو کے نادر خیالات سن کر آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کیے پھر تائی ہی ہمت کر کے آگے آئیں۔

"یہ کیا بات ہوئی اماں! بچی کو پالا پوسا ہم نے اب گھر کی بچی کوئی اور۔۔۔ لے اڑے یہ ہمیں نہیں گوارا نویہ تو اس گھر کی بہو ہے میں یا میری بہن۔ ہم دونوں میں سے ہی کسی کی بہو بنے گی۔ اور اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں تو بٹی سے کہیں کہ ہم دونوں کی بیٹیاں بھی اس کی بھتیجیاں ہیں ان میں سے کسی ایک کے بارے میں فیصلہ کرنا ہوگا اسے۔" تایا اور چچا بھی تائید میں سر ہلا رہے تھے گویا اپنی نصف بہتر اور بھابھی کی بات سے متفق ہوں پھر تائی نے یہی بات پھپھو کے سامنے ذرا آگے ہو کر خود ہی دوہرادی تھی۔ ایک لمحے کو پھپھو کے منہ کے زاویے بگڑ گئے۔

"اچھا بھائی میرے لیے تو اس گھر کی تینوں بچیاں برابر ہیں لیکن بڑے بھیا یا چھوٹے بھیا بدلے میں گاؤں والی ساری زمین میرے بیٹے کے نام کرنی ہوگی آپ کو۔۔۔ باپ کے مرتے ہی چچا نے بھی منہ پھیر لیا اب ماموں سر پر ہاتھ نہیں رکھیں گے تو کون رکھے گا باقی کونسی بچی کا رشتہ دینا ہے یہ فیصلہ میں آپ پر چھوڑتی ہوں، ہاں زمین والی شرط برقرار ہے۔ خوب سوچ لیں پھر بات کریں گی۔" کہتے ہی پھپھو اسکرین سے آؤٹ ہو گئیں۔

"ہونہہ رہی ہمیشہ کی ہمیشہ لالچی۔۔۔ میاں مر گئے تو

کون سی کمی چھوڑی مرحوم نے۔۔۔ لمبا چوڑا چلتا ہوا کاروبار۔ جائیداد سب کچھ تو چھوڑ کے گئے ہیں۔" چچی بولیں۔

"یہ تو بہت نامناسب بات کی ہے فرحت نے اب بھلا ساری زمین ہم کیسے فرحان کے نام کرسکتے ہیں' وہ کوئی اکیلے ایک بندے کی زمین تو ہے نہیں تینوں بھائیوں کی ساری اولاد ہی اس کی وارث ہے جبکہ اپنا حصہ تو فرحت کب کا لے چکی ہے۔" تایا جھنجلا کر بولے۔

"اچھا میں سمجھاؤں گی فرحت کو۔ میرا مشورہ مانو تو سبین کی منگنی فرحان سے اور عطیہ کی منگنی اسید سے کر دو وہ بھی تو ہمارا بچہ ہے اس کا بھی تو ہم نے ہی سوچنا ہے۔" بڑی اماں نے فرحان کے لیے تایا کی بیٹی اور اسید کے لیے چچا کی بیٹی کا نام لے کر تایا اور تائی کی باچھیں کھلا دیں جبکہ چچی کا موڈ بگڑ گیا تھا۔

"ہونہہ میری بیٹی کے لیے وہی ایک آوارہ ہی تو رہ گیا ہے۔" وہ تلملائی تھیں مگر دل ہی دل میں کہ میاں سے ڈرتی بھی بہت تھیں وہ چپ تھے گویا اماں جی کی بات سے متفق تھے۔

"اور بڑی بہو! نوبیہ کو چونکہ تم نے ماں بن کر پالا ہے تو اس پر تمہارا حق زیادہ ہے۔ اسے کاشان کی دلہن بننا چاہیے۔ میرا خیال ہے تم سب کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا اور ہاں۔۔۔ گاؤں والی زمین میں سے جتنا سبین کا حصہ بنتا ہے وہ اس کے نام کر دینا اور میں تو کہتی ہوں کہ جائیداد اور زمینوں کی تقسیم اور تصفیے والدین کو اپنی زندگی میں ہی کر دینے چاہئیں تاکہ بعد میں یہی چیزیں رشتوں میں دراڑیں ڈالنے کا سبب بنتی ہیں۔" اور اس رات کئی لوگوں کی زندگیوں کا فیصلہ ان بڑوں نے کیا تھا یہ جانے بغیر کہ ان کے یہ فیصلے ان کی اولاد کو قبول بھی ہوں گے یا نہیں تاہم کچھ ماہ تک یہ فیصلے بچوں سے مخفی رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا کہ سوائے فرحان کے سب ہی اپنے تعلیمی مراحل سے گزر رہے تھے اور تعلیم کی تکمیل میں کسی کو چھ ماہ تو کسی کو سال درکار تھا پھر بھی پھپھو کو فون کرکے بڑی اماں نے ساری بات پہنچا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا کہہ رہی ہیں ممی آپ!" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا "مجھ سے پوچھنا گوارا نہ سہی مجھے بتا تو دیتیں بالا ہی بالا سارے فیصلے کرلیے۔" فرحان نے پھپھو سے کہا۔ فرح ایک سائیڈ پر اپنے ناخنوں پر کیوٹکس لگا رہی تھی گویا کمرے میں موجود باقی دو فریقین سے کوئی سروکار نہ ہو۔

"تو کیا کرتے تم' انکار کردیتے تمہارے چچا کی فیملی نے جو کچھ ہمارے ساتھ کیا ہے وہ بھی تمہارے سامنے ہے ایسے میں میں اپنے بھائیوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گی تو اور کس کے سامنے جاؤں گی اور بے فکر رہو میں نے ہر بات صاف صاف بتا بھی دی ہے انہیں کہ بیٹی دینے کی صورت میں انہیں تمہیں سپورٹ بھی کرنا ہو گا۔ میں تو نوبیہ کے لیے چاہ رہی تھی پہلے تمہاری انڈرسٹینڈنگ بھی ہے اس کے ساتھ اور بھائی بھی تمہیں باہر بلا لیتے مگر بڑی بھابھی ہمیشہ اپنا مطلب دیکھتی ہیں کہا کہ نوبیہ تو کب سے بہو بنانے کا سوچ بیٹھی ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولیں۔

"ارے یہ کیا غضب کرنے چلی تھیں آپ' نوبیہ کو اپنا کزن سمجھ کر' ترس کھا کر اگر میں چند باتیں کرلیتا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اس سے شادی کرلوں ایک شکل و صورت ہی ہے اس کے پاس' باقی دیکھا ہے تعلیم ہے تو نہ ہونے کے برابر نہ اٹھنے بیٹھنے کا ڈھنگ نہ سوسائٹی میں موو کرنے کا سلیقہ۔ بڑے ماموں کی بیٹیاں کم از کم ایجوکیٹڈ تو ہیں بندہ فخر سے تعارف تو کرا سکتا ہے۔ میں تو اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں اتنی جلدی یہ سب ایکسپیکٹ نہیں کر رہا تھا۔" وہ کچھ الجھ کر بولا۔

"ہم کون سا جلدی کر رہے ہیں سبین امتحانات سے فارغ ہولے تب تک تم بھی اپنے چچا سے مل کر کاروبار الگ کرنے کا فیصلہ انہیں سناؤ اور پھر تمہیں کچھ دن لگیں گے نیا کاروبار سیٹ کرنے میں اور اسے

اسٹیبلش کرنے میں بھی تو ٹائم لگے گا شادی تو تب ہی کریں گے۔ ہاں رشتے کا ڈکلیئر کردیں گے تاکہ سب کو پتا چل جائے کہ بیین بھی رانیہ سے کسی بھی حوالے سے کم نہیں ہے۔ شکل و صورت، تعلیم کس چیز کی کمی ہے اور تو اور میرے بھائیوں کی گاؤں والی زمین تو سونا اگلتی زمین ہے۔" پھپھو نے یقیناً "بہت دور کی سوچی تھی۔

دروازے سے کان لگائے کھڑی نوبیہ کے ارمانوں کا تاج محل اتنی جلدی زمین بوس ہو جائے گا اس نے کب سوچا تھا۔ "اور یہ فرحان گھٹیا انسان کتنی بار اشاروں اشاروں میں مجھے باور کرایا کہ وہ مجھے ہی چاہتا ہے۔" اپنے کمرے میں آکر ٹہل ٹہل کر اس کی ٹانگیں شل ہو گئیں۔ "شکر ہے کسی کمزور لمحے کی زد میں میں نے اپنے دل کی حالت عیاں نہیں کردی۔ کتنی سبکی ہوتی۔" وہ سوچے جارہی تھی۔ "میں بھی اب یہ ظاہر نہیں ہونے دوں گی کہ کبھی یہ دل اس دولت کے پجاری کے پیچھے دھڑکتا تھا ہونہہ۔ تعلیم تو دیکھیں ممی نوبیہ کی.... بڑا آیا تعلیم یافتہ۔" آنسو پونچھتے وہ خود سے ہی بولے جارہی تھی۔ بالآخر شام کو اس نے گھر واپس جانے کی رٹ لگادی۔

"بس میرا دل گھبرا رہا ہے مجھے فوراً "گھر بھجوائیں اماں بی کی یاد آئی ہے!" وہ رو ہی دی تو پھپھو کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"ارے بیٹا! میں تو چاہ رہی تھی کہ منگنی میں تو سب نے آنا ہی ہے ان کے ساتھ ہی واپس بھیجوں گی تمہیں خیر روؤ مت میں تمہیں بھجوانے کا بندوبست کرتی ہوں۔" مگر اس سے پہلے ہی پتا چلا کہ اماں جی نے نوبیہ کو بلوا بھیجا ہے اور اسید اسے لینے کے لیے آیا ہوا ہے۔

"ارے بھئی ایسی بھی کیا بے گانگی کتنے عرصے بعد آئے ہو میرے گھر یاد ہے کب آئے تھے آخری بار' آجاؤ چائے پیئے بغیر نہیں جانے دوں گی تمہیں۔" پھپھو کو جب پتا چلا تھا اسید آیا ہے اور باہر گاڑی میں ہی نوبیہ کا انتظار کر رہا ہے وہ اسے کھینچ کھانچ کر لے کر آئیں۔

"کیا حال بنا رکھا ہے تم نے بچے اپنا' کہاں ہوتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ بھائی کی سب سے بڑی اولاد ہو اور بڑی اولاد کا بہت آسرا ہوتا ہے انسان کو مگر تمہاری حرکتوں سے عاجز ہیں بھائی' مت تنگ کیا کرو اسید ماں باپ کو۔"

پھپھو کو میکے سے جیسی رپورٹ ملتی تھی اسی کے مناظر میں وہ اسے نصیحت پہ نصیحت کیے جارہی تھیں۔

"جی ٹھیک ہے نوبیہ کو بلائیں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔" ان کی لمبی چوڑی بات کے جواب میں اس نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے اپنے مخصوص سنجیدہ انداز میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا جب وہ اجازت لینے کے لیے ان کے آگے جھکا تو نوبیہ ستا ہوا چہرہ لیے اپنا چھوٹا سا بیگ اٹھائے آگئی تھی۔ پھپھو نے دونوں کو رخصت کیا۔

"تمہیں اپنے گھر آرام نہیں ملتا جو منہ اٹھا کر آئے روز کبھی یہاں تو کبھی وہاں چل پڑتی ہو پتا بھی ہے اماں جی تمہارے بغیر کتنی تنگ ہوتی ہیں۔ وہ تو انہوں نے مجھے بھیجا ورنہ تم نے ابھی نہ جانے کتنے دن ڈیرے ڈالے رکھنے تھے۔"

"ہونہہ دوسروں کو نصیحت خود میاں فضیحت۔" وہ چونکہ پہلے ہی بھری بیٹھی تھی سو سر جھٹک کر ہولے سے بولی۔

"کیا کہہ رہی ہو' اونچا بولو میں بھی سنوں۔" اسید کو اس کا انداز غصہ دلا گیا۔

"میرا دماغ مت خراب کرو اور چپ کر کے ڈرائیو کرو بات کرنے سے پہلے اپنے گریبان میں بھی جھانک لیا کرو۔" ٹھکرائے جانے کا غم تازہ تازہ تھا سو کسی کا غصہ کسی پر نکل گیا۔

"کیا... کیا مطلب ہے تمہاری اس بات کا؟" اسید نے گاڑی سائیڈ پر کر کے روکی اور پورے کا پورا اس کی طرف گھوم گیا غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ نوبیہ ایک لمحے کو ہی خائف ہوئی تھی مگر پھر اسی انداز میں بولی۔

"ہاں تو کیا جھوٹ کہا ہے میں نے مجھ پر ایک سو

ایک اعتراض ہیں تمہیں خود کے بارے میں کیا خیال ہے؟ فرسٹ ٹائم تو چلو یونیورسٹی کا بہانہ ہو گیا سیکنڈ ٹائم تمہیں کبھی کسی نے گھر میں نہیں دیکھا بعض دفعہ رات کو بھی گھر آنے میں ڈنڈی مار جاتے ہو۔ تمہاری وارڈ روب کی صفائی کے دوران نوٹوں کی گڈیاں اور ریوالور بھی میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔ وہ تو شکر کرو گھر میں کسی کو بتایا نہیں ہے میں نے۔۔۔ اور محترم کا ایک دفعہ فون سننے کا اتفاق ہوا مجھے' ادھر سے کوئی لڑکی فرما رہی تھیں کہ پروگرام ڈن تھا تو تم آئے کیوں نہیں اسید۔" وہ منہ بگاڑ کر طنزیہ انداز میں بولی۔

"اف یہ جاہل لڑکی۔۔۔ اسید کی بے اختیار گہری سانس نکل گئی۔ اس نے کچھ کہے بغیر دوبارہ سے گاڑی اسٹارٹ کردی اسے دوسروں کی باتیں چھپ کر سننے کی عادت تھی' سنی ہوئی بات کو اپنی مرضی سے موڑ توڑ کر مخالف فریق تک پہنچانا اور گھریلو جھگڑوں کو ہوا دینا اس کا شوق تھا مگر وہ دوسروں کے فون تک اٹینڈ کرلیتی ہے اور وقت پڑنے پر وارڈ روب کی تلاشی بھی۔

"تم اتنی بڑی ہو گئی ہو آج تک تمہیں اتنی تمیز کسی نے نہیں سکھائی کہ نہ تو بغیر اجازت کسی کا سیل یوز کرتے ہیں اور نہ ہی الماری میں گھستے ہیں وہ بھی اس صورت جب میں اپنا ہر کام خود ہی کرتا ہوں۔ کپڑے دھونے سے لے کر استری تک اور وارڈ روب کی صفائی بھی میں خود ہی کرلیتا ہوں تمہیں آئندہ ایسی کسی تکلیف کی ضرورت نہیں ہے۔" اپنے اندر کے بے پناہ غصے کو دباتے اس نے اس سے کہا۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔۔۔ کہ کر نوبیہ نے اپنا منہ کھڑکی کی طرف کرلیا۔

پچھلے ڈیڑھ سال سے وہ ایک فری لانسر صحافی کے طور پر ایک اخبار کے لیے کام کرتا تھا یہ کام اس کا شوق بھی تھا اور ضرورت بھی اور وہ چونکہ کرائم برانچ سے منسلک تھا سو ریوالور رکھنا ایک عام سی بات تھی اس کے لیے۔ جس لڑکی کے بارے میں نوبیہ بات کررہی تھی وہ اس کی ساتھی کولیگ تھی مگر آج تک اس نے یہ باتیں کسی سے ڈسکس نہیں کی تھیں کہ اسے اپنی ذات کی اہمیت بہت اچھی طرح معلوم تھی اس گھر میں۔ سوتیلی ماں اور بعد میں اس کی بہن اور پھر ان کے بچوں نے اپنی ماؤں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پہلے دن سے جو محاذ اس کے خلاف بنایا تھا وہ سب اس پر پوری طرح کاربند تھے اور تائی (سوتیلی امی) تو تایا کو اس سے برگشتہ کرنے میں خاصی کامیاب بھی تھیں۔ کالج میں آنے کے بعد اسے بہت برا لگتا جب ابا سے پیسے چاہیے وہ کسی کتاب خریدنے کے لیے ہوتے، فیس کے لیے یا کسی ضرورت کے لیے مانگنے پر جواب ملتا اپنی ماں سے لے لو بھئی اور ماں سے مانگنا اسے دنیا کا پر اذیت کام لگتا۔ سو باتیں سنا کر سو احسان جتا کر جب وہ پیسے اسے پکڑاتیں اس کا دل کرتا وہ آگ لگادے ان پیسوں کو اپنے اندر کی فرسٹریشن کو کاغذ پر کیا انڈیلا کہ وہ خود بھی پرسکون ہو گیا تھا اور لکھنے کے پیسے بھی مل جایا کرتے تھے اس کا قلمی نام چونکہ اور تھا سو کسی کو پتا نہ چل سکا۔ بی اے میں اس نے صحافت کو بطور اختیاری مضمون چنا اور جب اس نے تائی سے پیسے لینا بند کر دیے اور اخبار کے لیے باقاعدہ کام بھی شروع کردیا تب سے تائی اس کے اور خلاف ہو گئی تھیں۔ ان کے خیال میں وہ کسی غیر قانونی کام کرنے والے گروہ کے ساتھ مل گیا تھا اس نے تائید یا تردید میں دلچسپی نہیں محسوس کی تھی۔ اب پچھلے ڈیڑھ سال سے وہ ایک اچھی سرکولیشن کے اخبار کے ساتھ منسلک ہو گیا تھا وہیں اس کی مصروفیات بھی بڑھی تھیں اور یونیورسٹی میں یہ اس کا آخری تعلیمی سال تھا۔

"نوبیہ۔۔۔" اس نے باہر دیکھتی نوبیہ کو پکارا تھا۔

"میری ماں مرگئی تھیں اور تمہاری ماں تمہیں چھوڑ گئی تھیں اور یہ مائیں نہ ہوں تو بہت کچھ تو بگڑتا ہی ہے۔ انسان کے ساتھ ساتھ پوری زندگی بھی بگڑ جاتی ہے۔ ابھی بھی وقت ہے تعلیم کا ٹوٹا سلسلہ پھر سے جوڑو اور گھریلو سیاستوں سے دور رہنے کی کوشش کرو۔ تمہاری بہت سی عادتیں دوسروں کے لیے بہت تکلیف کا باعث بنتی ہیں مگر تمہیں ابھی احساس نہیں ہے کہ تمہیں خود کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ اللہ نہ کرے جو تمہیں کوئی تکلیف پہنچے میں تمہیں جو کچھ

کہتا ہوں اس میں مقصد یہی پنہاں ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو ضائع مت کرو خدا کے لیے میری تمہاری کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے، تم بہت اچھی ہو اور اچھے لوگوں کو اپنی ذات میں اچھائیاں پیدا کرنی چاہئیں جبکہ مجھے تمہاری ذات میں ان کی کمی نظر آتی ہے۔ میرا مقابلہ کرنے کی بجائے چند لمحوں کے لیے ان باتوں کو سوچ لینا۔" وہ دیکھتا تھا اس کی عادتیں اس کی وجہ سے ہونے والی گھریلو چپقلشیں، جب وہ تائی کی کوئی بات چچی کو غلط سلط کر کے بتاتی یا پھر اماں جی کے پاس آکر ان کی بہوؤں کے خلاف بات کرتی اسے۔ بہت برا لگتا وہ اس وقت بھی اسے ٹوک دیتا اور آج ایک بار پھر موقع پا کر اسے سمجھایا تھا۔ زندگی میں پہلی بار دوبدو لڑنے کی بجائے وہ خاموشی سے نیچے اتر گئی تھی۔ اسید کتنی ہی دیر گاڑی میں بیٹھا اسی کے متعلق سوچتا چلا گیا۔ سب نے اسے اپنے اپنے مفاد کی خاطر استعمال تو کیا تھا مگر اس کی تربیت کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دی گئی تھی نہ ہی تعلیم کی طرف تعلیم و تربیت۔ انسان کی زندگی کے دو روشن پہلو جو اگر مثبت ہوں تو زندگی ہی سنور جائے اور جو منفی ہوں تو زندگیاں ہی بگاڑ دے۔

گھر میں اس کا پہلا سامنا ہی تائی جان سے ہوا تھا۔ مگر خلاف معمول ایسے ہر موقع پر پھپھو کے خلاف بولنے کی بجائے انہوں نے اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"ارے نوبیہ! شکر ہے تم آگئی ہو اماں جی کی طبیعت کا تو پتا ہے تمہارے بغیر کتنی گھبرا جاتی ہیں اور یہ تم ہی ہو جو ان کو سنبھال لیتی ہو۔ ورنہ تمہارے بغیر ہم دونوں (تائی، چچی) اور بچیوں نے بھی کوشش کی کہ انہیں کوئی تکلیف اور کمی نہ ہو مگر اماں جی کی تان اسی بات پر جاکر ٹوٹتی تھی کہ نوبیہ کو دیکھو جا کر بیٹھ ہی گئی ہے نہ جانے والی کو خیال اور نہ ہی بلوانے والی کو کہ بوڑھی ماں کتنی تنگ ہوتی ہے۔" انہوں نے اماں جی کی کہی ہوئی باتیں دہرائیں نوبیہ غیر دماغی سے سرہلا کر رہ گئی اور یہ تھی بھی ٹھیک بات! نوبیہ جتنا اماں جی کا خیال گھر میں کوئی بھی نہیں رکھتا تھا جب نوبیہ کو ان کی بیٹی بلوا بھیجتیں تو فراحت کی ناراضی کے ڈر سے اسے بھیج تو دیتی تھیں مگر پھر اس کے بغیر بہوؤں اور پوتیوں کی محتاج ہوتیں جو ہر وقت نہ تو ان کی پٹی سے لگ کر بیٹھ سکتی تھیں نہ ہی ہر پکار پر بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوتیں۔ جز وقتی ملازم آکر کھانا دے جاتی اور کپڑے بدلوانے میں بھی مدد کر دیتی اس کے علاوہ وہ راہ تکتی رہتیں کہ کوئی ان کے کمرے میں آئے تو کوئی کام کہیں نیچے اور اوپر کے پورشن میں جو انٹر کام کا کنکشن ان کے کمرے میں تھا گھو بجا بجا کر تھک جاتیں تب جاکر منہ بنائے کوئی بہو یا پوتی نظر آتی۔

"اچھا ایک اور بات نوبیہ! اس بار تمہارے باپ نے تمہارے خرچ کے پیسے نہیں بھیجے۔ ذرا فون تو کرنا کہ کیا مسئلہ ہے۔ اب دیکھو ناں بیٹا! اتنا بڑا کنبہ، ایک تمہارے تایا کمانے والے اور کھانے والا سارا کنبہ یہ تو مجھے پتا ہے کیسے پورا کرتی ہوں۔" تائی کو اچانک ایک اور فکر نے آن ستایا تو نوبیہ کو کہا۔ حالانکہ اسید بھی انہیں مہینے کے دس ہزار دے رہا تھا گزشتہ کئی ماہ سے مگر اس بات کی ہوا انہوں نے تایا کو ہرگز نہیں لگنے دی تھی۔ تایا اور چچا دونوں بیویوں کی آنکھوں سے دیکھنے اور انہی کے کانوں سے سننے والے مرد تھے سو شادی کے بعد بیویوں کو جو راجدھانی سونپی تو پلٹ کر خبر نہیں لی تھی کہ وہ سیاہ کر رہی تھیں یا سفید۔ ان کی اسی عادت کا فائدہ اٹھا کر تائی نے اسید اور اس کے باپ کے درمیان فاصلے کو اتنا بڑھا دیا تھا کہ بظاہر اسے پاٹنا ان دونوں کے لیے ناممکن نظر آتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا ہوا ایسے کیوں رو رہی ہو عطیہ! ہوا کیا ہے؟" نوبیہ نے سوں سوں کرتی عطیہ کو دیکھا۔

"یہ پوچھو کیا نہیں ہوا؟ تبین بیاہ کے چلی جائے گی فرحان کے ساتھ۔ تم کاشی کے ساتھ عیش کرو گی اور میرے لیے وہ غنڈا، آوارہ اسید ہی رہ گیا ہے۔ جس دن سے امی نے مجھے بتایا ہے میری تو راتوں کی نیند ہی اڑ گئی ہے۔ امی کہتی ہیں چونکہ ابو کو کوئی اعتراض نہیں ہے

سو اس سلسلے میں کچھ کرنے سے قاصر ہیں مجھے بتاؤ نوبیہ! میں کیا کروں۔ کسی طرح اس دہشت گرد سے میری جان چھوٹ جائے پتا نہیں کیا کرتا ہے؟ امی بتا رہی تھیں کہ کچھ ماہ تک شادیاں بھی کرنے کا ارادہ ہے سب بڑوں کا۔ میں مرجاؤں گی مگر اسید سے شادی ہرگز نہیں کروں گی۔" اب وہ غصے اور دکھ سے بول رہی تھی۔ نوبیہ اسے تسلی بھی نہ دے سکی کہ وہ سب کچھ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ اسید واقعی ایک مشکوک بندہ تھا اچانک اسے ایک خیال آیا وہ چہرے پر سرخی لیے نوبیہ کے پاس آن بیٹھی۔

"نوبیہ۔ تم کچھ کرسکتی ہو۔ بلکہ بہت کچھ کرسکتی ہوں۔ کسی طرح۔ کسی بھی طرح ابا اور تایا کو یقین دلا دو کہ اسید میرے لیے مناسب نہیں ہے کچھ بھی کہہ کر۔ کچھ بھی کرکے۔ پلیز میری بہن نہیں ہو نوبیہ میں زندگی بھر تمہارا یہ احسان نہیں بھولوں گی۔" اب وہ منت ترلوں پر اتر آئی تھی۔ پھر کچھ ہی دیر میں اس نے اپنی منتوں سے نوبیہ کو راضی کرلیا کہ وہ اسید کے بارے میں تایا اور چچا کو کچھ ایسا کہے کہ وہ اس رشتہ سے انکار کردیں۔

☼ ☼ ☼

تائی کا موڈ آج صبح سے خراب تھا نوبیہ کے ابو کی کال آئی تھی تایا کے پاس کہ ان کو بزنس میں زبردست نقصان ہوا تھا وہ فی الحال کرائسس میں ہیں سو نوبیہ کے لیے کچھ بھی بھیجنے سے قاصر ہیں۔

"ساری دنیا کے یتیموں مسکینوں کا ٹھیکا نہیں لیا ہوا ہم نے۔ ماں باپ دونوں دوسری شادیاں رچا کر بے خبر ہیں۔ ماں نے تو مڑ کر پوچھا تک نہیں کہ بیٹی زندہ بھی ہے یا مرگئی' باپ ہے تو چند ہزار بھیج کر احسان کردیتا ہے۔ ہونہہ۔ کتنی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے لڑکی ذات کی۔" برتنوں کو اٹھا کر پٹخ پٹخ کر رکھتے وہ بولے جارہی تھیں۔

یہ سوچے بغیر کہ نوبیہ اگر ان کے ہاں رہ رہی تھی تو اس نے بہت سے کام اپنے ذمہ لے کر ان کو کئی ذمہ داریوں سے آزاد کردیا تھا بہت بچپن سے ہی ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس نے گھر سنبھال لیا تھا۔ اپنی تعلیم کی قربانی دی تھی۔ ماں باپ اور ہر چیز کے ہوتے ہوئے ہمیشہ اس کے لیے بچا کھچا کھانا آتا۔ عطیہ اور سبین کے کپڑے پہننے کو ملتے پھر بھی اسی حال میں مست تھی' خوش تھی۔

"توبہ ہے اماں جی! میں خبر نہ لوں آپ کی' تو کوئی پرسان حال نہیں آپ کا یہ دیکھیں بال اتنے الجھے ہیں آپس میں کہ سلجھانے کی کوشش میں ٹوٹتے ہی جا رہے ہیں۔" وہ اماں جی کے بالوں میں کنگھی کررہی تھی آج اصل میں تایا کے کوئی ملنے والوں کی فیملی آگئی تھی ان کے لیے کھانا گھر میں اسپیشل بنانا پڑا تھا اسے۔ وہ دوپہر کو ایک بار ہی آپائی تھی اماں جی کے پاس کپڑے بدلوا کر ابھی کنگھی اٹھائی ہی تھی کہ ملازمہ تائی کا بلاوا لے کر آگئی تھی۔ اسے پھر نیچے جانا پڑا تھا۔ ظہر عصر اسی مصروفیت میں گزری تھی۔ عشا کو کہیں جا کر اماں جی کا خیال آیا تھا اسے اور اماں جی بری طرح برس پڑی تھیں اس پر کیا کرتیں اپنا غصہ نکالنے کے لیے وہی دستیاب ہوتی تھی انہیں کچھ دیر بول چکنے کے بعد جب غصہ ٹھنڈا ہوچکا تب جا کر اماں جی نے پھپھو کے گھر کا تفصیلی حال احوال لیا تھا نوبیہ سے۔

"ہاں تو اچھا کیا ناں اب ان کو پتا چلے گا کہ بیٹی کو ٹھکرانے کا غم کیا ہوتا ہے۔" اماں جی پوری بات سن کر بولیں۔ جس میں سچ کم اور جھوٹ کی آمیزش زیادہ تھی جبکہ اپنی مخصوص جگہ پر کام میں الجھا اسید جو کہ چاہ کر بھی ان کی باتوں سے اپنی سماعتوں کو محفوظ نہ رکھ پایا تھا نے کلفذات کے پلندے سے سر اٹھا کر پھپھو کے خاندان کے بخیے ادھیڑتی نوبیہ اور بڑے جوش خروش سے سنتیں اور درمیان درمیان میں لقمے دیتیں اپنی دادی کو دیکھا جو بھلے نماز قرآن زکواۃ روزہ جیسے ارکان اسلام پر تو کاربند تھیں مگر غیبت جیسی برائی سے وہ بھی خود کو نہ بچاپائی تھیں اس سے زیادہ دیر چپ نہ رہا گیا۔

"اب تک تو سب ٹھیک ٹھیک ہی تھا پھپھو کی طرف سے' مجھے تو ان رشتوں کے خراب ہونے میں

بھی سو فیصد نہ سہی پچاس فیصد کارستانی آپ کی لگتی ہے آخر کو پندرہ روزہ ٹور تھا اور اس میں جہاں نویہ مرتضیٰ کا قیام وہاں کوئی گڑبڑ نہ ہو یہ میں مان ہی نہیں سکتا۔" وہ تسلسل دو دن ایک رپورٹ تیار کرنے کے سلسلے میں گھر سے باہر رہا تھا اور اس کی غیر موجودگی کو حسب معمول اس کی آوارہ گردی کے زمرے میں ڈال کر تائی نے بار بار اس بات کی تشہیر بھی کی تھی اور آج عصر کے وقت سے وہ اس رپورٹ پر فائنل کام کر رہا تھا کہ اس کا اپنا ذاتی کوئی کمرہ اس گھر میں نہ تھا جو اسٹور نما کمرہ تائی نے اسے دیا تھا وہاں اس کا سامان تو رکھا تھا مگر گھر کے درمیان میں وہ چھوٹا سا کمرہ ایسی جگہ ہرگز نہیں تھا جہاں بیٹھ کر کوئی کام سکون سے کر لیا جاتا جبکہ اماں جی کا کمرہ ایک پرسکون جگہ پر تھا دوسرے وہاں پر نویہ کے علاوہ شاذ ہی گھر کا کوئی فرد آتا تھا سو کام کے وقت وہ یہیں پر آکر یکسوئی سے کام کرتا نویہ تو اس کی بات سن کر بھڑک ہی اٹھی۔

"میں اگر بری ہوں تو تم کونسا دودھ کے دھلے ہو' ایک زمانہ تمہاری آوارگی کا گواہ ہے۔ تایا تمہاری شکل دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ تائی الگ نالاں ہیں۔ کیسے کیسے گندی غنڈوں جیسی شکلوں والے لوگوں کو میں نے خود تم سے ملتے دیکھا ہے۔" اسید کا چہرہ ایک لمحے کو پھیکا پڑا تھا پھر وہ کچھ کہے بغیر دوبارہ سر جھٹک کر کاغذات پر جھک گیا۔

وہ بات جو اس نے محض مذاق میں کہی تھی اس کو نویہ نے اچھا خاصا سیریس لیا تھا۔ اور وہ تو شاکڈ ہی رہ گیا جب اماں جی نے بھی کم وبیش وہی کچھ کہا جو نویہ کہہ رہی تھی بس الفاظ ذرا مختلف اور لہجہ نویہ کی نسبت نرم تھا۔

"اسید چھوڑ دے اپنی فضول قسم کی دوستیاں اور ایری غیری سرگرمیاں' اپنے باپ کو دیکھو کیسے بوڑھا لگنے لگا ہے۔ جوان بیٹے سہارا ہوتے ہیں والدین کا۔"

"کون سی سرگرمیاں اور کون سے دوست میرے آپ نے مشکوک اور غلط دیکھ لیے اماں جی۔" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔۔۔ اماں جی گڑبڑا سی گئیں اس طرح براہ راست پوچھ کچھ انہوں نے اس سے کبھی نہیں کی تھی۔ بس تائی ہی انہیں اور سب گھر والوں کو اس کے حوالے سے سناتی رہتیں اور سب کو ہی ان کی بات کا یقین تھا۔

"تو بیٹا کہاں رہتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ کون سا ایسا کام ہے جو گھر سے مسلسل غائب رہ کر ہوتا ہے۔ کاشان کو دیکھو ابھی رزلٹ بھی نہیں آیا باپ اور چچا کے ساتھ آفس جاتا ہے۔ اسی طرح روحیل ہے اس نے تین سال پہلے ہی کام سنبھال لیا تھا ایسے میں سب پریشان نہ ہوں تو کیا ہوں تمہاری طرف سے۔" اب کہ وہ خفگی سے بولیں۔

"اماں جی! میں بھی ہرگز ایسا کوئی کام نہیں کرتا جس کی وجہ سے آپ کو یا ابو کو کبھی کسی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ابو نے تو کبھی پوچھا ہی نہیں بس ہر دفعہ فرد جرم ہی عائد کی ہے۔ آج آپ نے پوچھ لیا تو بتائے دیتا ہوں کہ ایک اخبار کے لیے کام کرتا ہوں اور یہ بات کاشان اور روحیل کے بھی علم میں ہے۔۔۔ دیکھنے کا زاویہ ٹھیک نہ ہو تو کوئی انسان' اس کا کام کیسے ٹھیک نظر آسکتا ہے۔" کچھ دیر اماں جی کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے دھیرے سے کہا اور اپنا سارا سامان سمیٹ کر ایک تیز نظر نویہ پر ڈالی جو ویسے ہی اس سے کبیدہ خاطر ہوئی بیٹھی تھی۔ چلتا بنا۔

"ہونہہ جھوٹا ہے سارے زمانے کا اس کی باتوں میں مت آئیے گا کبھی۔" اماں جی کو پرسوچ انداز میں اس کی پشت تکتی دیکھ کر اس نے بھڑاس نکالی اور جاتے جاتے اس کے یہ الفاظ اسید کی سماعتوں میں بھی اترے تھے وہ سر جھٹک کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ حالانکہ آج اس کا بہت دیر تک بیٹھ کر کام کرنے کا ارادہ تھا۔ مگر ان لوگوں کی باتوں نے اس کا جی اتنا مکدر کیا تھا کہ مزید بیٹھا نہ گیا تھا۔ اپنے چھوٹے سے کمرے میں آکر وہ کتنی دیر تک اپنا غصہ کم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

☆ ☆ ☆

تایا کے چہرے پر اس وقت گمبھیر خاموشی تھی جبکہ

چچا بھی سر پکڑے بیٹھے تھے۔ ان دونوں کے سامنے صوفے پر بیٹھی نوبیہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو رہی تھی۔

"میں یہ سب آپ دونوں کو کبھی نہ بتاتی اگر جو عطیہ کی زندگی کا مسئلہ نہ ہوتا۔ اسید ہر گز بھی اس اچھی سی لڑکی کے قابل نہیں ہے۔ پھر اس نے اس پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا ایسی ایسی برائیاں بیان کی تھیں جن کے بارے میں اس بے چارے نے کبھی خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اور ثبوت کے طور پر اسید کی وارڈ روب کے خفیہ خانے سے ریوالور اور خاکی لفافے میں ایک بھاری رقم بھی لا کر تایا اور چچا کو دکھائی تھی اور تو اور کئی لڑکیوں سے اس کے تعلقات بھی ہیں۔۔۔"

نوبیہ کو آج پتا چلا تھا کہ وہ کتنی اچھی اداکارہ ہے؟ پھر اس نے روتے ہوئے کہا تھا کہ "وہ عطیہ کو برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔"

"ٹھیک ہے بیٹا آپ جائیں۔" تایا نے بھاری آواز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

"معاف کیجیے گا بھائی جان! آپ میرے باپ کی جگہ پر ہیں۔ مگر میں جیتے جی اپنی بیٹی کو کسی ایسے شخص کو کیسے سونپ سکتا ہوں جو ہر قسم کی اخلاقی اور معاشرتی برائی میں ملوث ہو۔۔۔ میری طرف سے آپ اس رشتہ سے انکار سمجھیں۔ اس کی مشکوک سرگرمیوں کی اطلاع مجھے بھی تھی مگر اس کا تعلیمی ریکارڈ ہمیشہ زبردست تھا۔ آپ کی بھابھی کی مرضی کے بغیر میں نے اگر ہاں کی تھی تو اس لیے کہ اس عمر میں چھوٹی موٹی حرکت ہر نوجوان ہی کرتا ہے تقریباً" وہ بھی ذمہ داری پڑنے پر سدھر جائے گا مگر اب یہ سب جاننے کے بعد ایسا ممکن نہیں رہا۔ مجھے معاف کر دیجیے گا۔" چچا نے تایا سے کہا اور وہاں سے چلے گئے تھے۔

اسید رات کو دیر سے گھر آیا تھا۔ حسب معمول اماں جی کی خیریت دریافت کرنے بھی آیا تھا نوبیہ نے گھبرا کر اس کا چہرہ دیکھا تھا کہ آیا تایا سے ملاقات ہو چکی یا نہیں مگر اس کے تاثرات نارمل تھے۔ دل میں چور تھا اس لیے اماں جی کے پاؤں دباتے میں ہی اٹھ کر چلی گئی تھی۔ اور صبح اسید کے لیے ایک برا دن طلوع ہوا تھا وہ ابھی سو رہا تھا جب تایا دھاڑ سے اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر داخل ہوئے تھے۔ ان کی تیز آواز سے وہ بے دار تو ہو گیا تھا مگر چونکہ نیند سے اٹھا تھا اس لیے سمجھ نہ سکا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں؟

"تمہاری ماں کے گزر جانے کے بعد میں نے ہر بار اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے میری اولاد کی زندگی بخش دی تھی کوئی بھی والدین اپنی اولاد کو مرنے کی بددعا نہیں دیتے مگر اسید تم نے میرا اتنا دل دکھایا ہے۔ اتنا برا کیا ہے کہ میرا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کاش تم بھی اپنی ماں کے ساتھ ہی مر جاتے تو مجھے اپنے بھائی کے سامنے اتنی ذلت تو نہ اٹھانی پڑتی۔" اسید اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اسے ڈانٹتے بھی تھے "برا بھلا بھی کہتے تھے اور بہت دفعہ تائی کی باتوں میں آکر اس سے کئی کئی ماہ کلام بھی نہ کرتے" مگر ایسے سخت الفاظ اور انداز تو کبھی بھی نہ ہوئے تھے ان کے اس کے ساتھ۔

"کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ اس دفعہ آپ کی نصف بہتر نے کون سا فرد جرم عائد کیا ہے مجھ پر جس کے لیے آپ ایسے نامناسب الفاظ استعمال کر رہے ہیں؟" تایا ذرا دیر سانس لینے کو رکے تھے جب اس نے دروازے سے جھانکتی تائی اور گھر کے باقی افراد کو ان کے پیچھے سن گن لیتے دیکھا اور پھر بے حد ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔

"اماں جی کو بلاؤ ذرا اپنے چہیتے کے فرمودات سنیں جو کہتا ہے کہ اس نے کیا کیا ہے؟" انہوں نے دھاڑ کر پتا نہیں کس سے کہا تھا کہ تائی ایک لمحے میں ہی غائب ہو گئی تھیں۔

"ارے بدبخت! شراب تو پیتا ہے۔ لڑکیوں سے تیرے تعلقات ہیں، کسی غلط کام سے وابستہ ہے کبھی راتیں باہر رہتا ہے۔ تیرے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی اور بتا بھلا کون شریف آدمی اپنے پاس ریوالور رکھنا پسند کرتا ہے۔ پھر بھی میرے بھائی نے میرا مان رکھتے ہوئے اپنی بیٹی کا ہاتھ تجھ جیسے آوارہ کے ہاتھ میں دینا گوارا کر لیا تھا مگر ایسا تب تک تھا جب تک تیرے

کرتوت ہم سب نہیں جانتے تھے۔۔۔" اسید نے غور سے ساری بات سنی تھی اور ایک لمحے کے اندر بات کی تہ میں پہنچ گیا تھا کہ ریوالور اور روپوں والی بات نوبیہ اس سے پہلے کر چکی تھی۔ "تو نوبیہ بی بی! اس بار آپ کا شکار میں ٹھہرا۔" اس نے سوچا مگر تایا کی رشتہ والی بات پر وہ چونک گیا۔

تبھی اماں جی کو تھامے تائی اندر آگئی تھیں۔ "کیا ہو گیا ہے محسن! کیوں صبح صبح اتنا بول رہے ہو؟ جوان بچہ ہے کتنی دفعہ کہا ہے آرام سے بات کیا کرو۔" اماں جی ہانپتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئیں اور غصے میں لال پیلے ہوتے بیٹے اور پھر سر جھکائے انگوٹھے کی ٹو سے زمین کریدتے پوتے کو دیکھ کر بولیں۔

"آپ کو کچھ پتا ہی نہیں اماں جی! پوری بات کا پتا چلے گا تو ایسے ہی بولیں گی جیسے میں چیخ رہا ہوں۔ اولاد کو آزمائش کہا گیا ہے مگر میری یہ اولاد میرے لیے میری سزا بن گئی ہے۔ ارے جیسے کارناموں میں یہ ملوث ہے ناں دیکھ لیجیے گا عنقریب پولیس کے ہتھے چڑھے گا یہ اور پھر خوب نام روشن کرے گا خاندان کا۔ ارے سب کچھ جان کر بھی میں چپ رہا تھا کہ چلو تعلیم میں تو اچھے گریڈ لاتا ہے مگر ایسی تعلیم کا کیا فائدہ جو جرائم کی طرف لے جائے انسان کو۔۔۔ اماں جی۔۔۔ میں آخری دفعہ کہہ رہا ہوں کہ اس سے کہیں چھوڑ دے سب کچھ اور کل سے میرے ساتھ آفس چلے ورنہ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے بس۔" تایا کو اس کی بے نیازی دیکھ کر اور غصہ آرہا تھا جبکہ تائی جو اس صورت حال سے بے حد خوش نظر آرہی تھیں اچانک آفس لے جانے والی بات پر ان کا منہ بن گیا۔

"اچھا! اب چلیے یہاں سے اس نے سدھرنا ہوتا تو کب کا سدھر گیا ہوتا۔ آپ ایسے ہی اپنی طبیعت خراب مت کریں۔" تائی جلدی سے تایا کا بازو پکڑ کر لے گئیں مبادا تایا کوئی اور ایمرجنسی فیصلہ نہ لے لیں اسید کے متعلق جس سے ان کے بچوں کا حق تلف ہو۔

"آج ناشتا بھی ملے گا یا یہی ڈرامہ چلے گا سارا دن۔" کاشان بے زار سا ہو کر بولا۔

"ہاں ہاں بیٹا! نوبیہ۔۔۔" وہ نوبیہ کو آوازیں دیتی کچن میں چلی گئیں۔ "اب کیا کر دیا اسید! میں نے کہا تھا مت پریشان کیا کرو باپ کو۔۔۔ بیٹا چھوڑ دو سب کچھ باپ سے معافی مانگ لو میرے بچے!" اماں جی جن کو ابھی تک تائی نے جلدی جلدی میں جتنا کچھ بتایا تھا کمرے سے یہاں تک لے آتے ہوئے اسی کے تناظر میں اس کا ہاتھ تھام کر بولیں۔ اس نے ایک بے بس نظر اماں جی کے ضعیف چہرے پر ڈالی پھر آکر ان کے پاس بیٹھ گیا۔

"اماں جی! میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جس کی میں کسی سے معافی مانگوں میں اپنے کسی فعل پر شرمندہ نہیں ہوں۔ آج میں اپنے ایک ناکردہ گناہ کی معافی مانگتا ہوں کل مجھے برا ثابت کرنے کے لیے کوئی اور بات نکل آئے گی۔ میرا گھر مکمل ہونے والا ہے اور سوچ رہا ہوں کہ بہت جلد یہاں سے چلا جاؤں اس سے پہلے کہ دیس نکالا مل جائے کہ یہی تو مطمع نظر ہے ماسٹر مائنڈ کا۔ اماں جی! بہت بار میں نے یہاں سے جانا چاہا لیکن ایک بات مجھے روک لیتی ہے کہ ماں باپ کے ہر عمل اور ہر رویے کے بعد چاہے وہ نازیبا کیوں نہ ہو۔۔۔ انہیں اف تک نہ کہو جب وہ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں ان کی خدمت کرو۔"

"اچھا تم نے الماری میں وہ موا پستول کیوں رکھ چھوڑا۔۔۔ ایسے چل ول جاتا تو۔۔۔ میرے اللہ میرے بچوں کو اپنی امان میں رکھنا اور اتنے زیادہ پیسے۔" اماں جی کے انداز پر اس ماحول میں بھی اسے ہنسی آگئی تھی۔

"اماں جی اپنی سیکیورٹی کے لیے اسلحہ رکھنا جرم نہیں ہے اور وہ رقم میری حلال کی کمائی ہے۔ میں نے تو عرصہ ہو گیا دوسروں کا محتاج ہونا چھوڑ دیا۔ آپ کو مجھ پر یقین نہیں ہے ناں میں۔۔۔ میں آپ کے سر کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں میں سچ کہہ رہا ہوں میں مجرم نہیں ہوں اماں جی۔" وہ جذباتی ہو کر بولا اور اپنا ہاتھ اٹھا کر ان کے سر پر رکھ دیا۔ اسی لمحے اس کی سچائی کسی وحی کی مانند اماں جی کے دل میں اتری تھی۔ وہ جانتی تھیں اپنی ماں کے بعد وہ ان سے بے انتہا محبت کرتا تھا اور ان کے

سر کی قسم کھا کر بھی جھوٹ نہیں کہہ سکتا تھا۔

"اپنے باپ کو کیوں نہیں بتاتا اسید... اسے بتا کہ تو ایسا نہیں ہے۔" وہ نم لہجے میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ وہ ایک مجروح سی ہنسی ہنس دیا۔

"وہ مانیں تب ناں اماں جی... انہوں نے ہمیشہ فرد جرم عائد کی پھر سزا سنائی ہے ہمیشہ' پوچھا تو کبھی بھی نہیں۔"

"اچھا... میں سمجھاؤں گی اسے... تم ایک بار پھر بتانا اسے آرام سے بات کرنا وہ بے رخی برتتا ہے' تو تو پیار سے بات کر سکتا ہے نا۔ اسید باپ پتھر بن جاتا ہے تو بیٹا چٹان کی صورت سامنے آتا ہے تعلقات بہتر ہوں بھی تو کیسے ہوں؟" اماں جی رنجیدگی سے بولیں۔

اس وقت وہ چاروں ہی اپنی کامیابی کا جشن منا رہے تھے۔ اف نوبیہ! دل کرتا ہے تمہارا منہ چوم لوں اسید جیسی بلا سے میرا پیچھا چھڑا دیا' ابو نے تایا کو جواب دے دیا ہے امی بھی خوش ہیں کہ سر آئی بلا ٹل گئی۔" کوئی چوتھی بار عطیہ یہ بات دہرا رہی تھی خوشی کے مارے۔

"اب تو یقین آگیا ناں میری صلاحیتوں کا۔" نوبیہ اترائی۔

"اپنی یہ صلاحیتیں میرے بھائی بچارے پر نہ آزمانا شروع کر دینا۔" ہبین نے کاشان کو دیکھ کر طنزاً" نوبیہ سے کہا۔

"نہیں نہیں نوبیہ ایسی ہرگز نہیں ہے وہ تو میں نے رو رو کر اس کی منتیں کیں تب کہیں جا کر یہ راضی ہوئی اور یار دیکھا جائے تو اس میں غلط بات بھی تو کوئی نہیں تھی اسید واقعی کسی اچھی لڑکی کے قابل ہرگز نہیں ہے بس تایا کو اس کے کارناموں کی خبر ہی تو کی ہے۔" عطیہ نے نوبیہ کا منہ بگڑتے دیکھا تو اس کی طرف داری کی' ویسے بھی تازہ تازہ کی گئی مدد کا نتیجہ تھا ورنہ وہ اور ہبین دونوں اپنی ماؤں کی طرف غضب کی مطلب پرست تھیں مطلب نکالنے کے لیے گدھے کو بھی باپ بنانے والے مقولے پر عمل کرتی تھیں اور بعد میں گھاس بھی نہیں ڈالتی تھیں۔

نوبیہ کا اس دن کے بعد اسید سے سامنا نہ ہوا تھا کہ تایا کو اسی روز اپنے بزنس کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ اسید پھر کسی کو نظر ہی نہیں آیا تھا۔ ہاں اماں جی ضرور بجھی بجھی سی تھیں۔

"پتا نہیں باپ بیٹے کے درمیان یہ سرد جنگ کب ختم ہو گی مجھے یقین ہے کہ میرا اسید ایسا ہرگز نہیں ہے جیسا اس گھر کے لوگ اسے سمجھتے ہیں۔" اماں نے کہا تو نوبیہ طنزاً" مسکرا دی تھی۔

فرح کی منگنی بھی ہو گئی تھی۔ نوبیہ کے سوائے سب وہاں گئے تھے۔ فرحان کی طرف دل ایسا کھٹا ہوا تھا کہ جانے کو دل ہی نہیں کیا تھا سو اماں جی کے پاس رکنے کا بہانا کر کے وہ نہیں گئی تھی۔ پھپھو نے خوشخبری سنائی تھی کہ وہ بہت جلد فرحان کے رشتے کی بات کرنے آنے والی ہیں۔ تایا کا دوسرے شہر میں قیام لمبا ہو گیا تھا جبکہ اسید بھی مسلسل غائب تھا صرف دو دفعہ ہی چکر لگایا تھا اس نے گھر۔ نوبیہ کے ابو بھی اپنے بزنس میں ہونے والے خسارے کو پورا کرنے کی تگ و دو میں تھے۔

"امی کچھ کریں... میں کہے دے رہا ہوں میں نے اس نوبیہ سے ہرگز شادی نہیں کرنی۔ پہلے تو چلو میں چپ تھا کہ چچا مجھے باہر کہیں سیٹ بھی کرا دیں گے اور نوبیہ اور میں باہر چلے جائیں گے اب دوسرا ماہ ہے انہوں نے تو نقصان کا بہانہ کر کے سرے سے نوبیہ کا خرچا ہی بند کر دیا میں تو سوچ رہا تھا اس بار ان سے امپورٹڈ آئی فون منگواؤں گا نوبیہ کے ذریعے مگر وہ تو رابطہ ہی نہیں کر رہے کہ ہم پیسے نہ مانگ لیں نوبیہ کے خرچ کے' کچھ بھیجیں گے خاک۔"

"ارے میں سب سمجھتی ہوں یہ تمہاری اس انگریز چچی کا کیا دھرا ہو گا ورنہ برسوں سے جما جمایا بزنس کیسے خسارے میں آگیا اور یہ تو تم نے خود بات کر لی ورنہ مجھے تو جب سے ہبین نے بتایا کہ کیسے نوبیہ نے عطیہ کی جان اس اسید سے چھڑائی مانو میں تو خود اس دن سے ڈری بیٹھی ہوں کہ بھئی یہ لڑکی بڑی خطرناک ہے کئی لڑائی جھگڑے تو ہم بہنوں میں کروا چکی ہے۔ وہ جب بات کھلتی تھی تب پتا چلتا تھا کہ ہم نے بات کچھ کی ہوتی

تھی نویہ بی بی کچھ کا کچھ جا کے لگاتی تھی۔ یہی کچھ اماں جی اور ہم بہوؤں کے درمیان کیا اس نے بہت بار۔ ہر بار ہی اماں جی بچی ہے کہہ کر نظر انداز کر جاتی تھیں مجھے تو بڑی فکر لگ گئی ہے تب سے۔ اس لڑکی سے کوئی بعید کل تمہارے تایا کو بھڑکا کر مجھے بھی گھر سے نکال باہر کرے۔" تائی خود بھی بھری بیٹھی تھیں۔

"میں نے ایک بار دبے لفظوں میں تمہارے ابو سے بات کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ تو ہتھے سے اکھڑ گئے ہیں کہ خبردار جو ایسی ویسی کوئی بات کی ہو میں بات سے پھرنے والا آدمی نہیں ہوں بس جب بینن کی بات طے ہو گی ساتھ میں کاشان کی بھی ساتھ ہی ہو گی۔" تائی نے تایا کے الفاظ دہرا کر کاشان کو پریشان ہی کر دیا وہ اضطراری انداز میں اٹھ کر ماں کے پاس آ بیٹھا اور ان کے گھٹنے تھام کر لجاجت سے التجا کرنے لگا۔

"امی خدا کے لیے کچھ کریں۔ میں نے نویہ سے شادی نہیں کرنی۔ ایسی شرپسند اور فسادی لڑکی جس کا شادی سے پہلے یہ حال ہے شادی کے بعد کیا کیا نہ غضب ڈھائے گی۔" اب اس کے ساتھ بینن بھی نویہ کے بخیے ادھیڑنے میں شامل تھی۔ یہ جانے بغیر کہ بہت دن بعد اسید آج گھر پر تھا اور اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس کے کانوں میں لاشعوری طور پر کاشان کے کچھ کلمات پڑے تھے۔ اگلی بات اس نے شعوری طور پر وہاں کھڑے ہو کر سنی تھی وہ اس قسم کی فطرت یا عادت نہیں رکھتا جس میں تجسس یا ٹوہ کا عنصر شامل ہوتا مگر جو کچھ نویہ کے بارے میں وہ جانتا تھا اور جو کچھ اس نے اسید کے ساتھ کیا تھا اس کے بعد اسے یقین تھا کہ وہ زندگی میں کوئی بڑی ٹھوکر ضرور کھائے گی اور زک پہنچانے والے یہی اپنے ہوں گے جن کی خوشنودی کے لیے اس نے اپنا بہت کچھ گنوا کر اپنے اندر بہت سی بری خصلتیں پروان چڑھا کر دوسروں کی زندگی ہمیشہ مشکل کی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ کبھی یہی مشکلات اس کا اپنا راستہ ضرور روکیں گی۔

"لو نویہ بی بی چوروں کو بھی مور پڑ ہی جایا کرتے ہیں۔ اب دیکھتے ہیں ماسٹر مائنڈ' نویہ سے اپنے بیٹے کاشان کی جان چھڑانے کے لیے کیا پلان بناتی ہیں ویسے بھی اس کام میں تو ماہر ہی ہیں۔" پہلے اسے شک تھا مگر اب تو ان سب کی باتیں سن کر اس کے یقین پر مہر لگ چکی تھی کہ تایا کو اس حد تک برگشتہ کہ وہ اسے گھر سے نکال تک دینے کے درپے ہو گئے تھے نویہ نے کیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کی تھکن کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی وہ ایک مشکل کیس پر کام کر کے آج ہی لوٹا تھا ویسے بھی اسے ٹی وی کے ایک چینل پر کام کرنے کی آفر بھی ہوئی تھی۔ کل ایک رپورٹ پر کام کر کے اس نے دیر تک ٹی وی پروگرام ریکارڈ کروایا تھا۔ سو دل و دماغ پر پوری طرح تھکن طاری تھی۔ گھر میں اسے نہ کبھی کھانا کھانے کا پروٹوکول دیا گیا تھا نہ اب وہ اس چیز کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ ہمیشہ گھر سے باہر کھانا کھا کر آتا۔ روم ریفریجریٹر کو اس نے ڈسپوزیبل کھانوں اور جوسز سے بھرا ہوتا سو کبھی گھر میں ضرورت بھی پڑتی تو انہی سے کام چلا لیا کرتا تھا۔ تائی کو ہر مہینہ ماہانہ خرچ دینے کے بعد ہی کبھی مڑ کر یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ بھی تو اس گھر کا بیٹا ہے کیا اس کا اس گھر پر اس کی کسی چیز پر کوئی حق نہیں؟ مگر حجت کرنے کی عادت ہوتی تب نا۔

تایا واپس آ گئے تھے دوسرے شہر سے بزنس کے تمام معاملات کلیئر کرنے کے بعد پھپھو ان کے آنے کی خبر سن کر فرحان اور فرح کو ساتھ لیے چلی آئی تھیں باضابطہ رشتہ کی بات کرنے ویسے بھی رانیہ کی بات طے ہو چکنے کے بعد اب وہ چاہتی تھیں اس کی شادی سے پہلے ہی فرحان کی شادی کر کے دکھائیں۔ ہاں ان کے دیور نے بزنس اور جائیداد کی تقسیم وکیل کو ساتھ بٹھا کر فرحان کا پورا حق اسے دیا تھا جس کی کم از کم پھپھو اور فرحان کو ہرگز امید نہیں تھی۔

اماں جی کے کمرے میں اس وقت خوب محفل گرم تھی۔ چچی' پھپھو' خاندانی مسائل چھیڑے بیٹھی تھیں۔ نوجوان پارٹی لاؤنج میں جمع تھی۔ اسید حسب معمول گھر سے باہر اور نویہ کچن میں سرگرم عمل تھی اس نے نوجوان پارٹی کو چائے دینے کے بعد اماں جی کے کمرے کا رخ کیا جہاں تائی بھی اب تشریف لا چکی

ئیں اور بیکن تو بیئر یں لیے جانے والے والی خاندانی زیورات کھولے بیٹھی تھیں سب ہی بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کررہے تھے۔

"اچھا نویہ! ایسا کرو بیٹا میں اب کیا اٹھوں؟ ایسا کرو یہ لو چابی میرے کمرے میں الماری کھول کر یہ زیورات احتیاط سے رکھ دو شاباش۔" نویہ جب چائے دے کر باہر نکلنے کو تھی تائی نے تینوں ڈبے بند کر کے اپنے دوپٹے کے پلو سے چابی کھول کر اسے پکڑائی۔ نویہ نے کسی معمول کی طرح وہ سب کچھ پکڑ لیا کہ تائی کے ایسے ہزاروں کام اس کے معمول میں شامل تھے مگر اپنی الماری خاص کر وہ ہمیشہ خود ہی کھولتی اور بند کرتی تھیں اور چابی بھی دوپٹے سے باندھ کر رکھتیں ہمیشہ کیونکہ تایا جو کیش لا کر دیتے وہ بھی اسی الماری میں موجود ہوتا اور گھر کے زیورات بھی وہیں موجود تھے۔ نویہ نے احتیاط سے زیورات جا کر الماری میں رکھے اور الماری بند کر کے چابی دوبارہ لا کر سب کے سامنے تائی کو پکڑا دی تھی۔

تایا اور چچا کے آنے پر محفل عروج پر پہنچ گئی بات تو بڑوں کے درمیان طے ہی تھی پھپھو نے رسماً "اپنا مدعا بیان کیا۔ تایا نے ہاں کر دی ساتھ میں بیبن اور فرحان اور نویہ اور کاشان کے نکاح کی تقریب کا دن مقرر کرنے کے بعد شادی کے حوالے سے بات چیت ہونے لگی۔ عطیہ جو اندر سے سن گن لے کر آئی تھی نے یہ خبر نوجوان پارٹی میں نشر کی جہاں بیبن شرمائی وہاں فرحان کا چہرہ بھی جگمگانے لگا جبکہ کاشان کے منہ کے زاویے بگڑ گئے تھے وہ فوراً" ہی وہاں سے اٹھ کر چلا گیا اور ماں کے کمرے میں جا کر ٹہل ٹہل کر اپنا غصہ کم کرنے لگا ساتھ ساتھ ماں کا انتظار بھی جنہوں نے یقین دلایا تھا کہ وہ جیسا چاہتا ہے ویسا ہی ہوگا وہ کچھ ایسا کریں گی کہ نویہ ہرگز بھی اس کی زندگی میں شامل نہیں ہوگی اور یہاں نکاح کا دن بھی مقرر ہو گیا تھا۔

اندر کچن میں برتنوں سے نبرد آزما نویہ کو بھی عطیہ نے یہ خوشخبری سنائی تھی اس نے بغیر کسی رد عمل کے یہ خبر سنی تھی اور کچھ کہے بغیر ڈھیلے ہاتھوں سے اپنا کام جاری رکھا تھا اس دن کا تو لڑکیاں انتظار کرتی ہیں کاشان جیسا خوب صورت ویل ایجوکیٹڈ بندہ اس کی زندگی میں شامل ہونے جا رہا تھا پھر اسے خوشی کیوں نہیں ہو رہی تھی؟ کیا ہوتا جو اگر کاشان کی جگہ فرحان اس کا مقدر ہوتا؟ اس نے سوچا اور دو آنسو ڈھل کر بے مول ہو کر پانی میں مل کر بہہ گئے۔

☼ ☼ ☼
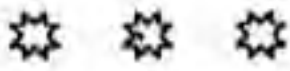
آج پھپھو کا ارادہ واپس جانے کا تھا تو سب نے مل کر ناشتا کیا۔ پھپھو اماں جی کو بھی نیچے لے آئیں کہ وہ بھی سب کے ساتھ ناشتا کریں۔ نویہ حسب معمول کچن میں چچی کے ساتھ مصروف تھی۔ اسید رات بہت دیر سے آیا تھا سو ابھی اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا نویہ تازہ پراٹھے سنکے سلائس گرم گرم چائے وقتاً" فوقتاً" پہنچا رہی تھی ٹیبل تک وہ ہمیشہ سب سے آخر میں ناشتا کرتی تھی۔ سب افراد کا بچا کھچا ناشتا اس کے لیے خاصی ورائٹی لیے ہوتا۔

ناشتا کے اختتامی مراحل تھے جب تایا نے کاشان کو اٹھنے کا کہا اور خود تائی سے وہ رقم لے آنے کو کہا جو انہوں نے کوئی تین چار روز قبل ان کے پاس رکھوائی تھی۔ کسی مشینری کی پے منٹ کے لیے آج وہ رقم درکار تھی۔ ایک لمحے کو سب نے ان کی تائی سے کہی ہوئی بات کو سنا تھا پھر سب ہی مصروف ہو گئے تھے کہ یہ معمول کی بات تھی چچا اور تایا ہمیشہ ہی بڑی رقوم اپنی اپنی بیگمات کے پاس رکھواتے تھے اور فوری ضرورت پڑنے پر لے بھی لیا کرتے تھے۔

تایا گھڑی دیکھتے ہوئے بے چینی سے تائی کا انتظار کر رہے تھے کہ انہیں گئے ہوئے دس منٹ سے زیادہ وقت ہو چلا تھا۔ "بیبن جاؤ بیٹا اپنی امی کو بلاؤ دیر ہو رہی ہے۔ میں اور کاشان سیدھے آفس جائیں گے تم ایسا کرنا۔۔۔۔"

تایا چچا کو کوئی ہدایت دے رہے تھے جب افتاں و خیزاں تائی چلی آئیں بے حد واویلا کرتی ہوئیں ساتھ میں بے حد گھبرائی ہوئی بیبن بھی تھی۔

"کاشان کے ابو... غضب ہو گیا... ہم برباد ہو گئے ارے لٹ گئے ہم۔" تایا کرسی سے اچھل کر کھڑے ہو گئے جب کہ باقی سب لوگ گھبرا کر تائی کی اس آہ و زاری کا متن سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔

"کیا ہوا... کچھ بتاؤں گی بھی یا ایسے ہی فضول میں بولے چلے جاؤ گی۔" تایا بے حد گھبرا کر بولے۔

"کاشان کے ابو کسی دشمن نے وار کر دیا آپ نے جو روپے میرے پاس رکھوائے تھے وہ بھی غائب ہیں اور سبین کے لیے جو پرانے زیور پالش کرا کے رکھے تھے جو بھاری والا سیٹ تھا وہ بھی روپوں کے ساتھ غائب ہے اور تو اور تالا بھی ویسے کا ویسا ہی لگا ہوا تھا جیسے میں نے لگایا تھا۔ ساری الماری کیا سارا کمرہ چھان مارا ہے مگر سمجھ میں نہیں آرہا کہ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا روپے اور زیور...." اب کے تائی دوپٹا منہ پر ڈال رونے لگیں۔

"کیا ہو گیا ہے بھابھی! وہیں کہیں ہوں گے اور کہاں جا سکتے ہیں۔" پھپھو اٹھتے ہوئے بولیں تایا بغیر کچھ کہے تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے جب کہ کاشان اور چچا بھی تایا کے پیچھے چلے گئے۔ چند لمحوں میں ہی سب ایک بار پھر تایا کے کمرے میں موجود تھے۔

"نوبیہ تمہیں میں نے زیورات رکھنے کو دیے تھے تب پیسے رکھے دیکھے تھے تم نے۔" اچانک تائی نے دروازے میں سے جھانکتی نوبیہ کو مخاطب کیا جو کچن میں تھی جب یہ فضیحتہ اٹھا تھا وہ شور شرابا سن کر یہاں تک آئی تھی۔

"پ... پتا نہیں تائی میں نے تو صرف زیور رکھے تھے اور پھر الماری بند کر کے واپس آگئی تھی۔" سب کی نظریں ایک دم ہی اس کی طرف اٹھی تھیں تبھی وہ بوکھلا کر بولی تھی۔

"نوبیہ میری بچی! اس دن تو نے کہا تھا ناں کہ تائی یہ سیٹ بڑا ہی پیارا ہے.... میں نے تیرے لیے بھی ایسا ہی بنوانے کا سوچا ہوا تھا بنوا دوں گی، تجھے بھی تو ایسا کر تو یہ سیٹ رکھ لے پر پیسے دے دو میرا بیٹا تیرے تایا نے آج ادائیگی کرنی ہے۔" تائی نے خوشامدانہ انداز میں کہا تو نوبیہ ایک دم گھبرا کر پیچھے ہٹی۔

"تائی یہ... یہ آپ کیا کہہ رہی... مم... میں کیوں؟" اس کی آواز بھرا گئی۔ کتنا مشکل ہوتا ہے اپنے بے حد پیاروں کی نظروں سے بے اعتباری کی تحریر مٹا کر اعتبار کے الفاظ لکھنا۔ لمحوں میں ہی جیسے منظر بدل گیا تھا۔ وہاں پر موجود ہر آنکھ میں اس کے لیے صرف شک تھا۔

"نوبیہ کو کیا ضرورت ہے؟ اس کو کس چیز کی کمی ہے یہاں؟ بھلا یہ کیوں کرے گی ایسا؟" پھپھو بولیں تو اس نے صرف تشکر بھری آنکھ سے ان کی طرف دیکھا تھا بولنے کی ہمت تھی نا طاقت۔ آنسوؤں کا گولہ حلق میں ہی اٹکا تھا گویا۔

"ایک فرد اور بھی تو ہے ایسا جو ایسی ہمت اور جرات کر سکتا ہے؟" چچی کی بات میں بلا کی معنی خیزی تھی۔ تائی نے گھبرا کر بہن کو گھورا کہ وہ کہاں بیچ میں ٹپک کر سب کا دھیان اسید کی طرف دلا رہی تھیں ان کا بنا بنایا کھیل بگاڑنے کو۔

"چلو کوئی بھی ناراض نہ ہو۔ مگر ہمارا نقصان ہوا ہے تو حق تو بنتا ہے ناں سب کے کمرے دیکھنا گھر کے افراد کے بعد ہی ملازمہ کی باری آئے گی۔ کاشان کے ابو آپ اور سبین نوبیہ کا کمرہ دیکھ لو میں اور چھوٹی (چچی) کاشان اور سبین کے کمرے دیکھ لیتے ہیں۔ آپ اور عطیہ باقی جگہیں دیکھ لو۔" تائی نے منٹ میں تفتیشی پروگرام تشکیل دیا۔

تایا کچھ جھجک رہے تھے مگر سبین ہاتھ پکڑ کر ابو کو نوبیہ کے کمرے میں لے گئی ان کے جاتے ہی باقی سب مطلوبہ ہدف کی تلاش کو چل دیے نوبیہ مرے مرے قدموں سے باہر ہال میں آگئی جہاں اماں جی بے حد پریشان بیٹھی تھیں اس ساری صورت حال پر پاس ہی سرخ آنکھیں لیے اسید بیٹھا تھا۔ پتا نہیں اسے کس نے جگایا تھا یا ویسے ہی خود جاگ گیا تھا بہر حال اماں جی کی زبانی مختصراً سارا معاملہ تو وہ جان ہی چکا تھا۔ بساط پلٹنے کو تھی۔ مہرے پٹنے کو تھے پر کس کے یہ ابھی پتا چلنا

باقی تھا۔

"اماں جی... دیکھیں ناں اماں جی... تائی کہتی ہیں کہ میں نے... "نویہ سے آگے کی بات کہنا مشکل ہو گیا اس نے ہچکیوں سے روتے ہوئے اماں جی کو تائی کا شک بتایا اسید نے بے حد گہری نظر اس پر ڈالی۔

"یہ دیکھیں یہ صلہ دیا ہے اس لڑکی نے ہماری عمر بھر کی ریاضت کا اپنے ہی گھر اپنے ہی بہن کے زیور اور روپوں پر ہاتھ صاف کر لیا۔ پوچھیں اس سے کب اسے میں نے باپ کی اور اس کی تائی نے اسے ماں کی کمی محسوس ہونے دی۔ اپنے بچوں سے بڑھ کر چاہا' خیال رکھا دو منٹ پہلے تک میں اس نیک بخت کی بات پر پچھتا رہا تھا' شرمندہ ہو رہا تھا جو اس نے اس پر شک کر کے کی تھی مگر اب یہ میں نے خود روپے اس کے بیڈ کے نیچے سے اور زیورات اس کے کپڑوں کے بیگ سے ثمین نے نکالے ہیں۔" نویہ کا چہرہ سفید پڑ گیا وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے تایا کو دیکھنے لگی جو اس کی طرف اشارے کر کر کے پتا نہیں کیا کیا کہہ رہے تھے۔

اب سب لوگ ہی شور سن کر وہاں آ گئے تھے۔ اسید کے چہرے پر سنجیدگی بھری رنجیدگی' کاشان' تائی اور ثمین کے چہرے پر اطمینان جبکہ باقی سب کے چہروں پر رنج و ملال کی کیفیت تھی۔ نویہ کی جیسے کاٹو تو لہو نہیں والی کیفیت تھی زبان کچھ کہنے کی کوشش میں پتھرا گئی۔

"کیوں نامراد؟ یہ کیا گھٹیا حرکت کی تو نے؟" اماں جی کے بھی تیور بدل گئے۔

"اماں جی... قسم لے لیں میں نے کچھ نہیں کیا۔" بالآخر ہکلا کر اس نے کہا۔

"فون ملائیں ذرا اس کے باپ کو ابھی کے ابھی۔ میں تو نہیں رکھنے والی اس لڑکی کو ایک منٹ بھی مزید یہاں' بہو بنانا تو دور کی بات ہے ارے کس کس چیز کی رکھوالی کرتی پھروں گی لے جائے اپنی چور اولاد کو۔ جس نے لحاظ نہیں کیا اتنے سالوں کی محنت کا' محبت کا' خدمت کا جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید کیا۔" اسید کے منہ سے بے اختیار ایک طویل سانس نکل گئی۔

ایک لمحے میں ساری بات کلیئر ہو گئی تھی اس کے ذہن میں نویہ نے جو داؤ اسید پر چلایا تھا تائی نے اسی کا استعمال کر کے نویہ کا پتا صاف کر دیا تھا بس طریقہ کار میں ذرا فرق تھا۔

"تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آئی نویہ! کتنی محبت' عزت ملی تمہیں اس گھر سے اور تم نے اسی میں نقب لگائی۔ اب کون بیاہنا پسند کرے گا تمہیں۔"

"میں... میں شادی کروں گا نویہ سے۔" پھپھو کے شعلہ اگلتے الفاظ کے بعد یہ الفاظ اسید کے منہ سے نکل کر سب کو شاکڈ کر گئے۔

"ہونہہ چور کا گواہ گرہ کٹ..." تائی اونچی آواز میں بڑبڑائیں۔

"تو میاں ابھی کے ابھی اس کو لے کے پھوٹ لو اس گھر سے' میرا گھر ہے یہ کوئی سنٹرل جیل نہیں ہے جدھر ہر قسم کے چور اچکوں کو پناہ بھی ملتی رہے روٹی پانی بھی... میں اب ایک منٹ نہیں رکھنے والی اس کو یہاں۔"

"جی بہت بہتر... اٹھو نویہ... امید کافی ہے کہ زندگی کے اس سبق نے تمہیں وہ سب سکھا دیا ہو گا جو میں نجانے کب سے تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔" نویہ نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"اٹھو نویہ میرے ساتھ چلو! ہماری اب اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

آپ کو کبھی یاد نہیں رہ سکا کہ کاشان کے علاوہ بھی آپ کا ایک بیٹا ہے اور میں کبھی یہ بات بھول ہی نہیں سکا کہ آپ میرے باپ ہیں میں اس گھر سے آپ کی مرضی سے جا رہا ہوں کہ آپ نے حکم دیا ہے... اور مجھے یقین ہے کہ آپ کی آنکھوں پر بندھی بدگمانی اور شکوک کی پٹی جب اترے گی تو آپ بہت پچھتائیں گے اور میں تب بھی آپ کا بیٹا ہی رہوں گا اور تب بھی آپ کا کہا گیا حکم سر آنکھوں پر ہو گا میرے لیے۔" اس نے سسکتی ہوئی نویہ کا ہاتھ پکڑ کر باپ کے سامنے آ کر کہا انہوں نے جواباً منہ پھیر لیا تھا۔

"ہاں تو تمہارے کرتوت تھے ایسے کہ تمہیں بیٹا مانا

اور کہا جائے۔ زمانے بھر کے آوارہ چور اور اب اپنے جیسی ایک اور بھی مل گئی ہے۔ مل بیٹھیں گے جب دیوانے دو۔" تائی نے غلط محاورہ استعمال کر کے چہک کر کہا اسید بے ساختہ مسکرا دیا حالانکہ یہ وقت مسکرانے کا نہیں تھا۔

"اماں جی میں نے ایک بار پہلے بھی کہا تھا اور آج پھر کہتا ہوں کہ میں غلط نہیں تھا بس آپ لوگوں کے دیکھنے اور پرکھنے کا انداز ہی غلط تھا میری جیت ان شاء اللہ وقت ثابت کرے گا۔" اس نے اماں جی کے سامنے رک کر کہا اور خالی الذہنی کی کیفیت میں موجود نوبیہ کو گھسیٹتا وہاں سے چلا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼
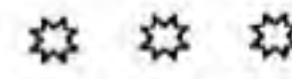
وہ اسے فوزیہ کے گھر لے آیا تھا اس کی وہ کولیگ جس کا ایک فون سن کر نوبیہ نے نہ صرف اپنی طرف سے بہت کچھ اخذ کیا تھا بلکہ غلط سلط انداز میں اس فون کال کو ہوا بھی دی تھی۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ رہتی تھی مختصراً" ساری صورت حال بتا کر اس نے اپنے اور نوبیہ کے فوری نکاح کا بندوبست کیا تھا۔ پھر شام کو اس کے سارے حقوق اپنے نام کروا کے وہ اسے اپنے اس فلیٹ میں لے کر آیا جو اس نے دو سال پہلے اقساط پر بک کروایا تھا اگرچہ فلیٹ میں ابھی صرف گزارے لائق ہی سامان تھا مطلب اس کا فلیٹ ایک فیملی کا گھر نہیں بلکہ ایک چھڑے چھانٹ لاپروا بندے کی عارضی رہائش گاہ کی منہ بولتی تصویر تھا۔ نوبیہ جیسے کسی خواب کی سی کیفیت میں تھی۔ اسید نے اسے کرسی پر بٹھایا اور خود جا کر جلدی سے چائے کے دو کپ بنا کر لے آیا۔ مگر اسے دروازے میں ہی جھٹکا کھا کر رک جانا پڑا وہ ایک بار پھر زور و شور سے رونے میں مصروف تھی ایک گہری سانس اس کے سینے سے بے اختیار نکلی اس نے دونوں کپ تپائی پر رکھے اور خود اس کے سامنے والی کرسی کھینچ کر بالکل مقابل آن بیٹھا۔

"رو کیوں رہی ہو نوبیہ؟" اس کے نرمی سے کیے گئے سوال پر نوبیہ کچھ اور شرمندہ ہو گئی۔ پھر اسید حیران ہی رہ گیا جب اس نے نوبیہ کو اپنے سامنے ہاتھ جوڑتے دیکھا۔

"مجھے معاف کر دو اسید! میں ہمیشہ تم سے لڑتی رہی۔ تمہیں بے حد برا سمجھتی رہی۔ تمہیں تایا کی نظر سے گرانے کے لیے بہت سے جھوٹ بھی بولے کیونکہ میں نے ہمیشہ تائی کی نظر سے تمہیں دیکھا تھا۔ آج انہی لوگوں نے میرے وجود کو تنکے سے بھی ہلکا کر دیا۔" وہ رو رو کر معافی مانگ رہی تھی۔ "تم یقین کرو اسید میں جھگڑالو ہوں۔ بدتمیز بھی ہوں۔ اپنی جگہ بنانے کے لیے اور دوسرے کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے میں نے بہت بار جھوٹ بولے بے شمار جھگڑے بھی کروائے کہ اس سے مجھے عجیب سی خوشی ملا کرتی تھی مگر۔" وہ رک گئی۔ "مگر میں چور نہیں ہوں۔"

"میں جانتا ہوں تم نہ بھی بتاؤ تمہاری زندگی اور فطرت کے ان گوشوں سے بھی واقف ہوں میں جن سے تمہیں بھی ابھی آگاہی حاصل نہیں ہے۔" اس نے نرمی سے اس کے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں پر سمیٹے۔

"تمہیں میری زندگی میں شامل ہونا تھا اس لیے قدرت نے بہت پہلے سے دل کا ایک کونا تمہارے لیے نرم رکھا، تمہیں یاد ہو گا میں بھی تمہیں برا بھلا کہتا تھا بدتمیزی، لڑائی جھگڑے اور گھریلو سیاستوں سے دور رہنے کو کہتا تھا تو مجھے ان سب میں ہرگز دلچسپی نہیں تھی مگر نہ جانے تمہاری ذات کو ایکسپلائٹ ہوتے دیکھنا مجھے ہمیشہ غصہ دلاتا تھا میں کڑھتا تھا کہ یہ لڑکی کیوں خود کو دوسروں کے ہاتھوں میں ضائع کر رہی ہے۔" نوبیہ کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو بھر آئے۔

"مجھے پتا ہے تم چور نہیں ہو کیونکہ تمہیں چور بنانے کا پلان میں نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا کہ اس کے بغیر تائی کے پاس کوئی اور آپشن تھا ہی نہیں اپنے بیٹے کی زندگی سے آؤٹ کرنے کا۔" پھر اس نے اس دن والی وہ ساری گفتگو اسے سنا دی جو اتفاق سے اس کے کانوں میں پڑی تھی۔ نوبیہ منہ کھولے بس اس کا

چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ اس نے ان سب کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا اور انہوں نے اس کے ساتھ کیا کیا۔

"اسید۔ تم نے مجھے معاف کر دیا ناں؟" وہ جھجک کر بولی کہ اسی پل اسے احساس ہوا کہ وہ اس کے ساتھ کیسی نازک ڈور سے بندھی ہے۔

"نہ کرتا تو شاید تم اس وقت میرے ذاتی گھر میں میری ذاتی بیوی کی حیثیت سے نہ بیٹھی ہوتیں۔" وہ شرارتی ہوا تو یہ نے بے حد حیرت سے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا کہ کیونکہ اس کو مسکراتے ہوئے دیکھنا اس کے لیے ایک خوب صورت اور عجیب تجربہ تھا۔

"کیا بات ہے؟ بہت خوب صورت لگ رہا ہوں کیا؟" یک ٹک اسے دیکھتے پا کر وہ ایک بار پھر شرارتی ہوا تو یہ گڑبڑا کر نظر جھکا گئی۔

اسید نے اسے اگلے دن نہ صرف کتابیں لا کر دی تھیں بلکہ ایوننگ کلاسز میں اس کا داخلہ بھی کروا دیا تھا۔ "زندگی کے کسی موڑ پر میں تمہیں احمد منزل کی کسی لڑکی سے ہرگز کم تر نہیں دیکھ سکتا۔ جلد یا بدیر جب بھی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو تو صرف غلطی کا احساس ہی نہ ہو بلکہ پچھتاوے بھی ساتھ ہوں کہ اس ہیرے کی تراش ہمارے ہاتھوں کیوں نہ ہوئی۔" اس نے کہا تھا اور تو یہ اس بات پر ایمان لے آئی تھی۔

اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ اسید چونکہ خود ایک پارس تھا سو اسے ہیرے میں ڈھالنا چاہ رہا تھا ویسے بھی جب سے اس نے ٹی وی پروگرامز سے شہرت حاصل کی تھی سب کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ سچ ہی کہتا تھا۔ بس انہوں نے جس نظر سے دیکھا تھا اسے 'وہ اینگل' ہی غلط تھا۔

☼ ☼ ☼

جھکے کاندھوں والے تایا سامنے اسکرین پر نظر آتے اسید کو دیکھ رہے تھے جس کو کسی پروگرام میں بطور مہمان بلایا گیا تھا کہ اس نے پچھلے دنوں ایسے ایسے کرائمز کا پردہ فاش کیا تھا جن پر بڑے بڑے لوگ بھی ہاتھ ڈالنے سے ڈرتے تھے۔

"آپ کی کامیابی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟" میزبان کے سوال پر تایا چونک گئے۔

"اللہ تعالیٰ کے بعد اپنے ابو کا 'اماں جی کا اور ماسٹر مائنڈ کا 'ماسٹر مائنڈ میری زندگی کا ایسا کردار جنہوں نے اپنی زبان ' اپنے رویے اور اپنے سلوک سے مجھے مسلسل جدوجہد کی تحریک دی۔ تھینک یو 'اماں جی ' ابو جی اور ماسٹر مائنڈ۔۔۔" تائی بھی تایا کے ساتھ ہی ششدر بیٹھی اس شاندار شخص کو دیکھ رہی تھیں جو انہی سے مخاطب تھا "ماسٹر مائنڈ" کا خطاب اسی نے انہیں دیا تھا۔ تایا نے ایک زہر خند نظر اپنی نصف بہتر پر ڈالی۔ جنہوں نے نظریں چرالی تھیں۔

چند ماہ پہلے ہی تو اپنے کامیابی کا جشن مناتے ہوئے انہوں نے سبین کو بیاہا تھا۔ مگر وہ اپنی ماں کا پرتو تھی زبان اور سازشی کارروائیوں 'میں سوپھپھو اور فرحان ان چند ہی ماہ میں عاجز آگئے تھے اس سے بات بات پر لڑ جھگڑ کر میکے آجانا اس کا معمول تھا۔ پھر انہی دنوں آفس میں ورکرز کی ہڑتال پر کاشان کی سپروائزر سے لڑائی اس حد تک بڑھی کہ اس نے ریوالور نکال کر اس پر گولی چلادی تھی۔ مزید ستم یہ کہ وہ اسلحہ بھی غیر قانونی تھا۔ ثبوت گواہان کی موجودگی اور گواہی کے باعث تین ماہ سے وہ جیل کی سزا کاٹ رہا تھا اور تایا وکیلوں کے چکر لگا لگا کر تھک گئے تھے۔ اماں جی مزید بوڑھی ہو گئی تھیں۔

تائی نے بوکھلاہٹ میں مزید غضب یہ کیا تھا کہ تو یہ کے ابو کا طویل عرصہ بعد رابطہ کرنے پر غصے میں انہیں بے نقط سنانے کے بعد کہا تھا کہ ان کی بیٹی اسید کے ساتھ گھر سے کہیں چلی گئی ہے ان کے منہ پر کالک مل کر سو آئندہ اپنی بیٹی کا پوچھنے کے لیے مت فون کریں۔۔۔ وہ تو پریشان ہو گئے تھے کہ یہ کیا ہو گیا ہے آخر۔۔۔ کیا کہہ رہی ہیں بھابھی۔۔۔ ایمر جنسی میں ٹکٹ کٹا کر فوراً "پاکستان پہنچے تھے۔ تایا ' تائی اس روز کاشان کو جیل ملنے گئے تھے۔ چچا آفس جبکہ چچی بازار گئی تھیں صرف اماں جی تھیں جنہوں نے رو رو کر بیٹے کو ساری بات کہہ سنائی تھی۔

"اتنا کچھ ہو گیا اور آپ نے مجھے جتایا ہی کچھ

نہیں۔" وہ کرب سے بولے تھے۔

☆ ☆ ☆

اس کا چھوٹا سا گھر اس کی چھوٹی سی جنت تھا۔ اب وہ تائی کے رحم و کرم پر پلنے والی نوبیہ نہیں تھی۔ نوبیہ اسید تھی۔ مشہور سلیبرٹی اسید کی بیوی اس کا پہلا سمسٹر مکمل ہو چکا تھا۔ فوزیہ سے اس کی پکی دوستی ہو گئی تھی وہ تعلیمی سلسلہ جو اس نے اسید کے کہنے پر اس نے مارے باندھے شروع کیا تھا اب اس میں اس کا اپنا شوق اور لگن شامل تھی۔ وہ اپنے اللہ کا جتنا شکر ادا کرتی کم تھا جس نے اسید جیسا ہم سفر اس کا مقدر کر دیا تھا وہ اپنے بیتے دن یاد کرتی تو کبھی اپنی بے وقوفیوں پر روتی اور کبھی اپنی ناعاقبت اندیشیوں پر مجروح ہنسی اس کے لبوں کو چھو جاتی یہ طے تھا کہ اسے ہر قدم پر اپنے رب کا شکر ادا کرنا تھا۔

اس روز سنڈے تھا اس کے انسٹی ٹیوٹ سے چھٹی تھی۔ اسید نے بھی شام کو پروگرام کرنا تھا سو وہ اس کا فرمائشی ناشتا بنانے کچن میں گھسی ہوئی تھی اسید نے اسے تمام ضروریات زندگی مہیا کی تھیں اس نے مکان کو اپنی صلاحیتوں سے گھر بنا دیا تھا۔ اب محبت' اعتبار اور باہمی ہم آہنگی کے سفر پر وہ دونوں قدم سے قدم ملا کر چل رہے تھے۔

ڈور بیل کی آواز سن کر اسید نے ٹی وی کی آواز ہلکی کی ایک نظر سامنے کچن میں کام کرتی نوبیہ پر ڈالی اور جا کر دروازہ کھولا اور ساکت رہ گیا۔۔۔ نوبیہ کے ابو۔۔۔ تائی ۔۔۔ تایا چچا' چچی اور تو اور عطیہ کا سہارا لیے اماں جی بھی تھیں۔

"اسید اندر بھی نہیں آنے دو گے؟" اماں جی مسکرا کر بولیں۔

"نہیں اماں جی! یہ اس کا حق بنتا ہے کہ یہ ہمیں دھکے مار کر نکال باہر کرے۔" تایا نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"ارے کیا کرتے ہیں ابو آپ آئیں۔۔۔ آجائیں آپ کا اپنا ہی گھر ہے وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔ نوبیہ بھی کچن سے باہر آگئی تھی۔ اسید سے معافی مانگتی تائی کو دیکھ کر وہ تمام اذیت بھرے پل آنکھوں کے سامنے آگئے جو اسے اب بھی کبھی کبھار رت جگا کرنے پر مجبور کر دیتے تھے۔

"ارے ماسٹر مائنڈ۔۔۔ گناہ گار مت کریں پلیز۔۔۔ آپ نے جو بھی سمجھا ہو مجھے مگر میں نے آپ کو اپنی ماں ہی جانا اور سمجھا اس لیے کبھی پلٹ کر شکوہ نہیں کیا۔" اسید نے تائی کے جڑے ہاتھ تھام کر کہا اب تایا اور تائی نوبیہ کی طرف آئے تھے۔ اس نے صرف ایک پل اسید کے چہرے کو دیکھا تھا پھر اس کی آنکھ کا نرم سا اشارہ اسے بھی تائی کے بندھے ہاتھ کھولنے پر مجبور کر گیا۔

اپنے پاپا کے گلے لگتے ہی وہ رو تی گئی اور شکوے بھی کرتی گئی بلا آخر اسید نے اسے پاپا سے الگ کیا تھا۔ لمحوں میں ہی دلوں کی کدورتیں ڈھل کر مطلع صاف ہو گیا تھا۔

تایا نے انہیں گھر لوٹ آنے کی التجا کی تھی۔ جبکہ اماں جی نے حکم دیا تھا۔ پاپا نے نوبیہ اور اسید کو شادی کے تحفے کے طور پر بھاری رقم کا چیک دیا تھا جبکہ تائی اسید کے قریب بیٹھ کر لجاجت سے روتے ہوئے کاشان کی رہائی کے لیے کوشش کا کہہ رہی تھیں۔

اسید نے ان کا ہاتھ تھپتھپا کر انہیں تسلی کرائی تھی۔

نوبیہ بہت دنوں بعد کھل کر مسکرائی پھر اسید کو بھی بات بے بات مسکراتے دیکھ کر اسے لگا زندگی بھی گویا مسکرا دی ہو۔

☆ ☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل ----------	نیہا علی
میک اپ ----------	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ----------	موسیٰ رضا

نبیلہ ابر راجہ

مکمل ناول

میں گمان نہیں یقین ہوں

نویں اور آخری قسط

"رنم سیال" ملک ایبک کے ساتھ اس کی جاگیر دیکھنے جارہی تھی۔ گاڑی نہروالی سڑک کے ساتھ ساتھ ہموار رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ کھلے شیشے سے ہوا کے ٹھنڈے جھونکے رنم کے بالوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کررہے تھے۔ اس کے بال بار بار اڑ کر ایبک کے کندھے سے ٹکرا رہے تھے اس کے دل میں گدگدی سی ہورہی تھی۔ ایبک کی توجہ ڈرائیونگ کی طرف تھی۔ رنم سیال نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر میوزک پلیئر آن کردیا۔ تب ایبک چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ دھیرے سے مسکرادی۔

بن پوچھے میرا نام پتا
رسموں کو رکھ کے پرے
چار قدم۔ بس چار قدم چل دو ناں ساتھ میرے
بن کچھ کہے
بن کچھ سنے
ہاتھوں میں ہاتھ لیے
چار قدم بس چار قدم
چل دو ناں ساتھ میرے

رنم اسٹیئرنگ ویل پہ جمے ایبک کے مضبوط مردانہ ہاتھوں کو دیکھے جارہی تھی۔ اس کی نظروں کے ارتکاز سے ایبک کی توجہ ایک ثانیے کے لیے تقسیم ہوئی۔ رنم کی آنکھیں لو دیتے جذبوں سے دہک رہی تھیں نگاہیں ملنے پہ اس نے چرانے کی یا چہرہ موڑنے کی کوشش نہیں کی۔ گانے کے بول اس کے دلی جذبوں کے عکاس تھے۔ ایبک جز بز ہورہا تھا۔ رنم سیال بہت تیزی سے اس سے بے تکلف ہوئی تھی۔ اس میں صاف گوئی اور بے باکی تھی۔ بہت آرام سے ہر بات کرلیتی۔ پہلی ملاقات میں ہی اس نے ایبک سے اس کے گاؤں آنے کی بات کی تھی بقول اس کے ایبک کی طرح اسے بھی سوشل ورک سے دلچسپی ہے۔ حالانکہ اسے دور دور تک سوشل ورک سے واسطہ نہیں تھا۔

اپنے علاوہ وہ کسی کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ دوران تعلیم اسے سب دوستوں میں نمایاں رہنے کا جنون تھا اس کی گاڑی' ڈریسنگ' مہنگی برانڈڈ اشیا کا استعمال' فراخدلی سے پیسے کا استعمال اس کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اس کے قریبی دوست اس بات سے آگاہ ہوجاتے کہ وہ گاؤں میں عام لوگوں کی بھلائی کے لیے کچھ پراجیکٹ شروع کرنے لگی ہے تو اس کایا پلٹ پہ ضرور حیران ہوتے۔ ملک ایبک کی قربت حاصل کرنے اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتی تھی۔

اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے دل کی بات کرنے کے لیے اس کے پاس وقت کم ہے۔ وہ گزرتے وقت کی تیز رفتاری سے خائف تھی۔ اس کے دلی جذبے اس کی نگاہوں سے جھلکنے لگے تھے۔ ملک ایبک نے سر جھٹک کر جیسے اس کی طرف سے دھیان ہٹایا۔

"آپ اپنی وائف کو بھی ساتھ لے آتے۔" رنم نے پھر خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی جو اچانک ان کے درمیان در آئی تھی۔ وہ فقط سر ہلا کر رہ گیا۔ حالانکہ وہ ایبک سے تفصیلی جواب سننے کی متمنی تھی۔

"میں آپ کے ساتھ اس طرح گھومتی پھرتی ہوں

زیان کو اعتراض تو نہیں ہوتا؟ آخر کو آپ کی نئی نئی شادی ہے۔" اس نے کرید جاری رکھی۔

"نہیں زیان کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔" ایبک نے مختصراً" جواب دیا۔

"مجھے کئی بار فیل ہوا ہے کہ آپ دونوں میں کچھ۔" رنم نے بولتے بولتے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ اپنی بات کا تاثر اس کے چہرے پہ دیکھنا چاہ رہی تھی۔ ایبک اور وہ دونوں اس وقت کھیتوں کے درمیان بنی پگڈنڈی سے گزر رہے تھے۔ ایبک اپنی جگہ رک گیا تھا۔

"آپ کو برا تو نہیں لگا۔" رنم نے اس کی خاموشی سے کچھ اخذ کرنے کی کوشش کی تھی۔

"دراصل میں نے زیان کے رویے سے اندازہ لگایا ہے کہ اسے آپ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" رنم

نے صاف گوئی سے کہا۔ ایبک کا دل لحہ بھر کے لیے سکڑا۔ اتنے برے حالات ہو گئے تھے کہ ان دونوں کے درمیان جو سرد خلیج حائل ہو گئی تھی یہ اجنبی نوار دلڑکی کتنی جلدی اس کی تہ تک پہنچ گئی تھی۔ رنم کا ملک محل سے کوئی تعلق نہیں تھا اسے آئے ایک ہفتہ ہی تو ہوا تھا اور۔۔۔

صرف چند دنوں میں ان دونوں کے مابین تعلقات کی نوعیت سے واقف ہو گئی تھی۔ ایبک اب آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کی خاموشی اس بات کا ثبوت تھی کہ رنم کے اندازے بالکل درست تھے۔ وہ سرمستی سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی عین اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وقت ہوا سانسیں تھم گئی ہوں اور وہ صدیوں سے اس کے پیچھے پیچھے چل رہی ہو آنکھیں بند کیے خود فراموشی کے عالم میں۔ ایبک اس کے سوالوں اور اندازوں کی درستی سے خائف ہو رہا تھا۔ اس لیے تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ٹیبل پہ بہت سے پیپرز پھیلائے ایبک اور رنم سیال اسکول کی تعمیر اور دیگر پراجیکٹ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ایبک کے ہاتھ میں پین تھا وہ اسے بتانے کے لیے پیپرز پہ نشاندہی کر رہا تھا۔ ایبک اور وہ کرسی جوڑے پاس پاس بیٹھے تھے۔ ایبک کے مردانہ پرفیوم کی مہک رنم بڑی وضاحت کے ساتھ محسوس کر رہی تھی۔ اس کی توجہ ایبک کی بتائی جانے والی تفصیلات کی طرف چنداں نہیں تھی۔ بلکہ وہ ایبک کی طرف متوجہ تھی۔ زیان تین چار بار وہاں سے گزری اور تین چار بار ہی انہیں مگن پایا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ اس طرف نہیں آئی۔ وہاں ایبک اور رنم کے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا۔ زیان خود کو مصروف رکھنے کے لیے کچن میں آ گئی۔

ایبک اور رنم جہاں بیٹھے تھے وہاں سے کچن کافی قریب تھا۔ زیان کو کچن میں گئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ وہاں سے زور زور سے رونے کی آواز آنے لگی سو فیصد یہ آواز زیان کی تھی۔ ایبک نے محسوس کر لیا تھا۔ وہ اور رنم ایک ساتھ وہاں پہنچے تھے۔ گھر میں کام کرنے والی دیگر ملازمائیں بھی صورت حال سے آگاہ ہونے پر بھاگی بھاگی آئیں پر ایبک نے سب کو وہاں سے ہٹا دیا۔ رنم نے معنی خیز نگاہوں سے ایبک کی سمت دیکھا۔ زیان کی نظر بہت حساس تھی اور ابھی تو ویسے بھی اس کی سب حسیات ان دونوں کی طرف متوجہ تھیں۔ کچن میں آ کر اس نے سبزی کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ دھیان سارا ایبک اور رنم کی طرف تھا اس لیے سبزی کاٹتے کاٹتے اس کے ہاتھ پہ چھری سے اچھا خاصا گہرا کٹ لگ گیا تھا۔ جس سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ اس بہتے خون کو دیکھ کر وہ زور زور سے رو رہی تھی۔ ایبک کو پہلے غصہ آیا پر اس کے ہاتھ سے بہتے خون کو دیکھ کر دھیما پڑ گیا۔ افشاں بیگم بھی وہاں پہنچ گئی تھیں۔ وہ زیان پہ خفا ہو رہی تھیں۔ اس کا رونا دھونا اسی طرح جاری و ساری تھا۔

ایبک نہ تو اس کے قریب گیا نہ کسی ہمدردی کا اظہار کیا بس دیکھ کر پلٹ گیا۔ وہ پھر سے رنم اور پیپرز کے ساتھ مصروف عمل تھا۔ زیان ہاتھ پہ بینڈیج کروا کر اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ سلمیٰ نے ٹنکچر آیوڈین سے خون صاف کر کے اس کے ہاتھ پہ پٹی لپیٹی تھی۔

رنم سیال کی نگاہ اس کے دل میں خنجر کی طرح اتری تھی۔ اوپر سے ایبک کا رویہ۔ وہ بولنا چاہ رہی تھی، احتجاج کرنا چاہ رہی تھی پر ازلی خودسری اور ضد نے زیان کے منہ پہ تالے ڈال دیے تھے۔ وہ کیوں ایبک کے سامنے اپنی زبان کھولے وہ اتنا زیرک، باشعور اور سمجھدار ہے اس کی ذرا سی حرکت اور تاثرات سے اس کے محسوسات کی تہ تک پہنچ جاتا ہے پھر اس بار وہ کیوں نہیں سمجھ پا رہا ہے۔ اور رنم سیال جانے کیا بلا ہے۔ جو ایبک پہ قابض ہونے کی کوشش کر رہی ہے اسے پھانس رہی ہے۔ اس کے گھر میں بیٹھ کر اسے

جلانے کی کوشش کررہی ہے۔ وہ ہوتی کون ہے۔ زیان روتے روتے خود سے لڑ رہی تھی۔

اس کی مخصوص حس نے رنم سیال کے بارے میں مخصوص اشارہ دے دیا تھا۔ پر وہ جان کر بھی انجان بننے کی کوشش کررہی تھی کہ اسے خود سے اقرار کرتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اسے ماننے میں 'قبول کرنے میں' خود کو سمجھانے میں کوئی مشکل نہیں آتی اگر وہ رنم کی نگاہوں میں وہی تحریر نہ پڑھ لیتی جو اس کے اپنے دل پہ لکھی تھی۔ رنم کی نگاہوں میں محبت جیسا طاقت ور جذبہ پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

زیان کو اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آرہا تھا کہ بوا رحمت اس کے سامنے بیٹھی ہیں۔ زندہ سلامت جیتی جاگتی۔ زیان بھاگ کر ان سے لپٹی تھی۔ انہیں چومتے ہوئے وہ روئے جارہی تھی۔

"بوا آپ کہاں چلی گئی تھیں میری شادی پہ بھی نہیں آئیں۔" وہ روتے روتے نروٹھے پن سے گویا ہوئی۔ بوا کے لیے زیان کی شادی خوش گوار سرپرائز سے کم نہ تھی۔

نواز انہیں ملک محل پہنچا کر واپس جاچکا تھا۔ زیان جلد از جلد سب کچھ جان لینا چاہتی تھی۔ اس کے چہرے پہ سچی مسکراہٹ تھی۔ عنیزہ ان سے بے پناہ محبت اور احترام سے ملی تھیں۔ اب زیان انہیں گھیرے بیٹھی تھی۔ وہ محل نما گھر دیکھ کر مرعوب ہو رہی تھیں یہ بات ان کے لیے اطمینان کا باعث تھی کہ زیان اس محل نما گھر کی مالکہ بن گئی ہے۔ وہ دل میں اللہ کی شکر گزار تھیں۔

نئے گھر' نئی جگہ میں وہ سب پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ تینوں بچوں کا داخلہ بھی اچھے تعلیمی ادارے میں ہو گیا تھا' ساتھ یہ علاقہ ہر طرح سے محفوظ تھا اس کی اپنی سیکورٹی تھی کوئی انجان شخص تصدیق کروائے بغیر یہاں قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ اب وہاب کی طرف سے کوئی خوف نہ تھا۔ بوا کو زیان کی یاد ستا رہی تھی۔ زرینہ بیگم سے اجازت لے کر وہ نواز کے ساتھ یہاں تک پہنچی تھیں۔

عنیزہ' بوا سے برسوں بعد ملی تھیں۔ دونوں کھل مل کر باتیں کررہی تھیں۔ زیان کی خوشی دیکھنے والی تھی وہ بوا کو اپنے گھر لے آئی انہیں سب سے ملوایا۔ ایبک زیان کے شوہر کی حیثیت سے ملا انہوں نے گہری نگاہ سے اسے دیکھا پھر دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے۔ بوا زیان کے بارے میں گزرے لمحوں کا احوال بتا رہی تھیں جس میں تعریفی پہلو نمایاں تھا۔ رنم غور سے ان کا جائزہ لے رہی تھی۔ واضح طور پہ اسے زیان کی بوا پسند نہیں آئی تھیں کیونکہ انہوں نے ہی زیان کو پالا پوسا تھا وہ اس کی زندگی کے اتار چڑھاؤ سے واقف تھیں۔ جو منصوبہ وہاب کی آمد سے اس نے تیار کیا تھا بوا کے منظر عام پہ آنے کے بعد اس منصوبے کی ناکامی کا امکان تھا لیکن رسک تو ہر حال میں لینا تھا۔

افشاں بیگم بوا کی باتیں بہت دلچسپی سے سن رہی تھیں۔

"اتنی سی تھی زیان۔ میں اسے تیار کر کے اسکول بھیجا کرتی تھی۔" بوا نے ہاتھ سے زیان کا سائز بتایا تو ایبک کے لبوں پہ مسکراہٹ آگئی۔ "پڑھائی میں بہت تیز تھی میری بچی۔ ذرا سا دھیان دینے سے ہی اچھے

نمبر لیتی تھی۔ کبھی اس نے مجھے تنگ نہیں کیا۔ آج کل کی لڑکیوں والے چھل فریب' ناز و انداز کچھ بھی نہیں ہے میری بچی میں۔ بہت رشتے آئے میری بچی کے اچھے اچھے گھرانوں سے۔ لیکن امیر میاں نے کہا ذیان ابھی بیس کی بھی نہیں ہوئی ہے میں اتنی جلدی شادی نہیں کروں گا۔ ساتھ ذیان کو پڑھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ شادی کا نام سنتے ہی غصے میں آجاتی شور کرتی کہ میں نے شادی نہیں کرنی۔" بوا مسکراتے ہوئے بتا رہی تھیں۔ ذیان مرکز نگاہ' موضوع گفتگو بنی ہوئی تھی۔ رنم سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ یہ بڑھیا اپنی سادگی میں ہر بات جتاتی جا رہی تھی۔

"ایبک اسکول کی تعمیر کب تک مکمل ہو گی؟" رنم نے ایبک کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔

"ہوں نہہ۔" وہ عدم توجہ سے بولا۔ رنم نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔ اتنے میں ذیان کا سیل فون بجنے لگا۔ وہ اس کے سامنے ٹیبل پہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اٹھایا۔ وہاب کی کال آرہی تھی۔ ایک دم اس کے چہرے کی رنگت بدلی اور اس نے کال منقطع کر دی۔ وہ پھر کال کر رہا تھا۔ ذیان نے سیل فون ہی آف کر دیا۔ اس کی حالت بری ہو رہی تھی۔ وہ بہانہ کر کے سب کے درمیان سے اٹھ آئی۔ اب ایبک کا فون بج رہا تھا۔ وہ معذرت کر کے کال سنتے باہر آگیا۔

"مسٹر ایبک آپ کی وائف نے تو سیل فون آف کر دیا ہے۔ اس لیے آپ سے رابطہ کیا ہے۔"

اس کے پہلے جملے نے ہی ایبک کو جلتے توے پہ بٹھا دیا۔ وہ اس کی بیوی کا ذکر کر رہا تھا۔

"کون ہو تم اور کال کرنے کا مقصد؟" اس نے غصے پہ قابو پا کر معتدل انداز میں کہا۔

"میں وہاب ہوں۔ آپ کے دولت خانے پہ پہلے بھی حاضری دے چکا ہوں۔ یقین نہ آئے تو اپنی ساس سے پوچھ لیں۔" وہ جو کوئی بھی تھا اسے پریشانی میں ڈال چکا تھا۔

"اب کیا ہے یہ بتاؤ۔"

"میں آپ سے ملاقات کر کے کچھ حقائق آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے ٹائم دیں میں ملنے حاضر ہو جاؤں گا۔" وہ بہت مہذب انداز میں بات کر رہا تھا۔

"او کے وہاب کل کسی بھی وقت آجاؤ۔" ایبک نے بات کر کے فون بند کر دیا۔ حویلی سے جاتے وقت نمناں نے بھی اس سے بات کی تھی اور کسی اجنبی نوجوان کی آمد کا ذکر کیا تھا۔ وہ گاؤں آیا تو مصروفیات میں اس غیر اہم بات کو بھول بھال گیا۔ ذیان کے سیل فون پہ اس کے سامنے ہی تو کال آئی تھی' اس نے سنے بغیر رابطہ ہی منقطع کر دیا تھا بعد میں بہانے سے اٹھ گئی تھی۔ جانے یہ وہاب نامی شخص کون تھا اور کون سے حقائق اس کے علم میں لانا چاہ رہا تھا۔ ذیان کو عنیزہ چچی کو وہ کیسے جانتا تھا۔

فون سننے کے بعد وہ دوبارہ بوا کے پاس آکر بیٹھا تو اس کا چہرا سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس کے تاثرات سے رنم کو اندازہ ہوا کہ وہاب نے منصوبے کے پہلے حصے پہ عمل کر دیا ہے۔ کیونکہ ذیان بھی وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ بوا اس کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھیں۔ رنم دل ہی دل میں استہزائیہ مسکرا رہی تھی۔ ذیان کی کہانی کا بہت جلدی دی اینڈ ہونے والا تھا۔ وہاب آہستہ آہستہ کامیابی کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ وہاب اس کے لیے امداد غیبی تھا ورنہ وہ کبھی بھی اپنے منصوبے پہ عمل نہ کر سکتی تھی۔ بوا رحمت جو ذیان کی تعریفیں کر کے رنم کا دل جلا رہی تھیں ان کا بھانڈا پھوٹنے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ملک صاحب مجھے یہ آپ کے دوست کی بیٹی کچھ خاص پسند نہیں آئی ہے۔" ملک جہانگیر کے گرد لحاف درست کرتے ہوئے افشاں بیگم نروٹھے پن سے گویا ہوئیں۔

"کیوں کیا ہوا ملکانی! کیوں پسند نہیں آئی؟" ملک جہانگیر موڈ میں تھے اس لیے ان کی بات کا برا نہیں مانا۔

"جب سے آئی ہے ایبک کو لے کر نکل جاتی ہے

کبھی کہتی ہے مجھے گاؤں دکھاؤ تو کبھی اسکول۔ ہر وقت اس کے پاس بیٹھی رہتی ہے۔ ایک ایک بار بھی اس کے ساتھ زبان کو لے کر نہیں گیا۔"

"ارے اس کے دل میں انسانیت کا درد ہے غریبوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے وہ تب ہی تو گاؤں آئی ہے۔" ملک جہانگیر رسان سے بولے۔

"آپ نہیں جانتے ملک صاحب میں نے جو دیکھا اور محسوس کیا ہے اس کی آنکھوں کا رنگ وہ نہیں ہے جو عام عورت کا ہوتا ہے۔ وہ ہمارے ایبک میں کچھ اور طرح کی دلچسپی لے رہی ہے۔ صرف ایک ملاقات میں ہی اتنی بے تکلف ہوئی کہ یہاں ہمارے گھر پہنچ گئی۔ ٹھیک ہے آپ کے دوست کی بیٹی ہے لیکن مجھے اس کے عادات و اطوار کچھ بھائے نہیں ہیں۔"

"ارے تمہارا وہم ہوگا' یہ کہ وہ ایبک میں خاص دلچسپی لے رہی ہے۔ وہ شادی شدہ بیوی والا ہے۔" ملک جہانگیر چنداں ان کی بات کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ افشاں بیگم غصے سے ان کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

"کرتی ہوں میں ایبک سے بات' چلتا کرے اسے یہاں سے۔ شہر میں انسانیت کا درد جگائے اپنے تنگ اور چھوٹے چھوٹے کپڑے پہن کر۔" افشاں بیگم نے پہلی نظر میں ہی رنم کو ناپسند کردیا تھا۔ اس کا جدید اسٹائلش پہناوا انہیں بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ وہ شکر کررہی تھیں کہ معاذ نے انکار کردیا تھا اور ایبک کی بار خود احمد سیال کی بیٹی باہر چلی گئی تھی۔ شکر ہے ان کے دونوں بیٹے بچ گئے تھے ورنہ ملک جہانگیر کو اپنے دوست کی بیٹی بہت پسند تھی۔

ملک جہانگیر کا خاندان روایات اور پرانی قدروں کی پاسداری کرنے والا خاندان تھا۔ نوجوان نسل جدید قدیم قدروں کا مرکب تھی انہیں کھلاڈلا ماحول اور بے جا آزادی پسند نہیں تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ ان کے ہاں عورت کو کمتر یا بے زبان مخلوق سمجھا جاتا ہو۔ جائز حد میں ہر طرح کی آزادی دی گئی تھی مگر بے باکی کو پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ اور یہ بے باکی رنم میں بدرجہ اتم

موجود تھی۔

وہ بغیر دوپٹے کے سلیولیس ٹاپ میں ایبک کے ساتھ گھومتی پھرتی رات دیر تک اس کے پاس پاس بیٹھی رہتی۔ ان کے ہاں کی عورتیں ایسی نہیں تھیں۔ خود زیان شادی سے پہلے ایبک کے ساتھ لیے دیے رہتی۔ انہوں نے کبھی اسے ایبک کے ساتھ ہنستے بولتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ روایتی عورت کے نسوانی غرور سے مالا مال تھی۔ خود افشاں بیگم بھی ایسی تھیں اس لیے رنم انہیں ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہاب' ملک ایبک کے سامنے ان کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ اس کے پاس تکلیف دہ انکشافات کا خزانہ تھا۔

"زیان اور میں شروع سے ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جی رہے تھے ہم۔ امیر خالو کی مرضی سے ہمارا رشتہ طے ہوا۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ زیان کے گریجویشن کرلینے کے بعد ہماری شادی ہونی تھی۔ پر زرینہ خالہ کو کسی صورت ہماری خوشی منظور نہیں تھی۔ انہیں شروع سے ہی زیان سے چڑ تھی کیونکہ وہ ان کی سوکن کی بیٹی تھی۔ ساری عمر انہوں نے زیان سے نفرت کی۔ میری امی کو زیان پسند تھی۔ میں اسے' اس نفرت بھرے ماحول سے نکالنا چاہتا تھا۔ بظاہر خالہ نے ہنسی خوشی سب قبول کرلیا تھا۔ امیر خالو کے مرتے ہی انہوں نے میری اور زیان کی شادی کرنے سے انکار کردیا۔ انہیں خوف تھا کہ اس شادی کی صورت میں زیان کو اس کے باپ کے ترکے میں حصہ دینا پڑے گا کیونکہ میں نے خالہ کو صاف صاف کہا تھا کہ میں زیان کے ساتھ مزید کوئی ناانصافی برداشت نہیں کروں گا۔

خالہ نے سازش تیار کی اور خالو کا گھر بیچ کر غائب ہوگئیں۔ خود انہوں نے زیان کو زبردستی یہاں پہنچادیا۔ میری محبت کو قتل کردیا۔ مجھے کچھ دن قبل ہی اطلاع ملی کہ میری محبت تو کسی اور کی زوجیت میں ہے۔ وہ اپنی خوشی سے اپنی مرضی سے یہاں نہیں آئی ہے' ظالم دنیا نے ہمیں ایک دوسرے سے الگ کردیا ہے۔ زیان کچھ دن اور وہاں رک جاتی تو ہم کورٹ میرج کرکے اب تک ایک ہوجاتے۔ وہ میری محبت ہے۔ میں کتنی مشکلات سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ میرے لیے خوشی کا پہلو یہ ہے کہ زیان نے میری محبت کو اب تک سینے سے لگا کر رکھا ہوا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے اپنی محبت اپنا وجود اب تک کسی کو نہیں سونپا ہے۔ میں اس اعتماد کے سہارے یہاں تک پہنچا ہوں۔

آپ میرے ساتھ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ چاہیں تو مجھے دھکے دے کر نامراد کرکے ذلیل و خوار کرکے یہاں سے نکال دیں' چاہیں تو میری محبت میری جھولی میں ڈال کر مجھے بامراد کردیں' سب آپ پہ ہے ملک ایبک۔" وہ بات کے اختتام پہ اچانک اس کے پاؤں پہ جھک گیا۔ اور اس کے دونوں پاؤں پکڑ لیے۔ ملک ایبک بھونچکا ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بمشکل اپنے پاؤں اسے چھڑائے۔ وہاب کی اداکاری بے حد غضب کی اور جان دار تھی۔ وہ دھڑ دھڑ ساتوں آسمان اس کے سر پر گرا رہے تھے۔ اپنی گفتگو میں وہاب نے جس طرف اشارہ کیا تھا ملک ایبک بخوبی اس کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔

زیان نے پہلی رات ہی آتم توش والا ڈرامہ کرکے ایبک کو خود سے دور رہنے پر مجبور کردیا تھا۔ شادی سے پہلے ہی وہ اس سے کتراتی اور گریزاں رہتی۔ جیسے یہ شادی اس کی مرضی کے بغیر زبردستی ہورہی ہے۔ گویا اس کا چپ چپ رہنا' گریزپائی کس کے قریب نہ ہونا سب کچھ وہاب کی محبت کی وجہ سے تھا۔ اسے وہاب سے ملنے سے پہلے اس بات کا علم نہیں تھا کہ زیان کن حالات میں ملک محل تک پہنچی ہے۔ گویا اس کی سوتیلی ماں نے اسے اور وہاب کو دور کرنے کے لیے یہاں بھیجا تھا۔

جب وہ شادی کا کارڈ دینے کے لیے شہر امیر علی کے گھر گئے تو ان کی بیوہ وہ گھر چھوڑ کر کسی نامعلوم مقام پہ

رہائش اختیار کرچکی تھیں گویا وہاب اپنی بات میں سچا تھا۔ زیان کے اور اس کے مابین کیسے تعلقات ہیں اس کا علم ان دونوں کے سوا صرف اللہ کو تھا مگر وہاب بھی ان کے تعلقات کی ذاتی نوعیت سے آگاہ تھا ظاہر ہے اسے بتانے والی زیان تھی۔ اس کی بیوی۔ اس کے ماں باپ کی من چاہی لاڈلی بہو۔ من میں کسی اور کی چاہت کے دیپ جلائے دلہن بن کر ایبک کے گھر میں آئی تھی۔ جس طرح وہاب نے اسے ایک ایک بات سے آگاہ کردیا تھا' ایسے زیان اسے بتادیتی تو وہ کبھی بھی اس کے ساتھ شادی نہ کرتا۔ وہاب اپنی محبت اور جذبوں میں سچا تھا تب ہی تو اس کے پاؤں میں جھک گیا تھا۔ اس کے آنسو مگرمچھ کے تو نہیں تھے۔ اس کا دل دکھا تھا اس کی محبت چھن گئی تھی اس کے ارمانوں کا خون ہوا تھا۔ اس لیے وہ مرد ہو کر بھی رو رہا تھا۔

دکھ' اذیت و کرب کیا ہوتا ہے کوئی اس وقت ایبک سے پوچھتا۔ وہاب کا ایک ایک جملہ اس کے ذہن پہ ہتھوڑے برسا رہا تھا ایسے لگ رہا تھا اس کا وجود روح میں ڈھل گیا ہو اور اس کی روح کو کانٹوں پہ گھسیٹا جارہا ہو۔ وہ اپنے ہمزاد کو مجسم اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھ سکتا تھا۔ اس کا ہمزاد تکلیف میں تھا شدید تکلیف میں۔ وہ تکلیف میں بھی ہنس رہا تھا ایبک پہ۔ ایبک اس سے چھپ رہا تھا چرا چھپا رہا تھا۔ وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

"ملک ایبک تم نے کتنا بڑا دھوکا کھایا ہے۔ تم اس لڑکی کو دلہن بنا کر لائے ہو جو کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ اور تم بھی تو اسے پسند کرتے ہو محبت کرتے ہو جو وہاب کو چاہتی ہے۔" وہ اسے آئینہ دکھا رہا تھا۔

ملک ایبک کے چہرے پہ اذیت رقم تھی۔ وہ کوشش کے باوجود بھی وہاب سے ایک لفظ بھی نہ کہہ پایا تھا۔ اس نے جواب میں وہاب سے اتنا بھی نہیں کہا کہ جو اتنے بڑے بڑے دعوے کررہے ہو تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت بھی ہے کہ نہیں۔ وہاب اس کی مسلسل خاموشی سے اپنے من پسند نتائج اخذ کرچکا تھا۔

"آپ بس مجھ پہ ایک احسان اور کرنا۔" وہاب نے التجائیہ انداز میں ایبک کی سمت دیکھا۔ ایبک نے شکست خوردہ آنکھیں اس پہ جمادیں۔

"میری آمد کی اطلاع کسی کو نہیں ہونی چاہیے۔"

"کیوں؟" ایبک پہلی بار بولا۔

"زیان پاگل ہے۔ ایسا نہ ہو کچھ الٹا سیدھا کر بیٹھے۔" وہاب کی طرف سے عجیب جواب موصول ہوا۔ مرد کبھی عورت پہ کھل کر اعتبار نہیں کرتا خاص طور پر اس عورت پہ جو اس کی بیوی بھی ہو۔ اپنی شریک حیات کے بارے میں چھوٹی سی ذرا سی بات اسے بدگمان کرسکتی ہے چاہے لمحہ بھر کے لیے ہی سہی وہ برگشتہ ضرور ہوتا ہے۔ تصدیق اور تحقیق کی ضرورت تو بعد میں پڑتی ہے پہلا مرحلہ شک اور بدگمانی سے بچنے کا ہوتا ہے اور وہ عورت خوش قسمت ہوتی ہے جس کا شوہر اس کی طرف سے لمحہ بھر کی بدگمانی کا بھی شکار نہ ہو۔

ایبک زیان سے محبت کرتا تھا۔ اسے نکاح کے بندھن میں باندھنے کے بعد ایبک نے بہت سے خواب بھی آنکھوں میں سجا لیے تھے۔ اور وہاب ان خوابوں کو کرچی کرچی کرنے چلا آیا تھا۔ آتم توش والا قصہ کھلنے کے بعد ایبک زیان کو سنبھلنے کا' اپنی محبت کو پہچاننے کا موقع اور وقت دے رہا تھا' تاکہ وہ اس کے جذبوں کی سچائی سے واقف ہو کر خود اپنی محبت کا اقرار کرے اور اس کے بعد اس میں تبدیلی کا عمل شروع ہوگیا تھا۔ اس کی خاموشی ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے ملک محل کو اپنا گھر تسلیم کرلیا تھا۔

بابا جان اور امی اس سے خوش تھے خاص طور پہ بابا جان اسے بہت پیار کرتے تھے تو افشاں بیگم واری صدقے جاتیں' رہ گیا معاذ تو وہ زیان کا دوست تھا۔ زیان نے سب سچائیوں کو تسلیم کرلیا تھا۔ ماضی کی تلخیوں اور کڑواہٹ کو فراموش کرکے وہ حال میں جینا شروع کرچکی تھی۔ ایبک صرف اس کی انا کی شکست کا انتظار کررہا تھا کیوں کہ وہ محسوس کررہا تھا کہ زیان کو اس کا رویہ ہرٹ کرنے لگا ہے۔ وہ اسے شکوہ کناں نگاہوں

سے دیکھتی ہے بولتی کچھ نہیں ہے۔ صرف ایک بار اسے بول دے کہ "ایبک میں تمہاری محبت پہ ایمان لے آئی ہوں۔" ایبک کو محسوس ہو رہا تھا اس کا انتظار زیادہ طویل نہیں پکڑے گا زیان کی توانائی اور حوصلہ کمزور پڑتا جا رہا تھا جہاں وہ تھک کر گر پڑتی ایبک اسے اٹھا کر سینے میں چھپا لیتا۔ اس کا انتظار جوں کا توں تھا کہ اب وہاب اس کی جنت کو دوزخ بنانے چلا آیا تھا۔

وہ اس کی جنت میں آگ لگانے آیا تھا اور اپنا کام مکمل کر کے گیا۔ ملک ایبک کسی کو بتائے بغیر شہر آ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کی شکست خوردگی کا تماشا دیکھے اسے اپنے آپ کو خود ہی سنبھالنا تھا حوصلہ دینا تھا اپنے آنسو خود صاف کرنے تھے۔

☆ ☆ ☆

"ہاہاہا زیان میں ہار کر بھی جیت گیا ہوں۔ تم یہاں آ کر یہ سمجھتی تھیں کہ مجھ سے محفوظ ہو گئی ہو۔ یہ تمہاری بھول تھی۔ اب تم ایبک کی طرف سے طلاق نامے کا انتظار کرو۔" وہ فون پہ بات کرتے ہوئے اونچی آواز میں قہقہے لگا رہا تھا۔

"بکواس بند کرو اپنی۔ ایبک محبت کرتے ہیں مجھ سے۔ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔" وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ایسا بہت جلد ہونے والا ہے اور جب تمہیں طلاق مل جائے تو سیدھی میرے پاس چلی آنا میرے دل کے دروازے کھلے ہیں تمہارے لیے۔ ویسے میں ملک ایبک کے پاس آیا تھا تمہارے ڈرائنگ روم میں تمہارے شوہر کی میزبانی سے مستفید ہو کر گیا ہوں۔" وہ اسے ترنگ میں آ کر بتا رہا تھا۔

"وہاب تم نے یہ سب اچھا نہیں کیا ہے۔ ایبک سمیت کوئی بھی تمہاری بات کا اعتبار نہیں کرے گا۔ تم جھوٹ بولتے ہو بکواس کرتے ہو۔" وہ مسلسل اسے جھٹلا رہی تھی۔

"میرا تو فائدہ ہی فائدہ ہے ایک طرف سے پیسے ملے ہیں تو دوسری طرف سے تم ملی ہو۔ ہاہاہا۔" کامیابی کے نشے میں سرشار وہاب نے ایک اور اہم بات کا انکشاف کیا۔

"کس نے دیے ہیں پیسے تمہیں؟" وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

"اسی نے جو آج کل ایبک کے پیچھے پاگل ہے۔" وہ اسی انداز میں بولا تو زیان کے ذہن میں تارے کی مانند ایک نام چمکا۔ زیان کی طرف سے مسلسل خاموشی پہ وہاب کو محسوس ہوا جیسے اس نے بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔ زیان فون بند کر چکی تھی۔ اب وہ ریسیو کرنے والی نہیں تھی۔

زیان نے اسی ٹائم معاذ سے رابطہ کیا۔ معاذ ہمیشہ اسے اچھے مشورے دیتا تھا۔ بیل جا رہی تھی پر وہ فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ زیان نے مایوسی سے ہاتھ میں پکڑے سیل فون کو دیکھا۔ وہ ایک بار پھر معاذ کا نمبر ڈائل کرنے جا رہی تھی کہ اچانک اس سے فون گیلری کھل گئی۔ اس میں وہاب کی اس کال کی ریکارڈنگ موجود تھی جو وہاب نے اسے ابھی ابھی کی تھی۔ وہاب کی یہ کال اس نے کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ریکارڈ نہیں کی تھی بس اتفاقاً اس نے کر لی تھی۔ اب وہ یہ ریکارڈنگ معاذ کو سنوانا چاہ رہی تھی۔ پر وہ کال ہی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ زیان نے غیر ارادی طور پہ ملک ایبک کو کال کی پر اس نے بھی ریسیو نہیں کی۔

☆ ☆ ☆

معاذ اسکائپ پہ آن لائن تھا اس نے زیان کی کال کی جانے والی ریکارڈنگ سن لی تھی۔ حقیقی معنوں میں آج وہ پریشان ہوا تھا۔ وہاب نے جب اسے پہلی بار کال کی تھی تو تب ہی سے زیان نے اسے شریک راز کر لیا تھا۔ وہ اس کی گزشتہ زندگی سے واقف تھا۔

"بھابھی، بھائی کہاں ہیں؟" اس نے پریشانی چھپاتے ہوئے دریافت کیا۔

"وہ کل بتائے بغیر اچانک شہر چلے گئے ہیں۔ میں نے کال کی وہ بھی نہیں اٹھائی۔"

"آپ اب انہیں کال مت کرنا اور وہاب کی کوئی

کال آئے تو اسے بھی ریکارڈ کرلینا' لیکن اسے احساس نہ ہونے پائے اور آپ رنم سیال کی طرف سے محتاط رہیں۔

آپ ایسا کریں جاکر ارسلان چچا کو یہ سب بتادیں۔ فون ریکارڈنگ بھی سنوادیں' اور میرے ساتھ رابطے میں رہیں۔" وہ جلدی جلدی بول رہا تھا۔ زیان ہر بات پہ سعادت مندی سے سرہلا رہی تھی۔ معاذ خود بے حد پریشان تھا' مگر زیان کے سامنے نارمل پوز کررہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ترک محبت کر بیٹھے ہم ضبط محبت اور بھی ہے
ایک قیامت بیت چکی ہے ایک قیامت اور بھی ہے
ہم نے اس کے درد سے اپنے سانس کا رشتہ جوڑ لیا
ورنہ شہر میں زندہ رہنے کی ایک صورت اور بھی ہے
ڈوبتا سورج دیکھ کر خوش ہو رہنا کس کو راس آیا ہے
دن کا دکھ سہ جانے والو رات کی وحشت اور بھی ہے
میری بھیگی پلکوں پہ جب اس نے دونوں ہاتھ رکھے
پھر یہ بھید کھلا ان اشکوں کی قیمت اور بھی ہے
اسے گنوا کے محسن اس کے درد کا قرض چکانا ہے
ایک اذیت ماند پڑی ہے ایک اذیت اور بھی ہے

دوسرے دن کا سورج بھی ڈھل چکا تھا۔ ایک کمرا بند کیے پڑا تھا۔ اس کا سیل فون بج بج کر خاموش ہوچکا تھا۔ وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پارہا تھا کہ کسی سے بات کرے۔ اس نے سیل فون لے کر کال ریکارڈ چیک کیا۔ سب سے آخری کال زیان کی تھی اور دو دن میں اس کی یہ واحد کال تھی۔ باقی ایک سو بیس کالز رنم سیال کی تھیں۔ اس کا ان باکس رنم کے پیغامات سے بھرا ہوا تھا۔

"ییک آپ میری کال ریسیو کیوں نہیں کررہے ہو۔ پلیز مجھے اپنی خیریت بتادو۔ میں بہت پریشان ہوں۔" رنم سیال کی طرف سے ملنے والا یہ میسج چند منٹ پہلے کا تھا۔ پھر رنم سیال کالنگ کے الفاظ جگمگائے تو اس نے غیر ارادی طور پہ کال ریسیو کرلی۔ لاشعوری طور پہ وہ اپنا درد بانٹنا چاہ رہا تھا۔ رنم تو جیسے درد کا درماں بن کر آئی تھی۔ ایک سب کچھ بتاتا جارہا تھا۔ رنم سیال بھی تو چاہتی تھی کہ وہ بولے اور خوب کھل کر بولے۔ جب وہ دل کی بھڑاس نکال لے پھر رنم سیال اس کے دکھتے دل پہ اپنی ہمدردی کے پھاہے رکھے۔ اسے احساس دلائے کہ وہ اس کے لیے بہت اہم ہے۔ وہ پھر کھل کر جذبات کا اظہار کرے۔

"ایک انسان زندگی میں شادی ایک بار کرتا ہے اور یہ کام اسے سوچ کر دیکھ بھال کر کرنا چاہیے۔ ورنہ آپ کی طرح انسان ہاتھ ملتا ہے۔ آپ کے رشتے کی ایبنارملیٹی میں نے چند دن میں ہی فیل کرلی ہے اور آپ خود اس چھوٹی سی بات کو بھی نہ سمجھ سکے کہ زیان کے دل میں آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

اس نے مارے باندھے شادی تو کرلی ہے' مگر تمام عمر اس رشتے کو تسلیم نہیں کرے گی اس کے دل میں آپ سے پہلے ہی کوئی اور بستا ہے وہ اسے دل سے کبھی نہیں نکالے گی۔ یعنی دوہری زندگی گزارتی رہے گی۔"

رنم سیال کی باتیں بجائے اسے تسلی دینے کے اور بھی پریشان کررہی تھیں' لیکن یہ بات تو طے شدہ تھی کہ وہ اس کے اس طرح یہاں آنے پر پریشان تھی۔ ڈھیروں مسڈ کالز اس کا ثبوت تھیں جبکہ زیان نے صرف ایک کال کی تھی ان باکس میں کوئی پیغام نہیں تھا اس کا۔

"مجھے گھر جاکر زیان سے اس معاملے پہ بات کرنی چاہیے۔ میں یہاں کیا اکیلا اپنی ہی آگ میں جل رہا ہوں۔ مجھے بات کرنی چاہیے سب صاف کرنا چاہیے۔" عقل نے اسے راستہ دکھایا تھا۔ اس نے اٹھ کر کپڑے تبدیل کیے اور تیار ہوکر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے مطلوبہ وقت سے آدھے گھنٹے پہلے ہی حویلی پہنچ گیا تھا۔ صد شکر کہ کسی سے اس کا سامنا نہیں ہوا ورنہ اس کا چہرہ بہت کچھ بتانے کے لیے کافی تھا۔ وہ زیان کو ڈھونڈتا سٹنگ روم میں آیا۔ وہاں زیان تو نہیں البتہ رنم سیال بیٹھی کسی سے فون پہ بات کررہی تھی۔

"ییک آپ آگئے تھینکس گاڈ۔ میں بہت اپ

سیٹ رہی ہوں۔ مجھے انفارم تو کردیتے۔" اس نے ایبک کو دیکھ کر فون بند کردیا تھا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ اپنائیت تھی۔

"مجھے اچانک جانا پڑ گیا تھا۔" اس نے سرسری انداز میں وضاحت کی۔

"مجھے پتا ہے آپ بہت اپ سیٹ ہو، لیکن ڈونٹ وری۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم اکیلے نہیں ہو۔" بلا کی بے تکلفی تھی اس کے لہجے میں۔ ایبک آپ سے تم ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی پریشانی میں زخم کی بے تکلفی نظرانداز کردی تھی۔

"میں جارہا ہوں بیڈ روم میں" آپ انجوائے کریں امی جان کے پاس بیٹھیں۔" ایبک لمبے لمبے ڈگ بھرتا اوپر آگیا۔

زیان بیڈ روم میں موجود تھی۔ ایبک اچانک کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے تاثرات بتارہے تھے کہ کوئی نہ کوئی طوفان آنے والا ہے۔ وہ بے پناہ سنجیدہ لگ رہا تھا۔

"زیان بیٹھو مجھے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرکے خود بھی بیٹھ گیا۔ اس نے خود کو پرسکون کرنے کے لیے پانی پیا اور بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ زیان سمجھ گئی تھی کہ اس نے کیا بات کرنی ہے۔

"مجھے معلوم ہے میرا آپ کے ساتھ شادی کا فیصلہ غلط ہے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ رشتہ طے کرتے وقت آپ کی مرضی معلوم نہیں کی گئی یہ بڑی غلطی تھی، مگر نہ جانے رشتہ ہونے سے لے کر شادی کے درمیانی عرصے تک میں یہی سمجھتا رہا کہ آپ مجھے پسند کرتی ہیں۔ ورنہ پہلے میں نے سوچ رکھا تھا آپ کو سوچنے کا ٹائم دوں گا شادی لیٹ کروں گا تاکہ آپ ذہنی اور جذباتی طور پہ آمادہ ہوجائیں، لیکن وہ میری غلطی تھی، میں مانتا ہوں اور شادی کے دن ہی میں نے آپ کا رویہ محسوس کرلیا تھا۔ میں آپ کے کہے بغیر جان گیا آپ کو کم سے کم مجھے تو بتانا چاہیے تھا کہ شادی میں آپ کی رضامندی شامل نہیں ہے۔

آپ کسی اور کے ساتھ وابستہ رہیں کچھ دن پہلے تک ہرگز مجھے علم نہیں تھا۔ آپ صرف ایک بار مجھے بتادیتیں تو میں آپ کو، آپ کے گھر واپس بجھوا دیتا، لیکن ابھی بھی دیر نہیں ہوئی ہے وہاب آپ کا انتظار کررہا ہے۔" زیان بڑے تحمل سے اس کی ایک ایک بات، ایک ایک لفظ، ایک ایک فقرہ سن رہی تھی آخر میں اسے رہا نہیں گیا وہ بول ہی پڑی۔

"آپ میرے مستقبل کا فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں اور میں اپنے گھر میں ہی ہوں۔ مجھے اور کہیں نہیں جانا۔ مجھے کیا کرنا ہے، میں جانتی ہوں میں کوئی مٹی کا کھلونا نہیں ہوں جسے آپ اپنی مرضی کا روپ دینے پہ تل گئے ہیں۔ میری ایک اپنی شخصیت ہے، اپنا نام ہے، میں اپنے فیصلے خود کرتی ہوں۔ کون میرا انتظار کررہا ہے، کون نہیں، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ مجھے اپنی ذات سے غرض ہے بس۔ باقی دنیا کا ٹھیکا میرے ذمے نہیں ہے۔" وہ بری طرح بپھری ہوئی تھی۔ ایبک جو یہ سوچ کر آیا تھا کہ وہاں روتی دھوتی، صفائیاں دیتی زیان ملے گی اس کی جگہ آگ بگولا بنی حسینہ سے ملاقات ہوئی تھی، وہ بھی حسینہ ایٹم بم سے۔

"میں تمہارے اور وہاب کے راستے سے ہٹ جاؤں گا۔"

"بڑی خوشی سے۔ لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ میں کسی وہاب کو نہیں جانتی۔ ایک وہاب تھا روبینہ آنٹی کا بیٹا، لیکن مجھے کبھی بھی اس سے دلچسپی نہیں رہی اور نہ ہے۔ آپ چاہیں تو بوا اور زرینہ آنٹی سے تصدیق کرسکتے ہیں وہ آپ کو سب کچھ بتائیں گی، لیکن خدارا مجھے میری نظروں میں مت گرائیں، میں نے صاف ستھری لائف گزاری ہے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔ سر اٹھا کر۔۔۔ اور میرا یہ اٹھا سر کوئی نہیں جھکا سکتا ایک چھوڑ دس وہاب آجائیں۔ آپ کو ہیرو بننے کا شوق ہے تو شوق سے فضول قربانیاں دیں، لیکن مجھے کسی کے ساتھ انوالومت کریں۔" زیان کا غصہ بولتے بولتے کافی کم ہوگیا تھا۔

ایبک نے مکمل توجہ کے ساتھ اسے گرجتے برستے دیکھا۔ یہ انداز محبت میں چوٹ کھائی ہوئی زبردستی شادی کی جانے والی لڑکی کا تو نہیں تھا۔ یہ تو اپنی انا اور عزت نفس کو بچانے والی عزیز رکھنے والی کا تھا۔ جس کے لیے اس کا پندار اور نسوانی غرور سب سے بڑھ کر تھا۔ اس کے بعد ایبک کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔

✡ ✡ ✡

زیان نے آنا" فانا" بوا کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی ایک ہی رٹ تھی مجھے کچھ دن کے لیے بوا کے ساتھ جانا ہے۔ عنیزہ اسے بوا کے ساتھ بھیجنے کے حق میں نہیں تھیں۔ پہلے ہی وہ اس گھر سے بہت دکھ اٹھا چکی تھی۔ عنیزہ وہاب کی طرف سے بھی ڈری ہوئی تھیں اور سب سے بڑھ کر بوا اسے ساتھ نہیں لے جانا چاہ رہی تھیں۔

"تم اب شادی شدہ شوہر والی ہو۔ اپنے گھر میں رہو ہنسی خوشی۔" انہوں نے رسان سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"بوا میں تو صرف کچھ دن کے لیے آپ کے ساتھ جا کر رہنا چاہ رہی تھی۔" وہ نروٹھے پن سے گویا ہوئی۔

"بوا کو بہت جلدی ہم یہاں لے آئیں گے کیوں بوا؟" عنیزہ نے تائید چاہنے والے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

"میں چھوٹی دلہن کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی نا اور زیان بھی بہت پیاری ہے مجھے۔ میں مہینے دو مہینے میں ملنے آ جایا کروں گی۔ ناراض مت ہونا۔" زیان کو بوا کی وفاداری پہ پیار آگیا کون کسی کے ساتھ اتنا مخلص ہو سکتا تھا جتنی بوا ان کے خاندان کے ساتھ تھیں۔

"ٹھیک ہے بوا جیسی آپ کی خوشی۔ ورنہ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں اور باقی زندگی آرام سے گزاریں؟"

"میں بہت خوش باش ہوں وہاں سب کے ساتھ۔" بوا نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔

"بوا میں کچھ دن کے بعد آؤں گی آپ سے ملنے۔"

"ہاں اپنے شوہر کے ساتھ آنا۔" جاتے جاتے انہوں نے پھر نصیحت کی تو زیان بے بس سی ہنس دی۔

✡ ✡ ✡

زیان نے براہ راست ملک جہانگیر سے بات کی۔ وہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا چاہ رہی تھی۔ داخلے کی آخری تاریخ میں چند روز ہی باقی تھے۔ ملک جہانگیر نے اسے بخوشی اجازت دے دی تھی' لیکن افشاں بیگم کو دال میں کچھ کالا لگ رہا تھا۔ ایبک شہر میں تھا۔ رنم بھی اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔ وہ دعا کر رہی تھیں کہ اب وہ ان کے گھر میں واپس نہ آئے' لیکن حیرت انگیز طور پہ خلاف توقع وہ ایبک کے ساتھ تیسرے دن ہی لوٹ آئی۔ وہ سارا سارا دن ایبک کے ساتھ مصروف رہتی۔ وہ یہاں ایک چھوٹا سا اسپتال بنوانا چاہ رہی تھی۔ ملک ایبک نے اسپتال کے لیے اسے مفت زمین اپنے پاس سے دی تھی۔ اب وہ دونوں دن رات اسی میں لگے ہوئے تھے جبکہ زیان یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے پہ تل گئی تھی۔ ملک ارسلان ایڈمیشن فارم لے کر جمع بھی کروا آئے تھے کیوں کہ ایبک ان دنوں بہت مصروف تھا۔

ایبک کو تو زیان کی سرگرمیوں کی فکر ہی نہیں تھی۔ ادھر وہاب نے بھی کچھ دنوں سے چپ سادھ رکھی تھی۔ اس نے رنم کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ترنگ میں اس نے زیان کے سامنے کیا کچھ اگل دیا ہے ورنہ اپنے وعدے کے مطابق وہ باقی پیسے اسے ہرگز نہ دیتی۔ جب ایبک طلاق نامہ سائن کر کے زیان کے حوالے کر دیتا تو رنم اسے باقی پیسے بھی دے دیتی۔ وہاب اس کی جذباتی کمزوری سے خوب فائدہ اٹھا رہا تھا' لیکن وہ اب چڑنے لگی تھی۔ وہاب کے ساتھ ملک ایبک کی ملاقات کو اتنے دن ہو گئے تھے' لیکن ابھی تک اس ملاقات کے ویسے نتائج سامنے نہیں آئے تھے جیسے وہ توقع کر رہی تھی۔

اس نے اسپتال کا نقشہ بھی منظور کروالیا تھا۔ ایک کے ساتھ باہر دھوپ میں گھوم گھوم کر اس کی سرخ و سفید رنگت جھلسنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کے شوق میں وہ اس کے ساتھ گھنٹوں دھوپ میں جلتی۔ وہ روز اسکول کی تعمیر کا جائزہ لینے آتا۔ ٹھیکے دار اور مستریوں کے ساتھ مغز ماری کرتا پھر وہ انڈسٹریل ہوم کا بھی چکر لگاتا۔ کبھی تعمیراتی سامان آرہا ہے تو وہ بھاگ بھاگ کر ادھر جارہا ہے۔ کوئی چیز کم پڑگئی ہے تو وہ بھی اس کی دردسری۔

رنم سیال تو مرجھا کر رہ گئی تھی۔ اس تگ و دو کا پھل یا صلہ اسے ابھی تک ملا نہیں تھا۔ کیوں کہ وہ ایک تک نہ تو حال دل پہنچاپائی تھی اور نہ ہی اس کے منصوبے کے مطابق اس نے زیان کو طلاق دی تھی اگرچہ دونوں میں تعلقات سردمہری کا شکار تھے۔ کیوں کہ ایک کے منہ سے کوئی نہ کوئی ایسی بات اس کے سوال کے جواب میں منہ سے نکل ہی جاتی تھی جس سے وہ واقف ہونے کے چکر میں مری جاتی۔ وہ بس اس کے ساتھ ہوتا تو ہر ٹائم اپنے پراجیکٹس کی باتیں کرتا۔ جیتی جاگتی رنم گویا اسے نظر ہی نہ آتی۔

☼ ☼ ☼

اب ہم نے کسی سے کچھ نہیں کہنا ہے
بھلے ہمیں زخم لگ جائے
بھلے وہ عمر بھر سیل نہیں پائے
ہمیں خاموش رہنا ہے
اب ہمیں کسی سے کچھ نہیں کہنا ہے
ہم نے رو کے دیکھا ہے
ہم نے شور مچا کے دیکھا ہے
اپنے زخم دکھا کے دیکھا ہے
پر ہوا کچھ نہیں حاصل
اب ہمیں کسی سے کچھ نہیں کہنا ہے
تمہیں گر یاد ہو تو
ہم نے تمہیں قصہ سنایا تھا
اپنا درد بتایا تھا
تم ہی بھر
عمر کے کرب کے مداوا بنے تھے
جلتے زخموں کی دوا بنے تھے
اور پھر!!!
ذرا جو وقت گزرا تو
زمانے کے چلن میں ڈھل گئے تم بھی
وقت کے ساتھ بدل گئے تم بھی
تمہیں تو بہت
زمانہ شناسی کا دعوا ہے
پھر کیوں نہ پہچان پائے تم
ہمیں کیوں نہ جان پائے تم
اب ہمیں تم سے کچھ نہیں کہنا ہے
ہمیں خاموش رہنا ہے
سب آنسو پی کے
سب زخم سی کے

زیان کا ایڈمیشن ہوگیا تھا۔ اس کی رہائش یونیورسٹی ہوسٹل میں ہی تھی زیان جارہی تھی۔ افشاں بیگم بری طرح تپی ہوئی تھیں۔ وہ دندناتی ہوئی غصے میں عنزہ کے پاس آئیں۔ انہوں نے غالباً" پہلی بار افشاں بھابھی کو اس طرح غصے میں دیکھا تھا۔

"بھابھی کیا بات ہے کیا ہوا ہے؟" انہوں نے ہولتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

"ہونا کیا ہے میرے بیٹے کو سوشل ورک سے فرصت نہیں اور زیان گھر سے ہی جارہی ہے۔ کسی کو کوئی فکر ہی نہیں ہے سب آنکھیں بند کرکے بیٹھے ہیں اور وہ جو موئی رنم میرے گھر میں ڈیرا ڈال کر بیٹھ گئی ہے کوئی پروا نہیں کسی کو۔ ارے میرا گھر اجڑ رہا ہے۔"

"اللہ نہ کرے بھابھی کہ آپ کا گھر اجڑے۔ آپ بیٹھیں میں پانی دیتی ہوں آپ کو۔" عنزہ نے ہاتھ کا دباؤ ڈال کر انہیں پاس پڑے صوفے پہ بٹھادیا۔ پانی پی کر ان کے حواس تھوڑے بحال ہوئے۔

"جب سے رنم یہاں آئی ہے میرے گھر کا سکون غارت ہوگیا ہے۔ ملک صاحب سے کچھ کہتی ہوں تو وہ

میری بات کو مذاق میں اڑا دیتے ہیں۔ ایبک سارا دن اس پر کٹی لومڑی کے ساتھ غائب رہتا ہے اور ذیان اسے پوچھتی ہی نہیں۔" پر کٹی لومڑی کی اصطلاع پہ عنیزہ کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

"وہ اس کے لیے میدان کھلا چھوڑ کر خود بھاگ رہی ہے یونیورسٹی۔ آجائے معاذ اس سے بات کرتی ہوں۔ وہی میرا دکھ سمجھتا ہے۔ باقی سب اندھے گونگے اور بہرے بنے ہوئے ہیں۔" افشاں بیگم ایک بار پھر اشتعال میں آرہی تھیں۔

"بھابھی ذیان اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہے باقی باتیں پریشان کن ہیں۔ آپ ایبک سے خود بات کریں یا میں ارسلان صاحب سے کہوں گی۔" عنیزہ کو ذیان نے یہی بتایا تھا کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہے۔ باقی اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ عنیزہ نے اسی حوالے سے بات کی تھی۔ باقی قصے کا انہیں علم ہی نہیں تھا۔ افشاں بیگم جوں جوں بتاتی جارہی تھیں توں توں ان کی فکر بڑھتی جارہی تھی۔ ذیان نے ان تمام باتوں کی انہیں ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔

انہوں نے اپنے تئیں فرض کرلیا تھا کہ وہاب والا قصہ بھی دفن ہوچکا ہے۔ ذیان کس عذاب سے گزر رہی ہے اس کا احوال اس کے چہرے اور آنکھوں میں رقم نہیں تھا۔

"مجھے رنم سیال کو اپنے گھر سے دفعان کرنا ہے۔ نوکرانیاں تک اس کے کرتوت سے واقف ہوگئی ہیں آنکھوں آنکھوں میں میرے بچے کو کھانا چاہتی ہے۔" رنم سیال محویت سے ایبک کو تکتی تھی جسے افشاں بیگم نے آنکھوں آنکھوں میں کھانے سے تشبیہ دی تھی۔

"ذیان سے کہو ایبک کو ڈھیلا مت چھوڑے۔" عنیزہ سر ہلا کر رہ گئیں۔

ساتھ والے روم میں موجود ذیان ان دونوں کی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن چکی تھی۔ ایبک کو تو بس اس پہ فرد جرم عائد کرنی تھی اس کے بعد اس کی بلا سے وہ جو چاہے کرتی پھرے۔ ملک ارسلان نے یونیورسٹی میں اس کا ایڈمیشن کروایا تھا۔

وہ تیاری مکمل کرکے گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ ادھر اس کی گاڑی گیٹ سے باہر نکلی۔ ادھر ایبک کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ ایبک اسے دیکھ چکا تھا۔ ایبک کے ساتھ بیٹھی رنم سیال کو بھی ذیان نے جی بھر کر دیکھا تھا۔ کس استحقاق اور دھڑلے سے وہ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ ذیان کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ اس نے چاہنے کے باوجود پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

ایبک کے ساتھ ایک گھر میں ایک چھت تلے رہتے ہوئے اس درد کو برداشت کرنا کتنا مشکل تھا جو آج کل وہ سہہ رہی تھی۔ رنم سیال کی نگاہیں والہانہ ایبک کا طواف کرتیں وہ صبح سے شام تک باہر اس کے ساتھ رہتی۔ گھر آکر بھی وہ ایبک کے ساتھ لگی رہتی۔ ادھر وہاب نے اسے طلاق کی خوش خبری سنائی تھی۔ معاذ اور وہ دونوں کسی نتیجے پہ پہنچنے کے انتظار میں تھے۔ آج کل معاذ کے ساتھ بھی اس کا رابطہ کم کم تھا۔

☼ ☼ ☼

گاڑی رکتے ہی ملک ایبک لمبے لمبے ڈگ بھرتا افشاں بیگم کی طرف آیا۔ اس نے ذیان کو گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔ ایسے تو وہ کہیں بھی نہیں جاتی تھی ہمیشہ گھر کے افراد میں سے کوئی نہ کوئی اس کے ساتھ ہوتا۔

"امی جان ذیان کہاں گئی ہیں؟" اس کے لہجہ میں بے قراری تھی۔

"بیوی تمہاری ہے وہ اور پوچھ مجھ سے رہے ہو۔ ویسے آج اس کا خیال کیسے آگیا ہے تمہیں۔ تم سوشل ورک کرو۔ انسانیت کے درد بانٹو اور وہ یونیورسٹی میں پڑھنے جائے۔" افشاں بیگم نے اپنی توپوں کا رخ سیدھے سیدھے اس کی طرف کیا تو وہ بوکھلا سا گیا۔

"اپنے گھر کی خبر لو۔ تمہیں ہوش ہو تب نا۔" اس کے پیچھے آتی رنم پہ انہوں نے ترچھی نگاہ ڈالی اور مڑ کر چلتی بنیں۔ ایبک بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ رنم سیال نے اس کے کندھے پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

"تمہاری وائف تمہیں بتائے بغیر چلی گئی۔ ویٹس امیزنگ۔ دس از ناٹ فیئر۔" اس کے لہجہ میں مصنوعی تاسف تھا جبکہ اندر سے اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ ایبک نے اپنے کندھے پہ رکھے اس کے ہاتھ کو ہٹا دیا۔ ایک ثانیے کے لیے وہ شرمندہ ہوئی پھر نارمل ہو گئی۔

"ایبک چلو شہر چلیں۔ کسی اچھے ریسٹورنٹ میں لنچ کریں گے۔ رات میں بھی پاپا کے پاس رکوں گی کل آجائیں گے۔"

"نہیں نہیں جاسکتا بزی ہوں۔" ایبک نے کنپٹی مسلتے ہوئے کہا۔ اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔

"اوکے تم ریسٹ کرو۔" اس نے فراخدلی سے کہا۔

☆ ☆ ☆

وہ ریسٹ کرنے کے لیے لیٹا تھا کہ شاید لحہ بہ لحہ بڑھتے سر درد سے نجات مل جائے، مگر درد اور سوچیں بڑھتی جارہی تھیں۔ زیان نے اسے بتائے بغیر یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا کم از کم وہ اسے بتاتی تو سہی۔ وہ خود اسے ساتھ لے جاتا ایڈمیشن کرواتا۔ وہ ضدی اور خود سر لڑکی اس کی مانتی کہاں تھی۔ اوپر سے امی جان نے بھی اس پہ چڑھائی کردی تھی۔ ایبک کو نیند ہی نہیں آرہی تھی۔ کچھ منٹ کے لیے اس کی آنکھ لگی تھی کہ باہر سے آتی تیز تیز آوازوں سے کھل گئی۔ وہ اٹھ کر ٹیرس کی طرف آیا اور نیچے آواز کے مرکز کی طرف دیکھا۔ وہاں معاذ موجود تھا حسب معمول شور مچاتا ہنستا مسکراتا۔ وہ امی جان اور پاپا سے مل رہا تھا پاس ہی بیگز اور سوٹ کیس پڑے تھے وہ یقیناً ابھی ابھی آیا تھا۔ ایبک نیچے اتر آیا۔

"تم نے اپنے آنے کی اطلاع ہی نہیں دی میں خود ایئر پورٹ پہ ریسیو کرتا تمہیں۔" اس سے گلے ملتے ایبک نے شکوہ کیا۔

"سنا ہے لوگ آج کل اپنے مہمان کے ساتھ بہت بزی ہیں اس لیے میں نے سوچا آپ کو اپنے مہمان کی ناز برداری میں مگن رہنے دوں۔" معاذ نے انتہائی لطیف انداز میں اس پہ چوٹ کی ایبک کچھ بول ہی نہ پایا۔ پہلے امی جان اور اب یہ معاذ... معاذ امی جان کو بازو کے گھیرے میں لیے آگے کی طرف جا رہا تھا جب اچانک ایک کمرے سے رنم برآمد ہوئی۔

معاذ افشاں بیگم کے کندھے پہ رکھا ہاتھ ہٹاتا بڑے پرجوش انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

"اوہ مس نہنال۔ یہ آپ ہیں میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ آپ اتنی زیادہ چینج ہو گئی ہیں قمیص شلوار سے ٹاپ اور ٹراوزر پہ آگئی ہیں۔ سبحان اللہ! کیا ترقی کی ہے آپ نے۔ دوپٹا بھی غائب کر دیا ہے۔" رنم اس کے پے در پے جملوں سے بوکھلائی جا رہی تھی۔

"معاذ یہ نہنال نہیں، رنم سیال ہیں ابو کے دوست احمد انکل کی بیٹی۔" ایبک نے معاذ کو ٹوکتے ہوئے اس کا تعارف کروایا تو رنم کی جان میں جان آئی۔

"کیوں مذاق کر رہے ہیں آپ۔ یہ نہنال ہیں مس نہنال۔ لباس بدلنے سے شخصیت بدل نہیں جاتی۔" پے در پے جملوں سے رنم کا اعتماد خوف بن کر ڈھے گیا تھا۔ نہنال کہہ کر مخاطب کیے جانے پہ معاذ نے اس کا رکنا اور چونکنا واضح طور پہ محسوس کیا تھا۔ معاذ سے وہ ویسے بھی خائف رہتی تھی وہ رنگ میں بھنگ ڈالنے پھر آپہنچا تھا۔

ملک ایبک چھوٹے بھائی کو رنم سیال کے بارے میں بتا رہا تھا۔ معاذ کو دیکھ کر رنم کمرے میں جاچکی تھی۔ اس کا سامنا کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ مستقل طور پہ واپس آگیا تھا۔ رات کے کھانے کے لیے نوکرانی اسے بلانے آئی تو رنم نے بھوک نہ ہونے کا عذر کر کے دروازہ بند کر لیا۔

☆ ☆ ☆

معاذ کھانے کے بعد دیر تک ایبک کے پاس بیٹھا رہا۔ زیان نے یونیورسٹی میں ایبک کو بتائے بغیر ایڈمیشن لیا تھا اس کے اس اقدام سے معاذ کو اس کی بے وقوفی پہ تاؤ آیا تھا۔ معاذ زیان اور ایبک کی وجہ سے بغیر بتائے اچانک واپس آیا تھا۔ اس معاملے میں خود کو، جان کر

بھی مزید لاعلم رکھنا حماقت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے براہ راست بھائی سے اس موضوع پہ بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

معاذ نے سب سے پہلے اسے وہاب کی کال ریکارڈنگ سنوائی۔ سنتے سنتے ایبک کے چہرے کا رنگ بدلتا جارہا تھا۔

"یہ تم تک کیسے پہنچی؟"

"زیان بھابھی کی مہربانی سے۔ اب آپ خود فیصلہ کریں کہ یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔ میں بابا جان کے ساتھ احمد انکل کے گھر گیا تو وہاں ان کی بیٹی کے فوٹوگرافس دیکھ کر چونک گیا۔ ملک محل میں آکر میں نے اشاروں سے جب نمناں سے کسی لڑکی کی مشابہت کا ذکر کیا تو وہ چونک گئی۔ میں نے بہت سے مواقع پہ اس کی گھبراہٹ نوٹ کی۔ میں نے اسے عنیزہ چچی اور ارسلان چچا کی باتیں چھپ چھپ کر سنتے دیکھا۔ زیان بھابھی کے لیے اس کی نفرت نوٹ کی۔ پھر اس کی پراسرار گمشدگی اور وہاب کا ٹپکنا۔ احمد انکل کی بیٹی کا حویلی میں نزول۔ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں نہیں ہیں۔" وہ تائید چاہ رہا تھا۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

"بھائی جان کامن سینس کی بات ہے کوئی آپ کو اور بھابھی کو کیوں الگ کروانا چاہ رہا ہے۔ کس نے وہاب کو پیسے دیے ہیں وعدے پہ۔ نمناں اور رنم کا راز کیا ہے۔ اس سے کون پردہ اٹھا سکتا ہے' میں ان سب سوالوں کے جواب جان کر رہوں گا۔"

"تم کیا کرو گے؟"

"میں احمد انکل کے پاس جاؤں گا۔ ان سے پوچھوں گا اور آپ نے بھابھی کو کیوں جانے دیا۔ آپ ان کی طرف سے اتنے لاپروا ہو گئے ہیں۔" وہ پھر سے زیان کے ایڈمیشن والے واقعے کی طرف آگیا تھا۔

"معاذ وہاب نامی یہ شخص یہاں مجھ سے بھی ملنے آیا تھا۔ اس نے زیان کے ماضی کے حوالے سے بہت سی باتیں کیں۔ وقتی طور پہ میں تھوڑی دیر کے لیے منفی انداز میں سوچنے لگا تھا' لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں نے کوئی منفی قدم نہیں اٹھایا۔

"بھائی جان ہر رشتہ اعتبار مانگتا ہے۔ جب اعتماد اور اعتبار دم توڑ جائے تو رشتہ بھی دم توڑ جاتا ہے۔ انسان دل میں ہی رشتوں کا قبرستان بنالیتا ہے۔ زیان بھابھی نے اپنے فادر کے گھر سوتیلی ماں کے ساتھ بہت مشکل میں زندگی گزاری ہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور خواہشات تھیں جو باوجود کوشش کے بھی پوری نہ ہو سکیں۔ لاشعور میں دبی لاحاصل تمناؤں نے انہیں اذیت پرست بناڈالا' وہ تلخ ہوتی گئیں۔ ان کے دل میں بہت سی غلط فہمیاں تھیں جو یہاں آنے کے بعد آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئیں۔

بھابھی بہت زود رنج اور حساس ہیں' آپ کو اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ زیان بھابھی اور میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ ایک قریبی دوست کی طرح مجھ سے سب کچھ شیئر کرتی ہیں۔ ان کی نظر میں' میں نے یہ اعتبار محنت سے قائم کیا ہے ورنہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو آسانی سے اپنی ذات کے اندر کسی کو جھانکنے تک نہیں دیتے۔ اس لحاظ سے میں خود کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں۔"

"واقعی معاذ تم خوش قسمت ہو۔ میں اس کے ساتھ اتنے قریبی رشتے میں منسلک ہوتے ہوئے بھی وہ کچھ نہ جان سکا جو مجھے جاننے کا حق تھا۔ اس نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔" وہ احساس زیاں میں گھرا ہوا تھا۔

"بھائی جان وہ کھونے کے احساس سے ڈرتی ہیں۔" معاذ نے بہت گہری بات کی۔

"معاذ اس طرح کے حالات میں کوئی بھی مرد بدگمانی کا شکار ہو سکتا ہے۔ میں انسان ہوں کوئی فرشتہ نہیں ہوں عام سا آدمی ہوں۔ میں نے جب اس سے بات کی تو وہ مجھے وضاحت دے سکتی تھی سب کچھ کلیئر کر سکتی تھی۔"

"بھائی جان جہاں محبت ہوتی ہے وہاں وضاحت کی کیا ضرورت۔ وہ سمجھتی ہیں کہ چونکہ وہ آپ سے محبت کرتی ہیں اس لیے انہیں کسی وضاحت یا صفائی کی

ضرورت نہیں۔"

ایبک کے لیے یہ انکشاف حیران کن تھا کہ وہ اسے محبت کرتی ہے۔ اس نے اپنے کسی عمل سے آج تک اظہار نہیں کیا تھا کہ وہ اس کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتی ہے۔ کتنی گہری تھی وہ۔ اور ایبک یہی سمجھتا رہا کہ زیان نے بحالت مجبوری اس کے ساتھ شادی کی ہے۔

"آپ محترمہ رنم صاحبہ کا بوریا بستر گول کریں۔ میں اپنی بھابھی کو اداس یا مایوس نہیں دیکھ سکتا۔ آپ وہاب پہ تھوڑا کام کریں، بہت سے باتیں اگلوا سکتے ہیں اس سے۔" معاذ نے مشورہ دیا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"میں ذرا بابا جان کے پاس جارہا ہوں ان کے علم میں یہ باتیں لانا ضروری ہیں۔"

ایبک نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ خوب صورت خیالوں کی رو میں بہتا ہوا بہت دور تک جاچکا تھا۔ یہ احساس ہی کیسا خوش کن اور جانفزا تھا کہ زیان اس سے محبت کرتی ہے۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں احمد کے پاس جانے یا پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ رنم جب گاؤں دیکھنے کے بہانے دوسری بار "ملک محل" میں آئی تو احمد نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔ کیوں کہ اس نے مجھے سب بتا کر پیشگی معذرت کرلی تھی۔ رنم ضد میں اپنی بات نہ مانے جانے پہ گھر سے نکلی تھی کہ ایک اتفاق کے تحت وہ ہوٹل میں ارسلان اور عنیزہ سے ٹکرائی وہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ یہاں کی مشکل زندگی اور بدلی ہوئی شخصیت کے ساتھ جینا رنم کو بہت دشوار لگا اور وہ لوٹ گئی۔

اس نے تسلیم کرلیا کہ وہ غلطی پہ تھی اس کے جذبات میں وقتی طور پہ ابال اٹھا تھا وہ ایسے نوجوان سے شادی کرے جو اسے بغیر جہیز اور مال و دولت کے قبول کرے۔ وہ سہولیات کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ لیکن احمد نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ رنم ایبک کو پسند کرنے لگی ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے چالیں چل رہی ہے۔ تمہاری ماں نے کتنی بار شکایت کی، لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس کا شک درست ہو سکتا ہے۔" بابا جان نے اس کی بہت بڑی پریشانی بیٹھے بٹھائے حل کردی ہے۔ وہ اسی لیے اطمینان سے بیٹھے تھے کہ احمد انکل نے انہیں سب بتا دیا تھا سوائے ایک بات کے۔ وہ باپ تھے اپنے منہ سے کیسے بتاتے کہ رنم ایبک کو پسند کرنے لگی ہے اسے حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ان کی خوش فہمی میں حالات اس نہج تک جاچکے تھے اور انہیں خبر ہی نہیں تھی۔

"بابا جان اس مسئلے کو کیسے حل کرنا ہے؟" معاذ امید افزا نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"دیکھو معاذ! احمد سیال میرا بہت اچھا دوست ہے' میں اس کی بیٹی کو براہ راست کچھ نہیں کہہ سکتا ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایبک خود رنم کی حوصلہ شکنی کرے۔ وہ ضدی اور جذباتی لڑکی ہے ایسا نہ ہو کچھ الٹا سیدھا کر بیٹھے۔ ویسے میں احمد کو شرمندہ نہیں کرسکتا۔ اللہ بھی تو عیب چھپانے والوں کو پسند کرتا ہے۔ باقی میں اس گھر کا سربراہ ہوں۔ میرے جیتے جی زیان کو کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وہ میری آنے والی نسلوں کی وارث ہے میری بہو ہے اسے کوئی ٹیڑھی نگاہ سے بھی دیکھے میں برداشت نہیں کروں گا۔" ملک جہانگیر کے انداز میں عزم تھا۔ معاذ نے ہولے سے سرہلایا۔

☼ ☼ ☼

معاذ اسے لینے کے لیے پہنچا ہوا تھا۔ پہلے تو وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئی پھر اس کے ساتھ لے جانے کے مطالبے پہ ناراض ہوگئی۔

"میں فی الحال گھر نہیں جاسکتی۔ میری پڑھائی ابھی ابھی اسٹارٹ ہوئی ہے سمسٹر کے اینڈ پہ چھٹیاں ہوں گی تو میں آجاؤں گی۔" اس نے روکھائی سے جواب دیا۔

"آپ یہاں پڑھائی کے چکر میں بیٹھی رہیں اور ادھر وہ آپ کے شوہر نامدار کو لے اڑے گی اس کے

ارادے بہت خطرناک ہیں۔" معاذ نے اسے ڈرانا چاہا پر وہ ذرا بھی مرعوب نہ ہوئی۔

"جو چیز آپ کے نصیب میں نہ ہو" آپ کچھ بھی کرلو آپ کو نہیں مل سکتی۔ تمہارے بھائی نے مجھے کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا اور فیصلہ سنا دیا۔ میں اس کے نکاح میں ہوں اور وہ مجھے کسی بے جان گڑیا کی مانند وہاب کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ میں اپنی قسمت کا فیصلہ خود کروں گی تم جاؤ اپنا وقت ضائع مت کرو۔" صاف لگ رہا تھا وہ اس کی بات نہیں مانے گی۔ واپسی کے لیے مڑتے معاذ کے قدم بہت مایوس اور ست تھے۔

☼ ☼ ☼

ایبک نے گھر سے غائب رہنا شروع کردیا تھا۔ رنم کال کرتی تو وہ ریسیو نہ کرتا۔ اب کسی جگہ وہ اسے ساتھ لے جانے سے احتراز کرتا۔ ہفتے بھر میں ہی رنم بور ہوگئی۔ اور پاپا کے پاس آگئی۔ وہ اسے دیکھ کر کھل اٹھے۔

"اب میرے پاس رہو۔ مجھے تمہاری کمپنی چاہیے۔ بوڑھا آدمی ہوں۔ جانے کب بلاوا آجائے۔"

"پاپا پلیز ایسی باتیں مت کریں مجھے ڈر لگتا ہے۔" وہ ناراض ہوگئی۔

"اپنا بچھڑنا زندگی کا حصہ ہے یہ حقیقت ہے۔"

"پاپا مجھے آپ سے نہیں بچھڑنا۔" وہ ضدی بچکانہ لہجہ میں گویا ہوئی۔

"ارے ہاں یاد آیا فراز تین چار بار تمہارا پوچھنے آچکا ہے۔"

"کیوں آیا ہے وہ یہاں؟" وہ غصے سے بولی۔

"ارے ملنا چاہ رہا تھا تم سے۔ تم لوگ اچھے دوست رہ چکے ہو۔" انہوں نے اسے کچھ یاد کروانے کی کوشش کی۔

"پاپا میں جب اس سے ہیلپ مانگنے اس کے پاس گئی تو اس نے میرے ساتھ بلف کیا۔ فوراً" آپ کو کال کرکے بتادیا کہ میں اس کے گھر میں ہوں۔" وہ ابھی تک پرانی ناراضی دل میں رکھے بیٹھی تھی۔

"اس نے تمہارے ساتھ بلف نہیں کیا بلکہ بھلائی کرنے کی کوشش کی تھی۔ تم ہمیشہ سے بے وقوف رہی ہو۔"

"ہاں پاپا آپ نے میری ذہانت کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔" اس نے منہ بسورا۔

"اور تمہارا کمپلیکشن ——— کتنا ڈارک اور ڈل ہو رہا ہے بالوں کا بھی یہی حال ہے میرے بچے۔" احمد سیال نے اسے غور سے دیکھا تو اس کے سراپے میں آنے والی تبدیلیاں فوراً" نوٹ کرلیں۔

"پاپا میں دھوپ میں گھومتی پھرتی رہی ہوں نا اس لیے۔"

"تم گھر بیٹھو ایڈمیشن لو اپنی پڑھائی اسٹارٹ کرو۔ یہ گاؤں میں سوشل ورک کرنا تمہاری صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔ دیکھو آئینے میں خود کو۔" پاپا نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کر شیشے کے سامنے کھڑا کردیا۔ وہ کتنی کمزور اور روکھی پھیکی سی لگ رہی تھی۔ جلد بھی عجیب بدرنگ اور ڈل نظر آرہی تھی۔ وہ خود کو غور سے دیکھ کر ڈر سی گئی۔

"میں آج ہی سیلون جاتی ہوں۔" اس نے فوراً" پروگرام بنایا۔

رنم نے پورا ہفتہ پارلر میں اپنا حلیہ اسکن اور بال ٹھیک کروانے میں لگایا تھا۔ اسے واپس آئے چوتھا دن تھا جب فراز سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ برابر اسے ملنے کے لیے آرہا تھا پر وہ گھر نہیں ہوتی تھی آج شومئی قسمت اس کی شکل دیکھنے کو ملی تھی۔ فراز اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

"رنم یہ تم ہی ہو یا تمہاری فوٹو کاپی ہے۔"

"کیا ہوا ہے مجھے؟" اس نے ایک دم اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرا تھا۔ اس وقت وہ بھول بیٹھی تھی کہ وہ فراز سے ناراض ہے۔

"تم ایک دم تبدیل ہوگئی ہو۔ کہاں گئی وہ لڑکی جو محفلوں اور پارٹیز کی جان تھی اتنی ڈل اور اوڈ لگ رہی

ہوئی سنائی دے رہی تھی۔" فراز نے اسے چھیڑا تو وہ بدک گئی۔

"میں گاؤں میں سوشل ورک کر رہی ہوں نا۔" اس نے جیسے خود کو بہلایا۔

"سوشل ورک کرنا ہے تو اپنے شہر میں کرو۔ گاؤں میں مارے مارے پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دیکھو تو اپنا حلیہ۔ بالکل مڈل کلاس کی عورت لگ رہی ہو۔"

اف یہ طعنہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ تو ایبک کی خاطر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر شہر سے گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ وہاب کو پیسے دے کر ایبک کو زیان کی طرف سے بدگمان کروا کے طلاق دلوا دے گی اور پھر آرام سے اس کی شادی ایبک کے ساتھ ہو جائے گی، لیکن یہ تو بہت مشکل تھا وہ ایبک کے طلاق دینے تک گاؤں میں رکتی تو اس اسٹائلش پرسنالٹی کا کباڑا ہو جاتا جیسے ابھی ہو رہا تھا۔

رنم نے اس دن فراز کے ساتھ اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ سے ڈنر کیا بعد ازاں وہ اسے لانگ ڈرائیو پہ لے گیا۔ وہ بہت آرام سے گاڑی چلا رہا تھا۔

"رنم میں تم سے آج کچھ کہنا چاہتا ہوں اسے پہلے کہ دیر ہو جائے۔" فراز کا انداز بہت خاص تھا۔ رنم جو شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی ایک دم رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں بولو۔"

"رنم آئی لو یو۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جب تم مدد مانگنے میرے پاس آئی تھیں تو میں اسی وقت تم سے یہ بات کہنا چاہتا تھا، لیکن میری بزدلی نے اجازت ہی نہیں دی۔ تم جس نوجوان کو ڈھونڈ رہی تھی وہ میں بھی تو ہو سکتا ہوں۔ میں تمہیں بغیر جہیز کے تمہارے پاپا کی حیثیت کے بغیر قبول کر سکتا ہوں میرے کہنے کا مطلب ہے کہ تم کچھ بھی مت لے کر آنا پھر بھی میں تم سے شادی کر لوں گا۔" رنم کی آنکھوں میں اچانک آنسو آ گئے تھے۔

"فراز تم یہ بات اس وقت بھی تو بول سکتے تھے نا جب میں گھر چھوڑ کر تمہارے پاس آئی تھی۔ تمہیں پتا بھی نہیں ہوگا کہ میں نے گاؤں میں کیسی زندگی گزاری ہے۔ یہ چند ماہ جو میں نے پاپا سے تم سب سے دور رہ کر گزارے کتنے ہارڈ تھے تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہاں مجھے بے آسرا بے سہارا لڑکی کا ٹائٹل ملا تھا۔ میری قسمت اچھی تھی جو اللہ نے مجھے اچھے لوگوں سے ملوایا۔ تمہیں پتا ہے میں جہانگیر انکل کے گھر رہی ہوں وہی پاپا کے دوست۔" وہ روتے روتے بتا رہی تھی۔ فراز نے گاڑی ایک ذیلی سڑک پہ موڑتے ہوئے روک دی تھی اس نے ٹشو پیپر باکس سے ٹشو پیپرز نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

"ہاں احمد انکل مجھے بتا چکے ہیں۔ سوری میں نے تمہیں ہرٹ کیا۔" فراز نے معذرت کی۔

"تو تم مجھے آفیشلی پرپوز کر رہے ہو؟" اس نے بے یقینی سے فراز کو دیکھا۔

"ہاں! میں تمہیں پرپوز کر رہا ہوں۔ تمہیں اعتراض نہ ہو تو میری فیملی تمہارے گھر آئے؟"

"ہاں میں سوچوں گی۔" وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں اس کا فیصلہ چھپا ہوا تھا۔ فراز کے اظہار نے اسے شانت کر دیا تھا۔

گھر جا کر اس نے پاپا کو بڑی بے تکلفی سے فراز کے ساتھ ہونے والی باتیں بتائیں۔ وہ خوش نظر آ رہی تھی۔ یعنی اس نے فراز کو قبول کر لیا تھا۔ احمد سیال کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ تھوڑے دن میں ہی گاؤں سے اکتا جائے گی۔ اس لیے انہوں نے اسے اجازت دے دی تھی۔ وہ ایبک پہ اپنا حق جتا رہی تھی انہیں علم تھا کہ یہ سب وقتی ہے کیوں کہ وہ مشکلات برداشت کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ کہاں وہ ایبک کی حصول کے لیے مری جا رہی تھی اور اب فراز کے پرپوزل کے آگے ڈھیر ہو گئی تھی۔ رنم سیال کے بارے میں وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ حیران کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھی کسی وقت کہیں بھی کچھ بھی کر سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

فراز کے پرپوزل نے رنم سیال کو ایبک اور گاؤں،

سوشل ورک سب کچھ بھلا دیا تھا۔ وہ ایبک کے ساتھ گاؤں میں صحت کی سہولتوں کی دستیابی کے لیے اسپتال بنوانا چاہ رہی تھی۔ ایبک نے اسپتال کے لیے اسے مفت زمین فراہم کی تھی۔ اس کا نقشہ بھی منظور ہوچکا تھا۔ فراز سے ملاقات سے پہلے تک اس کا ارادہ برقرار تھا۔ اسپتال کے لیے تعمیراتی سامان کی لاگت ایبک نے ٹھیکے دار سے معلوم کرلی تھی۔

اب تعمیراتی سامان آتا تو اسپتال کی تعمیر کا آغاز ہوتا۔ وہ بھول بھال گئی تھی حالانکہ صرف کچھ دن پہلے تک اس کا جوش وجذبہ برقرار تھا۔ اپنی افتادِ طبع کے ہاتھوں مجبور رنم سیال اسپتال ' سوشل ورک ' غریب اور غریب کے مسائل سب بھول گئی تھی۔ ایبک نے اس کی ذرہ بھر بھی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ وہ اسے بھول بھال کر فراز کے ساتھ محبت کے نئے سفر پہ گامزن تھی۔

فراز کی فیملی ان کے گھر آئی تھی۔

احمد سیال خوش تھے۔ انہیں رنم کا یہ کلاس فیلو پسند تھا۔ انہیں پوری امید تھی کہ فراز ' رنم سے شادی کے بعد اسے سنبھال لے گا اور اس کی غیر مستقل مزاجی کو ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔ احمد سیال نے فراز کے گھر والوں کو ہاں کردی تھی۔

رنم ' فراز کے ساتھ مارکیٹ کے چکر لگا رہی تھی۔ اسے منگنی پہ پہنا جانے والا ڈریس خریدنا تھا اسے کچھ پسند ہی نہیں آرہا تھا۔ راعنہ ' کومل ' اشعر ' تینوں دوست رنم سیال کی کایا پلٹ پہ حیران تھے کہاں تو وہ بغیر جہیز کے شادی کے لیے مری جارہی تھی اور اب منگنی کے فنکشن کے لیے اعلا سے اعلا انتظامات پہ زور دے رہی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی منگنی کا فنکشن شاندار اور یادگار ہو۔ سب برسوں یاد رکھیں ایک دوسرے کو بتائیں کہ رنم سیال کی منگنی کیسے شاندار طریقے سے ہوئی تھی اس نے کتنا مہنگا ڈریس اور جیولری پہنی تھی کھانا کتنا اچھا اور ذائقے میں لاجواب تھا۔

منگنی کے عام سے فنکشن کے لیے اتنے اعلا پیمانے پہ انتظامات ہو رہے تھے رنم کے قریبی دوستوں کو اندازہ تھا کہ رنم اور فراز کی شادی کیسی ہوگی۔ بے ہودہ نمائش اور پیسے کا زیاں۔ شان و شوکت کا مظاہرہ ' شو آف۔ سب یاد رکھیں گے کہ احمد سیال کی بیٹی جیسی شادی تو اب تک ان کے سرکل میں کسی کی بھی نہیں ہوئی ہے۔

رنم سیال کے دل سے غریبوں کا درد نکل چکا تھا۔ ملک ایبک بھی فراز کی آمد کے بعد نکل چکا تھا۔ کیوں کہ اسے پتا تھا ایبک نے اس کی محبت کو کسی صورت بھی قبول نہیں کرنا تھا۔

رنم سیال کی منگنی کا دعوت نامہ ٹیبل پہ پڑا تھا۔ احمد سیال خود ملک جہانگیر کے پاس آئے تھے۔ کہاں تو رنم ایسے نوجوان سے شادی کرنا چاہ رہی تھی جو اسے بغیر جہیز کے تین کپڑوں میں قبول کرے اور اب اس کی منگنی کا فنکشن فائیو اسٹار ہوٹل میں ہو رہا تھا۔ اس کا منگنی پہ پہنا جانے والا جوڑا ہی صرف لاکھوں روپے میں تھا۔ معاذ نے کارڈ دیکھ کر ہرے کا نعرہ لگایا۔

☼ ☼ ☼

معاذ کی شادی اس کی خالہ کی بیٹی سے ہو رہی تھی۔ وہ اعتدال کو شروع سے پسند کرتا تھا۔ کسی کو بھی اس رشتے پہ اعتراض نہیں تھا۔ بس شادی جلدی میں ہو رہی تھی کیوں کہ ملک جہانگیر کی طبیعت اچانک زیادہ خراب ہوگئی تھی۔ ذیان سب ناراضی بھلائے انہیں دیکھنے کے لیے گھر آگئی تھی۔ یہاں ملک محل بقعہ نور بنا ہوا تھا۔

معاذ کی مہندی تھی۔ ملک جہانگیر نے اسے دیکھتے ہی بازو کھول دیے۔ وہ بھاگ کر ان کے سینے سے لپٹی تھی۔

"میرے بغیر ہی شادی کر رہے تھے آپ؟" وہ روٹھے پن سے بولی۔

"تمہارے بغیر اس گھر میں کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ جاؤ اچھی طرح تیار ہو جاؤ۔ ملکانی تمہارے انتظار میں ہے۔" ملک جہانگیر شفقت سے مسکرائے۔

وہ ان سے الگ ہو کر پلٹی تو دروازے پہ عنیزہ ' ملک

ارسلان' افشاں بیگم اور معاذ سب گھر پہ تھے۔ ایک شرمندہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آگئی۔ افشاں بیگم نے اچانک آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"آؤ تیار ہو جاؤ۔" وہ بنا چوں چراں کیے ان کے ساتھ ہولی۔ وہ افراتفری میں تیار ہوئی۔ گہرے رنگ کے بھاری جوڑے میں وہ بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ باہر سے مسلسل دروازہ پیٹا جا رہا تھا۔

"جلدی کرو باہر آؤ۔"

بڑے کمرے میں وہ دیگر لڑکیوں کے ساتھ مہندی کی سجاوٹ میں مصروف تھی۔ ہر طرف شور' ہنگامہ اور خوشی تھی۔ زیان مہندی کی سجاوٹی طشتریوں میں موم بتیاں سیٹ کر کے جلا رہی تھی۔ جب اس کی بے خبری میں اس کا دوپٹا جلتی موم بتیوں پہ جا گرا۔ ریشمی دوپٹے نے پل بھر میں آگ پکڑلی۔ زیان نے بدحواسی میں چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ سب لڑکیاں بجائے دوپٹے کو اس کے وجود سے الگ کرنے کے 'دور ہٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ وہ زیان سے خوف زدہ تھیں کیوں کہ اس پہ عاشق ہونے والے جن کی مبالغہ آمیز کہانیاں انہوں نے بھی سن رکھی تھیں۔

ایک نے عقل مندی کی بھاگ کر ایبک کو بلا لائی کہ زیان بھابھی پہ جن آگیا ہے۔ وہ شدت سے اس کی آمد کا انتظار کر رہا تھا وہ نہ آئی تو ایبک نے خود جا کر اسے زبردستی لے کر آنا تھا۔ وہ مردانے میں تھا اس لیے اسے نہیں پتا تھا کہ زیان واپس آگئی ہے۔ وہ کچھ منٹ پہلے ہی اپنے کمرے میں آیا تھا۔ وہ نہا کر نکلا تھا شرٹ کے بٹن بھی پوری طرح نہیں لگائے تھے جب زیان پہ جن آنے کی خوش خبری ملی۔

وہ فوراً" بیڈ روم سے نکل کر ہال کی طرف دوڑا۔ لگ رہا تھا زیان نے اس بار اس کا تماشا بنوانے کے لیے زبردست پلاننگ کی ہے۔ وہاں عجیب سی ہڑبونگ مچی تھی۔ زیان کے دوپٹے کو آگ لگی ہوئی تھی اور وہ مسلسل چیخ رہی تھی۔ باقی لڑکیاں اسے دیکھ کر خود بھی یہی کام کر رہی تھیں۔ اتنا کسی سے نہ ہو سکا کہ جلتا دوپٹا الگ کر کے دور پھینک دیتیں۔ دوپٹے کے جلتے کنارے نے زیان کی شرٹ کے دامن کو چھو لیا تھا۔ جب ایبک نے بجلی کی تیزی سے دوپٹا اس کے وجود سے الگ کر کے پھینکا۔

زیان کو کھینچ کر وہ اپنے ساتھ بیڈ روم میں لے آیا۔ زیان ڈر رہی تھی کیوں کہ ایبک کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا جانے اب یہ غصے کی سرخی تھی یا کسی اور چیز کی کیوں کہ ساری لڑکیاں چیختے ہوئے ایک بات دہرا رہی تھیں کہ زیان بھابھی پہ جن آگیا ہے۔ زیان نے اتنی آکورڈ سچویشن میں اس سے ملنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایبک اس کے سامنے کھڑا تھا بالکل پاس۔

"زیان آگ نے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا۔" اس کے لہجہ میں بے قراری تھی۔ زیان نے حیران نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ تو یہ سمجھ رہی تھی کہ ایبک کمرے میں لا کر اس کی کلاس لے گا۔ اتنی نرمی کی وہ توقع نہیں کر پا رہی تھی تب ہی تو چند ثانیے بعد کمرے میں اس کی سسکیوں کی آواز گونج رہی تھی۔

"آئی سویر اس بار میری غلطی نہیں ہے ساری لڑکیوں نے خود ہی کہا کہ مجھ پہ جن آگیا ہے۔" روتے روتے اس نے ہر ممکن طور پہ اپنی صفائی دینے کی کوشش کی۔

"جن تو تم پہ سچ مچ آنے والا ہے آتم توش سے زیادہ زور آور اور طاقت ور" ایبک مسکراہٹ چھپانے کے لیے پلٹا تو زیان نے پیچھے سے اس کا کندھا پکڑ لیا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔" اس بار اس کے رونے میں شدت تھی۔

"تم نے ہی تو سب کچھ کیا ہے۔ اب معصوم بن رہی ہو۔" ایبک نے دروازہ لاک کر دیا اور پلٹ کر دوبارہ زیان کے پاس واپس آیا جو حد درجہ خوف زدہ نظر آرہی تھی۔ حالانکہ وہ دل میں ایبک سے ناراض تھی دھڑلے سے واپس گھر آئی تھی۔

"کہو تو تمہارے جرائم بتاؤں؟" ایبک نے اس کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ وہ اب اس کے مقابل تھی۔ گھیر دار پاؤں کو چھوتے اسٹائلش فراک اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس بغیر دوپٹے کے ایبک اس کا ایک

ایبک اس کو شفافت سے دیکھ رہا تھا۔

"اپنی مرضی سے تم نے سب کچھ کرلیا۔ مجھے ذہنی اذیت دی۔ مجھ سے محبت کرتے ہوئے بھی مجھے لاعلم رکھا، بچتی رہیں مجھ سے۔ بڑے دھڑلے سے مجھے کہا کہ اپنے بارے میں، میں خود فیصلہ کروں گی۔ گھر سے ہی چلی گئیں تم۔ فیصلہ کیے بغیر۔ میں تو انتظار ہی کرتا رہا۔ اتنے دن جو میں تم سے دور رہا خاموش رہا صرف اس لیے کہ تم اپنی غلطیوں سے سیکھو اور صرف ایک بار مجھے اپنا فیصلہ سناؤ۔ تم نے مجھے اپنی محبت سے لاعلم رکھا، لیکن میں تم سے محبت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا تمہیں بتا رہا ہوں صاف صاف۔ کیوں کہ میں تم سے محبت کرنا نہیں چھوڑ سکتا اور میں یہ بھی جان چکا ہوں کہ تمہارے صبر کا پیمانہ پوری طرح بھر گیا ہے۔ اب بھی اگر میں نے کوئی غلطی کی تو میرا حشر کردو گی۔" مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے وہ انوکھے طریقے سے اعتراف محبت کررہا تھا۔ زیان زیادہ دیر حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن نہ رہ پائی تھی۔ ایبک نے اس کی کمر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کے گرد بانہوں کا حصار مضبوط کردیا تھا۔

"آپ چھوڑیں مجھے۔ آپ کو سب پتا تھا جب اچھی طرح سے آپ میرے جذبات سے آگاہ ہوچکے تھے، پھر یہ سب کرنے کی ہم اجنبی بننے کی کیا ضرورت تھی۔" زیان نے اپنے ناخن ایبک کے بازو میں چبھونے کی کوشش کی۔

"میں ایسا نہ کرتا تو مجھے کیسے پتا چلتا کہ تم مجھ سے اتنی شدید محبت کرتی ہو اتنی زیادہ کہ رنم کی محبت بھری نگاہ بھی میرے اوپر برداشت نہیں کرسکتیں۔" ایبک نے شرارت سے بولتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔

"اچھا چلیں آپ باہر جائیں مجھے تبدیل کرنا ہے ڈریس۔" زیان نے اس کے بازو پرے کیے۔

"ایسا کرو آج برائیڈل ڈریس پہن لو۔" ایبک نے معصومیت سے کہا۔

"ہونہہ۔ کیوں؟"

"دلہن میرا دل کررہا ہے۔" ایبک نے دوبارہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"پتا ہے روشنی کی ایک کرن میری مٹھی میں ہے۔"

"کون سی کرن؟"

"ملک ایبک۔" جواباً وہ کھل کھلائی۔

"یہ گمان نہیں ہے سراسر یقین ہے۔" وہ اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وقت کی گردش اس سے تھم گئی تھی۔ وہ گھڑی کی ٹک ٹک میں ایبک کے دل کی دھڑکنیں بھی گن سکتی تھی۔ ایبک کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔

"زیان۔" ایبک کی نگاہ سرگوشی بن گئی تھی۔

خاموشی اور سکوت۔ شوخ لمحوں کی آہٹ۔

زیان کا گمان یقین بن کر محبت کے سچے جذبوں پہ مہر ثبت کررہا تھا۔

عائشہ جمیل

فیصلہ

"اگر کسی کو نظر آرہا ہو تو اندھیرا پھیلنے سے پہلے چارپائیاں اوپر پہنچا دو۔" اماں کی آواز گل کی سماعتوں سے ٹکرائی، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اماں جانماز پہ بیٹھیں تسبیحات پڑھنے میں مشغول ہو گئیں۔ وہ خالی خالی نظروں سے اماں کو تکے جا رہی تھی اور ان کے رویے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ اس کی سوتیلی ماں تھی، مگر پھر بھی اسے ایسا لگا جیسے وہ ان کی سوتیلی اولاد ہے۔ پچھلے ایک ڈیڑھ ہفتے سے انہوں نے اس سے بات تک نہیں کی تھی۔ وہ ان کے رویے کے بارے میں سوچ سوچ کر کڑھ رہی تھی۔ جہاں پیار و محبت ہو وہاں اگر رویوں میں تبدیلی محسوس ہونے لگے تو کڑھنے کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے جب سامنے والے کو آپ اپنی صفائیاں دے دے کر تھک جائیں اور وہ سمجھنے کے لیے بالکل تیار نہ ہو۔ ایسا ہی اس کے ساتھ ہو رہا تھا اور اب تو تھک ہار کر اس نے صفائیاں دینا بھی چھوڑ دی تھیں۔

اماں نے جانماز تہ کر کے باہر رسی پر ہی لٹکا دیا اور تسبیح کمرے کی کھڑکی میں لٹکا کر گل نایاب کو گھورنے لگیں جو ابھی بھی کمرے کی دہلیز میں سر پکڑے بیٹھی تھی اور انہیں سخت ناپسند تھا کسی کا اس طرح سر پکڑ کے دہلیز پہ بیٹھنا۔ گل مہتاب تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے آئی اور ماں کے ساتھ مل کر ایک ایک چارپائی اوپر لے جانے لگی۔ اسے اس طرح بیٹھے بیٹھے جانے کتنا وقت گزر گیا اسے پتا ہی نہ چلا۔ دونوں کمرے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جامن کے درخت پہ رکھی واحد چارجنگ لائٹ صحن کے اندھیرے کو مٹانے کی سعی میں مصروف تھی۔ اسے اپنے قریب قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے جو سر اٹھا کر دیکھا تو اباجی کھڑے تھے۔ گل نایاب نے پھر سے سر جھکا لیا۔

"گل بیٹی! ایسے کیوں بیٹھی ہے یہاں، چل اوپر چل کے کھانا کھا۔" اباجی نے دست شفقت اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ گل مہتاب بھی اسے کب سے آواز دے رہی تھی، مگر جواب ندارد رہا تو اباجی خود ہی نیچے چلے آئے۔

"اباجی! مجھے بھوک نہیں ہے۔ آپ جا کے کھانا کھائیں۔" اس نے نظریں جھکائے جھکائے جواب دیا۔

"بھوک کیوں نہیں ہے میرے شیر کو۔" اباجی مسکراتے ہوئے بولے۔

"میں نے شام کھانا کھایا عصر کے بعد۔"

"ہوں... صبح، دوپہر کا چھوڑ کر شام میں کھا لیا اور اب پھر کھانے کی چھٹی۔ بچے! تیرے اس طرح نہ کھانے سے میری کوئی سال بھر کی گندم نہیں بچے گی۔ چل اٹھ شاباش جلدی سے، آ کے کھانا کھا سب کے ساتھ۔" اباجی لاڈ سے بولے۔

"اباجی! مجھے واقعی اس وقت بھوک نہیں ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اباجی اس کی آنکھوں کی نمی دیکھ چکے تھے وہ بھی اٹھ کے کھڑی ہو گئی۔

"میں جانتا ہوں میرا بیٹا! اداس ہے، مگر بچے! ماں

ہے وہ تیری، بہت فکر ہے اسے بھی۔ کہیں کچھ غلط نہ ہو جائے اس لیے کچھ چڑچڑی سی ہو رہی ہے وہ، بس تو دل پہ نہ لیا کر اس کی باتوں کو وہ جھلی تو بول بال کے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتی ہے اور ایک تو ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پہ کڑھتی رہتی ہے۔ اللہ نے دو کان کس لیے دیے۔ اس سے سن اور اس سے نکال دے۔" اباجی نے اس کا کان پکڑتے ہوئے کہا تو وہ بھی آنکھوں میں نمی لیے ہنس دی۔

"تو ٹینشن نہ لے بس، اللہ نے چاہا تو اچھا ہی ہوگا۔ وہ رب ہے اس کے ہر کام ہی مصلحت ہوتی ہے۔ چل جلدی سے میرے شیر... بچے کی طرح مسکرا کے دکھا اور پھر اوپر چل، جتنی بھوک ہے اتنا ہی کھا لے۔ اگر تیری ماں لیٹ گئی ہوگی تو غصے میں مجھے بھی کھانا نہیں دے گی۔" اباجی کی بات پر وہ مسکراتی ہوئی اوپر کی جانب ان کے ساتھ ساتھ چل دی تھی۔

☆ ☆ ☆

گزشتہ دو روز سے بجلی غائب تھی اور یہ لوڈشیڈنگ کی ہی کرامات تھی کہ جس نے گل نایاب جیسی درویش صفت بندی کو بھی آج کھلے آسمان تلے لیٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نیند تو اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور وہ چت لیٹی سیاہ آسمان کی وسعتوں میں جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ سوچوں کا لاامتناہی سلسلہ تھمنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ یہاں تک کہ فضا میں گونجتے اباجی کے خراٹے بھی اس کی سوچوں کے سلسلے میں خلل نہ ڈال پائے۔ رات کا آخری پہر تھا، دور کہیں سے کتوں کے لڑنے اور بھونکنے کی آواز آئی تو وہ یک دم ہی چونک کر اٹھ بیٹھی۔ جانے کتنی ہی ساعتیں ایسے

کے سلسلے سے دامن چھڑانے کی سعی کرتی وہ پھر سے لیٹ گئی۔

ایک نظر چارپائی پہ اپنے برابر لیٹی گل مہتاب کو دیکھا۔ جو پرسکون گہری نیند سو رہی تھی۔ گل نایاب کو اپنے علاوہ ہر ذی روح جو اس وقت محو استراحت تھا سب پہ ہی رشک آرہا تھا۔ گل نایاب کہنیوں کے بل اٹھی اور ایک طائرانہ نگاہ سب پر ڈالی۔ سب کو سوتا دیکھ کر اس نے پھر سے تکیے پہ سر گرا دیا تھا۔ گھر میں پچھلے ڈیڑھ ہفتے سے چلنے والی سرد جنگ نے بالاخر اسے فیصلہ کرنے پر مجبور کر ہی دیا تھا۔ ایک گہری بوجھل سانس گم صم فضا کے سپرد کرکے اس نے تکیے کے نیچے سے اپنا موبائل نکالا اور اپنے فیصلے کو نظم کی صورت ڈھالتے اس کے ہاتھ تیزی سے موبائل اسکرین پہ کچھ ٹائپ کر رہے تھے۔

"آؤ مل کر فیصلہ کرتے ہیں"
تم تو مجھے
میری جان' میرا ایمان
میری چاہت' میری دھڑکن
اور۔۔۔
اور محبت نادان' کہا کرتے تھے
مگر اب فراموش کرنا پڑے گا
دیکھو۔۔۔!
روح تو فنا ہو جاتی ہے
پر اس پہ لگے زخم
کبھی مندمل نہیں ہوتے
اسی طرح۔۔۔
دل پہ ہوئے نقش الفاظ
کہیں پہ گم نہیں ہوتے
وہ ملزم قیدی کی طرح
آزادی کی خاطر
دل کی دیواروں سے جب ٹکراتے ہیں
تو ایک ارتعاش پیدا ہوتا ہے
جسے ہم دھڑکن دل کہتے ہیں

مگر اب فراموش کرنا پڑے گا
دیکھو۔۔۔!
وہ قدم کیسے طے کر سکتے ہیں
سفر آبلہ پائی کا
جن قدموں نے نرماہٹ پھولوں کے سوا کبھی
نہ سہا ہو درد کانٹوں کی چبھن کا
میں تو بابا کی شہزادی' ماں کی دلاری
اور بھیا کی لاڈلی ہوں
یہ لاڈلیاں' دلاریاں اور شہزادیاں
ایسا نہیں کرتیں
اک محبت کی خاطر
کئی چاہتوں کا خون نہیں کرتیں
دیکھو۔۔۔!
تمہاری جان' تمہارا ایمان
تمہاری چاہت' تمہاری دھڑکن
اور۔۔۔
اور محبت نادان
ایسا کیسے کر سکتی ہے
تم بھی جانتے ہو!
ہم دونوں قسمت سے لڑ نہیں سکتے
نہ ہی ضمیر کے بوجھ تلے جی سکتے ہیں
تو پھر۔۔۔
آؤ مل کر ایک "فیصلہ" کرتے ہیں
اپنی اپنی محبت کو دل کی لحد میں دفنا کر
خلوص نیت سے۔۔۔
ملن کی آرزو کا قتل کرتے ہیں
آؤ مل کر ایک فیصلہ کرتے ہیں

لکھتے لکھتے گل نایاب انگلیاں جیسے شل ہو گئی تھیں۔ یہ ایک نظم ہی نہیں بلکہ اس کا فیصلہ تھی ایک ایسا فیصلہ جس پر ڈٹ جانے کے بعد پیچھے ہٹنا محال ہوتا ہے۔ ایک ایسا ہی فیصلہ اس نے بھی کر لیا تھا۔ تین ٹیکسٹ کے ذریعے گل نایاب نے اپنا فیصلہ ہواؤں کے دوش پہ شہریار تک پہنچا دیا تھا۔ اس کی توقع کے مطابق اس کا موبائل کچھ ہی دیر بعد بجنا شروع ہو گیا تھا۔ جلتی

بجھتی اسکرین پہ شہریار کالنگ دیکھ کر اس کے آنسوؤں میں روانی آگئی تھی۔ تواتر سے بہتے آنسو کان کی لو کو چھو کر بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔ اس نے خود کو ٹٹولا، مگر وہاں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ شہریار کی آواز اور اپنی سماعت کو روبرو ہوتا دیکھتی۔ اس نے موبائل کو سوئچ آف کر دیا۔

☆ ☆ ☆
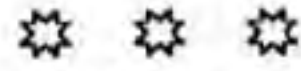
"اماں! مجھے نہیں کھانا یہ، بہت مرچیں ہیں اس میں۔" سی سی کرتا آفتاب گل چند لقمے لینے کے بعد پلیٹ پرے کھسکاتا ہوا بولا۔ آنکھوں میں پانی بھرے ہونے کے باوجود اس نے اماں کے چمٹے کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ فٹ پیچھے ہٹا۔ آفتاب گل کو سرخ آنکھوں اور بہتی ناک کے ساتھ ہنستا دیکھ کر وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔

"ناس پٹی اولاد جینا حرام کر رکھا ہے۔ کسی کو یہ کھانا ہے تو کسی کو وہ؟ ایک ہی دفعہ زہر کیوں نہیں کھا لیتے۔ اچھا ہے جان چھوٹے سب کی۔" زلیخا بیگم کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ کہیں کا غصہ اس وقت کہیں اور نکل رہا تھا۔ الفاظ کسی اور کے لیے ادا ہو رہے تھے تو جتایا کسی اور کو جا رہا تھا۔ گل افروز اور آب گل کو ہوم ورک کرواتی ہوئی گل نایاب نے ایک نظر آفتاب گل کو دیکھا۔ جسے اچھے بھلے سالن میں بھی مرچیں لگ رہی تھیں۔ وہ افسوس سے سرہلا کر رہ گئی۔

"اماں! بہت بھوک لگی ہے۔ بھئی، پیسے دو۔ باہر سے لا کر کچھ کھاؤں گا۔" آفتاب گل منہ بسورتے ہوئے بولا۔

"یوں بولو نا کہ تمہاری زبان کو باہر کی چاٹ کی لت لگ گئی ہے۔ کوئی پیسے ویسے نہیں ہے میرے پاس۔" زلیخا بیگم ہاتھ پہ لگے آٹے کو مسل کر کونے میں جھاڑتے ہوئے بولیں۔ انہوں نے توا ہٹا کر دیکھا تو گیس کا پریشر کم ہونے کی وجہ سے چولہے کی آنچ بہت کم تھی۔ حبس کی وجہ سے توا تو ٹھنڈا تھا، مگر ان کا دماغ مزید گرم ہو گیا تو پھر سے چولہے پہ پٹخنے کے انداز میں انہوں نے ایک تیز نظر باہر کے منظر پہ ڈالی جہاں گل نایاب اباجی کو پانی پلانے کے بعد ان سے دعائیں لے رہی تھی۔

"ہونہہ۔" سر جھٹک کر وہ ایک مرتبہ پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئیں۔ اٹھ پٹخ کے ساتھ بڑبڑاہٹ بھی جاری تھی۔

"کیا ہو گیا ہے؟ گلوں کی اماں! کیوں بڑبڑا رہی ہے ایسے۔" اباجی نے آفتاب گل کو اپنے ساتھ چمٹاتے ہوئے کن انکھیوں سے بیگم کو دیکھ کر سرسری سے انداز میں استفسار کیا، مگر شاید انہوں نے بہت غلط موقع پر انٹری دی۔ زلیخا بیگم تو پھٹ پڑیں۔

"ارے، نام ہے صرف گلوں کی ماں کا، مگر حقیقت میں کانٹوں کی ماں سے کم نہیں۔" جلے دل کا پھپھولا پھوڑا۔

"ارے، ہوا کیا ہے؟" وہ کچن کے دروازے کے پاس پڑی چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے بولے۔ انداز تکان بھرا تھا۔

"اباجی! آ۔۔۔" آفتاب گل نے بڑا سا منہ کھول کر زبان نکال کر دکھاتے ہوئے مسکین سی صورت بنائی تو اباجی بھی سمجھ گئے کہ ضرور آج بھی ان کے لاڈلے کو سالن میں مرچیں تیز لگی ہیں۔ اباجی بھی محض سرہلا کر رہ گئے۔

"اب بھی آپ پوچھتے ہیں کہ ہوا کیا ہے؟ جب آپ کی یہ گلدستہ اولاد جگہ جگہ بدنامی کے گل بکھیرے گی نا، لگتا ہے تب ہی آپ کی آنکھوں سے پٹی اترے گی۔" تیز تیز روٹی بیلتے ہوئے جواب آیا۔ گلوں کی اماں کا اشارہ وہ بخوبی سمجھ گئے۔

"ارے چھلیے! زندگی میں ایسے موقع تو آتے ہی رہتے ہیں۔ بھڑکنے کے بجائے ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لینا چاہیے۔" انہوں نے اپنی زوجہ محترمہ کو سمجھاتے ہوئے کہا اور جیب سے پچاس کا نوٹ نکال کر بیٹے کے ہاتھ میں تھمایا۔ پیسے پکڑ کر اماں سے نظریں چراتا ہوا آفتاب گل فوراً ہی رفوچکر ہو گیا، مگر وہ بھی

ماں ہیں ان ہی کے چوچلوں نے بگڑے ہوئے ہیں۔

"خوب بگاڑیں آپ انہیں، پہلے کیا کم بگڑی ہوئی ہے یہ اولاد۔ جب بالکل ہاتھوں سے نکل جائے گی نہ تو پھر میری تربیت کو الزام مت دینا۔" گلوں کے ابا خفن مسکرا کر رہ گئے اور وہ جی جان سے خاک ہوئیں۔

"کیا جواب دینا ہے پھر لڑکے والوں کو" نہ طور نہ طریقہ۔ بس منہ اٹھا کر اور لڑکے کو بھی ساتھ لے آئے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آئے لوگ۔ لڑکا کام وام تو کچھ کرتا نہیں ہے۔ بس باپ کا کاروبار ہے۔ وہ بھی دل کیا تو چلا گیا نہیں تو نہ سہی۔ گھر والوں کو دیکھ کر تو لگ رہا تھا کہ جیسے زبردستی ساتھ ہوئے ہوں۔۔۔ گھر میں بھی شہریار کی بڑی بہنوں کا راج چلتا ہے۔ بتا پھر کیا جواب دوں انہیں، صبح بھی لڑکے کا باپ دکان پہ آیا تھا۔" گلوں کے ابا کمر سیدھی کرنے کی غرض سے لیٹ گئے اور دونوں ہاتھوں کو سر کے نیچے رکھا۔

"مجھے کیا پتا، پتا ہو گا آپ کی لاڈلی کو جس کی رضامندی سے وہ لوگ اس گھر تک آئے۔ جس نے بیاہ رچانا ہے اسی سے پوچھ لو، مگر ایک بات یاد رکھنا گلوں کے ابا! اپنے بھرا کو آپ خود ہی جواب دہ ہیں۔ نغمانہ (دیورانی) پہلے ہی باتوں باتوں میں جتا چکی ہے۔ انہیں جلدی سے ہاں، نہ کا جواب دیا جائے۔ گل نایاب اگر نایاب ہو کر ان کی پہنچ سے دور ہوئی تو یہ بات اپنے ذہن سے نکال دینا کہ وہ اپنے کماؤ پوت کے لیے چلبلی سی گل مہتاب کو اپنی بہو بنائے گی۔" روٹیوں کو ہاٹ پاٹ میں رکھ کر سالن کی پتیلی چولھے پہ رکھی اور آنچ کم کر دی۔

"اچھا۔۔۔ اللہ مالک ہے۔ اتنی بدظن مت ہو اپنی اولاد سے، پھر بھی ایک دفعہ تو خود بھی پوچھ لینا ذرا پیار سے۔ ویسے مجھے تو کہہ دیا ہے۔ گل نایاب نے ہمارا ہر فیصلہ اسے منظور ہو گا۔ بے شک اس کی رضامندی ہو اس رشتے میں، مگر مجھے پتا ہے۔ میں نے شہریار کے گھر والوں کو منع بھی کر دیا تو بھی میری بیٹی پلٹ کر نہیں پوچھے گی کہ میں نے منع کیوں کیا۔" ان کو کتنا یقین تھا اپنی اولاد پہ زلیخا بیگم ان کے مان اور محبت کو دیکھتی ہی رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼
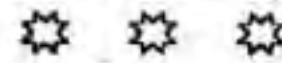
"گل باجی! آپ سو رہی ہیں کیا؟" گل مہتاب نے کروٹ کے بل لیٹی گل نایاب سے پوچھا۔

"ہوں، نہیں کیا بات ہے؟" گل نایاب سیدھی ہو کر لیٹ گئی۔

"باجی! وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" گل ناب کی خاموشی میں آواز گونجی تو گل نایاب نے فوراً" ہی اسے ٹوک دیا۔

"شش۔ آہستہ تو بول لیا کرو۔ کون ہے؟"

"وہ۔ وہ شہریار۔ بھائی۔" گل مہتاب اٹکی۔

"اس وقت۔ وہ کس کے نمبر پہ کال کر سکتے ہیں جب میرا نمبر تو بند ہے۔" گل نایاب نے اسے مشکوک نگاہوں سے نیم اندھیرے میں گھورا۔

"انہوں نے گھر کے نمبر پہ کال کی۔"

"اور تم نے اٹینڈ کر کے بات کر لی۔" گل نایاب نے اس کی بات کاٹ کر تاسف سے کہا۔ گل نایاب اور گل مہتاب میں لاکھ بے تکلفی سہی مگر اس معاملے میں گل مہتاب جھجک رہی تھی۔

"سوری باجی! وہ گھر کے نمبر پہ کال کر رہے تھے تو نیا نمبر دیکھ کر میں سمجھی شاید کسی اپنے کا ہو گا۔" گل مہتاب اسے خاموش دیکھ کر موبائل ہاتھ میں تھامے بیٹھی رہی۔

"باجی! وہ اتنی منتیں کر رہے تھے کہ ایک بار ان کی آپ سے بات کرا دوں۔ ایک بار بات کرنے میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔" گل نایاب کو خاموش دیکھ کر گل مہتاب کی ہمت بندھی۔

"مجھے کسی سے بھی بات نہیں کرنی ہے۔" گل نایاب نے آنکھیں بند کر کے بازو آنکھوں پہ رکھ لیا تھا۔

"باجی! پلیز۔"

"ہرگز نہیں، بس ایک بار کہہ دیا ہے نا، مجھے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔ چپ کر کے تم بھی سو جاؤ۔" زیرو پاور کے نائٹ بلب کی روشنی میں وہ حیرت سے گل نایاب کو تکنے لگی۔ ایک پل کو تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ وہی نرم خو سی گل باجی ہے۔ جنہوں نے

بھی اتنے سخت لہجے میں کسی سے بات نہ کی اور اب کیسے وہ اپنی ہی بات پر اڑی ہوئی تھیں۔

"ایک بار بات کرنے میں کوئی حرج تو نہیں، پہلے بھی تو آپ ان سے بات کرتی تھیں۔ تو اب کیا ہوا؟" گل مہتاب چاہتی تھی کہ وہ ایک بار بات کرلے۔

"تم جانتی ہو، شہریار کے گھر والوں کو اباجی نے اس رشتہ کے لیے انکار کردیا ہے۔" گل نایاب نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا۔

"وہ بھی یہی پوچھنا چاہتے ہیں۔ آخر اس انکار کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔ اتنے اچھے تو ہیں۔ شہریار بھائی، اتنے ہینڈسم کہ یونیورسٹی میں تو لڑکیاں مرتی ہوں گی ان پہ۔ مگر انہوں نے سب کو چھوڑ چھاڑ آپ کو پسند کیا۔ شادی کے لیے آپ کا انتخاب کیا ہے اور سیدھے سادھے طریقے سے اپنا پروپوزل بھیجا۔" گل مہتاب سخت متاثر تھی شہریار کی شخصیت سے۔

"میں نے کب کہا کہ وہ اچھا نہیں ہے۔ اس گھر تک اس کی فیملی کے آنے کی میری صرف یہی شرط تھی کہ فیصلہ میرے والدین کا ہی ہوگا اور ان کا ہر فیصلہ مجھے منظور ہوگا۔ اباجی ایسے ہرگز نہیں ہیں جو اپنی اولاد کی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ بنیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اماں کے ہزار منع کرنے کے باوجود وہ مجھے کبھی بھی میری خواہش پہ مجھے یونیورسٹی میں ایڈمشن نہ دلاتے۔ اباجی نے بھی ایک زمانہ دیکھا ہے۔ کچھ تو کمی بیشی انہیں اس رشتے میں نظر آئی ہوگی۔ جو انہوں نے منع کیا ہے۔" گل نایاب اٹھ کر تکیہ سیٹ کرکے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"گل باجی! زندگی آپ نے گزارنی ہے، اباجی نے نہیں اور آپ شہریار بھائی کو پسند بھی تو کرتی ہیں۔ پھر ایسے کیسے آپ خاموشی سے اپنی محبت سے دستبردار ہوسکتی ہیں۔ اب بھی وقت ہے گل باجی! اپنے فیصلہ پہ نظر ثانی کرلیجیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو بعد میں پچھتانا پڑے۔ بلیو می! میں بھرپور آپ کا ساتھ دوں گی اور شہریار بھائی کے ساتھ آپ بہت خوش رہیں گی۔" گل مہتاب کا اس طرح سے شہریار کی وکالت کرنا گل نایاب کو ایک آنکھ نہ بھایا لوٹتے ہوئے عل سے وہ بول اٹھی۔

"بس کرو گل مہتاب! بس... بہت ہوگیا۔ ہاں... میں شہریار کو چاہتی ہوں۔ بتاؤ پھر میں کیا کروں؟ جب میرے ماں باپ میری شادی اس کے ساتھ نہیں کرانا چاہتے۔ گڑگڑاؤں ان کے آگے۔ انہیں مجبور کروں تاکہ وہ میری شادی شہریار کے ساتھ کرادیں اور اگر نہ مانیں تو... تو بھاگ جاؤں اس کے ساتھ گھر سے۔ بھاگ کے شادی کرلوں۔ جانتی ہو، میرا اس طرح سے کوئی اسٹیپ اٹھانے سے کیا ہوگا۔" گل نایاب نے رک کر اسے دیکھا۔ "آج جو تم میڈیکل کی تعلیم حاصل کررہی ہو نا اور جو ڈاکٹر بننے کے سپنے ان آنکھوں میں سجائے بیٹھی ہو۔ سب سے پہلے تو تمہارا یہ سپنا ہی چکنا چور ہوگا۔ تم پر نہ صرف تعلیم بلکہ آنے والے رشتوں کا بھی دروازہ بند ہوجائے گا۔ اور اگر جو بھولے بھٹکے کسی ان پڑھ جاہل یا کسی کام چور مرد کا رشتہ آ ہی گیا تو یاد رکھنا۔ اماں ابا نے تمہیں بوجھ سمجھ کر رخصت کردینا ہے۔ یہ جانے بغیر کہ تمہارا مستقبل کیا ہوگا۔

آفتاب گل ہمارا اکلوتا بھائی جو ابھی 6th کلاس میں ہے، اتنی عقل نہیں ہے اسے مگر کل جب وہ بڑا ہوگا تو لوگوں کے طعنے سن کر کیا وہ ہماری ایسی عزت کرسکے گا جس طرح کی وہ عزت آج کرتا ہے۔ ہماری گل افروز اور آپ گل کو کیسے ان کے ناکردہ گناہوں کی سزا دوں؟ کیسے چھین لوں ان سے ان کا معصوم سا بچپن۔ جو عمران کی کھیلنے کودنے کی ہے اسے بے جا پابندیوں کی بھینٹ چڑھا دوں... بولو؟" بولتے بولتے وہ ہانپ چکی تھی۔ چند گہری سانس لینے کے بعد اس نے ایک نظر گل مہتاب کے چہرہ پہ ڈالی جہاں شرمندگی اور ندامت تھی۔

"ماں باپ... جنہوں نے پڑھا لکھا کر اتنا بڑا کیا ہے کیسے ان کی پرورش پر حرف آنے دوں۔ میں اتنی بے ضمیر نہیں ہوں گل مہتاب! کہ خود ہی ان کی عزت کا جنازہ نکالوں۔ ہمارے اباجی جو گلوں کے ابا کے نام سے مشہور ہیں۔ نہ صرف اس محلہ کے بلکہ پوری کالونی

کے لوگ ان کی عزت کرتے ہیں۔ فخر سے دیکھتے ہیں انہیں کہ وہ اپنی بیٹیوں کو اعلا تعلیم دلوا رہے ہیں۔ جو لوگ ہمارے کردار کی آنکھیں بند کر کے گواہی دیتے ہیں نا۔ وہی لوگ میرے اس طرح گھر سے بھاگ جانے پر تھو تھو کریں گے۔ بدکردار کہیں گے ہمیں۔۔۔ بدکردار ہم اور سراسر الزام میری تعلیم کو ہی دیں گے۔ جبکہ تعلیم تو انسان کو باشعور بناتی ہے۔ ایک عورت کو آئندہ نسلوں کی امین سمجھا جاتا ہے۔ تو پھر میں یہ کیسے گوارہ کرلوں۔ کہ آئندہ آنے والی نسل کی گردنوں میں یہ بدنامی کا طوق خود اپنے ہاتھوں سے پہناؤں۔

گل مہتاب! جب جب کسی کی بہن یا بیٹی اپنے عاشق کے ساتھ گھر سے فرار ہوگی۔ تب ہی اس گھر میں برے لفظوں کے ساتھ تذکرہ میرا بھی ہوگا۔ لوگ وقتی طور پر تو فراموش کردیتے ہیں۔ مگر ایسی باتیں کبھی بھی ذہنوں سے نہیں مٹتی ہیں۔" اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اس نے گل مہتاب کو دیکھا۔ جو شرمندگی سے نظریں چرائے موبائل کے بٹنوں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ گل نایاب نے اس کے ہاتھوں سے موبائل چھین لیا۔

"تم اب بھی چاہتی ہو کہ میں شہریار سے بات کروں تو ٹھیک ہے۔ مگر میری یہ اس سے آخری بات ہوگی۔ کیونکہ میں اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹوں گی۔" اس نے کال ملانے کے لیے جیسے ہی بٹن پش کیا۔ موبائل کی روشن اسکرین کو دیکھ کر گل نایاب نے تاسف سے گل مہتاب کو دیکھا۔ کیونکہ شہریار لائن پہ ہی تھا اور کال چل رہی تھی۔ ان کے مابین ہونے والی تمام گفتگو وہ بھی سن چکا تھا۔ اس نے موبائل کان سے لگایا۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔

"ہیلو۔"

"بہت بہت شکریہ۔ گل نایاب! تم نے آخری دفعہ ہی سہی نگرانی کرنے کی زحمت تو گوارا کی۔" شہریار کی آواز ایئرپیس میں گونجی۔

"جہاں تمہاری سوچ کی پختگی کو جان کر خوشی ہوئی اور اپنے دل پر فخر جس نے صرف تمہیں پیار کیا۔ مگر وہیں ساتھ ہی یہ افسوس بھی رہے گا کہ میں تمہارے والدین کے معیار پر پورا نہ اتر سکا۔ خیر۔ اتنا بڑا قدم اٹھا کر تو میں بھی اپنی بہنوں کا مستقبل داؤ پر نہیں لگا سکتا ہوں۔ اینی وے، گل! فون رکھنے سے پہلے میری ایک آخری بات سن لو۔ پلیز منع مت کرنا۔" شہریار نے التجا کی۔

"جی، بولیں! مگر اس کے بعد میں کچھ نہیں سنوں گی۔" گل نایاب نے درشتی سے کہا۔

"اور اس کے بعد میں بھی تم سے کچھ نہیں بولوں گا۔" گلا کھنکارنے کے بعد شہریار کی گمبھیر آواز گل نایاب کی سماعتوں میں گونجنے لگی۔

چلو تم ساتھ مت دینا
مجھے بے شک بھلا دینا
نئے رشتے بنا لینا
بھلا دینا سبھی وعدے
سبھی قسمیں، سبھی ناتے
تمہیں اجازت ہے جاناں!
جو دل چاہے وہ سب کرنا
مگر اب تم کسی سے بھی
ادھورا پیار مت کرنا

"اپنا بہت خیال رکھنا گل نایاب! اللہ حافظ۔" کتنی ہی دیر تک شہریار کی آواز اس کی سماعتوں میں گونجتی رہی۔ ہوش کی دنیا میں لوٹنے کے بعد، اس نے موبائل دائیں سائڈ سرہانے پہ رکھ کر جیسے ہی نگاہ اٹھائی۔ نیم اندھیرے میں کسی کو دروازے میں ایستادہ دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل چکی تھیں اور وہ کانپ کر رہ گئی۔ بے خودی میں گل نایاب کے لب ملے تھے۔

"اباجی!"

✡ ✡ ✡

اسرار صاحب، جو گلوں کے اباجی کے نام سے مشہور ہیں۔ نہایت ہی ایماندار اور مخلص انسان ہیں۔ زلیخا بیگم جب بیاہ کر اس گھر میں آئیں تو ایک شادی شدہ نند آپا پروین اپنے گھربار کی تھیں۔ باقی چھوٹی نند اور دیور اور ساس، سسر کے ساتھ تین کمروں کے مکان میں سب ہی ساتھ رہتے تھے۔ دو برس بعد اللہ نے

جب انہیں اولاد کی خوشی سے نوازا تو پھول جیسی معصوم سی بچی کو گود میں لیتے ہی اسرار صاحب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے اور بے اختیار ہی ان کے منہ سے پھسلا' یہ تو میری گل نایاب ہے۔ گل نایاب اسرار صاحب کے لیے اللہ کا خاص تحفہ تھی اور یہ بچی حقیقی معنوں میں ان کے لیے بھاگوان ثابت ہوئی۔ کیونکہ ان کا کپڑے کا کاروبار جو پچھلے آٹھ ماہ سے رکا ہوا تھا وہ بھی اب چل پڑا تھا۔ وہ جو لوگوں کے قرض دار ہوگئے تھے۔ وہ قرض بھی جلد ادا ہو گیا تھا۔

دوسرا نمبر پر گل مہتاب پھر آفتاب گل اور آخر میں ان کی دو جڑواں بیٹیاں گل افروز اور آب گل تھیں۔ کسی خاص نیکی کا صلہ اللہ نے انہیں نیک اولاد کی صورت عطا کیا تھا۔ ان کی ساری اولاد نہ صرف ظاہری طور پر پیاری تھی بلکہ سیرت میں بھی کئی گناہ زیادہ خوب صورت تھی۔ اسرار صاحب نے بھی ساری ہی زندگی ایمانداری سے گزار دی تھی مگر حرام کمائی کا ایک لقمہ بھی انہوں نے اپنی اولاد کو نہ دیا۔ زلیخا بیگم تھیں تو صابر و شاکر مگر غصے کی تھوڑی تیز تھیں۔ بس اولاد اور گھر کی ذمہ داریوں نے انہیں چڑچڑا سا کر دیا تھا۔ اور ان کی یہ کیفیت پچھلے ڈیڑھ دو ہفتوں سے مسلسل تھی۔ وجہ گل نایاب کا آوٹ آف فیملی سے آیا ہوا پرپوزل تھا۔ جس میں گل نایاب کی پسند بھی شامل تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ انہیں اپنی بیٹی پہ اعتبار نہ تھا بلکہ انہیں لڑکے کے گھر والوں کا رویہ بالکل بھی پسند نہ آیا تھا۔ کیونکہ شہریار کی ماں بنتیں جاتے جاتے انہیں یہ جتا گئی تھیں کہ وہ شہریار کے لیے اپنی بیٹی کی نند لانا چاہتی ہیں اور اگر ایسا نہ ہوا تو شہریار کی بہنوں کا مستقبل داؤ پر لگ سکتا ہے۔ مگر وہ شہریار کی ضد کی وجہ سے اس در تک آئیں۔

گل نایاب کو اداس دیکھ کر وہ کڑھتی رہتی تھیں کیونکہ ان کا تعلق ماؤں کے اس قبیلہ سے نہ تھا جو اولاد کو اداس دیکھ کر انہیں چوم چاٹ کے سینے سے لگا لیتی ہیں۔ یہ صفت تو گلوں کے ابا جی میں پائی جاتی تھی۔ گلوں کے ابا جی اس رشتہ کے لیے لڑکوں والوں کو انکار کر چکے تھے اور وہ جانتے تھے کہ لاڈلی بیٹی اس فیصلہ پہ انہیں اف تک نہ کہے گی۔ اور ایسا ہی ہوا تھا کیونکہ گل نایاب نے ان سے اس انکار کی وجہ تک نہ پوچھی اور ان کے فیصلہ پہ سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ گلوں کے ابا جی سامنے کا منظر دیکھ کر ششدر رہ گئے اور کچھ دیر بعد ان کی بے تاثر آواز گونجی۔

"کیا ہو رہا ہے یہ؟ اتنی رات گئے کس سے بات ہو رہی تھی؟" جانتے تو وہ تھے مگر انجان بن کر استفسار کیا۔ گل مہتاب نے اٹھ کر فوراً" سے بیشتر لائٹ آن کی۔

"ابا جی! وہ۔۔۔ وہ شہریار کی کال تھی۔ سوری ابا جی! یہ میری اس سے یہ آخری بات تھی۔ آئندہ آپ کو اور اماں کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا؟"

گل نایاب نے نگاہیں جھکائے ہوئے ہی جواب دیا اور وہ جانتے تھے کہ اب وہ واقعی انہیں کبھی بھی شکایت کا موقع نہیں دے گی۔ گل مہتاب نے نگاہوں میں حیرت سموئے گل نایاب کو دیکھا کہ انہوں نے کیسے ابا جی کو سب سچ سچ بتا دیا تھا۔ ابا جی نے آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے اس کی پیشانی پہ بوسہ دیا۔ آج انہیں بھی اپنے اس فیصلہ پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔ جو انہوں نے اپنی بیٹی کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرانے کے لیے لیا تھا۔

گلوں کے ابا نے گل مہتاب کو شرمندہ دیکھ کر اسے بھی اپنی مہربان بانہوں میں سمیٹ لیا۔ تو اسی وقت گل مہتاب نے بھی ایک فیصلہ کیا کہ وہ ضرور اپنی گل باجی جیسی پختہ کردار کی مالک بنے گی۔

برابر کمرے میں لیٹی گلوں کی اماں نے دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔ اور ادھر گل نایاب ہلکے پھلکے من سے مسکرا دی۔ کیونکہ اسے اپنے رب پہ یقین تھا کہ وہ ضرور اسے خوشیوں سے نوازے گا۔

☆ ☆

مریم ماہ منیر

تم ہی میرا حوالہ ہو

ناولٹ

"کچھ کہو گی نہیں۔" طویل دورانیہ کی خاموشی کے بعد اس کی آواز نے آفس روم کے سناٹے کو چیرا تھا۔

جواب میں وہ خاموش رہی۔ تقریباً" پندرہ منٹ پہلے ہی اس کی اسسٹنٹ نے انٹر کام پر کسی ملاقاتی کا ذکر کیا تھا جس نے اپنا نام بتانے سے انکار کیا تھا۔ اسسٹنٹ کی فون ریسیور پر ابھرتی آواز کے ساتھ ہی اس کی نگاہ آفس کی سی سی ٹی وی اسکرین پر پڑیں جو لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے بند تھی۔ چند دن پہلے ہی آفس کا نیا جنریٹر آیا تھا۔ الیکٹریشن نے ابھی تک جنریٹر کی وائرنگ کو آفس سی سی ٹی وی سے کنیکٹ نہیں کیا تھا۔

"ہوں۔ ان صاحب کو بھیج دو میرے آفس۔" یہ کہتے ساتھ ہی اس نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور پھر اگلے منٹ میں آفس ڈور کھول کر اندر داخل ہوتے وجود پر نگاہ پڑتے ہی وہ اپنی جگہ ساکت ہو گئی۔ اس کے حواس جیسے مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ بہت دیر بعد وہ اس قابل ہوئی کہ اس وجود کو آفس ٹیبل کی دوسری جانب دھری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کر سکے۔ اب اس کے سامنے بیٹھا وجود اسے بولنے پر اکسا رہا تھا۔ وہ خاموش سی یک ٹک اس وجود کو دیکھتی یقین کے منازل طے کرنا چاہ رہی تھی گمان اس کی سوچوں کو بار بار الجھائے دے رہا تھا۔

"کچھ تو بولو۔"

"گھر میں سب خیریت ہے۔" اس کے ساکت لبوں میں جنبش ہوئی اس کے ذہن نے الفاظ اکٹھے کر کے پہلے یہ ہی فقرہ ترتیب دیا۔

"ہاں۔۔۔ بس چل رہا ہے۔"

"اور کچھ نہیں پوچھو گی۔" بے قراری اس کے لہجے سے چھلکی۔

"اور۔۔۔ اور آپ کیسے ہیں؟" بہت دیر بعد وہ اتنا ہی پوچھ سکی۔

"میں۔۔۔ میں خوش نہیں ہوں۔" عفت نے محسوس کیا کہ اس کی آواز میں پستی اور شکستگی تھی۔

جواب میں وہ خاموش رہی۔

"وجہ نہیں پوچھو گی۔"

"میں آپ کی خوشیوں کے لیے دعا کروں گی۔" وہ دھیمے لہجے میں اس وجود پر سے نظریں ہٹا کر بولی۔

"میں بے سکون ہوں۔"

"خدا آپ کو سکون دے۔" وہ بولی۔

"میں نے غلط کیا۔۔۔ بہت غلط۔" ان جانے پچھتاوے نے اس وجود کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔

عفت خاموش رہی۔

"میں نے بہت غلط کیا۔"

"خدا سے دعا کریں۔۔۔ اس طرح پریشان نہیں ہوتے۔" سنجیدہ لہجے میں عفت اس مرتبہ بولی۔

"کیا دعا کروں خدا سے کہ خدا میں نے ظلم کیا۔ میں ظالم ہوں مجھے معاف کر دے۔"

"وہ رحیم ہے۔"

"وہ رحیم ہے لیکن میں نے رحم نہیں کیا۔"

"خدا اور انسان میں فرق ہے۔"

"میں نے انسان ہو کر بھی کوئی ایسا کام نہیں کیا کہ خدا مجھ پر رحم کرے۔"

"آپ خدا سے دعا کریں۔"

"تم ہی دعا کرو خدا سے وہ مجھ پر رحم کرے۔ میرے دل میں رحم ڈالے۔ تم خدا سے کہو میری تو نہیں سنتا وہ تمہاری سن لے گا۔" اس وجود نے عفت کو منت بھرے انداز میں دیکھا۔

"حوصلہ کرتے ہیں اس طرح پریشان نہیں ہوتے۔" ایک گہری سانس لیے عفت ہنوز لہجے میں بولی۔

"تم کس مٹی سے بنی ہو۔ اپنے اوپر ظلم پر صبر کرتی ہو۔ ظالم کے دل میں رحم کے لیے دعا کرتی ہو جو تمہیں پریشان کرتے ہیں ان کو حوصلہ دیتی ہو۔ ڈوبتے ظالم انسان کو امید کے کنارے کا سہارا دیتی ہو۔" اس کی بات کے جواب میں وہ وجود تڑپ کر بولا۔ جواب میں ایک طویل خاموشی تھی۔ عفت نے نگاہ جھکا کر گود میں دھرے دونوں ہاتھوں پر جما دیں۔

"تم آج بھی ویسی ہی ہو۔ محکوم تھیں تب بھی ظلم سہ کر صبر کیا۔ عاجزی اختیار کی آج حاکم بن کر بھی انکساری کا دامن پکڑے ہو۔ کس مٹی سے خدا نے تمہارا ضمیر اٹھایا ہے۔" اس وجود کے لہجے میں حیرت کے جہاں پوشیدہ تھے۔

"تم سے معافی مانگنے آیا تھا اپنے کیے کی۔" جواب میں وہ خاموش ہی رہی مگر اس مرتبہ کی خاموشی پہلے کی خاموشی سے فرق تھی۔

"مجھے معاف کردو۔ مجھ سے بھول ہوئی۔" جواب میں ابھی بھی ہنوز خاموشی تھی۔ بہت سے پل بیت گئے کہ اس کے کانوں نے قدموں کی آواز کو اپنے سے دور ہوتے سنا تھا۔ پھر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ بہت سے پل وہ یونہی پلکیں جھکائے بیٹھی رہی کہ کمرے میں غیر معمولی خاموشی نے اسے نگاہ اٹھانے پر مجبور کردیا تھا۔ کمرے میں طائرانہ نگاہ ڈالتے اس کی نگاہیں ٹیبل پر جمی رہ گئیں۔ آفس ٹیبل کے سائڈ دراز میں سے اس نے شولڈر بیگ اٹھایا اور سیکریٹری کو آفس روم کو لاک کرنے کی ہدایات دیتی وہ باہر نکل آئی۔ بلیک مرسیڈیز کو گیراج سے سڑک پر ڈالتے ہوئے اس نے گاڑی کو گھر کی جانب جاتی سڑک پر ڈالا۔

☆ ☆ ☆

سفید گیٹ کے سامنے بلیک مرسیڈیز کے بریک چرچرائے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اس کا ہاتھ اسٹیئرنگ کے ہارن پر پڑا تو اٹھنا ہی بھول گیا۔ لگاتار ہارن کی آواز پر پھرتی سے چوکیدار آیا دروازے کے اوپر سے دیکھ کر تسلی کی اور پھر مستعدی سے مین گیٹ کھول دیا۔ گاڑی گیراج میں پارک کرتے ہی اس نے "ہینڈ بریک پر الٹے ہاتھ کو دھرے ڈرائیونگ سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا اس لمحے وہ عجیب سی ذہنی کشمکش کا شکار تھی۔ کاندھے پر سائیڈ سیٹ پر پڑا شولڈر بیگ ڈالے دروازہ کھولے وہ گاڑی سے نکل آئی کہ اسے گاڑی سے نکلنا تو تھا ہی گھر کا اندرونی مین گیٹ کھولے وہ راہداری میں داخل ہوئی۔ دروازہ بند کرکے وہ پلٹی۔ اس کے قدم لمحے بھر کو زمین پر جم سے گئے۔

"یہ کیا ہوگیا...؟" ایک سوچ اس کے ذہن کے پردے پر ابھری۔ اگلے پل اس نے قدم بڑھایا... ایک قدم اگلا قدم اس سے اگلا قدم اور پھر اس کے ذہن میں آتی اگلی سوچ نے اس کے اٹھتے قدموں کو پھر سے زمین پر جکڑ دیا۔

"ایسے کیسے ہوسکتا ہے۔" ایک گہری سانس لیے غائب دماغی کی حالت میں اپنے اطراف میں نگاہ ڈالی۔ اور پھر قدم اٹھاتے وہ اندر کی جانب بڑھی۔ اب اس کے قدم راہداری سے گزر کر دائیں جانب ایک کمرے کے دروازے کے سامنے آکر ٹھہر گئے۔ نظریں لکڑی کے بند دروازے پر ڈالیں اور اگلے لمحے وہ دروازے کا ہینڈل گھمائے کمرے میں داخل ہوچکی تھی اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سرسری انداز میں نگاہیں ڈالیں۔ اس کی نگاہوں کو کسی وجود کی تلاش تھی۔ وہ وجود اسے کمرے کی بیرونی کھڑکی کے سامنے کھڑا نظر آیا۔

سرمئی شلوار قمیص میں کندھے پر براؤن شال دھرے وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا وہ قدم اٹھاتی اس کے

قریب چلی آئی۔ کچھ بولنے کو اس کے ہونٹ بے چین ایک احساس نے اس کی آواز پر قفل ڈال دیے۔ دل میں ابھرتے اس احساس نے اس کے خیال کے پیروں پر بیڑیاں ڈالی تھیں۔ ایسا احساس جو اس وقت اس کے اور کمرے میں پہلے سے موجود وجود کے درمیان کسی تیسرے کی حیثیت سے کھڑا تھا۔

"کیا کروں... پوچھ لوں۔"

"مجھے پوچھنا چاہیے۔"

"نہیں..." اگلے لمحے اس کے دل نے حریف کی حیثیت اختیار کی تھی۔

"نہیں۔ پوچھنے کی غلطی نہ کرنا۔ پوچھنا ٹھیک نہیں۔ جو بات ذہن میں ہے اسے ذہن تک ہی محدود رہنے دو۔" اس نے ایک گہری کھوجتی نظر سامنے کھڑے وجود کے چہرے پر ڈالیں۔ بازی آج بھی مات تھی۔ فاتح آج بھی اس کا دل تھا۔ اس کے ذہن پر دل کی فتح کا پلڑا بھاری تھا، لیکن... اس کا دل فاتح ہو کر بھی مات کھا گیا تھا۔ اس کے دل کی فتح کو شکست میں بدلنے والا سامنے کھڑے وجود کا ذہن تھا۔ اس وقت اس کے دل و دماغ پر ایک طلسم کی کیفیت طاری تھی۔

"کیسی ہو؟" اس دو حرفی جملے کو سنتے ہی بے اختیار اس کی پلکیں جھکی تھیں۔ طلسم ٹوٹ گیا تھا اس نے دل کی ہار کا واضح اعتراف ماننے سے بہتر، نظریں جھکا کر چہرہ چھپا لینے سے کیا۔

"خوش ہو۔" اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اگلے پل جھکے سر پر وزن محسوس ہوا۔ بے ساختہ ہی اس نے جھکی نگاہیں اٹھائیں اس کی نظریں پھر سے مدمقابل وجود کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ اپنے چہرے پر دنیا جہاں کی حیرت لیے اس نے سامنے والے کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔

"خوش رہا کرو۔" تقریباً" آدھا گھنٹہ پہلے ایک وجود نے اس سے کہا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے۔ اب ایک وجود اس کے سامنے کھڑا اس سے اس کی خوشی کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔ اس نے اپنے سر پر دھرے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اب وہ جھکے سر سمت دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں قید مدمقابل کے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔ یہ انداز... یہ احساس... آج بھی ویسا ہی ہے۔ آج بھی کچھ نہیں بدلا۔ کیا اسے معلوم ہے کہ آج آفس میں اس سے ملنے کون آیا تھا؟

اس نے اپنے ذہن کے مطابق حساب لگانا چاہا، لیکن وہ فیصلہ نہیں کرپائی تھی اسے جب معلوم ہوگا تو کیا تب بھی اسے میری خوشی کا اتنا ہی خیال ہوگا۔ ایک اور سوچ نے اس کے ذہن و دل کو الجھایا۔ وہ اس کا ہاتھ چھوڑے خاموشی سے پیچھے ہٹی، پلٹی اور کمرے کا دروازہ بند کیے وہ دھیمے قدم اٹھاتی کچن میں چلی آئی۔ فریج کھول کر منرل واٹر کی ٹھنڈی بوتل اپنے منہ سے لگاتے ہوئے اس نے ٹھنڈک کی ایک لہر اپنے منہ سے معدے میں اترتے محسوس کی۔ ٹھنڈک کی لہر نے اس کے دہکتے وجود کو خاصا سرد کیا تھا، لیکن اس کی روح ابھی بھی تمازت کے احساس سے جل رہی تھی۔

کچن سے نکل کر وہ اسٹڈی روم میں چلی آئی دائیں

کندھے پر جھولتا شولڈر بیگ اس نے قریبی زمین پر ہی گرا دیا۔ پیروں کو جوتوں کی قید سے آزاد کرتے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ سے اپنے وجود پر پھیلا دوپٹا اتار کر فرشی کشن پر پھینکا۔ وہیں زمین پر چوکڑی کے انداز میں بیٹھ کر اس نے ننگے فرش پر اپنے جوتوں کی قید سے آزاد پاؤں کی انگلیوں کو حرکت دے کر آرام دینے کی کوشش کی۔ اپنے گھٹنوں پر دونوں بازوؤں کی کہنیاں ٹکائے سر کو دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں قید کیے وہ کسی انجانی سی سوچ میں غلطاں تھی۔

"مجھے اعتبار ہے۔" بہت سال پہلے اس کے کانوں نے یہ جملہ سنتے ساتھ ہی روح کو جی اٹھنے کی خبر دی تھی۔

☆ ☆ ☆

باہر کا دروازہ کھٹکا تھا۔

"جاؤ دیکھو کون ہے دروازے پر۔" کچن میں ہنڈیا پکا کر سلیمہ بیگم نے عفت کو آواز لگائی جو ساتھ کے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی اپنے اردگرد کتابیں بکھرائے پڑھنے میں مشغول تھی۔

"اچھا امی جی۔ دیکھتی ہوں۔" کھلی کتاب پر ہنوز سر دیے اس نے جواب دیا اور پھر بیڈ سے اتر کر جوتے پہنتی باہر صحن میں نکل آئی۔

"پہلے پوچھ لینا۔۔۔ کون ہے۔۔۔ پھر دروازہ کھولنا۔" سلیمہ بیگم نے کچن میں ہنڈیا میں ڈوئی ہلاتے صحن میں دروازے کی جانب جاتی عفت کو دیکھا۔

"جی۔۔۔ کون۔۔۔؟" وہ دروازے کے قریب آکر قدرے اونچی آواز میں بولی۔

"میں روشن ہوں۔ استاد کریم دین کا بیٹا۔" دروازے کی دوسری جانب سے آواز سنائی دی۔

"جی کہیے۔" عفت نے کنڈی کھول کر ہلکے سے دروازے کا پٹ وا کیا اور درز میں سے پوچھا۔

"میں ابا کا پتا کرنے آیا تھا یہاں تو نہیں آئے۔"

"نہیں۔"

"اچھا۔۔۔ آپ چچا جان کو بلا دیں۔" اس کا جواب سن کر وہ بولا۔

"وہ ابھی اسکول سے واپس نہیں آئے۔" عفت نے اطلاع دی۔

"لیکن چار بج رہے ہیں۔"

"آج دیر سے آنا تھا انہوں نے۔"

"دیر سے کیوں؟" روشن کا لہجہ استفہامیہ تھا۔

"آج میٹنگ تھی اسکول میں۔۔۔ سٹی برانچ سے کچھ سینئر ٹیچرز نے آنا تھا یہاں وزٹ کے لیے آپ وہیں پتا کرلیں" تایا کریم وہیں ہوں گے۔" عفت اس کے سوال کے جواب میں وضاحتی انداز میں بولی۔

"اوہ۔۔۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ پچھلے ہفتے تو ابا نے مجھے فون پر بتایا تھا۔" روشن اس مرتبہ آہستہ آواز میں بولا گویا انداز خود کلامی کا تھا۔

"اصل میں، میں ابھی کچھ دیر پہلے ہی شہر سے واپس آیا ہوں۔ ابا گھر پر نہیں تھے اور اماں بھی نہیں تو میں سیدھا یہیں چلا آیا۔" اب وہ کہہ رہا تھا۔

"تایا جان تو یہاں نہیں ہیں۔ تائی بازار گئی ہوں گی۔ آپ کچھ دیر انتظار کریں آجائیں گے۔"

"جی شکریہ! خدا حافظ۔" اس کے جانے کے بعد عفت نے دروازے کی کنڈی لگائی اور واپس کمرے میں چلی آئی۔

"کون تھا؟" سلیمہ بیگم کی کچن سے آواز آئی۔

"تایا کریم کا چھوٹا بیٹا۔۔۔ روشن" تایا کا پوچھ رہا تھا۔

"ہم کہاں چلیں۔" سلیمہ بیگم اب کچن سے نکل آئیں۔

"میں سونے جارہی ہوں۔" وہ کتابیں سینے سے لگائے کمرے سے نکلتے ہوئے بولی۔

"ابا آئیں تو انہیں روشن کا بتا دیجیے گا۔ میں تھوڑا آرام کرلوں پھر شام میں اٹھ کر پڑھائی شروع کرنی ہے۔" وہ صحن میں چلی آئی اور کتابیں وہیں پڑے میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

"روز ہی تو شام میں پڑھائی کرتی ہو۔ کون سا نئی پڑھائی شروع کرنے والی ہو۔" سلیمہ بیگم اس کے پیچھے پیچھے صحن میں آگئیں۔

"امتحان سر پر آرہا ہے۔ اس بار بی اے کے پیپرز ہیں بہت مشکل امتحان ہے۔" وہ صحن کی ایک جانب رکھے پانی کے کولر سے پانی کا گلاس بھرتے ہوئے بولی۔

"ڈیٹ شیٹ آگئی؟" سلیمہ بیگم نے پوچھا۔

"ابھی دو ماہ ہیں اندازا"۔ تاریخ فکس تو نہیں ہے' لیکن امی آپ کو پتا ہے نا کورس کتنا ٹف ہے۔ ایف اے فائنل ہی میں بہت مشکل ہوئی تھی اس بار تو بی اے فائنل ہے۔" یہ کہتے ساتھ ہی اس نے پانی سے بھرا گلاس منہ سے لگایا۔

"اللہ خیر کرے گا۔ جاؤ جاکر آرام کرو۔"

"اور ابا آئیں تو ان سے میرے ٹیوٹر کا پوچھ لیں۔" خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے عفت بولی۔

"کون سا ٹیوٹر؟"

"آپ کو نہیں علم.... میں نے ابا سے بات کی تھی۔ انگلش ٹیوشن کے لیے کوئی ایک ماہ کے لیے انتظام ہوجائے تو۔ آج اسکول کی سینٹرل برانچ سے ٹیچرز نے آنا تھا میں نے ابا کو کہا تھا کہ ان سے بات کریں کوئی پڑھانے پر راضی ہوجائے۔"

"ہوں.... کرلوں گی بات۔"

"کیا ہوا گئی نہیں سونے۔" اسے یونہی میز کے قریب کھڑے دیکھ کر سلیمہ بیگم بولیں۔

"وہ امی سوچ رہی تھی ابا کا انتظار کرلوں۔ ان سے ٹیچر کا پوچھ کر پھر سوؤں گی۔"

"جاؤ بیٹا آرام کرو۔ جب تمہارے ابا آئیں گے تو میں ان سے پوچھ لوں گی۔ نجانے کب آئیں آج میٹنگ ہے تو دیر سویر ہوجاتی ہے' کتنی دیر انتظار کروگی۔" عفت ان کی بات سن کر صحن سے ملحقہ اپنے بیڈ روم میں چلی آئی۔

☼ ☼ ☼
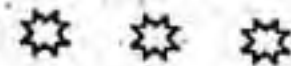
شام گئے اجمل سعدی صاحب واپس لوٹے تو وہ ان کے پاس چلی آئی۔

"السلام ابا۔"

"وعلیکم السلام۔"

"آج آپ دیر سے لوٹے۔" ہاتھ میں پکڑا چائے سے بھرا کپ ان کو پکڑاتے وہ بولی۔

"ہوں۔"

"میٹنگ کیسی رہی؟" ان کے قریب ہی موڑھا رکھ کر وہ بیٹھ گئی۔

"آج کی تو ٹھیک رہی۔ اگلے ہفتے پھر ہوگی۔" اجمل سعدی چائے سے بھری پیالی ہونٹوں سے لگاتے بولے۔

"اگلے ہفتے؟" عفت نے سوال کیا۔

"کچھ ذاتی مصروفیات کی بنا پر تین ٹیچرز نہیں آسکے آج۔" اس کے سوال کے جواب میں اجمل سعدی بولے۔

"آپ نے میرے لیے بات کی۔ انگلش ٹیچر کی؟"

"آج تو مینجمنٹ نے دو ٹیچرز کو اپائنٹ کیا ہے۔ ان میں سے بھی ایک نے معذرت کرلی ہے۔ دونوں ہی اردو سبجیکٹ کے لیے ہیں۔ اگلی میٹنگ میں انگلش سبجیکٹ کے ٹیچرز کی سلیکشن ہوگی پھر بات کروں گا۔" اجمل سعدی نے وضاحتی جواب دیا۔

"کیوں ابا.... ؟ گورنمنٹ اسکول کی گورنمنٹ جاب۔ ساتھ میں رہائش الگ۔ ہر ماہ شہر آنے جانے کی سہولت کے لیے ٹرانسپورٹ مفت.... یہ بھی تو زیادہ ہے تین ہزار سینٹرل برانچ سے۔ اچھی بھلی تو نوکری ہے اور کیا چاہیے انہیں۔" وہ حیران ہوئی۔

"سینٹرل سٹی میں رہائش پذیر لوگ یہاں جاب کرنا بہت کم پریفر کرتے ہیں۔ اب اس کی وجہ تو تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔" اجمل سعدی کی بات سو فیصد درست تھی۔ اس نے تائیدی انداز میں سرہلایا۔

"جی جانتی ہوں۔ کون آنا چاہتا ہے شہر کی رنگا رنگ زندگی سے دور یہاں... لیکن ابا اب ہمارا علاقہ شہر سے اتنا دور بھی نہیں رہا۔ میٹرو نے فاصلہ خاصا کم کردیا ہے میٹرو کے ساتھ ملحقہ سڑک بھی پکی ہونے کی وجہ سے اپنی کنونس پر بھی دو گھنٹے کا سفر ہے۔ سینٹرل لاہور سٹی تک مصطفیٰ آباد کا۔"

"اب خود ہی دیکھ لو۔ تمہیں بھی تو لاہور سینٹرل برانچ سے ہی انگلش ٹیوٹر چاہیے۔" خالی کپ قریبی میز پر رکھتے ہوئے اجمل سعدی قدرے مسکرائے۔

"ابا۔ اس وقت یہاں پر موجود ٹیچرز کو جتنا آتا ہے ان سے زیادہ مجھے آتا ہے' لیکن امتحانی پرچے کے لحاظ سے کچھ کمی سی ہے۔" اس کی بات میں دم تھا اسی لیے کچھ دیر کو اجمل سعدی خاموش ہوگئے انداز سوچتا ہوا تھا۔

"یہ اپنا کریم دین کا بیٹا ہے نا روشن... کہو تو اسے کہوں۔ ایم اے انگلش کرکے آیا ہے لاہور یونیورسٹی سے۔ ابھی پڑھائی سے فارغ ہے۔ رزلٹ کا انتظار ہے۔ آج ہی شہر سے لوٹا ہے' تمہیں پڑھائی میں ہیلپ ہوجائے گی۔" کچھ دیر بعد انہوں نے ہونٹوں کی خاموشی کا قفل توڑا۔

"لیکن ابا تائی نے تو بتایا تھا بزنس فنانس میں ڈگری لی ہے۔" اجمل سعدی کی بات سن کر وہ الجھن بھرے انداز میں ان کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

"ڈگری تو بزنس فنانس میں لی ہے' لیکن پڑھائی کے شوق نے ایم اے انگلش بھی کروادیا۔"

"نہیں ابا۔ اچھا نہیں لگتا۔ تایا جان کیا سوچیں گے ابھی ان کا بیٹا امتحان سے فارغ ہوا نہیں کہ پھر پڑھائی میں الجھادیا۔" وہ جھجکی۔

"تم اس کی سوچنے کو چھوڑو۔ یہ میرا اس کا معاملہ ہے' میں نے بھی اس کے بہت کام کیے ہیں۔ وہ انکار نہیں کرے گا۔ میں بات کروں اس سے؟"

"ابا۔ ابھی رہنے دیں۔ میں آپ کو بتادوں گی۔" عفت گومگو کی کیفیت میں بولی۔

یہ اس کا روشن سے مختصر سا تعارف تھا۔ جو گاہے بگاہے اور کبھی کبھی کریم دین کی بیوی کی زبانی اس نے گفتگو کے درمیان سنا تھا۔

"سویرا کے بی ایڈ کے پیپر کب ختم ہونے ہیں۔" اجمل سعدی نے بات کا رخ موڑتے ہوئے گفتگو کا ایک اور موضوع تلاش کیا۔

"اور ہاں ابا یاد آیا۔ کل آپی کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ کو بتادوں کہ اگلے پیر کو ان کا آخری پرچہ ہے۔ مجھے تو امی کو بھی بتانا یاد نہیں رہا۔" بے ساختہ ہی وہ اپنا دایاں ہاتھ ماتھے پر مارتے ہوئے بولی۔ پھر خالی کپ میز پر سے اٹھا کر کمرے سے نکل آئی۔

"امی کل دوپہر آپ سو رہی تھیں تو آپی کا فون تھا ہوسٹل سے۔" کچن میں موجود سلیمہ بیگم کو وہ سویرا کے ٹیلی فون کے بارے میں تفصیل بتانے لگی۔ اجمل سعدی اور کریم دین مصطفیٰ آباد کے ایک گورنمنٹ اسکول میں پچھلے دس سال سے تدریس کے شعبے سے منسلک تھے۔ اسکول میں اور بھی استاد اسی علاقے سے تعلق رکھتے تھے' لیکن یہ دونوں اور ان کی بیگمات دلی طور پر ایک دوسرے کے زیادہ قریب تھے۔ ایک سال پہلے ہی تجربے کی بنیاد پر اجمل سعدی کی پرنسپل کے عہدے پر پروموشن ہوئی تھی۔ اجمل سعدی کی دو بیٹیاں بڑی سویرا اور چھوٹی عفت تھیں اور کریم دین کے دو بیٹے بڑا عدیل اور چھوٹا روشن تھا۔

☼ ☼ ☼

دو ماہ کا عرصہ کتنی جلدی گزر گیا تھا کہ وہ خود سوچنے بیٹھی تو حیران ہوئی تھی آج کل اس کے پیپرز زور و شور سے چل رہے تھے کہ ایک شام کریم دین اپنی بیوی کے ہمراہ ان کی طرف چلے آئے۔ ان کی آمد ایک نئے رشتے کی بنیاد کی امید لیے ہوئے تھی وہ سویرا کے لیے اپنے بڑے بیٹے عدیل کا رشتہ لے کر آئے تھے۔ عدیل

پچھلے چار سال سے سعودیہ نوکری کے سلسلے میں مقیم تھا۔ گزرے چار سالوں میں اس کے دو چکر تقریباً" سال ڈیڑھ کے فاصلے سے ایک ایک ماہ کے لیے پاکستان کے لگے تھے۔ اگلے ماہ اس کی ایک ماہ کی چھٹی پھر سے منظور ہو چکی تھی۔ وہ سعودیہ میں کسی الیکٹرک کمپنی پر خاصی اچھی پوسٹ پر تھا اس کا اندازہ پچھلے تین سالوں میں کریم دین کے گھر کے بدلتے حالات کو دیکھ کر کیا جاسکتا تھا۔ سعودیہ جانے کے ایک سال تک تو اسے وہیں سیٹ ہونے میں لگے تھے اور پھر ایک سال بعد ہی وہ تقریباً" ہر تین ماہ بعد ایک لگی بندھی رقم اپنے ماں باپ کو بھیج دیتا تھا۔

"کیا ہوا۔۔۔؟ کچھ غلط کہہ دیا۔"

"نہیں کریم دین۔ ایسی بات نہیں ہے۔ بس اچانک سے تم لوگ آئے ہو تو سمجھ نہیں آرہی۔" اجمل سعدی خاصے گڑبڑائے تھے۔

"مجھے کچھ وقت چاہیے سوچنے کے لیے۔ اور میں سویرا سے پوچھے بنا کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔" کریم دین اور ان کی بیگم کے یوں اچانک چلے آنے اور اپنے بیٹے عدیل کے لیے ان کی بیٹی سویرا کو مانگنے پر وہ ایک لمحے کو جہاں خوش ہوئے وہیں ایک پریشانی نے ان کے دل کو گھیرے میں لے لیا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن کریم دین آف پریڈ میں اجمل سعدی سے ملنے پہنچ گئے۔

"میں کل گھر میں تجھ سے کھل کر بات نہیں کرسکا۔" اجمل سعدی کے آگے کریم دین نے تمہید باندھی۔

"ہاں۔۔۔ ہاں بولو کریم دین۔" اجمل سعدی سنجیدگی سے ہمہ تن گوش تھے۔

"میں سویرا اور عدیل کے رشتے کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا ہوں۔" یہ کہتے ساتھ ہی کریم دین نے بات بڑھانی چاہی۔

"میں کچھ کشمکش و پیچ میں ہوں۔" اس کی بات کے

مطلب کی تہ تک پہنچتے ہوئے اجمل سعدی صاف گوئی سے بولے۔

"ہوں۔ جانتا ہوں۔ عدیل کو لے کر تمہارے دل میں خاصے خدشے ہیں۔" جواب میں اجمل سعدی خاموش سر جھکائے بیٹھے رہے۔

"میں عدیل اور سویرا کے رشتے کی گارنٹی تو نہیں دے سکتا، لیکن اپنی پرورش پر فخر ضرور ہے جب تمہاری بھابھی نے عدیل کے سلسلے میں سویرا کی جانب اشارہ کیا تو بہت دن تک میں بھی خاموش رہا۔ تمہاری میری دوستی کم کم از کم دس سال کا عرصہ تو ہو گیا ہے اور ان دس سالوں میں عدیل کی زندگی کے چھ سال اسی گاؤں میں گزرے ہیں۔ مانا کہ وہ تعلیم کے سلسلے میں ہوسٹل رہا، لیکن گھر تو اس کا آنا جانا رہتا تھا۔"

"چار سال سے نظروں سے دور ہے۔ عجیب سے واہمے ستاتے ہیں۔" اجمل سعدی ابھی گومگو کی کیفیت میں تھے۔

"چھوٹے روشن کو ہی دیکھ لو۔ دونوں ہی میری اولادیں ہیں۔ دونوں ہی میری تربیت میں پلے بڑھے ہیں اور پھر عدیل تو بڑا ہے تین سال روشن سے۔ اس کی عادتیں تو تمہارے سامنے کی ہیں اگر سویرا سے دو سال چھوٹا نہ ہوتا تو۔۔۔ میرے لیے تو عدیل ہو یا روشن دونوں برابر ہیں۔" کریم دین تسلی آمیز لہجے میں یقین سموئے بولے۔ انہیں دل سے سویرا کو بہو بنانے کی خواہش تھی۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ بس بیٹی کا باپ ہوں تو ایسے ہی کچھ ڈر سا گیا ہوں۔ مجھے اندازہ تھا پہلے سے ہی اس بات کا۔ اسی لیے میں نے آج تم سے کھل کر بات کی ہے۔" اجمل سعدی جلد بازی کے فیصلے میں کشمکش و پیچ کا شکار تھے، لیکن کریم دین سے کھل کر بات کرنے پر کافی اندیشے عدیل کی ذات کو لے کر کہیں دل کے کونے میں ہی دفن ہو گئے۔ سویرا سیدھی سادھی نیک خو لڑکی تھی۔ اجمل سعدی کے پوچھنے پر اس نے خاموشی اور فرمانبرداری سے ہاں میں سر جھکا دیا تھا۔ عدیل نے اگلے ماہ پاکستان آنا تھا۔ ارادہ تھا کہ واپسی پر سویرا کو بھی ساتھ ہی بھیجا جائے۔ اس لیے طے پایا کہ نکاح ٹیلی فون پر پڑھا دیا جائے۔ تاکہ ویزا پیپرز کو بھی وقت ضائع کیے بنا پراسز میں لایا جا سکے۔

ابھی خوشیوں نے ان کے گھر کا راستہ بھی ٹھیک سے تلاش نہیں کیا تھا کہ غموں کی گہری آندھی نے ان کے دونوں گھرانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ عدیل نے اجمل سعدی کی جائیداد میں سویرا کے حصے کا مطالبہ کر دیا تھا۔ کریم دین اپنے بیٹے کے اس عجیب سے مطالبے پر اجمل سعدی سے شرمندہ تھے۔ اپنے دونوں بیٹوں کی تربیت پر انہیں ناز تھا، لیکن عدیل نے پل میں کیا پینترا بدلا کہ وہ اجمل سعدی سے نظر ملانے کے قابل نہ رہے تھے۔

"میں تم سے شرمندہ ہوں۔"

"ارے بچے ہیں۔ ایسی ضدیں لگا لیتے ہیں۔"

"عدیل بچہ نہیں ہے۔ مجھے تو سمجھ نہیں آ رہی کہ اس کے دماغ میں یہ بات کیسے آئی ہے۔ میں ٹیلی فون پر اپنے طور پر بہت کوشش کر چکا ہوں سمجھانے کی۔ اب پاکستان آئے تو سامنے بٹھا کر بات کروں۔"

"تم پریشان نہ ہو کریم دین۔"

"پریشانی کی بات ہے اجمل۔۔۔ میں نے سویرا کو بیٹی سمجھا ہے۔ رب نے مجھے بیٹی نہیں دی یہ خواہش کبھی دل میں آئی تھی۔ مجھے معلوم ہوتا عدیل ایسا کرے گا تو میں تم سے رشتہ داری جوڑنے سے پہلے ہزار مرتبہ سوچتا۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی کم از کم ٹیلی فون پر نکاح نہ ہوتا۔ میں پہلے عدیل کے پاکستان آنے کا انتظار کرتا۔ میں نے نکاح میں جلدی کی۔"

عدیل نے پاکستان آنے کی شرط رکھی تھی کہ جائیداد میں پہلے سویرا کے نام حصہ لکھا جائے۔ اجمل سعدی نے بہت سوچ بچار کے بعد سویرا کا حصہ اپنی زندگی میں ہی اس کے نام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کریم دین نے منع کیا، لیکن انہیں بیٹی کے رشتے کو بچانے کے لیے یہ شرط کوئی مہنگی نہ لگی تھی۔

"مجھے اس کے ارادے نیک نہیں لگ رہے۔" کریم دین عجیب مخمصے میں تھے۔

"کیا فرق پڑتا ہے کریم دین۔ آج نہیں تو میرے مرنے کے بعد تو سویرا اور عفت کا ہی سب کچھ ہے۔"

"طریقہ غلط ہے۔" کریم دین کا اعتراض بجا تھا۔

"تو کیا میرا مرنا ضروری ہے۔" اجمل سعدی نے قدرے مسکرا کر بات مذاق میں ٹالنی چاہی۔

"کیوں مذاق میں بات ٹال رہے ہو۔ عدیل اولاد میری ہی ہے۔ نکاح سے 'پہلے' میں نے ہی اس کی جانب سے تمہارے ذہن میں آتے خدشات کو صاف کیا تھا۔ اب میں ہی تمہیں اس کے چھپے ارادوں سے خبردار کر رہا ہوں۔"

☆ ☆ ☆
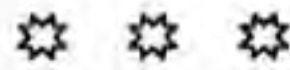
جائیداد سویرا کے نام منتقل ہوتے ہی شادی کی تیاریوں نے دونوں گھرانوں کے باسیوں کو مصروف کر دیا تھا۔ ابھی ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ عدیل کا پاکستان آنے کا پروگرام کینسل ہو گیا۔ عذر تھا کہ اس کی کمپنی کو کسی بزنس ڈیل میں نقصان ہوا ہے تو نتیجتاً" انہوں نے اپنے ورکروں کی چھٹیاں منسوخ کر دی ہیں۔ اس لیے سویرا کو یہاں سے بھیج دیا جائے۔ اگر اس کا انتظار کیا تو ایک سال مزید لگ سکتا ہے۔ اس خبر کے ساتھ ہی شادی کی تیاریاں ماند پڑ گئی تھیں۔ سب کے چہروں پر اداسی سی چھا گئی تھی، لیکن بہر حال کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اس طرح ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے تو کچھ بھی حاصل ہونے والا نہیں تھا۔

وہ دن بہت ہی جلد طلوع ہوا تھا۔ سویرا کو بائی ایر عدیل کے پاس جانا تھا، لیکن کسی کو علم نہیں تھا کہ اس اجلی صبح کی شام ان دونوں گھرانوں پر تاریکی کے بادلوں کی چھاؤں لانے والی ہے۔ ایئرپورٹ جاتے وقت ایک ٹرالر سے ٹیکسی ٹکرانے کی وجہ سے کریم دین اور سویرا موقع پر ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اجمل سعدی کو انتہائی زخمی حالت میں قریبی اسپتال میں آئی سی یو میں شفٹ کیا گیا، لیکن زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شام کے وقت وہ بھی خالق حقیقی سے جا ملے۔

ان تمام حالات میں عفت اور روشن کے کاندھوں پر بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ آن پڑا تھا۔ خود سنبھلنے اور ذمہ داریاں سنبھالنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ تھا۔

عفت نے اجمل سعدی کی خالی سیٹ کے لیے جاب کی درخواست دی تھی۔ یوں بھی اس وقت امتحان سے فارغ تھی۔ اس کی جاب صرف وقتی بنیادوں پر ہی اپروو ہوئی تھی کیوں کہ اس نے ابھی بی اے کے پرچے دیے تھے۔ سیٹ کی ریکوائرمنٹ کم از کم ایم اے تھی۔ جو بھی تھا اس وقت اپنے باپ کی سیٹ کے لیے جاب کی درخواست 'فرسٹ پرائٹی' کے طور پر منظور کر لی گئی تھی۔ اس شرط کے ساتھ کہ ایم اے کی ڈگری مقررہ معیاد میں جمع کرا کر اس پوسٹ کے لیے پرمننٹ بیسس پر اپائنٹ ہو سکتی ہے۔

روشن نے فنانس ڈیپارٹمنٹ کی پوسٹ کے لیے پہلے ہی لاہور میں دو تین مشہور کمپنیز کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا۔ اس نے ایم اے انگلش صرف شوق کی خاطر کیا تھا۔ وقتی طور پر اس نے بھی اسکول میں کریم دین کی سیٹ سنبھال لی تھی۔

اجمل سعدی نے زندگی میں دونوں دکانیں کرائے پر چڑھائی ہوئی تھیں جن کا کرایہ ہر ماہ آتا تھا۔ اجمل سعدی کی وفات کے بعد کرایہ داروں نے کرایہ دینے پر کچھ پس و پیش کی تھی روشن نے درمیان میں پڑ کر مسئلہ کو حل کیا تھا۔ کرایہ داروں کا خیال تھا کہ بیوہ اور ان کی بیٹی میں اتنی ہمت نہ ہوگی کہ وہ اپنے کرایہ کے حصول کے لیے زیادہ تگ و دو کریں۔

اب روشن کی ہر ماہ ذمہ داری تھی کہ وہ دکان داروں سے کرایہ لے کر سلیمہ چچی کو گھر دینے آتا تھا۔ اس وقت دونوں ایک ہی اسکول میں جاب کر رہے تھے، لیکن دونوں خاصے لیے دیے رہتے تھے۔ پھر بھی عفت نے اس بات پر ایک مرتبہ اعتراض کرنے کی کوشش کی تھی اسے اچھا نہیں لگا تھا کہ اس کی ذمہ داری بلاوجہ روشن کے کندھوں پر ڈالی جائے، لیکن اس نے بہت خوش اسلوبی سے اس ذمہ داری کو نبھانے کی خواہش کی تھی۔ عفت کے اعتراض کے جواب میں وہ بولا تھا۔

"ابا عدیل بھائی کی بے جا جائیداد کی حصہ داری پر اجمل چچا سے خاصے شرمندہ تھے۔ انہیں عدیل بھائی سے شکوہ تھا۔ اگر اس وقت وہ زندہ ہوتے تو تب بھی مجھے خود سے اس ذمہ داری کو نبھانے کو کہتے اور یہ کون سا ساری زندگی ایسا چلے گا۔ وقتی طور پر کرایہ دار تھوڑے اکڑے ہوئے ہیں۔ آہستہ آہستہ انہیں بھی سمجھ آجائے گی کہ اپنی دکان داری کرنی ہے تو کرایہ دینا لازمی ہے۔"

ابھی تین ماہ ہی گزرے تھے کہ دونوں گھرانوں میں ایک نئی کہانی نے جنم لینا شروع کیا۔

"تم نے کیا سوچا روشن کے بارے میں؟" سلیمہ بیگم نے اس کے قریب بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ کیا سوچنا ہے امی۔" اپنے لہجے میں لاپرواہی سموتے ہوئے عفت نے جواب دیا۔

"میں نے تم سے پچھلے ہفتے تمہاری فاطمہ تائی کے گھر آنے کا ذکر کیا تھا۔"

"ہاں تو ان کے شوہر کے دوست کا گھر ہے۔ وہ جب چاہے آئیں۔ انہیں آنے سے کس نے روکا ہے۔"

"عفت کیوں بات کو گھما پھرا رہی ہو۔" سلیمہ بیگم کھینچ تان کر اسے موضوع کی جانب کھینچ ہی لائیں جسے وہ اگنور کرنے کی کوشش میں تھی۔

"امی۔ اگر آپ کو میری باتوں سے سمجھ نہیں آرہی تو پھر سیدھے صاف الفاظ میں ہے کہ مجھے اس رشتے سے انکار ہے۔" عفت نے بھی جواب میں سیدھی اور دوٹوک بات کی۔

"وجہ؟" سلیمہ بیگم کا انداز استفہامیہ تھا۔

"امی۔ آپ کو ابھی بھی وجہ کی ضرورت ہے۔" عفت کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"ہاں۔ اگر روشن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو مجھے کسی وجہ کی ضرورت نہ پڑتی۔ نہ ہی تم سے پوچھنے کی میں خود ہی انکار کر دیتی۔" اس کی بات کے جواب میں سلیمہ بیگم وضاحتی لہجے میں بولیں۔

"روشن میں ایسی کیا بات ہے؟" عفت نے آنکھیں سکیڑیں۔

"بیٹا میں نے بھی زندگی برتی ہے۔ دنیاداری میں نے بھی نبھائی ہے۔ اچھی بری جیسی کٹی اور کٹ رہی ہے دلوں کے بھید جاننے کا دعویٰ تو نہیں، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں روشن شریف لڑکا ہے۔" گہری سانس لیے دھیمے لہجے میں سلیمہ بیگم نے جواب دیا۔

"آپ کا عدیل بھائی کے بارے میں بھی یہی کہنا تھا۔" اس کا لہجہ جتاتا ہوا تھا۔

"میں نے اس سے بات کی ہے۔ اس کی باتوں انداز اور طور طریقوں کو بہت غور سے دیکھا ہے۔ تمہارے ابا زندہ ہوتے تو شاید میں روشن کو تمہارے حوالے سے اتنا غور سے نہ دیکھتی، لیکن تمہارے ابا کے بعد میں زندگی میں پہلے سے کہیں زیادہ محتاط ہو گئی ہوں اور چاہتی ہوں کہ میرے بعد تمہیں زندگی میں مضبوط سائبان ملے۔ اس کے لیے مجھے روشن سے بہتر تمہارے لیے زندگی کا ساتھی نظر نہیں آتا۔" سلیمہ بیگم کا لہجہ ہنوز تھا۔

"تو گویا آپ فیصلہ کر چکی ہیں میرے روشن سے رشتے پر۔" عفت کے انداز میں انجانے خدشے کا احساس تھا۔

"نہیں۔ آخری فیصلہ تمہارا ہی ہو گا۔ تمہاری رضا مندی کے بنا میں یہ رشتہ قبول نہیں کروں گی۔" سلیمہ بیگم نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"آپ یہ مت بھولیں کہ وہ عدیل بھائی کا چھوٹا بھائی ہے۔" لہجے کی ناگواری نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا۔

"جانتی ہوں، بہت اچھی طرح۔" سلیمہ بیگم کا انداز سادگی لیے تھا۔

"تو پھر آپ کو یہ بھی پتا ہو گا کہ دونوں کے ماں باپ بھی ایک ہیں۔" لہجے کی ناگواری بنا کسی لگی لپٹی کے سلیمہ بیگم پر عیاں کی۔

"طنز کر رہی ہو؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ بلکہ آپ کو اس طرف اشارہ کر رہی ہوں۔ جہاں آپ کی نظر نہیں پڑی۔ آپ

روشن کو صرف اچھائی کی آنکھ سے دیکھ رہی ہیں۔"

"جہاں تک تربیت کی بات ہے تو مانتی ہوں دونوں بھائی ایک ہی ماں باپ کے زیر سایہ پلے بڑھے ہیں، لیکن ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ فطرت بھی ایک جیسی ہو۔ روشن کے اچھائی اور برائی کے ترازو کے دونوں پلڑوں پہ اس کی اچھائی کا پلڑا بھاری ہے۔"

"امی۔ ایک بیٹی اس گھر میں دے کر نتیجہ آپ بھگت چکی ہیں۔ ایک بیٹی جان سے گئی اب دوسری کو بھی اس گھر میں بھیجنا چاہتی ہیں؟" یہ کہتے ساتھ ہی عفت کی پریشانی پر ان گنت بل پڑ گئے۔

"بیٹی ان کے ہاتھوں جان سے نہیں گئی۔ اس کی قسمت میں اتنی ہی زندگی لکھی تھی' ہاں دکھ ضرور ملا وہ بھی نصیب کی باتیں ہیں۔ بہر حال مجھے روشن ہر لحاظ سے تمہارے لیے اچھا لگا ہے۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔ میرے خیال میں اس رشتے سے انکار سے پہلے تمہیں اس کی بات ضرور سن لینی چاہیے۔" اس کی بات ٹوک کر وہ کسی حتمی لہجے میں کہتی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی تھیں اور بہت سی سوچوں سمیت عفت کو کمرے میں اکیلا چھوڑ گئیں۔

☼ ☼ ☼
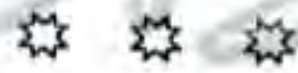
"امی نے بتایا تھا کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔" عفت گھر کی بیٹھک میں چلی آئی جہاں روشن پہلے سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ بغیر کسی سلام دعا کے وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔ میں نے ہی ان سے کہا تھا کہ مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" اسے سامنے پا کر روشن کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ کو لگتا ہے کہ میں آپ کی باتیں سن کر قائل ہو جاؤں گی۔" عفت نے کچھ فاصلے پر پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے بیٹھتے ساتھ ہی اس نے روشن کو بھی دوبارہ کرسی پر بیٹھتے دیکھا تھا۔

"مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔" اس نے روشن کو کہتے سنا۔

"ہاں اتنا ضرور سوچ سکتا ہوں کہ انکار کرنے سے پہلے سوچیں گی ضرور۔" روشن کا لہجہ پر اعتماد تھا۔ اجمل سعدی کی وفات کے بعد یہ اس کی اور روشن کی اکیلے میں دوسری ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات اس نے اسکول میں اسے اپنے آفس بلا کر کی جہاں اس نے کرائے کی وصولی کے سلسلے میں بات کی تھی۔

"مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے انکار ہے۔"

"میں نہیں جانتا کہ آپ میرے بارے میں کیا سوچتی ہیں' لیکن اتنا اندازہ ہے کہ عدیل بھائی کے رویے کے بعد میرے بارے میں کیا کچھ سوچا جا سکتا ہے۔" عفت کو لگا جیسے روشن نے اس کے انکار کو کوئی اہمیت نہ دی ہو۔

"میں یہ بھی نہیں جانتا کہ آپ اپنی آئندہ آنے والی زندگی کے بارے میں کیسا سوچتی ہیں' لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آپ کے ساتھ میری زندگی اچھی ضرور گزرے گی۔"

"اچھی زندگی کی ڈیفینیشن کیا ہے۔" بے ساختہ ہی اپنی زبان سے ادا ہونے والے جملے پر عفت کو خود بھی حیرت ہوئی۔

"جس میں خوشی میں کوئی ساتھ دینے والا ہو یا نہ ہو' لیکن غم میں اپنوں کا ساتھ ہو۔" نہایت ہی پر سکون انداز میں روشن بولا۔ اس کے ساتھ ہی روشن نے سامنے ٹیبل پر پڑے رجسٹر کو کھول کر ایک پیپر اس کی جانب بڑھایا۔ عفت نے اندازہ لگایا کہ وہ رجسٹر اپنے ہمراہ لایا تھا۔

"یہ کیا ہے۔"

"اسٹیمپ پیپر" مختصر الفاظ میں روشن نے جواب دیا۔

"اس میں لکھا ہے کہ آپ کے والد کی طرف سے آپ کو ملنے والی پراپرٹی پر صرف آپ کا حق ہے۔ اگر آپ کا مجھ سے نکاح ہوتا ہے تو میرا اس پراپرٹی اور دکانوں کے کرائے میں اور آپ کی کمائی کے پیسوں پر

کوئی حق نہیں ہوگا۔ آپ تسلی سے اسے پڑھ لیجیے گا۔ یہ مکمل ہے' میں نے اس پر سگنیچر کردیے ہیں۔ آپ کے سگنیچر ہونے باقی ہیں۔ عدیل بھائی کے غلط رویے کی وجہ سے آپ کے دل میں جو خدشات ہیں وہ بے معنی نہیں ہیں۔ ایسے حالات میں فطرتی طور پر آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو ایسا ہی سوچتا۔ اگر آپ کو میرا ساتھ منظور ہو تو اس اسٹیمپ پیپر پر سگنیچر کرکے اپنے پاس ہی سنبھال لیجیے گا۔" اس سے بات کرنے سے پہلے عفت کو اندازہ نہیں تھا کہ چند منٹ بعد ہی ان دونوں کے مابین سرسری گفتگو کسی سنجیدگی کے مرحلے میں داخل ہوجائے گی۔ اس کا خیال تھا وہ روشن سے ملے گی اسے انکار کرے گی اور وہ اس کا انکار مان لے گا۔

"عفت۔۔۔ دلوں کے بھید رب جانتا ہے۔ میرے دل میں جو کچھ ہے رب کے بعد مجھے علم ہے۔ آپ کے دل میں کیا کچھ ہے رب کے بعد آپ سے بہتر اس پوری دنیا میں کوئی نہیں بتا سکتا۔ کچھ خونی رشتے رب نے ہمارے لاشعور سے ہمارے ساتھ جوڑے ہوتے ہیں۔ کچھ رشتے ہمیں شعور کے بعد خود بنانے پڑتے ہیں۔ ان کے لیے اپنی سمجھ بوجھ کے ساتھ ماضی میں نبھائی دنیاداری' برتی دنیا کو دیکھ کر اپنے ذہن میں خود کیلکولیٹ کرنا ہوتا ہے۔" عفت کو روشن کا لہجہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ لگا۔

"میری کیلکولیشن کے مطابق مجھے آپ اپنے لیے زندگی کا بہترین ہمسفر لگی ہیں۔ انسان کے دل میں کیا ہے اسے برتے بنا پتا نہیں چلتا' میں آج کی تاریخ میں آپ کو اپنے لیے بہترین ساتھی کی سوچ لیے ہوئے ہوں۔ کیا معلوم آئندہ آنے والے وقت میں مجھے یہ ماضی کی سوچ غلط لگے۔ ہونے کو کچھ بھی ہوسکتا ہے' لیکن انسان کو آزمائے بنا اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔" کچھ پل کے لیے سہی' لیکن عفت کو صحیح معنوں میں اپنی قوت گویائی سلب ہوتے محسوس ہوئی تھی۔

"میں چلتا ہوں۔ آپ سوچ کر جو بھی فیصلہ کریں چچی جان کو بتا دیجیے گا۔ وہ اماں سے خود ہی بات کرلیں گی' لیکن اس بات کو ذہن میں رکھیے گا کہ آپ کا جواب کچھ بھی ہو۔ انکار یا پھر اقرار مجھے اس کا احترام ہوگا۔" یہ کہتے ساتھ ہی روشن اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"خدا نے ہر انسان میں اچھائی اور برائی دونوں پہلو رکھے ہیں۔ آپ کے بارے میں جب بھی سوچا اچھائی یا برائی کچھ بھی سمجھ نہیں آیا۔ کیوں کہ میں ابھی تک آپ کے بارے میں اتنا نہیں جانتا کہ کوئی ٹھوس رائے قائم کرسکوں' لیکن اتنا ہے کہ میں آپ پر اعتبار کرسکتا ہوں۔" وہ روشن کی باتوں سے قائل نہیں ہوئی تھی' لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اس کے پاس روشن سے بہتر آپشن نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ اسکول سے جلدی نکل آئی تھی۔ اس کے کندھے پر لٹکے بیگ پر اس کی ہاتھ کی سخت گرفت تھی۔ اس میں گھر کی رجسٹری کے پیپرز تھے۔ اجمل سعدی کی فوتگی کے بعد گھر میں رشتہ داروں کے ہجوم میں اس نے بہتر جانا کہ گھر کی رجسٹری اور دو دکانوں کے ضروری کاغذات وہ آفس لاکر میں رکھ دے اس کا خیال تھا مناسب وقت میں وہ واپس پیپرز گھر لے جائے گی۔

ابھی وہ گھر سے دور ہی تھی کہ اسے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ بے اختیار ہی اس نے مڑ کر دیکھا' لیکن اس کے پیچھے کوئی نہیں تھا بلکہ دوپہر کے اس وقت تو گرمی کی حدت سے چرند پرند بھی اپنے گھونسلوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ ایک انجانے احساس نے اس نے اٹھتے قدموں میں تیزی کی' یک دم ہی اس کے بیگ میں دھرے سیل کی بیل بج اٹھی۔ ہنوز قدم اٹھاتے اس نے بیگ سائیڈ سے اپنے سامنے کیا اور بائیں ہاتھ سے بیگ پکڑے دایاں ہاتھ بیگ میں ڈالا۔ موبائل اسکرین پر روشن کا موبائل نمبر جلتا اور بجھتا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے یس کا بٹن پش کیا۔

"ہیلو۔۔۔" فون کان سے لگایا۔

"عفت یہ میں ہوں۔ روشن۔ کال کیوں نہیں ریسیو کررہیں؟"

"ہاں بولو۔" اس نے روشن کی بات کا جواب نہیں دیا۔

"میری بات غور سے سنو۔" وہ عجلت میں بولا۔

"مجھے ابھی تمہاری بات نہیں سننی' میں گھر جارہی ہوں گری ہے۔ پیدل ہوں گھر پہنچ کر تم سے بات کرتی ہوں۔" اس نے کال کاٹ دی اور سہمی ہوئی نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لیا جو وہم اسے ستارہا تھا کہیں وہ روشن تو نہیں تھا' لیکن ابھی بھی اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔

گھنٹی دوبارہ بجی تھی۔ اور اس مرتبہ صحیح معنوں میں اس کے دماغ کو تپ چڑھی تھی۔ ابھی کل ہی تو اس کا مغز کھا کر گیا ہے ایک مرتبہ میں اسے کیوں نہیں بات سمجھ آتی۔ اس سے پہلے کہ وہ فون ریسیو کرکے اسے بے نقط سنانے ہی والی تھی کہ اس نے اپنے قریب بہت سے قدموں کی چاپ سنی اس کے قدم رک گئے تھے۔ موبائل فون کان سے لگا تھا' لیکن زبان تالو سے جا لگی تھی۔ چند لمحے پہلے کا وہم مجسم شکل بنے اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ عدیل اپنے دو دوستوں کے ہمراہ اس کے راستے میں استادہ تھا۔

"جی سالی صاحبہ۔۔۔ کہاں جارہی ہیں؟" عدیل واپس پاکستان ایک ماہ کی چھٹی پر آیا تھا اور جب سے آیا تھا اس کی اور سلیمہ بیگم کی جان کو آیا ہوا تھا۔ اچانک ہی عدیل نے اس کے کاندھے پر لٹکے بیگ کو ہاتھ ڈالا تو عفت کا چہرہ خوف کے رنگ میں نہا گیا۔ کان سے لگے فون کی بیل ابھی بھی بج رہی تھی۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر تھوک نگلا اور انجانے احساس میں گھرے اس نے یس کا بٹن پش کیا۔

"میری بات تو سنو۔۔۔ میں۔۔۔"

"روشن۔" اس لفظ کو ادا کرنے میں اسے کتنی ہمت درکار ہوئی تھی یہ وہی بہتر جانتی تھی' لیکن کچھ ایسا تھا اس کی آواز میں جس نے روشن کو جملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی قفل ڈال دیے تھے اور پھر چند ہی سیکنڈ کی خاموشی کے بعد فون لائن کٹ گئی تھی یا پھر کاٹ دی گئی تھی۔

"عدیل بھائی میرے راستے سے ہٹ جائیں۔" وہ سختی سے بولی۔

"سالی صاحبہ مجھ میں کہاں اتنی جرات کہ آپ کے راستے میں آؤں۔ اصل میں تو راستہ آپ نے میرا روکا ہوا ہے۔" یہ کہتے ساتھ ہی اس نے بیگ کو کھینچا تو وہ ایک جھٹکے سے اس کے کندھے سے اتر کر اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے اچکتا کسی نے جھپٹا مار کر اس کے ہاتھ سے بیگ اچک لیا تھا۔

"روشن تم یہاں۔۔۔" عدیل کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"جی بھائی جی۔۔۔ میں گھر جارہا تھا کہ دور سے آپ لوگوں کو کھڑے دیکھا تو یہیں چلا آیا۔" پرسکون انداز میں کہتے ہوئے اس نے بیگ عفت کو واپس پکڑایا تھا۔

"کیسی ہو؟" ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے وہ اس کی جانب دیکھ کر بولا۔ جواب میں وہ خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"سکول سے آرہی ہو؟ آج جلدی نکل آئیں گھر کے لیے۔ چلو میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ بہت دن ہوگئے چچی جان کو ملے ہوئے۔" وہ مسکراتے ہوئے بول رہا تھا' لیکن عفت کو لگا کہ وہ مخاطب اس سے تھا اور سنا اس کو رہا تھا جو اس وقت روشن کی بے وقت کی انٹری سے بنا بنایا کام بگڑتے خاصا بدمزا ہوا تھا۔

"اچھا عدیل بھائی۔ میں گھر آتا ہوں تو پھر گپ شپ کرتے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں کہ آج شام کی چائے اماں کے ساتھ اکٹھے پیتے ہیں۔" یہ کہتے ساتھ ہی اس نے قدم آگے بڑھائے تو نا محسوس انداز میں وہ بھی اس کے ساتھ چل پڑی۔

"میں تمہارے سیل فون پر صبح سے کال کرنے کی کوشش کررہا ہوں' لیکن تمہارا فون بند تھا۔ پھر اندازا "بارہ بجے فون آن ہوا تو تب سے تم فون ہی ریسیو نہیں کررہی تھیں۔" اور وہ چاہتے ہوئے بھی اسے یہ نہیں کہہ پائی کہ اسی کے فون اٹینڈ نہ کرنے کی خواہش

میں تو اس نے نو بجے سے فون آف کیا ہوا تھا کہ کل کی بحث کے بعد اس سے بچنے کا آسان حل اسے یہی نظر آیا تھا۔

کل رات کو روشن نے اسے کال کی تھی۔ وہ اس سے کہنا چاہ رہا تھا کہ اسے عدیل سے بچ کر رہنا چاہیے' لیکن جواب میں عفت نے اسے کھری کھری سنائی تھیں کہ عدیل اس کا بھائی ہے اسے ہر غلط فعل سے روکنے کا اختیار رکھتا ہے اور اگر وہ اسے کچھ نہیں کہتا تو وہ بھی اس کے ساتھ ہی اس کی جائیداد ہتھیانے میں پیش پیش ہے اس کے ساتھ رشتے پر پہلے ہی عفت کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑ چکا تھا۔ کبھی کبھی اسے اپنے خیال سے ہی انحراف ہونے لگتا تھا۔ وہ اجمل سعدی کی وفات کے بعد سے اس کا رویہ دیکھ رہی تھی۔ وہ ہر برے وقت میں اس کی ڈھال بن جاتا تھا۔ وہ ابھی اپنے مسئلے کا حل سوچ رہی ہوتی تھی کہ اسے پتا چلتا کہ روشن اس کا مسئلہ حل کر چکا ہے۔

"ہاں کہو میں سن رہی ہوں۔"

"مجھے کل ہی تم نے بتایا تھا کہ گھر کی رجسٹری کے کاغذات تم نے آفس لاکر میں رکھے ہیں اور وہ تم جلد ہی لے آؤ گی۔" عفت کو یاد آیا کہ کل رات روشن نے اسے اسکول میں میٹنگ کے بارے میں ریمائنڈر کے لیے کال کی تو اس نے اسے سرسری انداز میں بتایا تھا اور وہ عدیل کے حوالے سے اسے ڈانٹنے بیٹھ گئی تھی۔

"میں نے ...."

"ہاں۔" میں نے کل کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا۔ اس نے راستے میں آنے والے پتھر کو جاگر کی نوک سے ٹھوکر لگائی۔

"پہلے تو مجھے اس بات کا خیال نہیں آیا' لیکن بعد میں سوچا تو مجھے لگا کہ تمہارا ان پیپرز کو گھر لانا ٹھیک نہیں' میں صبح سے تمہیں اس لیے کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ تمہیں منع کر دوں' لیکن تمہارا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ پھر میں نے اسکول کے نمبر پر ٹرائی کیا تو تمہاری اسسٹنٹ نے بتایا کہ تم گھر کے لیے آج جلدی نکل گئی ہو۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم آج رجسٹری کے پیپرز گھر لانے والی ہو۔"

"تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟" وہ پوچھے بنا نہ رہ پائی۔

"تم وقت کی خاصی پابند واقع ہوئی ہو۔ جہاں تک میں نے تمہیں ان گزرے چند ماہ میں ابزرو کیا ہے اور یہ بھی کہ تم بہت پنکچوئیل ہو۔ بلاوجہ جاب سے چھٹی نہیں کرتیں اس لیے اگر تم آج اسکول سے پہلے نکل آئیں تو ضرور کسی اہم کام کے سلسلے میں نکلی ہو گی اور آج کل تمہاری زندگی کی ٹاپ پرائٹی (ترجیح) میرے خیال میں یہی ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں۔"

"تم نے مجھے بتایا تھا کہ پیدل راستے میں ہوں ویسے میں بھی تمہارے پیچھے ہی آرہا تھا۔ اسی لیے جلدی پہنچ گیا۔" عفت نے دل ہی دل میں اس کی ذہانت کا اعتراف کیا تھا۔

"اور ان تمام ضروری باتوں اور ضروری کاموں سے زیادہ ضروری ایک اور کام ہے اور وہ ضروری کام اب میری زندگی کی پرائٹی بن چکا ہے۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے روشن کو دھیمے لہجے میں کہتے سنا۔

"پرائٹی۔" عفت کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"تمہاری زندگی کی پرائٹی اس رجسٹری کی پروٹیکشن ہے اور میری زندگی کی پرائٹی میری ذات سے جڑے رشتوں کی سیفٹی ہے۔" اب کی بار روشن نے ایک نظر ساتھ چلتی عفت کے چہرے پر ڈالی۔

"اور آج کی تاریخ میں میری زندگی کا اس سے ضروری اور اہم کام اور کوئی نہیں ہے۔" وہ عفت کے چہرے سے نگاہ ہٹائے دوبارہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

"تمہیں اپنے تمام ضروری ڈاکومنٹس کسی لاکر میں رکھنے چاہئیں۔" چند لمحے بعد روشن نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔

"تمہارا لاکر ہے؟"

"نہیں۔" عفت نے نفی میں سر ہلایا۔ اب وہ دونوں چلتے ہوئے گھر والی گلی میں داخل ہوئے۔

"تمہیں کوئی بینک پسند ہے۔ آئی مین جہاں تم لاکر کھلوانا چاہو۔" اب وہ اس سے اس کی پسند پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔"

"میں کل صبح لاہور جارہا ہوں۔ شام تک واپسی ہے میں چچی جان سے پوچھ لیتا ہوں۔ تم میرے ساتھ ہی چلو۔ اپنا آئی ڈی اور ریجنل لے لینا۔ لاکر کھلوا کر وہیں پیپرز بھی رکھ دینا۔" گھر کے دروازے پر پہنچ کر روشن کے قدم رک گئے۔ گویا وہ اسے وہیں تک چھوڑنے آیا تھا اس کا محافظ بن کے۔

"میں تمہارے ساتھ کیسے جاسکتی ہوں؟" عفت نے کندھے اچکائے۔

"تم میرے نکاح میں ہو۔" روشن کی بات پر وہ ٹھٹکی۔ روشن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

✡ ✡ ✡
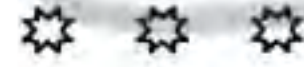
بینک لاکر کھلوا کر رجسٹری کے پیپرز رکھ کر بینک سے نکلتے اس نے اپنے ذہن سے کسی بوجھ کو سرکتے محسوس کیا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" روشن اس کے ساتھ چلتے ہوئے رکا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تمہیں یہاں کوئی اور کام تو نہیں۔ کوئی خریداری کرنی ہو۔"

"نہیں۔ بس اب گھر واپس چلتے ہیں۔"

"مجھے یہاں ابھی تھوڑا کام ہے اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو۔۔۔"

"نہیں۔ مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا۔"

"پھر چلیں پبلک سروس کمیشن کے مین آفس۔" عفت نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

"گورنمنٹ جاب کے لیے اپلائی کرنا ہے۔ بزنس اینڈ فنانس ڈیپارٹمنٹ میں جابز اناؤنس ہوئی ہیں پچھلے ہفتے۔"

"اب تو کینڈیڈیٹ آن لائن ہی جاب کے لیے اپلائی کرتے ہیں۔" عفت نے سرسری طور پر اسے بتایا۔

"ہاں۔ اپلائی تو آن لائن ہی کرنا ہے لیکن مجھے کچھ انفارمیشن چاہیے تھی۔ ان کے آفس کال کرتا ہوں تو لینڈ لائن بزی جاتی ہے۔ کچھ ہمارے علاقے میں موبائل سگنل پرابلم بھی ہے۔" وہ پی ایس سی کے آفس کے باہر اس کا انتظار کررہی تھی کہ دس منٹ میں وہ واپس آگیا۔

"کیا ہوا؟"

"ابھی کنسرن بندہ سیٹ پر نہیں ہے ساڑھے بارہ تو ہوگئے ہیں کہہ تو رہے ہیں کہ دس منٹ تک آجاتا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اب لنچ بریک کرکے ہی واپس آئے گا۔" روشن نے سامنے کے منظر پر نظر جماتے ہوئے قیاس آرائی کی۔

"دو تو بج جائیں گے۔"

"ایسا کرتے ہیں کہ پاس میں ہی لارنس گارڈن ہے وہیں چلتے ہیں۔ دو بجے تک واپس آجائیں گے۔" تقریباً پانچ منٹ میں ہی وہ لارنس گارڈن کے مین روڈ کے کنارے کھڑے تھے۔

"تم اس طرف چلنا شروع کرو میں ٹیکسی والے کو پیسے دے کر فارغ کروں۔" روشن نے پارک کے مین لوہے کے دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا پھر ٹیکسی ڈرائیور کی جانب رخ پھیر لیا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی سیمنٹ کے فرش سے ہوتی ہوئی اب سرخ ٹائیلوں والے فرش تک چلی آئی۔ پارک کی مین انٹرنس کے تقریباً دس منٹ کے فاصلے کا فرش سرخ ٹائیلوں کو جوڑ کر خوب صورت فرشی ڈیزائن کی شکل میں بنایا گیا تھا۔ ٹائیلوں کو جوڑنے کے لیے سفید سیمنٹ کا استعمال کیا گیا تھا۔

"چلو اس طرف چلتے ہیں۔" وہ ابھی فرش کا ٹھیک سے جائزہ بھی نہیں لے پائی تھی کہ اس نے اپنے پیچھے آواز سنی۔ روشن اس کے ساتھ سے نکل کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا جنگلے کو عبور کررہا تھا۔ ایک نظر اطراف میں ڈالتی وہ بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔ روشن کا رخ سامنے

برگد کے درخت کے تنے کے ساتھ زمین میں گھڑے
بنگی بنچ کی جانب تھا۔
"تم بیٹھو میں کھانے کے لیے کچھ لاتا ہوں۔" دو
قدم بڑھا کر وہ رکا اور پھر پلٹا۔
"تم کچھ کھانا چاہو تو مجھے بتاؤ۔"
"سادہ پانی۔" اس کے جانے کے بعد وہ شولڈر
بیگ کندھے سے اتار کر بنچ پر رکھے خود بھی بیٹھ گئی۔
جھک کر اسٹریپ کھولے پیروں کو جوتوں کی قید سے آزاد
کیا۔ بھری دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ چھاؤں اور گرم
ہوا کا امتزاج عجب رنگ دکھا رہا تھا۔ خوش گوار نہ سہی
تو اتنا ناخوش گوار بھی نہیں تھا۔ موسم اور وقت کی
مناسبت سے اس وقت بہت کم لوگ پارک میں موجود
تھے۔ روشن واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کھانے پینے
کی چیزوں سے بھرا شاپر تھا۔ اس نے بنچ پر شاپر رکھ کر
قریب ہی گھاس پر جوتے اتار کر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔
عفت نے شاپر میں سے اورنج جوس کا ڈبا نکال کر باقی
شاپر روشن کی طرف بڑھایا جسے اس نے خاموشی سے
پکڑ لیا۔
"سینڈوچ نہیں کھاؤ گی۔" شاپر سے سینڈوچ نکال
کر وہ اس پر پلاسٹک ریپر اتارتے ہوئے بولا۔
"نہیں۔۔۔ بھوک نہیں ہے۔" اس نے پلاسٹک
کور اتار کر دو میں سے ایک سینڈوچ اس کی جانب
بڑھایا کچھ سوچتے ہوئے اس نے خاموشی سے ہاتھ
بڑھایا۔ روشن نے اپنا سینڈوچ ختم کیا اور وہیں گھاس پر
دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے تکیہ بنائے لیٹ گیا۔
نیلی جینز پر سفید کاٹن کی سرمئی دھاریوں والی شرٹ
میں وہ خاصا وجیہہ نظر آرہا تھا۔ اس نے ایک نظر اس
کے لیٹے وجود پر ڈالی۔ ڈارک براؤن بال برگد کی شاخوں
سے چھن کر آتی دھوپ میں چمک رہے تھے۔
اس نے پیچھے قہقہوں کی آواز سنی۔ گردن موڑ کر
دیکھا۔ لڑکے لڑکیوں کا ٹولہ پاس سے گزر رہا تھا۔ دوپہر
کے اس وقت بیشتر کالجز اور اسکول آف ہو جاتے تھے
چند منچلے اسٹوڈنٹ شاید قریبی کالج سے یہاں وقت
گزاری کو چلے آئے تھے۔ دو لڑکوں اور دو لڑکیوں پر
مشتمل ٹولہ ان کے بنچ کے قریب سے گزرتے ہوئے
کچھ دیر رکا وہ سب ان دونوں کو دیکھ رہے تھے پھر کچھ
کانوں میں کھسر پھسر کی اور قہقہوں کی بوچھاڑ میں آگے
کو قدم بڑھا دیے کچھ انجانے سے تاثرات چہرے پر
سجائے عفت نے ان چاروں پر نظر کی۔ ان چاروں
کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور نگاہوں کی معنی خیزی کو
سمجھتے ہوئے عفت کا دل یک دم ہی دھڑک اٹھا۔
"اف توبہ کیا سوچ رہے ہیں روشن اور میرے
بارے میں۔" ان چاروں کا ٹولہ تو اب ان کے بنچ سے
دور ہو گیا تھا' لیکن عفت کے حلق میں سینڈوچ کی
بائٹ اٹک گئی تھی اس نے ترچھی نگاہوں سے
آنکھیں بند کیے گھاس پر لیٹے روشن کو دیکھا اور پھر
احتیاطاً" اس سے دور ہٹ کر بنچ کے دوسرے کونے پر
جا بیٹھی۔ چند سیکنڈ بعد ہی روشن نے اس کی جانب سے
کروٹ موڑی۔
"دنیا کی سوچ پر چلیں تو زندگی کے دو قدم بھی
اٹھانے دوبھر ہو جائیں۔" اس کی سماعت کو دھوکا ہوا
تھا۔
"توبہ کتنا تیز ہے یہ لڑکا۔" وہ اس کی پشت پر نظریں
جمائے یہ سوچے بنا نہیں رہ سکی۔

✡ ✡ ✡

"امی کل تک تو اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"
"کیا پتا ہو تمہیں نہ بتایا ہو۔"
"لیکن امی۔۔۔ ابھی اتنی جلدی کیسے ہو سکتا ہے ابھی
ابا اور آپی کا غم بھی دور نہیں ہوا۔" وہ بیڈ کی چادر کی
شکنیں نکالتے ہوئے بولی۔
"ان کا غم تو' ساری عمر کا رونا ہے۔" سلیمہ بیگم کے
لہجے میں اداسی اور دکھ کا عنصر نمایاں تھا۔
"امی۔۔۔ اگر روشن کا دماغ الٹ ہو گیا تو کم از کم تائی
جان کو تو سوچنا چاہیے تھا۔" وہ الجھی تھی۔
"تم ان کی امانت ہو۔ وہ جب چاہے مانگ لیں۔"
سلیمہ بیگم کا لہجہ نرم تھا۔
"امانت نہ ہوئی کوئی ڈرائنگ روم کے کارنر پر پڑا

شوپیس ہو گئی۔" بڑبڑاتے ہوئے سارا غصہ تکیہ پر نکالا۔ جسے پٹخنے والے انداز میں بیڈ پر پھینکا تھا۔

"کیا کہا۔" جواب میں عفت خاموش رہی تو وہ بولیں۔

"میرے کہنے نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ آج نہیں تو کل تو تمہاری رخصتی کرنی ہے۔ اور تمہارے ابو کے بعد میرے کاندھوں پر بہت ذمہ داریاں ہیں۔ بہتر ہے۔ مناسب وقت پر اپنی ذمہ داریاں نمٹاؤں۔" کل ہی تو وہ لا کر اس کے ساتھ کھلوا کر آئی تھی۔ اندازا" پورا دن اس کے ساتھ گزارا تھا' لیکن روشن کے کسی انداز یا گفتگو کے کسی بھی پہلو سے یہ نہیں اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ اگلے دن ہی رخصتی کے لیے فاطمہ بیگم کو ان کے گھر بھیج دے گا۔ جب سے اس کے علم میں بات آئی تھی اس کے دماغ کا میٹر گھوما ہوا تھا۔ وہ ان حالات میں جب کہ ابھی ابا اور سویرا کی فوتگی کو سال بھی نہیں ہوا وہ رخصتی کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ویسے بھی جس طرح اس کا نکاح ہوا تھا ابھی وہ رخصتی کے لیے تیار نہیں تھی۔

وہ کمرے میں آئی اس نے موبائل پر اسے کال کرکے اچھی خاصی سنانے کا ارادہ کیا تھا' لیکن پھر اس کی انگلیوں نے کی پیڈ پر حرکت کی تھی۔ اگلے پل وہ موبائل فون آف کیے سونے کے لیے بیڈ پر لیٹ گئی صبح اٹھی تو موبائل آن کرتے ہی اسکرین پر میسج ریسیو لکھا دکھائی دے رہا تھا۔

"میں کچھ باتوں کی وضاحت دینا ضروری نہیں سمجھتا۔ کچھ چیزیں وقت گزرنے کے ساتھ سمجھ آتی ہیں۔" اس نے خالی ذہن اور خالی نظروں سے یہ میسج پڑھا تھا۔ رخصتی کے بعد وہ اسے لاہور اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ ایک ماہ ہونے کو آیا تھا' لیکن ان دونوں کے مابین اجنبیت کی دیوار ہنوز قائم تھی۔ اس رات وہ سونے کے لیے لیٹنے لگی کہ بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر عفت نے خاکی لفافہ پڑا دیکھا۔

"عفت۔۔۔ یہ تمہارے کرائے کے پیسے۔ ایک دکان کا کرایہ میں چچی اماں کو دے آیا ہوں یہ دوسری دکان کا کرایہ۔" ابھی وہ لفافہ کھول ہی رہی تھی کہ اس نے روشن کی آواز سنی۔

"یہ تم ہی رکھو۔" وہ رکھائی سے بولی اور لفافہ واپس اپنی جگہ رکھ دیا۔

"یہ تمہارے ہیں۔"

"جن پیسوں کی خاطر تم نے مجھ سے نکاح اور پھر زبردستی رخصتی کرائی ہے۔ ان پیسوں کو میں لے کر کیا کروں۔ مجھے دینے کا دکھاوا کرنے کی کیا ضرورت ہے مجھے دے کے بھی تم نے کچھ دن بعد کسی بہانے واپس تو لے ہی لینے ہیں۔ تو پلیز اس فارملیٹی کو بھی رہنے ہی دو۔"

"عفت۔۔۔" روشن کے چہرے پر ایک تاریک سایہ لہرایا تھا۔ عفت تیزی سے کمرے سے نکلتے ہوئے اس بات کو نوٹ ہی نہیں کرپائی کہ روشن کی آنکھیں نم تھیں کچھ دیر میں وہ اس کے سامنے موجود تھا۔

"مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

"آج تک ہر ضروری بات تم ہی کرتے آئے ہو۔" عفت کے لہجے میں طنز تھا۔

"تمہیں کیا لگتا کہ میں نے تم سے نکاح کیوں کیا؟؟"

"تم خود سے پوچھو۔"

"تمہیں لگتا کہ میں نے نکاح کے بعد رخصتی کی جلدی ان کرائے کے پیسوں کے لیے کی ہے۔"

"اپنے دل سے پوچھو۔" وہ تنکی۔

"تم بدگمان ہو عفت۔ تم اچھی طرح جانتی ہو میں تمہارے ساتھ ہی جاب کے لیے پبلک سروس کمیشن انفارمیشن لینے گیا تھا۔" جواب میں وہ خاموش رہی۔

"تم میرے بارے میں ایسا سوچتی ہو تو بہت زیادہ غلط سوچتی ہو۔" اسے عفت کی سوچ نے دلی صدمہ دیا تھا۔

"تمہیں لگتا ہے کہ میں نے تم سے اس لیے شادی کی کہ مجھے عدیل بھائی کی طرح تمہاری جائیداد میں غرض تھی۔"

"کوئی اور وجہ بھی ہے؟؟"

"ہاں ہے وجہ۔۔۔ لیکن تمہیں اس وجہ کی طرف

دیکھنے کا کہوں گا بھی تو تم یقین نہیں کروگی۔" وہ پھر سے خاموش ہو گئی۔ بات کا جواب دینا بحث کے مترادف تھا اور اس وقت وہ کسی قسم کی بحث کے موڈ میں نہیں تھی کم از کم ایسی بحث۔ جس کا حاصل کچھ نہ تھا۔

"میں دل کا اتنا برا نہیں ہوں جتنا میرے بارے میں خیال کرتی ہو۔" روشن کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جس نے عفت کو لمحے بھر کو اپنی جگہ شرمندہ کر دیا تھا۔ اجمل سعدی کی وفات کے بعد زندگی کی کڑی دھوپ میں وہ کتنی ہی مرتبہ عفت اور سلیمہ بیگم کے لیے سائے کا احساس بنا تھا۔ اسے اس بات سے انکار نہیں تھا۔ اپنے ہر مسئلہ پر وہ جس حق سے اس کی مدد کو آن پہنچتا اور اسے کوئی بھی تکلیف آنے سے پہلے وہ اس کے لیے ڈھال بن جاتا۔ وہ لاکھ بھی روشن سے اس بات پر انکار کرنا چاہتی، لیکن اس کا دل ہر مرتبہ روشن کے خلوص کی چپکے سے گواہی دے دیتا تھا۔ اس کے ہر فعل سے پہلے وہ دل میں وثوق سے کہتی۔

"ہو نہ ہو۔ یہ بھی عدیل بھائی سے ملا ہوا ہے۔" لیکن اس فعل کے آخر میں اسے ڈھونڈنے سے بھی روشن کی کوئی ایسی بات کوئی ایسا انداز دکھائی نہ دیتا۔ جس کو بنیاد بنا کر وہ روشن کے خلوص پر شبہ کرتی۔ کئی مرتبہ سوچنے بیٹھتی تو اسے سلیمہ بیگم کی روشن کے بارے میں کہی باتوں کی سچائی کا ادراک ہونے لگتا جو انہوں نے روشن کا رشتہ آتے وقت اس سے کہیں تھیں۔

لیکن عدیل کے کیے دھرے کے رنگ اس قدر پکے تھے کہ روشن کے ہر فعل پر، عدیل کے ماضی کے فعل کا رنگ غالب آجاتا۔ ہر طرح سے وہ اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کرتی تھی کیوں کہ وہ بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھتی تھی کہ روشن سے اس کا رشتہ صرف اس کے باپ کے دوست کے بیٹے کی حیثیت سے نہیں تھا بلکہ اس سے نکاح کے بعد وہ اس کے شوہر کی حیثیت سے بہت سے رشتوں کی بنیاد بدل چکا تھا۔ نئے رشتوں کی بنیاد پڑ چکی تھی۔

گزرتے وقت نے کافی حد تک عفت کو نہ چاہتے ہوئے بھی سمجھوتے کا پابند کر دیا تھا۔ زندگی خاصی حد تک اپنی ڈگر پر لوٹ آئی تھی۔ زندگی اچھی نہ سہی تو پہلے جتنی بری بھی نہیں رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم ہوتی کون ہو میرے نام پر فیصلے کرنے والی۔" تیزی کے ساتھ دروازہ کھول کر اس کے پاس آتے ہوئے وہ دھاڑا تھا۔

"یہ کب آیا۔" عفت الماری کے پٹ کھولے کپڑوں کی تہ ٹھیک کر رہی تھی لمحے بھر کو اس کے ہاتھ رکے۔

"جواب دو مجھے۔" وہ اس کے سر پر چڑھا بولا۔

"اس وقت کوئی اور راستہ میرے پاس نہیں تھا۔" کچھ پل لگے تھے عفت کو معاملے کی تہ تک پہنچنے میں پھر وہ نہایت سکون سے بولی۔

"تم مجھے فون پر کانٹیکٹ کر سکتی تھیں۔" سرد اور درشت لہجے میں وہ بھڑکا۔

"میں نے کیا تھا۔ فون بند تھا۔" الماری کے پٹ بند کر کے وہ بیڈ تک چلی آئی۔

"میسج چھوڑ دیتیں۔ موبائل آن کرتا تو پڑھ لیتا۔" عفت کو وہ حد درجہ اکھڑا ہوا لگا۔

"میں نے کیے تھے۔ تقریباً" پندرہ بیس میسجز کیے تھے۔ تم ان باکس چیک کرو۔" عفت کو اندازہ ضرور تھا کہ روشن اس کے فعل سے ناراض ہو گا، لیکن اس حد تک۔۔۔ اس نے سوچا نہیں تھا۔

"صرف دس دن کے لیے گیا تھا قبر میں ہمیشہ کے لیے نہیں چلا گیا تھا۔" اس کا لہجہ حد درجہ درشتی لیے ہوئے تھا۔

"روشن۔۔۔" اس کے جملے سے عفت کے دل کو تکلیف ہوئی۔

"تم صبر کرتیں۔۔۔ انتظار کرتیں۔۔۔"

"میں صبر کرتی، لیکن عدیل بھائی کو صبر نہیں تھا میں انتظار کر لیتی، لیکن کورٹ تمہارے انتظار کی پابند نہیں تھی۔ جج نے اس پیشی پر فائنل ڈسمشن لیا تھا۔" اپنی صفائی میں وہ بولی تھی۔ روشن کے جارحانہ انداز

صحیح معنوں میں لمحے بھر کو وہ خوف کی لپیٹ میں آ گئی۔

"پیشی آگے چلی جاتی۔"

"پہلے ہی دو پیشیاں آگے ہو چکی ہیں۔ جج نے پچھلی پیشی پر بھی لاسٹ وارننگ دی تھی۔" عفت کا دھیما لہجہ ہنوز وضاحتی تھا۔

"تو لینے دیتیں کورٹ کو فیصلہ۔" قریب پڑے سائیڈ ٹیبل کو ٹھوکر رسید کرتا دونوں مٹھیاں بھینچے وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا بولا۔

"جب تم نے برے وقت میں ساتھ نہیں چھوڑا تو میں کیسے چھوڑ دیتی۔"

"یہ تم نے اچھی کہی۔"

"تمہارے پہلے ہی سے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔" بے اختیار ہی اس کے ہونٹوں سے نکلا جسے سنتے ہی روشن مزید تپا تھا۔

"واہ عفت بی بی۔۔۔ تمہیں ان احسانات کا بدلہ چکانے کو یہی طریقہ ملا تھا۔"

"ایسا نہیں ہے روشن۔" عفت کے دل کو اپنی تذلیل محسوس ہوئی۔

"میں تائی اماں کو اس وقت ان حالات میں کیسے چھوڑ دیتی۔" روشن کو اتنے جارحانہ انداز میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ صحیح معنوں میں وہ پریشان ہوئی تھی۔

"مائنڈ اٹ وہ میری ماں ہیں تمہاری نہیں۔" کتنے ہی پل عفت کو روشن کے کہے جملوں پہ گمان کی سی کیفیت کا احساس ہوا تھا۔

"روشن وہ میری بھی کچھ لگتی ہیں۔" عفت کو یہ کہتے ساتھ ہی اپنی آنکھوں میں مرچیں سی لگتی محسوس ہوئیں۔

"ان کا تم سے اگر رشتہ ہے تو میری وجہ سے۔ ان کی ذمہ داری میری ہے، تمہاری نہیں۔"

"روشن۔۔۔ وہ اس گھر میں رہ رہی ہیں۔ وہ گھر ان کا ہے ان کی چھت چھایا۔" عفت کی آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئی تھیں۔

"دیٹس ناٹ یور ہیڈک" روشن کا لہجہ قطعی تھا۔ وہ اس کی آنکھوں سے گالوں تک کا سفر کرتے آنسوؤں سے ناواقف نہیں تھا۔

"بہر حال تم نے جو کیا میں اس کے لیے تمہارا احسان مند ہوں۔ یہ سب کر کے تم نے میرے لیے جو پرابلم پیدا کی ہے اسے میں کسی بھی طرح ہینڈل کر لوں گا، لیکن پلیز آئندہ ایسا کوئی احسان میرے سر ڈالنے کی کوشش نہ کرنا۔"

"اسٹے اوے اینڈ ڈو ناٹ انٹرفیر ان مائی پرسنل افیئرز۔" اس بار اس کا لہجہ دھیما ضرور تھا، لیکن لہجے کی سختی ہنوز تھی۔ یہ کہہ کر وہ کمرے میں رکا نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

عدیل نے پچھلے چھ ماہ سے کریم دین کی پراپرٹی میں حصہ داری کا مقدمہ ڈالا ہوا تھا۔ صرف اپنے حصے کی بات ہوتی تو اس پر کسی کو بھی اعتراض نہیں تھا، لیکن مسئلہ تب بنا جب کورٹ نے وکیل کے ذریعہ نوٹس بھیجا کہ روشن نے پہلے ہی کریم دین سے ان کی زندگی میں جائیداد میں اپنے حصے کے برابر کا پیسہ لے کر شہر میں اپنے مکان کی تعمیر پر لگوالیا۔ اس لیے اب اسے اپنے باپ کی پراپرٹی میں سے مزید حصے کا دعوا کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ تمام ثبوت کورٹ کے پاس موجود تھے جن کے مطابق وہ جس گھر میں رہائش پذیر تھا وہ تو عفت کے نام تھی، لیکن اس پر کنسٹرکشن کریم دین کی جانب سے روشن کو ملنے والی رقم کی بدولت تھی۔ اسٹیمپ پیپرز پر اس کی جانب سے مع دستخط بیان تھا کہ وہ کریم دین کی زندگی میں یا ان کے مرنے کے بعد ان کی چھوڑی جانے والی جائیداد میں حصہ داری کا مجاز نہیں۔

روشن نے اس اسٹیمپ پیپرز کی فوٹو کاپی دیکھی تھی۔ دستخط اسی کے تھے۔ ذہن پر زور دینے پر یاد آیا کہ جن دنوں عدیل کے سعودیہ جانے کی کوششیں ہو رہی تھیں یہ ان دنوں کے لیے گئے خالی اسٹیمپ پیپرز پر دستخط تھے۔

ایک خاموشی نے روشن کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس کے لیے عدیل کا یہ انداز بہت بڑے

دکھ کا پیش خیمہ تھا۔ وہ گھر گیا تو فاطمہ بیگم نے اسے بتایا کہ وہ گھر کو بیچنا چاہ رہا ہے اس سلسلے میں لوگ گھر کو دیکھنے آرہے ہیں۔ اس نے اپنے طور پر عدیل سے بات کرنا چاہی لیکن اس کے روکھے پن کی وجہ سے وہ خاموش رہ گیا۔ کریم دین کی وفات کے بعد فاطمہ بیگم کے لیے یہ بہت بڑی تکلیف تھی۔ یہ گھر اس نے کریم دین کے ساتھ مل کر بہت دل سے بنایا تھا۔ اپنے دونوں بیٹوں کی اس گھر میں پرورش کی تھی۔ اب انہی کی اولاد ہی اس گھر کی بنیادوں کو ہلانے پر تلی ہوئی تھی۔

روشن نے آفس سے ارجنٹ لون کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لون سے ملنے والی رقم عدیل کو دے کر گھر خود خریدے۔ اسی لیے وہ کورٹ کے دو پیشیوں کو اپنے وکیل کے ذریعے کروا چکا تھا۔ اسی دوران میں اسے دس دن کے لیے آفس کے کام کے سلسلے میں جانا پڑا تو پیچھے سے کورٹ کی پیشی فکس ہو گئی۔ آخری پیشی پر اگلی پیشی کی تاریخ فائنل نہیں ہوئی تھی اس کا خیال تھا کہ اس کے واپس آنے تک وہ کچھ نہ کچھ انتظام کرلے گا۔ دو تین ملٹی نیشنل کمپنیز سے اس کے ایگریمنٹ چل رہے تھے اور پھر تین بینکوں میں بھی اس نے لون اپروول کے لیے اپلیکیشنز دی ہوئی تھیں۔ لیکن اس کے جانے کے بعد ایک دم ہی حالات پلٹے کہ دس دن بعد گھر واپس آنے پر بھی حیران تھا۔

عفت نے ایسے میں اپنی نام کی تمام پراپرٹی عدیل کے پاس گروی رکھ کر گھر کو بکنے سے بچایا۔ جو کورٹ کے فیصلے کے مطابق اس کے نام ہو چکا تھا عفت کے علم میں تھا کہ روشن اس گھر کو لے کر کتنا جذباتی تھا اس سلسلے میں اس نے اپنے طور پر کوشش کی تھی جو نیکی کی صورت میں الٹا اس کے گلے پڑ گئی تھی۔ عفت کو ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے اس تمام عمل کو وہ اپنی ذات کو لیڈ ڈاؤن کرنے کے طور پر لے گا۔ اس وقت اس کے نزدیک روشن کی خواہش کا احترام اور تائی اماں کے سر پر چھت کا سہارا تھا گو کہ وہ ہر مرتبہ مصطفیٰ آباد جاتی تو انہیں ساتھ چلنے کو ضرور کہتی اور یہ اس کی دلی تمنا تھی کہ تائی اماں اس کے اور روشن کے ساتھ رہیں۔ لیکن فاطمہ بیگم اس گھر کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھیں کہ اس گھر سے ان کی دلی وابستگی اور شوہر کی یادیں بسی تھیں۔

شام میں وہ لاؤنج میں آئی تو روشن کو سامنے صوفے پر بازو آنکھوں پر رکھے لیٹے دیکھا۔ آواز سن کر روشن نے بازو آنکھوں سے ہٹا کر چہرہ موڑ کر ایک نظر ڈالی اور پھر کروٹ بدلی تھی۔ عفت کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر سے آنسو جھلملانے لگے تھے۔ وہ کونسا اس کے ایسے رف رویوں کی عادی تھی۔ اپنے ساتھ پہلی مرتبہ برتے جانے والے اس بے رخی اور بے نیازی کے رویے پر دو گھنٹے میں ہی نڈھال ہو گئی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے قریب چلی آئی۔

"رو... روشن۔ دھیمے لہجے میں اس نے آواز دی۔" جواب میں خاموشی تھی۔

"روشن۔" یہ کہتے ساتھ ہی اس کے گالوں پر پانی کی لکیر بنی تھی۔ روشن نے اس بار بھی جواب نہیں دیا۔ وہ ہنوز لیٹا رہا۔ وہ دھیرے قدم اٹھاتی واپس کمرے میں چلی آئی اور بیڈ پر بیٹھ کر نئے سرے سے پچھلے چند دنوں میں گزرے تمام واقعات کا جائزہ لینے لگی۔ اپنی غلطی تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ایسی غلطی جس نے روشن کو اس سے حد درجہ خفا کر دیا تھا کہ اس کی پکار کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔

بہت دیر بعد بھی جب اسے کچھ سمجھ نہیں آئی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ واش روم میں جا کر بیسن کے آگے کھڑے چہرے پر پانی کے چھینٹے ڈالے۔ بالوں کو برش کیا اور دوپٹا کندھے پر ٹھیک سے ڈالتی کچن میں چلی آئی۔ شام کی چائے وہ اور روشن اکٹھے مل کر پیتے تھے۔ دو مگوں میں چائے انڈیلتی ٹرے میں رکھے وہ لاؤنج میں روشن کے پاس چلی آئی۔

"روشن۔ چائے پی لو۔" صوفے کے قریب دھرے سینٹرل ٹیبل پر اس نے ٹرے رکھتے ہوئے آواز دی۔

اب بھی روشن نے اس کی آواز پر دھیان نہیں

دیا۔

عفت نے آگے بڑھ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا ہلایا۔ اسے لگا کہ جسے دہکتے کوئلہ کو چھولیا تھا۔ روشن کا جسم گرم تھا۔

"تمہیں تو بخار ہے۔" بازو آنکھوں سے ہٹا کر پر روشن نے دیکھا پھر کروٹ پھیر کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"بخار کی گولی لاتی ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔" لیکن وہ اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کچن کے کیبنٹ میں پڑا دوائیوں کا شاپر اٹھالائی۔ اسے کھول کر بخار کی دوائی نکال کر اس کے سامنے کی۔ روشن دوائی پکڑے بنا ہی اپنی جگہ سے اٹھا اور لاؤنج سے نکل گیا۔

"کیا ہوا ہے۔ ایسا کون سا جرم سرزد ہو گیا مجھ سے جو یہ مجھ سے اتنا روڈلی بی ہیو کر رہا ہے۔"

ٹیبل پر پڑے موبائل کی بیل بجی تھی۔ سوچوں کو ذہن سے پرے دھکیلتی وہ موبائل تک آئی۔ اسکرین پر تائی اماں کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس نے یس کا بٹن پش کرتے ہوئے موبائل کان سے لگایا۔

"کیسی ہیں آپ؟"

"میں تو ٹھیک ہوں۔ بیٹا اپنی سناؤ۔"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔"

"آواز سے تو نہیں لگ رہا۔" اس کی بھاری آواز سے انہوں نے اندازہ لگایا۔

"سو کر اٹھی ہوں اس لیے۔"

"روشن کہاں ہے؟"

"ابھی یہیں تھا باہر گیا۔"

"تم دونوں ٹھیک ہو نا؟"

"جی تائی اماں۔"

"میرا دل ہول رہا تھا۔ ایسے ہی کچھ پریشان تھی تو تب ہی خیریت پوچھنے کو فون کیا۔" جواب میں وہ خاموش سی ہو گئی۔

"عفت۔"

"جی۔" یک دم ہی اس کا دل بھر آیا۔

"سب ٹھیک ہے؟"

اب وہ رو رہی تھی۔ اسے اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رہا۔

"آپ میرے پاس آجائیں۔ مجھے آپ سے ملنا ہے۔" بے اختیار وہ مچلی تھی۔

"بیٹا کیا ہوا ہے۔ روشن کہاں ہے میری بات کرواؤ اس سے۔"

"کہا نا یہاں نہیں ہے ابھی باہر نکلا ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم آپ میرے پاس آجائیں۔ روشن سے کہیں وہ آپ کو جا کر لے آئے گا۔"

"عفت۔ صبر کرو بیٹا۔ مجھے بات تو بتاؤ کیا ہوئی ہے۔ لڑے ہو تم دونوں۔" فاطمہ بیگم نے اپنے طور پر قیاس آرائی کی۔ عفت کے رونے میں شدت آئی۔

"بس آپ روشن کو اس کے موبائل پر کال کر کے کہیں وہ آپ کو یہاں لے آئے۔ ابھی اسی وقت۔" عفت ضدی لہجے میں اپنی بات پر زور دے کر بولی۔

"اچھا کہتی ہوں۔ پریشان مت ہو۔ میں آتی ہوں تمہارے پاس تو دیکھتی ہوں کیا مسئلہ ہے۔ کیوں اتنی پریشان بیٹھی ہو۔ اور روشن بھی گھر پر نہیں ہے۔"

"روشن کو بخار ہے وہ دوائی نہیں کھا رہا۔ چائے بنا کر دی ہے وہ بھی پینے سے انکار کر دی ہے۔ مجھ سے بات نہیں کر رہا۔" اس کے بھرے ہوئے دل کو کسی غمگسار کی ضرورت تھی اور فاطمہ بیگم سے بہترین ہمدرد اسے بھائی نہیں دیا تھا۔ شکایتوں کی پٹاری کھل چکی تھی۔ کافی دیر بعد موبائل آف کر کے سر اٹھایا تو اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ روشن چند قدم کے فاصلے پر اس کے سامنے کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ وہ سب کچھ نہیں تو یقیناً "بہت کچھ تو سن ہی چکا تھا۔ عفت نے اس سے نظریں چرائیں۔

روشن نے ٹیبل پر پڑی میڈیسن اٹھالی تھی اور ٹرے میں پڑے دونوں مگوں میں سے ایک مگ اٹھاتے پھر اندر کی جانب چلا گیا۔

اسے تقریباً گھنٹے بعد ہی فاطمہ بیگم کا فون آیا تھا۔

"میں نے روشن کو خاصا ڈانٹا ہے۔ تم اس کا اتنا خیال کررہی ہو بیماری میں تو اسے اس بات کا احساس ہونا چاہیے۔ ایک تم اس کی تیمارداری کرو اور اوپر سے اس کی ڈانٹ بھی کھاؤ۔ اگر دوبارہ اس نے یہ حرکت کی تو مجھے بتانا۔ آج سنی ہے مجھ سے پھر دوبارہ سنے گا۔"

"آپ کب آئیں گی۔" کچھ دیر پہلے ان کے سامنے روکر وہ دل کا بوجھ ہلکا کرچکی تھی۔ "روشن کو دو تین کام ہیں کہہ رہا تھا وہ کرکے تو شاید اسی ہفتے یا پھر اگلے ہفتے۔"

"آپ آجائیں تو اچھا تھا۔" اس کی آواز میں خاصا ٹھہراؤ تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ ضدی بچے کی طرح اکھڑی ہوئی تھی۔

"میرے بس میں ہو تو میں اسی وقت تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔ میں نے تو روشن سے کہا تھا لوکل پر میں آجاتی ہوں لیکن تمہیں اس کا پتا تو ہے میرا لوکل پر سفر کرنا اسے پسند نہیں۔" جواب میں وہ خاموش رہی جانتی تھی کہ تائی اماں سچ بول رہی ہیں۔

"اب تم میرے جلدی نہ آسکنے پر پریشان نہ ہوکر بیٹھ جانا۔ تم نے بلایا۔ سمجھو میں آگئی تمہارے پاس۔ اور اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔ آج تو لمحے بھر کو مجھے ڈرا کر رکھ دیا۔ مجھے تو لگا پتا نہیں کیا لڑ جھگڑ بیٹھے ہو دونوں۔ اور تم روشن کی بیماری کا خیال نہ کرو۔ موسمی بخار ہے۔ خدا اس کو صحت دے تندرستی عطا کرے۔ ٹھیک ہوجائے گا صبح تک۔ کہہ تو رہا تھا کہ تمہاری دی دوائی کھالی اس نے۔" بہت دیر تک وہ ان سے باتیں کرتی رہیں۔ اس دوران ایک مرتبہ روشن کمرے میں کسی کام سے آیا تھا لیکن اس نے دھیان نہیں دیا۔ وہ فاطمہ تائی سے باتوں میں مصروف رہی۔ فاطمہ بیگم سے بات کرکے اس کا دھیان کچھ دیر پہلے کے واقعے سے خاصی حد تک ہٹ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼
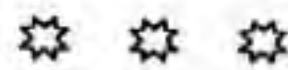
دونوں کی اپنی اپنی روٹین تھی۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی ذات سے جڑے ہونے کے باوجود الگ الگ ٹریک پر زندگی گزار رہے تھے۔ روشن ملٹی نیشنل کمپنی میں بہ حیثیت چیف ایگزیکٹیو کی پوسٹ سنبھالے ہوئے تھے۔ کیریئر کا آغاز تھا اسی لیے وہ آفس کے کاموں میں خاصی مستعدی سے حصہ لے رہا تھا۔

عفت جس اسکول کی پرنسپل تھی۔ اس کی کالج برانچ لاہور میں بھی بنی۔ یہاں صرف انہی اسٹوڈنٹس کو داخلے کی سہولت مہیا تھی جو گاؤں کی برانچ سے میٹرک کا امتحان پاس کیے ہوں۔ شہر میں برانچ کھولنے کا مقصد شہری سہولیات سے مستفید ہونا اور شہری زندگی میں رچنا تھا۔ اس کا یہ مقصد روایات سے دوری ہرگز نہیں تھی۔ اسی لیے کالج کا تمام اسٹاف چوکیدار سے لے کر خانساماں، مالی حتیٰ کہ ٹیچرز بھی مصطفیٰ آباد کے رہائشی تھے تاکہ شہری ماحول میں اسٹوڈنٹس کو اجنبیت محسوس نہ ہو۔ کالج میں ہوسٹل کی سہولت موجود تھی۔ اسی کالج برانچ میں عفت کو بطور پرنسپل جاب ملی تھی۔ گاؤں کی برانچ سے یہاں پر اس کی سیٹ ٹرانسفر کی گئی تھی اور اس ٹرانسفر میں روشن کے آفیشل کانٹیکٹس کا بڑا ہاتھ تھا۔

☼ ☼ ☼

ابھی گزرے واقعے کو تین گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ روشن کو اپنے کیے پر پچھتاوا ہونے لگا۔ وہ عفت کو بہت سخت الفاظ میں ڈانٹ چکا تھا۔ اسے جیسے ہی معلوم ہوا کہ عفت نے اس کے مصطفیٰ آباد والے گھر کو بکنے سے بچانے کے لیے اپنی پراپرٹی کے رجسٹری پیپرز عدیل بھائی کو گروی رکھوا دیتے ہیں' وہ لمحے بھر کو سکتے میں آگیا تھا۔ اس وقت اسے عفت کے اس اقدام پر اس کی حد درجہ حماقت کا گمان ہوا تھا۔ اس لیے وہ غصے میں اس پر چڑھ دوڑا۔ لیکن غصہ اترنے پر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچا تو اسے عفت کا ان تمام حالات میں اٹھایا قدم اتنا بھی بے وقوفانہ نہیں لگا تھا۔ اس کی جگہ اگر وہ بھی ہوتا تو شاید نہیں تو یقیناً" یہی کرتا اس صورت میں کہ جب وہ اسے کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کررہی تھی اور اس کا موبائل آف جارہا

تھا۔ اس نے موبائل کا بٹن پریس کرکے ان باکس دیکھا۔ مزید پچھتاووں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے ان باکس میں تقریباً" پندرہ میسجز عفت کے موبائل نمبر سے تھے۔ لیکن وہ آفس کے کام کی مصروفیت کی وجہ سے انہیں پڑھ نہیں پایا تھا۔

☆ ☆ ☆

عفت ابھی گھر میں پہنچی تھی۔ بہت عرصے بعد وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ کپڑے بدل کر کچھ دیر کے لیے وہ کمرے میں ادھر ادھر چکر لگاتا رہا۔ آج وہ دونوں کے درمیان میں ناراضی کی فضا کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ وہ روزانہ گھر آتا تو عفت پہلے سے گھر میں موجود ہوتی تھی۔ آج وہ روٹین سے پہلے ہی گھر لوٹ آیا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے سوچا کہ وہ اسے موبائل پر کانٹیکٹ کرے لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنا ارادہ ترک کردیا۔ اور پھر کمرے سے نکل آیا۔ کی ہینگر پر ٹنگی گاڑی کی چابیاں پکڑے وہ کچھ دیر بعد گاڑی کو عفت کے کالج کے راستے کی جانب موڑ چکا تھا۔

وہ اس وقت جینز اور بلیک ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ کالج کے احاطہ میں پارکنگ ایریا میں گاڑی پارک کرتے اس کے قدم پرنسپل آفس کی جانب اٹھے تھے۔ پیون اس کو دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ گو کہ وہ عفت کے آفس، گنتی کے دو مرتبہ ہی آیا تھا لیکن کافی لوگ اسے جاننے لگے تھے۔

"میڈم ہیں اندر۔"

"جی سر۔"

"میں اطلاع کرتا ہوں میڈم کی میٹنگ چل رہی ہے۔"

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں میں انتظار کرلیتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ ویزیٹرز ایریا میں پیچھے صوفوں کی جانب چلا آیا۔

دس منٹ میں آفس روم کا دروازہ کھلا تھا اس میں سے عفت کو نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ ساتھ میں ایک لڑکا بھی تھا۔ اس نے دور سے عفت کو دیکھا۔ وہ اس لڑکے سے مسکرا کر بات کررہی تھی۔

روشن کو وہ مسکراتے ہوئے اچھی لگی تھی۔ وہ اسے دیکھنا شروع ہوگیا تھا۔ بہت عرصے بعد وہ اسے اس طرح گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس وقت وہ ہلکے گلابی کاٹن کے سوٹ میں ہم رنگ دوپٹے میں ملبوس تھی۔

اس وقت بھی میک اپ کے نام پر وہ پنک لپ اسٹک ہی لگائے ہوئے تھی۔ کچھ عرصے پہلے اس نے لارنس گارڈن میں اسے گہری نظروں سے دیکھا تھا جب منچلوں کے ٹولے کی معنی خیزی پر اس نے عفت کو کنفیوژ ہوتے دیکھا۔ اس وقت اس کی کیفیت محسوس کرتے وہ خاصا محظوظ ہوا تھا اپنے تاثرات چھپانے کو اس نے عفت کی طرف سے کروٹ بدل لی تھی۔

عفت اس لڑکے کے ساتھ ابھی بھی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ غالباً" اس کا کولیگ تھا۔ یک دم ہی عفت کی نظریں اس پر پڑی تھیں۔

روشن اور اس کی نگاہیں ملی تھیں۔ اس کی نظر کا ٹھٹکنا ایک لمحے کے لیے روشن کو الجھن اور حیرت میں مبتلا کرگیا تھا۔ یکلخت ہی اس نے عفت کے وجود سے نظریں چرائیں۔ اسی پل ایک مانوس سی کیفیت نے روشن کو اپنے حصار میں لینا شروع کردیا تھا۔ عفت کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بھی غائب تھی۔ اب وہ اس لڑکے سے فارغ ہو کر واپس اپنے آفس میں چلی گئی۔ چند لمحوں بعد باہر نکلی تو اس کے ہاتھ میں بیگ تھا۔ روشن نے دور سے دیکھا وہ پیون سے کچھ کہہ رہی تھی۔ قدم اٹھاتی اس کے پاس چلی آئی۔

"چلیں۔"

"ہوں۔ تمہاری گاڑی؟" وہ دونوں کالج بلڈنگ سے باہر نکل آئے۔

"میں اپنی گاڑی میں آتی ہوں نہیں تو پھر کل صبح کے لیے پرابلم ہوگی۔"

"میں تمہیں صبح چھوڑ دوں گا آفس جانے سے پہلے۔" روشن نے فراغ دلی سے آفر کی۔

"اس میں تمہیں پرابلم ہوگی۔" وہ اسے ہکابکا چھوڑ کر اپنی پارک کی گاڑی کی جانب بڑھی۔ وہ اس کی سوچ سے کہیں زیادہ خفا تھی۔

☆ ☆ ☆

گھر پہنچنے کے کچھ دیر بعد ہی وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"یہ کیا ہے روشن؟" اس کے ہاتھ میں لفافہ تھا۔ اور آنکھوں میں سوال۔

"یہ تمہاری پراپرٹی کے پیپرز جو تم نے عدیل بھائی کے پاس گروی رکھی تھی۔"

"معلوم ہے نظر آرہا ہے لیکن میں کچھ اور پوچھ رہی ہوں۔"

"میں نے عدیل بھائی کو اس کی پے منٹ کردی۔"

"کہاں سے؟"

"لون کے لیے اپلائی کیا تھا اپروو ہوگیا۔"

"جس دن میری ضرورت بھی پوری ہوگئی۔ اس دن مجھے بھی یونہی زندگی سے نکال باہر کرو گے؟" زیر لب بولنے کے باوجود روشن کے کانوں نے عفت کے کہے الفاظ سن لیے تھے۔

"اب ایسے تو نہ بولو۔"

"تم میرے لیے کچھ بھی کرتے پھرو۔ مجھے بولنے کا کوئی حق نہیں۔ میں تمہارے لیے کچھ بھی کرنا چاہوں تو تمہیں ایک دم سے لگنے لگتا ہے کہ میں تمہاری ذات کو ڈی گریڈ کر رہی ہوں۔ ذات کو ڈی گریڈ کرنا اسے کہتے ہیں۔ تم نے میرے خلوص کو بہت دل لگا کر میرے منہ پر جوتے کی طرح دے مارا۔" وہ لفافے کی جانب اشارہ کرتے بولی۔

"مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں تمہاری بدگمانی کیسے دور کروں۔ مجھے لگتا تھا وقت گزرنے کے ساتھ تمہیں بہت سی باتیں خود ہی کلیئر ہوجائیں گی لیکن اب لگتا ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" روشن کے لہجے میں بے بسی کا عنصر نمایاں تھا۔

"تم نے اس دن مجھے بے بھاؤ کی سنائیں۔ میں سوچتی رہ گئی میرا قصور کیا ہے۔ روشن۔ تائی اماں۔ تم سے نکاح سے پہلے میرے لیے تائی جان تھیں۔ تم میرے اور تائی جان کے درمیان، بہت بعد میں آئے۔ ہونٹوں پر پڑا قفل کھلا تو شکوہ خود بخود الفاظ کا روپ دھار گیا۔ کتنی دیر تک وہ بولتی رہی اور روشن نے اسے بولنے دیا تھا۔ پھر وہ بول کر تھک گئی تو روشن نے اسے بیڈ پر بٹھا کر خود بھی کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"چچا جان کی فوتگی کے بعد تم نے تمام حالات کا جس طرح سے مقابلہ کیا تھا۔ یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ چچی کو جس طرح سنبھالا تھا میری نظروں سے پوشیدہ نہیں تھا۔ تم سے نکاح کا فیصلہ ان ہی تمام باتوں کو سوچ کر کیا تھا۔ جس دن میں نے رخصتی کا کہنا شروع کیا اس سے ایک دن پہلے تم میرے ساتھ لارنس گارڈن گئی تھیں۔ ہم دونوں کو بینچ پر بیٹھا دیکھ کر ان لڑکے لڑکیوں کے کمنٹس پر تمہاری جو حالت ہوئی تھی میں تمہیں اس وقت اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ تم سے اپنے اوپر ہلکی سی غلط نگاہ بھی برداشت نہیں ہوتی تو میں تمہیں ان تمام حالات میں جو اس وقت عدیل بھائی نے پیدا کیے ہوئے تھے کیسے اکیلا چھوڑ دیتا۔ تمہیں میں نے کرائے کے پیسے دیے اس پر تمہارا حق ہے۔ تم نے جواب میں جو کہا اس سے میرے دل کو تکلیف ہوئی۔ وہ پیسے اب بھی تمہارے ہیں۔ تمہیں پتا ہے وہ کہاں جاتے ہیں ہر ماہ؟"

"نہیں۔" وہ صاف گوئی سے نفی میں سر ہلا گئی۔

"تمہارے بینک اکاؤنٹ میں جمع ہوتے ہیں۔" اس نے انکشاف کیا۔

"میرے بینک اکاؤنٹ میں۔" عفت حیران ہوئی۔

"بینک اسٹیٹمنٹ لوگی تو تمہیں خود ہی کلیئر ہوجائے گا۔ مجھے معلوم تھا کہ تمہیں اس بات کا علم نہیں میں نے تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ ایسے ہی نہیں کیا تھا۔ مجھے تم سے طوفانی عشق نہیں ہوا تھا۔ مجھے تمہاری عادتیں اچھی لگی تھیں۔" روشن کے لہجے میں یقین تھا کہ عفت کے دل نے چپکے سے اس

کے لہجے کی سچائی کا اعتراف کیا تھا۔
"تم میرے اور امی کی خاطر جو چاہے کرتے پھرو اور میں تائی اماں کے لیے کچھ کروں تو مجرم ٹھہرائی جاؤں۔" ایک اور شکوہ عفت کے ہونٹوں سے نکلا۔
"تم نے عدیل بھائی کو اپنی پراپرٹی گروی رکھوائی تو مجھے تکلیف ہوئی تھی۔ تم نے اس پراپرٹی کے لیے بہت فائٹ کی تھی۔ اور بڑے آرام سے تم نے وہ سب گروی رکھوا دیا۔ جو چیز تمہیں تکلیف دے مجھے گوارا نہیں۔" روشن نے اس کی بات کے جواب میں کہا تھا۔ اس کے الفاظ عفت کی روح کو سکون دے رہے تھے۔ سو اسے غور سے سن رہی تھی۔
"اور اس دن اگر میں یہ نہ کرتی تو تائی امی اور تم تکلیف میں آجاتے۔" اس مرتبہ عفت کے لہجے میں شکوہ نہیں تھا۔ لیکن کچھ ایسا تھا جس نے روشن کو مجبور کردیا تھا عفت کی جانب دیکھنے کو۔
"تمہیں واقعی اس سے فرق پڑتا۔" روشن کے کھوجتے لہجے پر وہ فقط دیکھ کر رہ گئی۔
"مجھے معلوم ہے کہ تمہارے میرے اوپر بہت احسانات ہیں لیکن میں نے تائی اماں کے لیے جو کیا وہ دل سے کیا کسی احسان کو اتارنے یا تمہیں ڈی گریڈ کرنے کی کوشش میں نہیں کیا۔" بہت دیر بعد وہ بولی تھی۔
"تم چاہے مجھ سے محبت نہ بھی کرو لیکن کسی دوسرے کی خاطر تمہاری نگاہوں میں پسندیدگی میرے دل کو تکلیف دیتی ہے۔" روشن کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس لمحے وہ خود پر قابو نہیں رکھ پایا۔
"روشن... ہی از جسٹ مائی کولیگ۔" عفت اس کی بات پر بے ساختہ ٹھٹکی۔
"جانتا ہوں۔ مجھے تم پر اعتبار ہے۔" یہ کہتے ساتھ ہی عفت کے گال کو اپنے بائیں ہاتھ سے ہلکا سا چھو کر روشن دھیرے سے مسکرا دیا۔

☆ ☆ ☆
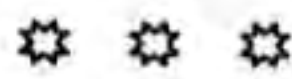
بظاہر سب کچھ نارمل ہوتے ہوئے بھی بہت دنوں سے وہ عجیب سی بے چینی محسوس کررہا تھا۔ آج اس نے آفس سے چھٹی کی تھی ارادہ تھا کہ وہ صبح دیر تک سو کر اپنے تھکے اعصاب کی آرام دینے کی کوشش کرے گا۔ لیکن معمول کے مطابق صبح چھ بجے اس کی آنکھ خود بخود کھل گئی تھی۔ اسے حیرت ہوئی تھی کیونکہ اس نے سوتے وقت الارم نہیں لگایا تھا۔ لیکن شاید فطری طور پر اس کے ذہن میں الارم فکس ہوچکا تھا۔ کچھ دیر وہ بیڈ پر لیٹا کروٹیں لیتے آنکھوں میں دوبارہ نیند لانے کی کوشش کرتا رہا پھر ناکام ہو کر اٹھ بیٹھا۔
اس وقت وہ لان میں بیٹھا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ موسم خاصا خوشگوار تھا۔ سردیاں شروع ہونے کو تھیں۔ صبح کے اس وقت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لیکن اسے گھٹن کا احساس ہنوز تھا۔
لان میں رکھی بید کی کرسی پر بیٹھے اس نے آنکھیں موند کر ٹیک لگائی تھی۔ پیروں کو جوتوں کی قید سے آزاد کرکے لان میں لگی کورین گھاس پر رکھا۔
ایک ہفتے پہلے ہی اس کے اسسٹنٹ نے اسے ایک کالر کے بارے میں بتایا تھا۔ جو اس کا پرسنل نمبر چاہتا تھا۔ کالر نے اپنا نام بتانے سے انکار کیا تھا۔ مسلسل تین دن تک اس کالر کے ٹیلی فون اسے آفس نمبر پر آتے رہے۔ اس نے سختی سے ہر کسی کو اپنا پرسنل نمبر دینے سے منع کیا ہوا تھا۔ ماضی میں اپنا پرسنل نمبر ہر کسی کو دینے کی غلطی میں خود خاصا تنگ ہوا تھا۔ ہر کوئی وقت بے وقت اسے کال کرکے تنگ کرتے تھے۔ آفس مینجمنٹ کی اہم کرسی پر بیٹھے ہونے کی وجہ سے ہر ایرے غیرے کی کال اور سفارشوں سے بچنے کے لیے اسے اس سے بہتر حل بھائی نہیں دیا تھا کہ وہ اپنا پرسنل نمبر محدود رکھے۔
تین دن کی مسلسل کالوں اور اسسٹنٹ کے مسلسل انکار کے بعد ایک دن ایک لڑکا آفس آیا اور کاؤنٹر پر ایک سفید چٹ پر موبائل نمبر لکھ کر دے گیا۔ اس پر کسی کا نام نہیں لکھا تھا۔ اسسٹنٹ نے اس چٹ پر لکھے نمبر کو انتہائی غیر اہم خیال کرتے ہوئے اپنے کام میں مشغول رہا۔ آفس آف ہونے کے وقت

وہ اپنے آفس سے نکل کر کاؤنٹر پر چلا آیا۔

"نہیں گھر جا رہا ہوں۔ کوئی کام تو نہیں رہا۔ آج کے لیے۔"

"نو سر۔ آج کے شیڈول میں دو ہی میٹنگز تھیں۔ ایک آپ نے اٹینڈ کر لی اور دوسری کینسل ہو گئی۔"

"ہوں۔ کوئی اگر کام ہو تو مجھ سے موبائل پر کانٹیکٹ کر لینا۔"

"جی سر۔" اس کا اسسٹنٹ مستعدی سے بولا۔

"یہ کیا ہے؟" ابھی وہ کاؤنٹر سے ہٹنے ہی لگا تھا کہ رجسٹر کے ایک کونے کے نیچے دبے سفید پرچی پر لکھا موبائل نمبر نظر آیا۔

"سر۔ یہ موبائل نمبر آپ تک پہنچانے ہی لگا تھا۔"

"کس کا ہے؟"

"کوئی لڑکا دے گیا تھا ابھی تقریباً گھنٹہ پہلے۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ آپ کو دے دیا جائے۔ موبائل نمبر والے کا نام اس نے نہیں بتایا۔ بس کہہ رہا تھا کہ آپ کو کہا جائے کہ ایک مرتبہ اس نمبر پر ضرور کانٹیکٹ کریں۔"

"کسی نے اپنا نام بھی نہیں بتایا۔"

"بس جلدی میں آیا تھا اور مجھے یہ پرچی پکڑا کر تیزی سے چلا گیا۔"

"ہوں... اچھا۔" اس لکھے نمبر پر نظر ڈالتے اس نے تہ کر کے کاغذ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ گھر پہنچنے تک اس کا ذہن اس موبائل نمبر کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔ پھر رات گئے سونے سے پہلے اس نے بک ریڈنگ کے لیے اپنی نظر کے گلاسز کی تلاش ہوئی تو کوٹ کی اندرونی جیب سے اپنے اسپیکٹیکلز نکالتے اس کے ہاتھ میں پرچی بھی چلی آئی۔ ایک لمحہ کے لیے اس نے اس موبائل نمبر کو غور سے دیکھا۔ ذہن پر زور دینے پر بھی یاد نہیں آیا کہ وہ کس کا موبائل نمبر تھا۔

چند منٹ بعد ہی اس کے ہاتھوں کی انگلیاں اس کے موبائل کی پیڈ پر حرکت کرتی اس نمبر کو ملا رہی تھیں۔ Yes کا بٹن پش کرتے ہی تیسری بیل پر اس کی فون کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

"ہیلو۔" دوسری جانب سے اس کے کانوں کے پردے سے ٹکرائی آواز نے اس کے وجود کو ساکت کر دیا تھا۔

"ہیلو۔ ہیلو۔ کون ہے۔" اسے بجلی کے ننگے تار نے چھوا تھا۔

وہ اس دنیا کے ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں کے ہجوم میں بھی اس آواز کو آنکھیں بند کر کے پہچان سکتا تھا۔ سالوں وہ آواز اس کے کانوں سے نہیں ٹکرائی تھی لیکن آج بھی اس آواز کو سن کر لگا تھا کہ جیسے روز ہی اس آواز کو سنتا ہو۔

☆ ☆ ☆

مقامی اسپتال کے ایک روم میں وہ اس وقت موجود تھا۔ کرسی پر بیٹھے اس نے اپنے سامنے بیڈ پر لیٹے فالج زدہ لاغر وجود کو انتہائی دکھ سے دیکھا۔ "تمہیں مجھ سے نفرت تو ہوئی ہوگی۔" اس لیے وجود کی آنکھیں ویران تھیں۔

"نہیں۔" بے ساختہ ہی روشن نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں نے کام ہی ایسا کیا تھا کہ غصہ تو آتا ہوگا۔"

"وہ بھی نہیں۔" کچھ سوچتے ہوئے روشن نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"ناراض ہونا تو فطری عمل ہے۔" عدیل کو سال پہلے ہی فالج کا ایک اٹیک ہوا تھا۔ اس کی زبان پر اثر ہوا تھا۔ جو کافی حد تک گزرے چند ماہ میں ٹھیک ہو گئی تھی۔ بہرحال لکنت ابھی بھی تھی۔

"نہیں۔ میں آپ سے ناراض کیوں ہونے لگا۔" ہونٹوں پر ملائم مسکراہٹ لیے وہ دھیرے سے بولا۔

"ناراض ہونے کے لیے کیا اتنی وجہ کافی نہیں کہ میں نے تمہیں تمہارے حق سے محروم کر دیا۔ ابا کی جائیداد پر جتنا میرا حق تھا تمہارا بھی برابر کا تھا۔" روشن نے محسوس کیا کہ عدیل کی آواز میں نقاہت ہونے کے

باوجود شرمندگی کا عنصر غالب تھا۔

"میں نہ تو آپ سے نفرت کرتا ہوں۔ نہ مجھے غصے آیا تھا اور نہ ہی میں آپ سے ناراض تھا۔"

"تم عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے لیکن تمہارا ظرف ہمیشہ سے بڑا تھا۔" عدیل نے لہجے میں ستائش لیے روشن کی جانب نرم نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اس وقت اپنی زندگی کے بدترین دور سے گزر رہا تھا۔ پھر روشن اگلے پندرہ دن روزانہ باقاعدگی سے اسپتال عدیل کے پاس جاتا رہا۔

"وہ الماری کھولو۔ اس میں تمہارے لیے کچھ ہے۔" ایک ہفتے پہلے ہی عدیل کو اسپتال سے ڈسچارج کیا گیا تھا۔ اور اس وقت وہ اپنے کرائے کے مکان میں بستر پر لیٹا روشن سے مخاطب تھا۔

"جاؤ روشن اسے کھولو۔ دو سال سے میں اس انتظار میں تھا کہ کب تمہاری امانت تمہیں واپس لوٹا سکوں۔ آج موقع ملا ہے تو میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔" الماری کی جانب بڑھتے روشن کے قدم رک گئے تھے۔

"عدیل بھائی۔ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔" روشن بات کی تہہ تک پہنچتے ہوئے بولا۔

"بات ضرورت ہونے نہ ہونے کی نہیں ہوتی۔ بات حق کی ہوتی ہے۔ اس جائیداد پر تمہارا حق ہے۔ کل بھی تھا آج بھی ہے۔ کل بھی رہے گا۔"

"میں اس حق سے تب ہی دستبردار ہو گیا تھا اور یہ بات میں نے اس وقت بھی آپ سے کہی تھی۔" وہ پلٹ کر دوبارہ اپنی سابقہ جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کہا نا روشن تمہارے کہنے نہ کہنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بات حق کی ہوتی ہے اور یہ تمہارا حق ہے۔"

"یہ مجھے نہیں چاہیے۔" صاف اور دو ٹوک لہجے میں روشن بولا۔

"تم نے گویا مجھے ابھی تک معاف نہیں کیا۔"

"ایسی بات نہیں ہے عدیل بھائی! میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ مجھے آپ سے کوئی شکایت

نہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے' کچھ تو ہو گا تمہارے دل میں میرے خلاف۔ کبھی تو خیال آتا ہی ہو گا کہ اگر میں اس جائیداد پر ناجائز قبضہ نہ کرتا تو تمہیں ان مشکلات میں سے نہ گزرنا پڑتا۔"

"انسان ہوں عدیل بھائی! خیال تو آ ہی جاتا ہے لیکن کبھی ماضی میں ایسا خیال آیا بھی تو وقت گزرنے کے ساتھ وہ خیال بھی بدل گیا۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔ جواب میں عدیل نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں اگر آپ کو یقین ہو تو۔" روشن اس کی نگاہوں میں بے یقینی کی تحریر پڑھتے ہوئے بولا۔

"اپنی تسلی کی خاطر وجہ جان سکتا ہوں۔"

"عفت۔" ایک حرفی جملہ میں اس نے عدیل کے سوال کا جواب دیا۔ عدیل کی آنکھوں میں سوال تھا۔

"ان تمام حالات نے مجھ سے عفت سے نکاح کا فیصلہ کرایا تھا باپ کی زمینی جائیداد کے بدلے میں خدا نے مجھے عفت کی صورت میں زندگی کی جائیداد دی۔ اگر وہ تمام حالات پیدا نہ ہوتے تو شاید میں عفت سے شادی پر اتنا سیریس بھی نہ ہوتا۔ آج اس کے ساتھ پر میں خدا کا جتنا شکر ادا کروں اتنا ہی کم ہے۔"

"ہوں۔ تو پھر تمہاری اس امانت پر تم سے زیادہ عفت کا حق ہے۔" عدیل جیسے کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے بولا۔

"جی۔!"

"اگر تم اجازت دو تو میں ابا کی جائیداد میں تمہارے حصے کا پاور آف اٹارنی عفت کو بنانا چاہوں گا۔" ابھی وہ بیماری سے پوری طرح صحت یاب نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اتنی باتوں کے بعد وہ اپنے وجود پر تھکن طاری ہوتے محسوس کر رہا تھا۔

"عدیل بھائی! میں نے آپ سے پہلے بھی صاف الفاظ میں کہا ہے کہ میں ابا کی جائیداد پر اپنے حصے سے دستبردار ہو چکا ہوں۔ آپ کہتے ہیں تو میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔ جہاں تک عفت کا تعلق ہے وہ آپ کا اور اس کا معاملہ ہے۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔"

"وہ بھی خاصی ناراض ہو گی مجھ سے۔" انہوں نے اپنے طور پر قیاس آرائی کی۔

"میں نہیں جانتا۔"

"کبھی تو اس نے ذکر کیا ہو گا اس بارے میں۔" عدیل نے کریدنے کے انداز میں پوچھا۔

"ہمارے درمیان کبھی اس بارے میں بات نہیں ہوئی۔" روشن نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"اس دن اگر تم درمیان میں نہ آتے تو میں اس سے رجسٹری چھین چکا تھا۔" کچھ پرانی باتیں اور واقعات ذہن میں تازہ ہوتے ہی عدیل بولا۔

"پرانی باتیں نہ سوچا کریں۔ کوئی فائدہ نہیں' سوائے تکلیف کے۔"

"وہ مجھے معاف نہیں کرے گی۔" عدیل کے نقاہت بھرے لہجے میں پچھتاوے کا عنصر بھی گھلا ہوا تھا۔

"دلوں کے بھید رب بہتر جانتا ہے۔ آپ اس سے معافی مانگیں۔ وہ معاف کرنے والا ہے۔" اس نے اسپتال سے ڈسچارج ہونے پر عدیل پر بہت زور لگایا کہ وہ کرائے کے گھر کی بجائے مصطفیٰ آباد فاطمہ بیگم کے پاس لے کر جائے لیکن عدیل نے سختی سے انکار کر دیا تھا۔

"وہ آپ کا گھر ہے عدیل بھائی۔"

"نہیں وہ میرا گھر نہیں ہے۔۔۔ تھا۔"

"آپ کیوں اتنا گلٹی فیل کر رہے ہیں۔ یہ زندگی ہے' ہو جاتا ہے۔ انسان ہیں غلطیاں ہونا لازم ہے۔"

"مجھ سے کوئی اور غلطی ہوتی پر یہ غلطی نہ ہوتی۔"

"امی آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔"

"جانتا ہوں' ماں ہیں وہ ہماری لیکن میں خود کو ابھی اس قابل نہیں سمجھتا کہ ان سے نظریں ملا پاؤں۔"

"کب قابل سمجھیں گے؟"

"تم نے اپنا حق لینے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ مجھ پر

قرض ہے۔ اس کو ادا کیے بنا میں مقروض ہوں۔"
"اچھا پھر میرے گھر چلیں۔"
"عفت کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔"
"عدیل بھائی ایسا کچھ نہیں ہے۔ جیسا آپ سوچ رہے ہیں۔" عدیل کی سعودیہ میں شادی ہوئی لیکن بیوی چند ماہ میں ہی کسی امیر کے چکر میں اس سے طلاق لے کر چھوڑ گئی تھی۔
"یہ مجھے تمہاری زبان سے نہیں اماں کی زبان سے نہیں بلکہ عفت کی زبان سے سننا ہے۔"
"ابھی چلتے ہیں۔ آپ کی یہ خواہش بھی ابھی پوری ہو جاتی ہے۔"
"ابھی نہیں۔۔۔ اس طرح نہیں۔ چلے جائیں گے کچھ دن تک ابھی نہیں لیکن تم وعدہ کرو کہ عفت اور اماں سے فی الحال میرے بارے میں کوئی ذکر نہیں کروگے۔" اور نہ چاہتے ہوئے بھی روشن کو اثبات میں سر ہلانا پڑا۔

☆ ☆ ☆

"عفت۔۔۔ عفت۔۔۔" اسے گہری نیند سے جگایا گیا تھا۔ نیند سے بوجھل آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے۔ آنکھیں کھولیں تو اپنے قریب ہی روشن کو بیٹھے پایا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹتی اٹھی تب ہی کھلی آنکھوں سمیت اس نے حیرت سے اپنے اردگرد نگاہ ڈالی۔ ذہن پر زور ڈالنے پر اسے یاد آیا۔ وہ اسٹڈی روم میں فرشی کشن پر بیٹھے بیٹھے وہیں لیٹ گئی اور پھر اس کی کب آنکھ لگی اسے پتا ہی نہیں چلا۔
"میں آیا تھا تمہیں دیکھنے لیکن تم سو رہی تھیں، تو جگانا ٹھیک نہیں لگا۔" اس نے اپنے وجود پر پڑی گلابی چادر ایک جانب سرکائی اور اٹھنے ہی لگی تھی کہ روشن بول اٹھا۔ "چائے بنا کر لایا ہوں۔ پی کر بتاؤ کیسی بنی ہے۔ ساتھ میں فریج کھولا تو اس میں یہ صبح کے تمہارے ہاتھوں کے اسنیکس بنے پڑے تھے۔ میں نے انہیں صرف گرم کیا ہے مائیکرو میں۔"
"یہ چادر۔۔۔"
"میں نے تمہارے اوپر ڈالی تھی۔ پہلے سوچا کہ تمہیں اٹھاؤں، پھر تم سوتے میں اتنی کیوٹ لگیں کہ میں نے تمہیں جگانے کا ارادہ ترک کر دیا۔" روشن نے "کیوٹ" کا لفظ اتنے مزے سے ادا کیا کہ وہ بھی مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔
"تم زندگی میں آخری مرتبہ سیریس کب ہوئے تھے۔"
"میرے خیال میں تم سے شادی کا فیصلہ کرتے وقت میں سیریس تھا اور پھر نکاح کے وقت اس سے زیادہ سیریس، رخصتی کے وقت سیریس کی انتہا نہ ہی پوچھو اور آج ابھی میں سیریس ہونے کے نئے ریکارڈ بنانے والا ہوں۔" وہ اس کی جانب چائے کا مگ بڑھاتا ہوا چہرے پر سنجیدگی اور آنکھوں میں شرارت کی چمک لیے بولا تو وہ قدرے کھل کر ہنسی تھی۔
"ٹائم کیا ہو رہا ہے؟"
"دنیاوی گھڑی کے مطابق تو اس وقت شام کے پانچ بج رہے ہیں لیکن اگر تم میری بیوی کی حیثیت سے پوچھو تو جب تم نے مجھے دیکھا تو سمجھو تمہارا دن طلوع

ہوگیا۔ اس کے مطابق تو ابھی ابھی دن چڑھا ہے' کیونکہ اچھی اور فرماں بردار نیک مشرقی بیویوں کے لیے ان کا شوہر ہی ان کی زندگی کا سورج ہوتے ہیں۔" روشن نے گو کہ بات مذاق اور شرارت میں کی تھی لیکن بے ساختہ ہی اس کی نگاہ چائے پیتے روشن کے چہرے پر پڑی تھیں۔ اگر وہ مذاق میں بھی یہ بات کہہ رہا تھا تو بھی کچھ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ ابا کی وفات کے بعد وہ واقعی اس کی زندگی میں کسی سورج کی روشنی کی مانند آیا تھا۔ اس بات پر وہ اپنے رب کا جتنا بھی شکر ادا کرتی وہ ہی کم تھا۔ صرف نیک اور فرماں بردار عورت ہی مرد کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہوتی بلکہ شریف اور حق حلال کمانے والا مرد بھی کسی عورت کے لیے رحمت سے کم نہیں ہوتا۔

وہ گزرے سالوں میں کئی مرتبہ سوچتی تھی۔ اگر سویرا آپی کی عدیل بھائی سے نکاح کے بعد سے لے کر ابا کی وفات اور عدیل بھائی کے دوبارہ پاکستان لوٹ کر جائیداد کے لیے مقدمے تک کے 'حالات پیدا نہ ہوئے ہوتے تو وہ کیسے روشن سے مل پاتی اور اس سے نکاح پر آمادہ ہوتی۔ روشن سے نکاح کے بعد حالات بہت تیزی سے بدلے تھے۔ چند مہینوں میں ہی روشن اور خود اس نے تیزی سے ترقی کے منازل طے کیے تھے۔ ان کا لاہور شہر کے وسط میں ایک کنال کا خوب صورت گھر۔ گھر کے گیراج میں کھڑی دو مرسیڈیز' تائی اماں کی محبتوں بھری آغوش اور خود اس کی اماں کا اس کی خوشیوں کے حوالے سے پرسکون وجود۔۔۔ اور ان تمام باتوں سے بڑھ کر روشن کی سنگت۔۔۔ اس کے لیے رب کی ہزار دی ہوئی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت۔۔۔ ایسی دولت جس کے سامنے دنیا کی باقی تمام دولتیں اور نعمتیں بہت چھوٹی دکھائی دیتی تھیں۔

"کچھ زیادہ ہی دل میں میرے لیے محبت کے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔" اسے اتنی محویت سے اپنی جانب دیکھتا پاکر روشن اس کے سامنے ہاتھ لہراتا ہوا بولا۔ اس نے فرش پر نظریں دوڑائیں۔

"کیا ڈھونڈ رہی ہو؟ جوتے' کہیں میری پٹائی لگانے کا ارادہ تو نہیں۔" روشن کی شگفتہ سی آواز اس کے کانوں کے پردوں سے ٹکرائی۔ اس نے اپنے شولڈر بیگ کو کھولا۔ وہ وہیں پر پڑا تھا جہاں دوپہر میں اس نے رکھا تھا۔ اس نے فائل نکال کر روشن کے سامنے کی۔ روشن نے سوالیہ انداز میں اس فائل کو اور پھر اس کی جانب دیکھا۔

"یہ عدیل بھائی کو واپس کردیں اور ہم کل صبح عدیل بھائی کو تائی اماں کے پاس لے کر جارہے ہیں۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ عدیل بھائی سے کب سے مل رہے ہو وہ کہاں رہ رہے ہیں لیکن اتنا ضرور اندازہ ہے کہ وہ ابھی تک تائی اماں سے نہیں ملے ہوں گے۔ میں بس تیار ہولوں۔۔۔ کپڑے چینج کرلوں' پھر تم مجھے عدیل بھائی سے ملوانے لے جارہے ہو۔ آج وہ دوپہر میرے آفس آئے تھے اور یہ پراپرٹی کے پیپرز وہیں چھوڑ گئے۔ انہیں واپس کرنے ہیں۔ مجھے خود سے واپس کرنے ہیں اور انہیں کچھ بتانا بھی ہے۔"

"کیا بتانا ہے۔"

"وہ میرا ان کا سیکرٹ ہوگا۔"

"پھر بھی کچھ اندازہ تو ہو۔۔۔ کوئی ہنٹ۔"

"مجھے ان کو کلیئرلی یہ بات بتانی ہے کہ کریم دین تایا کی جائیداد میں سے میرا جو حصہ تھا میں نے لے لیا اور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

"حصہ۔۔۔" وہ الجھا۔

"میں نے کریم تایا کی کل جائیداد میں سے ان کا بیٹا روشن دین کا زندگی بھر کا ساتھ اپنے حصے لکھوالیا۔" یہ کہتے ساتھ ہی وہ کمرے سے نکل گئی کہ اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے ایک جاندار مسکراہٹ نے روشن کے چہرے کا احاطہ کرلیا تھا۔ وہ عفت کے حوالے سے رب کا جتنا بھی شکر ادا کرتا کم تھا۔

✿ ✿

عابدہ احمد

برف کے آدمی

بھری دوپہر میں گھر کے کھلے سے صحن میں کمروں کے آگے چار ستونوں پہ کھڑی اس چھت کے نیچے خاتون بی بی ظہر کے چار فرض نماز کی نیت باندھے ڈھیلے سے انداز میں سینے پہ ہاتھ باندھے کھڑی تھیں۔۔۔ ذہن لکی کبوتر کی طرح مختلف خیالات کی منڈیروں پہ منکتا پھر رہا تھا۔

"امام دین کو تبلیغی دورے پہ گئے کچھ زیادہ دن ہو گئے اس بار" لکی کبوتر سینہ پھلائے چھما چھم پاکلیں ڈالنے لگا۔ رکوع میں جھکیں تو

"آئے ہائے! یہ مدثر کدھر رہ گیا آج؟" اپنے اکلوتے بیٹے کی فکر نے آن گھیرا۔۔۔ ابھی سجدے میں سر رکھا ہی تھا کہ دو منزلہ نیچے گلی میں ایکدم سے اٹھنے والے شور نے ارتکاز (جو کہ تھا ہی نہیں) توڑ دیا۔

"کیا ہو گیا؟" لکی کبوتر خیالات کی منڈیر پہ دوڑیں لگانے لگا۔۔۔ جیسے تیسے کر کے نماز کے آدھے ادھورے ارکان پورے کیے اور انتہائی سرعت سے اپنا دبلا پتلا وجود لیے اٹھ کر تقریباً" دوڑتے ہوئے گلی کی طرف بنی دیوار میں اینٹیں نکال کر ایک انسانی سر سے کچھ بڑے سوراخ سے اپنا منہ باہر نکال کر نیچے کا جائزہ لینے لگیں۔ گلی میں کچھ لوگ بھاگتے دوڑتے نظر آ رہے تھے، سر ہی سر عورتیں، مرد، بچے۔۔۔ شور ہی شور ہنگامہ۔۔۔ غلغلہ

"ہائیں! کیا آفت ٹوٹ پڑی اس محلے پہ" گردن پوری باہر نکالے اچنبھے سے آنکھیں گول گول ادھر سے ادھر گھماتے معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"کوئی بڑا جھگڑا لگتا ہے" نیچے گلی میں لگے مجمع سے وہ اندازہ لگانے لگیں۔ لوگ ایسے ہی تو انہیں سیانی آپا نہیں کہتے تھے ہر قسم کے معاملے کی تہ میں منٹوں میں پہنچ جاتی تھیں۔۔۔ کسی بھی گنجلک معاملے کی زنبیل میں ہاتھ ڈال کر "حل" کا موتی آبدار نکال لاتیں۔

"ہوا کیا ہے آخر" سارے میں سر گھما گھما کر اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے اوپر باریک (چپکی کے چاند سی

ہیئت والی) بھنویں ایک ماتھے کے اوپر جا چڑھی اور دوسری ناک کی ہڈی سے سرگوشیاں کرنے لگی۔۔۔ پلٹے تب بھی کچھ نہ پڑا۔۔۔

"اوہو! خود جا کے دیکھتی ہوں۔" یہ سوچ کے ابھی پیچھے ہٹنے کو ہی تھیں کہ گلی کی نکڑ سے نمودار ہوتے لوگوں کے ۔ جمگھٹے میں گھرے دو لڑکوں کو دیکھ کر بے ساختہ تھمی تھیں۔ اچٹتی سی نظر۔۔۔ انہیں کچھ شبہ سا ہوا۔

لوگوں کے مشتعل ہجوم میں گھرے۔۔۔ وہ دونوں۔۔۔

"میرا مدثر" پلک جھپکنے کے دورانیے میں وہ اپنے پیٹ کے جنے کو پہچان چکی تھیں۔ اب سے کچھ دیر پہلے کا معاملے کو جان لینے کا چسکا ایک ماں کی فکر مندی میں ڈھل چکا تھا۔۔۔ قبل اس کے کہ وہ سفید براق کپڑوں میں ملوث اپنے بیٹے۔۔۔ اپنی عمر بھر کی کمائی۔۔۔ ہاں! بس یہی تو کمایا تھا دونوں جہانوں کے لیے۔۔۔ یہی دولت تھی' یہی آسرا تھا یہی کوہ نور تھا جسے بد بخت' گناہگار محلے والے گریبان سے گھسیٹے پھر رہے تھے۔

"ان کی یہ جرأت" حیرت فکر مندی میں ڈھلی اور پھر غضب کی صورت اختیار کر گئی۔۔۔ وہ دو منزل نیچے کے حالات کو بگڑتا دیکھ کر تیزی سے پیچھے ہٹیں تاکہ ان "جہنمی" لوگوں کو' جو دن رات کتوں کی طرح ان کے قدموں میں لوٹتے اپنے مسائل کے حل کی آس میں' امام مسجد دین محمد کی زوجہ خاتون بی بی کی تلووں پہ لگی مٹی چاٹا کرتے تھے ان کی اوقات یاد دلانے دھڑا دھڑ سیڑھیاں اترتی چلی گئیں۔۔۔ ہر نیچے کو جاتی سیڑھی کا زینہ ان کے اشتعال کو اوپر لے جا رہا تھا۔ آخری سیڑھی اترتے ہی سامنے لوہے کے بنے گیٹ کے بند ہونے (جو کہ سارا دن عام سائلوں کے لیے کھلا ہی رہتا تھا) پہ انہیں حیران ہونے کا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ ان کی تیز آندھی بنے وجود کو کسی نے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کو گھسیٹا۔ گیٹ کھولنے کے لیے بڑھے ہاتھ سمیت وہ کھینچنے والے کی سمت ذرا سا لڑکھڑائی تھیں۔۔۔ اس جسارت پہ ایک دم آنے والے غصے سے ان کا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔

"آپا! نہ۔۔۔ باہر نہ جائیں وہ کسی کو بخشنے والے نہیں آج!" فرخندہ (پڑوسن) کی سرگوشی ان کے سن سے دماغ میں گونج کر رہ گئی۔

"وہ مدثر۔۔۔ صاحبزادہ مدثر کو۔۔۔ ان کی اتنی ہمت" جسم میں دوڑتا خون غصے سے ابلنے لگا۔۔۔ باہر گلی کی سمت ہاتھ سے اشارہ کرتے آدھے 'ادھورے جملے ان کے لبوں پہ آ آ کر دم توڑنے لگے۔

"مجھے جانے دے فرو" ہمیشہ کے سخت لہجے میں اس افتاد سے 'موم بتی کی طرح قطرہ قطرہ پگھلنے کی آنچ سی آ گئی تھی۔

"آپا! انہیں چھوڑیں گے وہ آپ کو بھی نہیں۔۔۔" اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتی آپا کو اب کی بار اس نے پیچھے سے آ کر دبوچ لیا۔

"تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟ یا پھر ان حرامیوں نے اپنی بیویوں کو بیوہ کروانے کا ارادہ باندھا ہے" اس کے تخیم تخیم نرغے سے اپنا وجود چھڑوانے میں ناکام ہو کر خوش الحان آپا پھٹے ڈھول کی سی آواز میں چیخی تھیں۔ باہر کا بڑھتا شور ان کے اب حواس مختل کرنے لگا تھا۔۔۔ انہیں جانا تھا۔۔۔ صاحبزادہ مدثر مشکل میں تھا۔۔۔ کیا ہوا تھا کیا قیامت بپا ہو گئی تھی؟ جوان بچ لوگوں کی اتنی جرأت ہوئی کہ ان کے ہاتھ آپا جی کے بیٹے کے گریبان تک جا پہنچے؟ سوچ ذہن میں کلبلائی تو ان کی کنپٹیاں دوران خون کا بوجھ سنبھالتے سنبھالتے بجنے لگیں۔۔۔ انہیں نے اب کی بار ایک جھٹکے سے اپنا آپ چھڑایا تھا۔۔۔ پیچھے سے فرخندہ 'آپا۔۔۔ آپا چلاتی رہ گئیں اور وہ برق بنی گیٹ کا لاک کھول کر باہر نکل گئیں۔

گلی سے دو فٹ اونچی بنی مسجد کی باہر والی سیڑھی پہ قدم رکھتے ہی انہیں زور کا چکر آیا تھا۔۔۔ جو کچھ ان کی آنکھ کی پتلی نے دیکھا تھا وہ سہارنا ان کے بس کی بات نہ رہی۔ وہ تیورا کر قبل اس کے کہ سات اونچی سیڑھیوں سے نیچے لڑھک جاتیں۔۔۔ پیچھے سے آتی فرخندہ نے انہیں دبوچ کر واپس اندر کی طرف کھینچ لیا۔۔۔ فضا میں ایک دم سے پولیس وین کے سائرن بجنے کی آوازیں آنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

کئی پیڑھیوں سے صاحبزادہ قاری امام دین کا خاندان اس علاقے میں رہائش پذیر تھا۔۔۔ اور اگر یہ کہا جاتا کہ "صاحبزادہ خاندان" کو ایک خاص روحانی مقام حاصل تھا تو یہ غلط نہ ہوتا۔۔۔ بزرگوں سے علاقے کی مسجد کا انتظام سنبھالتے سنبھالتے نئی پیڑھیوں نے روایتی امامت کا شملہ اتار کر قرأت قرآن میں اب ایک نمایاں مقام حاصل کرلیا تھا۔۔۔ بلکہ صاحبزادہ خاندان کی چوتھی پیڑھی میں تو بلاشک و شبہ بڑے بڑے قاری اور نعت خوان شامل تھے۔۔۔ بالخصوص خاتون بی بی المعروف سیانی آپا کے گھرانے نے تو ٹی وی کے روحانی پروگرامز اور نعتیہ محافل تک رسائی حاصل کررکھی تھی۔۔۔ مختلف چینلز والے اپنی اپنی گاڑیاں بھیج دیتے اور خاتون بی بی صاحبزادہ حافظ مدثر کے ہمراہ ٹی وی کی اسکرین پہ جلوہ افروز ہو کر خوب خوب داد و تحسین کے ڈونگرے اور نوٹ سمیٹتیں۔۔۔

یوں تو دونوں میاں، بیوی (صاحبزادہ امام دین اور خاتون بی بی) دو جمع دو بائیس بنانے والوں میں سے تھے اور کچھ ان کی روایتی پڑھائی (دونوں کزنز ایف۔ اے پاس تھے) جس سے کچھ سیکھا تو نہیں تھا، ہاں لیکن کتابوں کے ساتھ ساتھ لوگوں کے چہرے پڑھنے کا ہنر ضرور سیکھ لیا تھا۔۔۔ کب، کس سے اور کہاں کیسے چلنا ہے اس میں تو ان کا ثانی نہیں تھا۔۔۔ شادی کے فوراً بعد ایک نئے مہمان کی آمد کی خبر نے انہیں بیٹھے بٹھائے مفکرین اعظم کی صف میں لاکھڑا کیا تھا۔۔۔ "کتنا اور جتنا" کا حسابی قاعدہ جیسے دونوں نے گھول کر پی لیا تھا۔۔۔ کتنا کتنا کرتے کرتے دونوں نے بالآخر دماغ لڑا کر کمانے کے نئے طریقے سوچ ہی لیے، دوسرے ہی دن صاحبزادہ امام دین جتنا گڑ ڈلوا سکتا ہی میٹھا کے فارمولے کو جیب میں ٹھونسے جو گھر کی دہلیز پار کر کے گئے تو واپسی ایک درمیانے سائز کے ڈیک اور بے شمار کیسٹس کے ساتھ ہوئی۔۔۔ خاتون بی بی اپنے چھوٹے سے مٹکے پیٹ کو سنبھالے سج سج چھلتی امام دین کے کندھے پہ جھک آئیں جو کہ کمرے میں بنی نیچی سی پرچھتی پہ ڈیک کو سیٹ کر کے اب کیسٹ کو ریوائنڈ کر رہا تھا۔

"ارے! یہ اتنی ساری کیسٹس؟ کس کس قاری کی ہیں؟" امام دین کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈالتے ہوئے ان کی آواز میں تحیر بھری خوشی سمٹ آئی۔

"ہاں تو اور کیا۔۔۔ سات طرح کی قرأت رائج ہیں ساری دنیا میں۔۔۔ کم از کم تین لہجے تو ہمیں اپنانے ہی ہوں گے۔" مصروف سے انداز میں امام دین نے کہا تھا۔۔۔ چلیں جی! یوں سادہ سے امام مسجد امام دین اور گھریلو مسائل کا حل بتانے والی آپا سیانی نے کچھ عرصہ کی محنت شاقہ کے بعد قرأت میں سب سے معروف تین لہجوں کا تڑکا لگا کر اپنا مال یعنی کہ "قرأت" بیچنا شروع کر دیا۔۔۔ اس دنیا میں ہر چیز بکتی ہے۔۔۔ انسانوں سے لے کر مذہب تک۔۔۔ سو ان کا فن بھی بکنے لگا۔۔۔ شروعات آس پڑوس کی مذہبی محافل سے ہوتے ہوتے اب بات ٹی وی کے پروگرامز تک آ پہنچی تھی۔۔۔ اب تو "کتنا اور جتنا" کے جھنجھٹ سے بھی گلو خلاصی ہوئے کتنا عرصہ بیت گیا تھا۔۔۔ سادہ سی آپا سیانی کا جہاں بدلتے وقت کے ساتھ لباس بدلا۔۔۔ وہیں نام بھی بدل گیا۔ آپا کے بجائے "بجیا خاتون" ٹی وی پہ تو اسی نام سے انٹری ہوتی تھی۔۔۔ بس کمبخت محلے والے بار بار سمجھانے بجھانے کے بعد بھی آپا پہ ہی اٹکے ہوئے تھے۔۔۔ ان پہ تو زور نہیں چلتا تھا ہاں مگر صاحبزادہ حافظ مدثر پہ تو حکم بھی چلتا تھا اور زور بھی اس لیے فہمائش کر کر کے اب اس کی خود کو آپا کہلوانے کی عادت چھڑوا کر بجیا کا راگ بھیروں پکا کروایا تھا۔

اولاد انہوں نے ایک ہی پیدا کی۔۔۔ شوہر کے صلاح مشورے سے مدثر کی پیدائش کے وقت ہی بن بلائے آنے والے مہمانوں کا مستقل بندوبست انہیں اس ٹنٹے سے بچا گیا تھا۔۔۔ زیادہ اولاد کی خواہش دونوں کو ہی نہیں تھی۔۔۔ یہ مدثر بھی بغیر پلاننگ کے شادی کے شروع والے خمار میں ڈوبے دنوں میں جانے کہاں سے چلا آیا تھا۔۔۔ اب اتنے خود سر لا دین نہیں تھے

دونوں کہ گوشت کے اس انسان نما لوتھڑے کو ماں کے پیٹ کی اندر ہی ختم کروا دیتے۔۔۔ شکر کر کے صبر سے نو مہینے کاٹے اور پھر یہ بتاہی کاٹ پھینکا۔۔۔ مدثر کی پیدائش کے بعد خاتون بی بی کو کوئی خاص مشکل نہ ہوئی امام مسجد کی بیوی ہونے کے ناطے سارا محلہ ہی بچے کو ہاتھوں ہاتھ لیے پھرتا۔۔۔ اور پھر میکا و سسرال بھی اسی علاقے میں تھا اس لیے کوئی مسئلہ بھی ہوا نہیں۔۔۔

محلے خاندان میں اپنے سیان پن اور خوش اخلاقی کی وجہ سے ایک بڑا رتبہ حاصل تھا۔۔۔ تعریف اور تشہیر کسے اچھی نہیں لگتی؟ خاتون بی بی کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔۔۔ اتنا پیٹ کھانے سے نہیں بھرتا تھا جتنا اپنی تعریف سے سیری ہوتی تھی۔۔۔ اتنی سیری کہ انہیں اب کچھ عرصے سے بدہضمی کی مسلسل شکایت رہنے لگی تھی۔۔۔ اب تو عام ملنے جلنے والوں میں بھی یہ تاثر جڑ پکڑ رہا تھا کہ۔

"جب سے ٹی وی کے چوبارے چڑھی ہیں آپا! قدم تو وہاں سے اتر آتے ہیں لیکن دماغ وہیں بھول آتی ہیں شاید" کہنے والے ہونٹ لٹکا لٹکا کر کہتے۔۔۔ ان کی جانے بلا۔۔۔ وہ تو نئے سرے سے جوان ہونے کی تیاری پکڑ رہی تھیں۔۔۔ ہر دم مہندی سے بجے ہاتھ۔۔۔ لش لش کرتے بھڑکیلے رنگوں کے اسکارف۔۔۔ یہی سوچ جانے کب چینل سے بلاوا آجائے۔۔۔ کچھ لوگ جلتے۔۔۔ کچھ اب جل جل کر بجھ چکے تھے مطلب کہ "بھئی ہمیں کیا" کا گٹھر سر پہ اٹھائے یہاں سے وہاں گھوما کرتے۔۔۔ شوہر ہم خیال ہو، اس سے بڑی نعمت اور کوئی نہیں۔۔۔ وہ سیاہ کو سفید کرنے کے گر سے امام دین سے زیادہ واقف تھیں تو بس چلتی ان ہی کی تھی چاہے زبان ہو یا حکومت۔۔۔

☆ ☆ ☆

"جی اللہ کا فضل آپ سنائیں رضا صاحب" آپا اس وقت بڑے خوشگوار موڈ میں اپنا بڑا سا موبائل کانوں سے لگائے باچھیں کھلا رہی تھیں۔۔۔ جب مدثر کمرے میں داخل ہوا۔۔۔ وہ شاید جلدی میں تھا اس لیے انہیں فون پہ مصروف دیکھ کر کوفت کا شکار ہوا۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہنے کے لیے لب وا کرتا آپا نے وہیں سے اپنا ہاتھ جھٹک کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"استغفراللہ! کیا سوچ کر یہ بات آپ نے کی؟"

دوسری طرف کی بات سن کر ان کی خوش اخلاقی کمرے کی باہر کو کھلی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر کود گئی۔۔۔ مدثر کمرے میں رکھے واحد صوفے پہ چہرہ بیزار سا بنائے انہیں مسلسل کمرے میں ادھر سے ادھر چکراتے دیکھ رہا تھا۔

"آپ کو تو پتا ہی ہے کہ میرا تعلق قاریوں کے خاندان سے ہے۔۔۔ اللہ نے بڑی عزت دی ہے۔۔۔ میرا کیا دماغ خراب ہے جواب بھانڈوں والا کام بھی شروع کروں۔۔۔ ایک جہان واقف ہے مجھ سے۔۔۔ قرآت میں ہے کوئی میرے مقابلے کی آپ کے پاس؟" تکبرانہ انداز میں ناک چڑھا کر کہا۔

مدثر ان کی بات سن کر اک سانس بھر کر رہ گیا۔۔۔ سارا ماجرا سمجھ میں آگیا تھا۔۔۔ آپا کو شاید اب اداکاری کی آفر ہوئی تھی۔۔۔ یہ بھی ان کے شایان کام تھا؟ اسی لیے پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔۔۔ کچھ دیر اور ذرا لائن پہ موجود ہستی کی طبیعت صاف کرنے کے بعد اپنا موبائل بند کر کے بیڈ پہ اچھال دیا۔

"لو اور سنو! مجھے کہہ رہا ہے کہ ڈرامے میں کام کریں گی۔۔۔" اس کے ساتھ صوفے پہ دھپ سے گرتے ہوئے انہوں نے اپنی کھولن نکالی۔

"نہ میرے رتبے کا خیال آیا خبیث کو۔۔۔ منہ اٹھا کے فون ملا دیا۔۔۔ جاہل۔۔۔ جہنمی" اپنے سر سے سرکتے ریشمی بھڑکیلے اسکارف کو دوبارہ اتار کر لپیٹا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"ہاں کوئی بات کرنی ہے۔۔۔ جیب خرچ چاہیے کیا؟" اس کی طرف رخ موڑ کر اس کے اپنے کمرے میں آمد کا مدعا خود ہی سوال و جواب سے جانچنے لگیں۔۔۔ مدثر نے انتہائی برا منہ بنایا۔ اسے ان کی اس عادت سے نفرت کی حد تک چڑ تھی کہ اگلے کی سنے بغیر حرف

آخر کی طرح اپنے خیال پہ جم جاتی تھیں۔

"تم ٹھہرو ذرا! میں اپنا پرس نکالتی ہوں" اور وہی ہوا ۔۔۔ بالکل وہی ۔۔۔ اس کے گھٹنے پہ ہاتھ مار کر مطلب ٹھہرنے کا اشارہ کیا ۔۔۔ اور خود اٹھ کر اپنی ڈریسنگ کی دراز کھنگالنے لگیں۔

"کیا میں نے آپ سے کہا کہ مجھے پیسے چاہئیں؟" وہ بولا تو جھنجلاہٹ نمایاں تھی ۔۔۔ اپنا پرس دراز سے برآمد کر کے اس کے اندرونی تہوں سے پیسے نکالتا ہاتھ ایک لمحے کو رکا ۔۔۔ وہ پوری اس کی سمت گھومیں ۔۔۔ اس کا لہجہ انہیں تاؤ دلا گیا تھا لیکن اپنے غصے کو ایک سیکنڈ کے لیے کنٹرول کیا ۔۔۔ کہ سنوں تو کیا مسئلہ ہے۔

"تو؟" ان کا سوالیہ تو لبوں کو گولائی دے گیا۔

"مجھے شادی کرنی ہے۔" کچھ لمحے اپنی سوچ کو زبان دینے سے پہلے اپنے الفاظ کا وزن کیا کہ آیا آپا سہار پائیں گی یا حسب عادت تڑخ جائیں گی اور وہی ہوا وہ تڑخ چکی تھیں۔

"شادی ۔۔۔ شادی۔" ان کی آنکھیں دہکنے لگیں۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے ۔۔۔ اپنی عمر دیکھو اور اپنی فرمائش ۔۔۔ شرم کرو۔" غصہ غصہ انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس بونگے کو کیسے سمجھائیں ۔۔۔

"کیوں ۔۔۔ میں کوئی شیر خوار بچہ ہوں یا مخبوط الحواس شخص ۔۔۔" وہ بھی ان ہی کے پیٹ کا جنا تھا ۔۔۔ اس کی تکرار سن کر آپا کے پیٹ میں ایک گولا سا چکرانے لگا ۔۔۔ اور ہوتے ہوتے یہ چکر ان کے پیروں سے آلپٹا ۔۔۔

"تمہارا مسئلہ کیا ہے آخر؟ ۔۔۔ میں تمہیں سمجھا سمجھا کر عاجز آگئی ہوں کہ ابھی تم صرف پڑھائی پر توجہ دو ۔۔۔ کھاؤ کھیلو ۔۔۔ انجوائے کرو۔" بات کے آخر میں ہر بار کی طرح سب کچھ کرنے کا "فریڈم سرٹیفکیٹ" اسے تھما دیا ۔۔۔ مطلب کہ جو مرضی کرو اب ۔۔۔ پر شادی کا نام نہ لینا ۔۔۔ لیکن وہ بھی ایک ڈھیٹ تھا یا پھر شریف ۔۔۔ اسی بات پہ اس کی سوئی پھنسی ہوئی تھی ۔۔۔

"صاف لفظوں میں سن لیں آپ ۔۔۔ مجھے بیوی چاہیے ۔۔۔ میری شادی کر دیں بس" بڑا دبنگ لہجہ تھا جیسے آپا اس کی اولاد ہوں نہ کہ وہ ۔۔۔ اکلوتا تھا ۔۔۔ بدتمیزی کا حق محفوظ رکھتا تھا ۔۔۔ آپا نے یکدم رک کر اس کی بات سنی ۔۔۔ کچھ لمحے اسے گھورا ۔۔۔ پھر بولیں تو لفظ لفظ چٹان کی سختی لیے ہوئے تھا۔

"تم ابھی صرف اٹھارہ سال کے ہو مدثر ۔۔۔ یعنی کہ بچے ۔۔۔ اور میں ان پاگل ماؤں میں سے ہرگز نہیں جو اولاد کی خوشی کے لیے ایک ٹانگ پہ ناچتی پھرتی ہیں۔ ابھی کم از کم دس سال تک تو اپنی شادی کا سوچنا بھی نہیں ۔۔۔" آپا کا لہجہ اسے باور کرا گیا تھا کہ یہ چٹان ایک انچ بھی نہیں ہلنے کی ۔۔۔ وہ بے بسی سے لب کاٹنے لگا ۔۔۔ اپنی بات ختم کر کے وہ سکون سے پیٹھ موڑ کر کھڑی ہو گئیں ۔۔۔ مخصوص انداز کہ اب آپ باہر کا راستہ ناپیں ۔۔۔ اس نے ان کی پیٹھ کو گھورتے ہوئے اپنے بال مٹھی میں جکڑ کر کھینچے اور دروازے کو ٹھوکر مارتا باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

"کیا کہا؟ مدثر کا دماغ تو ٹھیک ہے" خاتون بی بی کی بات سنتے ہی نیم دراز داڑھی میں خلال کرتے امام صاحب جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھے تھے۔ ان کا رد عمل حسب توقع تھا۔

"پتا نہیں کیا خناس اس کے ذہن میں گھس گیا ہے ۔۔۔ میں تو خود انتہائی عاجز آگئی ہوں۔ اب تم ہی سمجھاؤ۔" ڈریسنگ کے آئینے میں اپنے ڈائی کیے ہوئے بالوں میں ہلکا ہلکا برش پھیرتے ہوئے قدرے لاپروا سے جھنجلائے لہجے میں کہا تھا۔

"سمجھاؤں کیا خاک؟ خود ہی چپ کر جائے گا ۔۔۔ جب کل کو کوئی نیا شوق دماغ میں اچھلنے لگا۔ اس عمر میں لڑکے ایسے مطالبے کرتے ہی رہتے ہیں ابھی پہلے تعلیم مکمل کر لے پھر باندھ دیں گے بلی کے گلے میں گھنٹی۔" بیگم کے انداز نے انہیں بھی شانت کر دیا تھا۔

"ہوں۔" خاتون بی بی کمر اونچی کیے بیٹھی یونہی خود کو آئینے میں تکتے سلجھے بال سلجھاتی رہیں یہ جانے بغیر کہ وہ دونوں اپنے بیٹے کی زندگی کا سلجھا ریشم خود ہی الجھا بیٹھے تھے۔

☼ ☼ ☼

بجیا (خاتون بی بی نے شروع سے ہی کبھی بھی اپنی سگی اولاد تک کو خود کو امی یا ممی نہیں کہنے دیا تھا۔ ان کے نزدیک جب وہ ممی دکھتی نہیں تھیں تو کہلواتی کیوں؟ عجیب سی منطق تھی لیکن لاٹھی بھی ان کی تھی اور بھینس بھی۔ اس لیے وہ جہاں چاہیں بھینس کو ہانک دیتیں) سے خصوصی طور پر اور بار بار اور ابی جان (امام دین) سے بھی اعلا درجے کی بے عزتی کروانے کے بعد مدثر نے چپ سادھ لی تھی پہلے بھی وہ باتونی تو نہیں تھا لیکن اب بس گپ چپ اندر باہر آتا جاتا۔ کوئی کچھ پوچھتا تو جواب دے دیتا ورنہ ناشتا' کھانا اکیلے ہی کمرے میں کیا کرتا کہ آپا کی اپنی بہت مصروفیات تھیں تو ابی جان کے امامت کے بے زار بکھیڑے تھے لیکن پھر بھی انہوں نے نوٹس کر لیا تھا کہ صاحبزادہ آج کل انتہائی چپ رہنے لگا ہے۔

"تم نے دیکھا مدثر میں اب وہ پہلے سی بات نہیں رہی" کافی دن بعد وہ تین لوگ کھانے کی ٹیبل پر اکٹھے ہوئے تھے۔ مدثر نے تھوڑا بہت ٹونگا اور پھر سونے کا بہانہ کر کے جیسے ان کی موجودگی سے فرار چاہا تھا۔

"چھوڑیں بھی۔ اب زیادہ اس کی للو چپو میں نہ لگ جانا۔ پھر سے دورہ پڑ جائے گا اسے 'بڑی مشکل سے تو چپ کر کے بیٹھا ہے" ایک ہاتھ میں بڑی سی اسکرین والا فون اور دوسرے ہاتھ سے لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے بمشکل فون سے سر اٹھایا۔ چہرے پہ ناگواری تھی اس دخل در معقولات پہ۔

"دیکھ لو کہیں اس کے اندر ہی اندر کوئی طوفان نہ اٹھ کھڑا ہو۔" وہ جانے کیا خاتون بی بی کو باور کروانا چاہ رہے تھے۔ اب کی بار انہوں نے فون اوندھا کر کے ٹیبل پر رکھا اور تیکھے چتون سے شوہر کو دیکھا۔

"مطلب اس سے ڈر کر اس کی بے تکی بات مان کر اس کے آگے پیچھے پھروں یہ چاہتے ہو تم۔" خوش اخلاق سیانی آپا کا اخلاق باہر تک ہی تھا گھر میں تو تنگی تلوار بنی رہتی تھیں۔ لہجہ سرخ مرچ کی طرح تیکھا ہو گیا۔

"میں تو یہ کہہ رہا ہوں۔ کہ لڑکا کہیں ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔ اس علاقے میں بڑی عزت بنی ہوئی ہے پرکھوں کی۔ یہ نہ ہو کوئی الٹی لت میں پڑ جائے۔" شعلہ بیان امام صاحب کی ساری ہوا بیگم کی ایک گھوری سے نکل جاتی تھی اور الفاظ بھی یوں آگے کے پیچھے 'پیچھے کے آگے پھس پھس کرتے منہ سے نکلتے تھے۔ اب بھی یہی ہوا بیگم کھانا چھوڑ مسلسل گھورے جا رہی تھیں۔

"کتنی بار کہا ہے تم سے کہ یہ سڑا ہوا محلہ چھوڑ کر کسی ایلیٹ ایریے میں چلے جاتے ہیں لیکن تمہاری ٹانگیں تو اسی دلدل میں دھنسی رہیں گی۔ پرکھوں کی قبروں پہ کونسا تم مٹی کا لیپ کرنے جاتے ہو ہر ماہ؟ بس سال کے سال محرم میں محلے والوں کے منہ کو اپنا منہ دکھا آتے ہو صدیوں پرانی قبروں کو۔" بات کو کہاں سے کہاں پہنچا کر اپنی مرضی کا رخ دینا تو کوئی سیانی آپا سے سیکھتا۔

"سو باتوں کی ایک بات کہ مجھ سے جو مرضی منوالے لیکن تمہاری یہ من مانی میرے ہوتے ہوئے ممکن نہیں اور یہ جو چار پیسے ٹی وی سے کما کر تم سمجھتی ہو سارا جہان خرید لو گی تو یہ خوش فہمی کا بلبلہ خود ہی پھوڑ لو۔ نہ ابھی ہماری اتنی ہمت ہے نہ پسلی کہ یہ بڑے مگرمچھوں کے ہمسائے میں جا کر آباد ہوں۔" امام صاحب کے اندر کا آن بان والا مرد بے دار ہو چکا تھا نوالہ پلیٹ میں پٹخ کر خاتون بی بی کی اچھی خاصی کلاس لے ڈالی۔ اس لہجے سے وہ ذرا دبتی تھیں اور چڑتی بے حساب۔

"تمہارا کوئی قبلہ ہے بھی امام دین۔ ویسے تو گھر بھر لیا دنیا جہان کی آلائشوں سے لیکن جگہ بدلتے ہوئے وہی جتوں والی ذہنیت۔ کڑوے دیتا ہے گنا نہیں جس کو بنانے میں خود بندے کا رس نکل جاتا ہے" خاتون بی بی ایسے صفاچٹ انکار سے بھڑ بھڑ جلنے لگیں۔

"ہاں دو اور طعنے کہ اچھے شوہر کی طرح دنیا کی ہر آسائش تمہاری گھر کی باندی بنا دی۔ رکھتا نہ جو تم

لوگوں کو دوسرے امام مسجدوں کی طرح عقل ٹھکانے آجاتی دو دن میں۔" امام دین نے ہاتھ ان کی آنکھوں کے آگے نچا کر اپنے سر سے بندھا امامہ اتار کر ٹیبل پر پٹخا۔ ابھی کھانے سے پہلے ہی عشا کی نماز پڑھا کر آئے تھے سو ابھی تک امامہ سر پر ہی بندھا تھا جو اب پٹخنے پہ سیدھا مرغ مسلم کے ڈونگے میں منہ دیے بیٹھا تھا۔

"لو اس باسی کڑی کو بھی ہمیشہ غلط ٹائم پہ ابال آتا ہے۔" امام دین کے غصے سے پھڑکتے نتھنے دیکھ کر دل ہی دل میں اسے کوسا لیکن منہ میں شیرینی گھول لی بولیں تو شیرہ ٹپکنے لگا۔

"اوہو! میرا یہ مطلب تھوڑی تھا میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ اب یہ محلہ ہمارے معیار کا نہیں رہا۔ سارا دن عورتیں دماغ کھاتی رہتی ہیں پہلے کی بات اور تھی۔۔۔ اب ہمیں ان لوگوں کے سروں پہ پاؤں رکھ کر اگلی منزلیں چڑھنے کی ضرورت نہیں۔ میرا ایک نام بن چکا ہے انڈسٹری میں جب چینل کی گاڑی اس تنگ سی گلی میں آتی جاتی ہے نا تو سچ پوچھو بڑی شرمندگی ہوتی ہے سارا محلہ ہی آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔" اپنی بے چارگی کا بیان خاصے جذباتی پن سے نشر کیا امام صاحب بھی ذرا ٹھنڈے پڑے تھے۔

"تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن یہ بھی کوئی کچی آبادی نہیں اچھے خاصے امرا آباد ہیں یہاں اور جو عزت مقام ہمیں اس تنگ محلے میں حاصل ہے نا اس کا ہزاروں بھی اس کھلی کوٹھیوں والے علاقے میں نہیں ملے گا۔" ان کی بات میں خاصا وزن تھا۔ لیکن ان کا اب دل اٹھ گیا تھا اس جگہ سے۔

"بھئی یہاں کوئی پرائیویسی نہیں ہے بالکل بھی جو جب چاہے آکے میرے سر پہ بیٹھ جاتا ہے اپنے دکھوں کا گٹھر اٹھائے۔ بھئی میرے کرنے کو اور ہزار کام ہیں۔ اب میں بیٹھ کر ان کے مسئلوں کی گتھیاں کب تک سلجھاتی رہوں۔ خود تو زیر اور زبر میں فرق بھی نہ کر سکیں اور میں خواہ مخواہ پڑھ پڑھ کے اور دم کر کر کے اپنا دماغ پلپلا اور منہ پوپلا بنا لوں" امام دین بے اختیار ہنسے تھے خاتون بی بی کے دکھوں کی فہرست واقعی بڑی لمبی تھی۔

"اب مسجد کے اوپر رہتے ہیں باہر کا گیٹ تو بند کرنے سے رہے۔ برداشت کر لیا کرو تھوڑا سا آخر کتنا آرام ہے ہمیں ان لوگوں کی وجہ سے اور کتنے کام کر دیتے ہیں بغیر کہے" شاید ابھی امام صاحب میں تھوڑی سی صلہ رحمی کے جراثیم زندہ تھے اس لیے سبھاؤ سے بیگم کو سمجھانا چاہا جو کہ اچھی خاصی بنی ہوا کو اکھاڑنے پہ تل جاتی تھیں کبھی کبھی۔

"ہاں بس برداشت ہی ہے اب تو" اک گہرا سانس بھر کے امام صاحب کی ہاں میں ہاں ملائی کہ بات تو سولہ آنے درست تھی۔

"کوئی نہیں کوئی نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا بس تم لڑکے پہ دھیان رکھو۔۔۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اس کی منگنی عبدالمتین (امام دین کا چھوٹا بھائی) کی لڑکی سے کر دیتے ہیں۔" وہ گھوم پھر کر پھر اسی نقطے پہ آن پہنچے تھے جہاں سے یہ ساری داستان حمزہ شروع ہوئی تھی۔

"بس بس اتنے زیادہ بھی ڈکٹیٹر مت بنو تم!" ان کی بات سنتے ہی ہاتھ اٹھا کر انہیں وارننگ دے دی کہ میاں یہیں رک جاؤ اب۔

"نہ منگنی نہ منگنی کی بات ابھی وہ صرف پڑھے گا اور مجھے پتا ہے کہ اس کے لیے کیا اچھا ہے کیا برا؟ اسکالر بناؤں گی اسے میں بہت بڑا 'یہ ٹی وی والے اسکالرز لاکھوں کما رہے ہیں۔۔۔ لاکھوں۔"

جوش میں وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک ہاتھ کمر پہ اور دوسرا امام دین کے آنکھوں کے آگے ناچ رہا تھا۔

"اپنے پاس رکھو فضول کے مشورے۔ ایک بات مان لی نا تمہاری بس ٹھیک ہے اب اتنا بھی سر پہ نہ چڑھو اور تمہاری اس بھتیجی سے تو میں مر کر بھی نہ کروں اپنے مدثر کی شادی ہے کیا وہ؟ میٹرک پاس حافظ قرآن۔" انتہائی حقارت اور نخوت سے ناک چڑھا کر کہا۔

"کیوں میری بھتیجی میں کیا برائی ہے؟" ان کے الفاظ و انداز سے وہ بھی تاؤ کھا گئے۔۔۔ کھانا پڑا ٹھنڈا ہوتا رہا اور وہ دونوں ایک نئی بحث میں پڑ کر ایک دوسرے

سے سر ٹکرانے لگے۔ اندر کمرے میں سرخ آنکھیں لیے اپنے آئی پیڈ کی اسکرین کو گھورتا مدثر کسی اور ہی جہان میں پہنچا ہوا تھا۔

اپنی زندگی میں مگن اس گھرانے کے دو بڑوں کو کانوں کان بھی خبر نہ ہو سکی کہ ان کی اکلوتی اولاد کے اندر کیا کیا طوفان سر پٹخ رہے تھے۔ اس کی نظر' ذہن اور دوست تک بدل چکے تھے۔ تبدیلی آئی تھی اور بڑے زور سے لیکن کوئی شور خاتون بی بی اور امام صاحب تک نہیں پہنچا تھا کہ ان کی اپنی دنیا بڑی ہنگامہ خیزی سے بپا رہا کرتی تھی اسے کون دیکھتا' پرکھتا وہ اپنی نئی دنیا میں گم ہو رہا تھا۔ پر کوئی اسے ڈھونڈنے نہ نکلا۔

☆ ☆ ☆
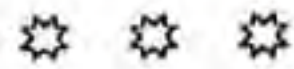
آج ایک سال سے اوپر ہو گیا مجھے جیل آئے ہوئے۔ باہر کی دنیا میں جانے کیا کیا بدلا لیکن میرے اندر تو سب کچھ بدل گیا۔ اس ایک حادثے نے مجھے انسان بنا دیا۔ جو میرے ماں باپ تو نہ بنا سکے۔ میں نے ایک چیز ضرور سیکھی ہے جیل میں کہ۔۔۔۔

"جن بچوں کے ماں باپ انہیں سمجھا سکھا نہ سکیں تو پھر وقت انہیں اپنی شاگردی میں لے لیتا ہے اور وقت سے بڑا سخت استاد کوئی نہیں۔" میں وقت کا سکھایا ہوا ہوں۔ اب کبھی یہ سبق ذہن سے محو نہیں ہو گا۔

میرے ماں باپ اپنا ایک اکلوتا بچہ تو ڈھنگ سے نہ پال سکے۔ ہاں خواہشوں کا اونٹ بڑے شوق سے پالا پروان چڑھایا۔ میں شروع سے ہی ایک ان چاہا بچہ تھا جو اپنے ماں باپ کی کسی پلاننگ کے بغیر ہی ان کی زندگیوں میں دندناتا گھس آیا۔ اب وہ کوئی لادین تو تھے نہیں ماشاء اللہ سے سارا ہی دین گھول کے پی رکھا تھا اس لیے مجھے قبول تو کر لیا لیکن آئندہ آنے والوں کا داخلہ ضرور بند کروا دیا۔ اگر میں کہوں کہ میرے ماں باپ نے دین کی تجارت دنیا سے سود پہ کی تو یہ سولہ آنے سچی بات ہو گی۔

مجھے اس بحث میں نہیں پڑنا کہ کب کب اور کہاں کہاں وہ غلط تھے؟ یہ فیصلہ آپ لوگوں نے کرنا ہے ہر بات بتانے والی سمجھانے والی نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی آپ کو خود بھی فہم کے سمندر میں غوطہ لگانا پڑتا ہے۔ کشتیوں میں بیٹھ کر سمندر کی گہرائی جانچنا اور اس سے لطف اندوز ہونا چھوڑ دیں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں جذباتی اور اخلاقی طور پہ ایک نگلیکٹڈ بچہ تھا۔ میرے ماں باپ مجھے سونے کا نوالہ ضرور کھلا رہے تھے لیکن نظر ان کی شیر کی نہیں تھی مجھ پر۔ "کوئی آپ کے ہاتھ میں ٹھنڈا کوئلہ پکڑا دے اس سے آپ کے ہاتھ جلیں گے نہیں لیکن کالے ضرور ہو جائیں گے۔"

مجھے کوئلوں کے گڑھے میں بٹھا کر اگر وہ سمجھ رہے تھے کہ میرا سفید دامن کالا نہیں ہو گا تو ان سے بڑا خوش فہم اور کوئی نہ تھا۔ ٹھنڈے کوئلے مجھے جلانے لگے دھیرے دھیرے شروع میں تو کچھ سمجھ نہ آئی لیکن دھیرے دھیرے ملتی آگہی ٹھنڈے کوئلوں کو بھڑکانے لگی۔ کسی کے ساتھ کی خواہش اس کم عمری میں ہی میرے اعصاب پہ کسی بلا کی طرح سوار ہو گئی۔ میں پڑھائی' لکھائی' سکھائی سب بھول گیا۔ اس مسئلے کا یہی حل سمجھ آیا کہ بجیا (اماں) سے بات کروں۔۔۔ نہ انہوں نے کبھی ماں کہلوایا اور نہ ہی بنیں۔ یک حرفی انکار' ہر بار سلگتی نظروں سے مجھے اپنے سامنے سے ہٹ جانے کا حکم دے دیتیں۔ ان کا ہی سکہ چلتا تھا گھر پہ سو یہاں بھی ان کی چلی۔

میں دکھ سے جیسے شل ہو گیا۔ کیسی ماں تھیں؟ کون تھیں؟ کیا تھیں؟ دل چاہتا انہیں آئینہ دکھا دوں لیکن پھر چپ کر جاتا بند ہونٹوں کے پیچھے الفاظ ٹکرا ٹکرا کر میری روح ہی زخمی کر دیتے۔ کیا اذیت تھی؟

کوئی غلط مطالبہ تو نہیں تھا میرا؟ حق تھا میرا کہ خود کو بربادی کے راستوں سے روکوں' فرض تھا ماں باپ کا چوکنے دربان بن کے بیٹھتے۔

میں حافظ قرآن ضرور تھا لیکن قرآن میرے دل پہ نہیں چڑھا تھا صرف زبان پہ رواں تھا۔ میں بھی ان بے شمار آدھے کالے اور بیمار دل والوں کی میراتھن میں

اندھا دھند دوڑنے لگا۔ تیز۔۔۔ تیز۔۔۔ تیز
میرا امام شیطان تھا' جو اس ریس میں سب سے آگے اپنے پیچھے بھاگے چلے آنے والوں کا حوصلہ بڑھانے کو اور تیز دوڑ رہا تھا یعنی دوڑا رہا تھا۔ دوڑتے دوڑتے میرا امام مجھے اس مقام پر لے آیا جہاں میرے ہی جیسے کچھ اور لوگ انسانیت کے نچلے ترین درجے' اک دوست کی کریانے کی دکان کے پچھلے حصے میں دو معصوم بچوں کے منہ پہ ہاتھ جمائے رقص ابلیس پہ ناچ رہے تھے میں اس سارے میں شامل نہیں تھا لیکن میں وہاں موجود تھا۔ بچوں کے تڑپتے مچلتے وجود دیکھتے ہوئے ان کی گھٹی گھٹی چیخیں سنتے ہوئے۔
صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو قتل کرنے کا منصوبہ بنانے والی پوری قوم میں سے چند ہی لوگ تھے۔۔۔ اور اس کو قتل کرنے والا صرف فرد واحد تو اللہ کا عذاب ساری قوم پہ کیوں نازل ہوا؟ میرے پاس آج اس کا جواب ہے کل نہیں تھا۔
برائی ہوتے دیکھ کر چپ سادھ لینے والا "بھئی میں تو نہیں یہ سب کر رہے ہیں" کہہ کر کندھے اچکا کر پیٹھ موڑنے سے اللہ کا عذاب نہیں مڑ جاتا۔ میں نے ان کا منصوبہ سنا نہ روکا' نہ ٹوکا' نہ خبردار کیا' بس یک ٹک دلچسپی سے دیکھتا رہا تو میں کیسے کیسے پکڑ میں نہ آتا؟
جانے کیسے جمعے کی نماز کے بعد ساتھ والی دکان کے بڑے سے ہال کمرے میں موجود نمازیوں کو بھنک پڑ گئی۔ دکان کا آدھا کھلا شٹر دیکھ کر کوئی شاید کچھ لینے آیا تھا' جب دکان کے پچھلے حصے میں گھٹی گھٹی چیخوں پہ آنے والے کے کان کھڑے ہوئے اور وہ سب کو بلا لایا۔ ہمیں کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی اور لوگوں کا ہجوم ہمارے سروں پہ آکھڑا ہوا۔ بس پھر یاد نہیں کیا ہوا؟
بس "آپا کا بیٹا" کی بازگشت ہی میرے کانوں میں گونجتی رہ گئی۔ بچوں کو کچھ لوگ لے کر ہسپتال بھاگے ہمیں تو بھاگنے کا بھی موقع نہ ملا اور اچھا ہوا نہیں ملا۔۔۔ ورنہ میں کبھی نہ سنبھلتا۔ میرا امام مجھے اپنے پیچھے دوڑاتے ہوئے سیدھا اس ہولناک' آگ سے بھرے گڑھے میں گرا دیتا۔

میں بچ گیا تھا اللہ نے مجھے بچا لیا تھا۔ مجھے ایک اور موقع دیا تھا سنبھلنے کا۔ ٹھوکر کھانے' سوچنے اور کرنے کا۔

میں خوش ہوں کہ میری گرفت ہو گئی۔ میری رسی کھینچ لی گئی۔ مجھے منہ کے بل اسی زمین کے اوپر گرا دیا گیا اس اندھے سیاہ بھڑ بھڑ جلتے گڑھے میں نہیں۔
پہلے جس کتاب کے الفاظ صرف میری زبان پر چڑھے تھے اب وہ دل و دماغ میں ڈیرہ جمائے بیٹھے ہیں۔ اب کوئی ابہام نہیں کوئی وسوسہ نہیں اب سب صاف ہے اندر بھی اور باہر بھی ہاں ایک بات کا مجھے انتہائی دکھ ہے کہ بجیا خالی ہاتھ ہی اس دنیا سے چلی گئیں۔ یہاں تو جھولیاں بھر بھر کمایا لیکن وہاں کے لیے۔۔۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہم برف کے آدمی ہیں جو کسی بھی آزمائش' مشکل سے پگھل جاتے ہیں۔
ہمیں حسرتیں پگھلا دیتی ہیں جنہیں پورا کرنے کے لیے اس پگھلی مائع کو کسی بھی سانچے میں ڈھال لو کوئی بھی شکل دے دو فرق نہیں پڑتا بس کوئی حسرت پوری ہونے سے نہ رہ جائے۔
میں اب بھی برف کا آدمی ہوں لیکن یہ برف صرف اللہ کے لیے پگھلتی ہے اور اسی کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔ میں کوئی نفسیات دان بھی نہیں کہ آپ کو یہ سب کیوں ہوا کی تشریح کر کے دوں سیاق و سباق سمیت غلطی کہاں ہوئی؟ کس سے ہوئی یہ سب لایعنی باتیں ہیں' ایک بار غلطی ہو جائے تو اس کے سدھار کے علاوہ معافی کا کوئی اور راستہ نہیں۔
میں زمین کے اوپر کیے گئے کاموں کی سزا یہیں بھگت رہا ہوں کہ یہی نجات ہے غلطی سدھارے بغیر زمین کے اندر چلے جانے والوں کو دوسرا موقع نہیں ملے گا صرف سزا! میں خوش قسمت ہوں کہ زندگی گناہوں کا بوجھ یہیں اتار جاؤں گا۔
مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔ بس یہ کہ۔
آئیں اپنے اپنے حصے کی مشعل جلائیں۔۔۔ اپنی غلطیاں سدھاریں کہ ابھی ہم زمین کے اوپر ہی ہیں۔۔۔ ابھی وقت ہمارا ہے۔

☼ ☼

فرحین اظفر

دیئے وفا

سوہا اور ماہا دونوں بہنیں اپنی ماں کے ساتھ گھر کی اوپری منزل میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔

گھر کی نچلی منزل میں ان کے تایا اور تائی اپنی دو بیٹیوں عفت اور نائلہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ تایا اکثر بیمار رہتے ہیں۔

حدید 'انس' عفت اور نائلہ کے خالہ زاد ہیں۔ نائلہ 'انس میں دلچسپی رکھتی ہے۔ مگر انس 'سوہا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار اپنی خالہ اور سوہا کی تائی کے سامنے کر دیتا ہے۔ خالہ کو بے پناہ دکھ کا احساس ہوتا ہے 'مگر بظاہر راضی خوشی اس کا رشتہ لے کر اپنی دیورانی کے پاس جاتی ہیں۔ سوہا کی والدہ یہ رشتہ خوشی خوشی قبول کر لیتی ہیں۔

نائلہ باقاعدگی سے اپنے والد کو اسپتال لے کر جاتی ہے۔ وہاں اسپتال کے کلرک شبیر حسین عرف شبو سے روابط بڑھ جاتے ہیں کہ اچھے برے کی تمیز کو بھول جاتی ہے۔

سوہا اور انس کی شادی کی تقریبات بہت اچھے طریقے سے انجام پاتی ہیں اور سوہا رخصت ہو کر انس کے گھر آ جاتی ہے۔

حدید کسی کو ڈراپ کرنے جاتا ہے اور اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

سوہا کے اکیلے پن کی وجہ سے عفت اس کے پاس رک جاتی ہے۔ گھر کے کاموں کے علاوہ حدید کا بھی خیال رکھتی ہے۔

حدید 'عفت کے دل میں اپنے لیے پسندیدگی کو جان لیتا ہے اور سوچ لیتا ہے کہ اس بار خالہ کو مایوس نہیں کرے گا۔

نائلہ 'شبیر حسین سے ملنا نہیں چھوڑتی اور آخر کار اپنی عزت گنوا بیٹھتی ہے 'جس کا اندازہ اس کی ماں کو بھی ہو جاتا ہے اور وہ اپنی عزت بچانے کے لیے حدید کے ساتھ نائلہ کی شادی کا فیصلہ کر لیتی ہیں اور اس بات کا اظہار انس اور ماہا سے بھی کر دیتی ہیں۔

حدید 'انس کی خاطر نائلہ سے شادی کرنے کے لیے رضامند ہو جاتا ہے اور شادی کے بعد پوری سچائی سے نائلہ کو بیوی کا درجہ دینا چاہتا ہے 'مگر نائلہ نے حدید کو مجبوری کے تحت اپنی زندگی میں قبول کیا اور اس کو وہ مقام نہ دیا جو اس کا حق تھا۔ حدید

خاموش ہوگیا کہ وقت کے ساتھ ساتھ نائلہ اس کو قبول کرلے گی، مگر حدید کی شرافت اور خاموشی کو دیکھتے ہوئے نائلہ کے دماغ میں کچھ اور ہی منصوبے بالا ہی بالا تشکیل پانے لگے، جس پر نائلہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑی کامیابی سے عمل پیرا تھی کہ وہ انس کی نہ ہوسکی تو سوہا اور انس کو بھی جدا کردے گی۔

ماہا کی شادی حسیب سے بخیر و خوبی ہوجاتی ہے۔ ماہا حسیب کے ساتھ دبئی چلی جاتی ہے، ماہا حسیب سے شادی کے بعد اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت لڑکی سمجھنے لگتی ہے، مگر اس کو پتا چلتا ہے کہ حسیب ایک بیٹے کا باپ ہے اور وہ فوراً پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیتی ہے۔

سوہا امید سے ہوتی ہے، مگر نائلہ بڑی عمدگی اور کامیابی سے سوہا کو اس خوشی سے محروم کردیتی ہے اور اس حادثے کے بعد انس کو اپنی زیادتی کا احساس ہوتا ہے اور وہ سوچ لیتا ہے کہ اب سوہا کو کوئی غم نہیں دے گا۔ نائلہ اسپتال میں شبیر حسین کو دیکھ کر چکرا جاتی ہے وہ سمجھتی ہے کہ شبیر حسین نے اس کو نہیں دیکھا، مگر شبیر حسین نائلہ کا پیچھا کرتے کرتے اس کے گھر پہنچ جاتا ہے اور نائلہ نہ چاہتے ہوئے بھی شبیر حسین کے جال میں گھر جاتی ہے۔

حسیب ماہا کو منالیتا ہے اور پاکستان آجاتا ہے، مگر ماہا پھر غلط فہمی کا شکار ہوجاتی ہے اور حسیب کے ساتھ جانے سے منع کردیتی ہے۔ حسیب اکیلا ہی دبئی جانے کے لیے روانہ ہوجاتا ہے کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے۔

عفت کا نکاح معراج کے ساتھ ہوجاتا ہے۔ جس کا حدید کو پتا چلتا ہے تو وہ حیران ہوجاتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

بارہویں قسط

"اسی نے دیکھا تھا سب سے پہلے۔" حدید کے تصور میں کسی کا جنون چکرایا۔ اس نے بے ارادہ ہی خشک لبوں کو زبان پھیر کر تر کیا۔ فون پر دوسری طرف اتنی لمبی خاموشی رہی کہ حدید سمجھا لائن کٹ گئی ہے۔

"طبیعت کیسی ہے اس کی؟ وہ ٹھیک ہے۔" اس کی ہیلو کے جواب میں جو آواز ابھری وہ بے حد تھکن زدہ تھی۔

"کس کی... ماہا کی... جی بس ٹھیک ہی ہے۔" اس نے گہری سانس لے کر اپنی پیشانی رگڑی۔

"کیا کہتے ہو تم... میں مزنہ کو بتاؤں ابھی یا پھر... صبح..." ان کی نظروں نے دیوار گیر گھڑی تک کا سفر کیا۔

"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ ویسے آج ابھی آنٹی کی چھٹی ہورہی ہے۔ ہم انہیں لے کر گھر جارہے ہیں۔ انہیں کچھ نہیں بتایا ہے، ہم نے ان کی اپنی حالت ٹھیک نہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ تم لوگ آج رات تو رہنے دو۔ میں صبح مزنہ کو بتادوں گا اور ہسپتال بھی لے آؤں گا۔" گفتگو کے فیصلہ کن اختتام تک پہنچتے پہنچتے وہ یوں تھک گیا تھا۔ جیسے میلوں کا سفر پیدل طے کرکے آیا ہو۔ اس نے سامنے بینچ پر بوجھل انداز میں بیٹھی سوہا اور ماہا کو دیکھا۔ وہ فون بند کرکے بے حد سست رفتار قدموں سے نزدیک آیا۔

"آنٹی کا سامان پیک کرلیا سوہا۔" سر جھکائے بیٹھی سوہا نے پژمردگی سے سر اثبات میں ہلایا۔

"چلو پھر... اٹھو ماہا نہیں سہارا دے کر باہر لاؤ۔ میں تب تک باقی سب نپٹاتا ہوں۔" حسب توقع ماہا اس کی بات پر سوہا کو دیکھ کر منمنانے لگی۔

"میں نہیں جاؤں گی میں اب نہیں جاسکتی۔" حدید نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر سوہا کو۔

"اسے سمجھاؤ سوہا۔ اس وقت ہمارے ساتھ چلے۔ اگر یہ یہاں رکے گی تو آنٹی لازما" اس کی غیر موجودگی کا پوچھیں گی۔ صورت حال کو سمجھ کر چلے اور اپنے آپ کو سنبھالے۔ ابھی مجھے انس کو بھی فون کرنا ہے۔ اس سے مشورہ کرنے کے بعد ہی میں فیصلہ کرسکوں گا کہ گھر میں فی الحال کس کس کو یہ خبر سنانی ہے۔"

اپنی بات مکمل کرکے وہ بنا ماہا کی طرف دیکھے۔ سیدھا بڑھتا چلا گیا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس کے اپنے اعصاب شل

ہو رہے تھے۔ سر اور جسم میں شدید درد کا احساس اچانک ہی جاگ اٹھا تھا۔ بے اختیار اس کا دل چاہا کہ ہر مسئلے اور فکر سے جان چھڑا کر گھر جائے اور کسی مہربان آغوش کی پناہ میں سکون سے آنکھیں موند لے۔ سکون کے تصور سے اس کے ذہن میں نائلہ کا چہرہ ابھرا اور وہ پاس کھڑی کیب تک جاتے جاتے ٹھٹک گیا۔

☼ ☼ ☼

بتول بہت دیر سے تماشا دیکھ رہی تھیں۔ وہ بار بار موبائل اٹھاتا اور اسکرین دیکھ کر بے اختیار اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ چمکتی جسے وہ بمشکل لب دبا کر چھپاتا۔ چند ایک لفظ یا دو ایک جملے ٹائپ کرتا اور سیل ایک طرف رکھ کر دوبارہ اپنے بیٹے کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ جو ایک چھوٹے سائز کا پیانو اپنے گھٹنوں پر ٹکائے باپ سے چپک کر بیٹھا الٹے سیدھے بٹنوں پر ہاتھ مارتا' شور بھی مچا رہا تھا اور خوش بھی ہو رہا تھا۔

پیانو سے نکلتے الٹے سیدھے راگ بہت اونچی آواز میں تھے۔ بتول کے کان پکنے لگے۔ مگر معراج کا وہ حال تھا۔ جیسے اسے اردگرد کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ وہ بیٹے کی طرف دیکھ کر دھیرے سے مسکراتا تو لبوں سے زیادہ اس کی آنکھیں مسکرا اٹھتیں۔ وہ نہ اپنے بیٹے کی بات سن رہا تھا' نہ اس پر توجہ دے رہا تھا۔ بس اس کی کسی بات کے جواب میں یا اس کے بطور خاص متوجہ کرنے پر پیانو کے کسی بٹن پر انگلی رکھ دیتا۔ بے ڈھنگے پیں پاں شور میں ایک اور بے ڈھنگی آواز گونج جاتی اور بس۔

بتول کے لیے معراج کی یہ مصروفیت آج سے پہلے کبھی اتنی چبھن آمیز نہیں رہی تھی۔ وہ آفس سے آنے کے بعد اکثر فون پر کالز اٹینڈ کرتا رہتا تھا۔ اسی طرح خود بھی کبھی دوستوں اور اپنے افسران کو فون اور پیغامات بھیجتا رہتا تھا۔ لیکن اس وقت بتول کی چھٹی بلکہ پہلی پانچ حسیں بھی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں کہ اس وقت معراج کے فون پر کوئی اور نہیں بلکہ عفت ہی تھی۔ جو مسلسل نہ صرف میسج پر اس سے بات کر رہی تھی' بلکہ اس کی توجہ بھی بٹا رہی تھی کہ معراج ٹھیک سے اپنے بچے کو وقت نہیں دے پا رہا تھا۔

"راجو۔۔۔ اے راجو۔" بالآخر جب ان سے برداشت نہیں ہوا تو انہوں نے معراج کو دھیرے سے آواز دے ڈالی۔ مگر معراج نے ان کی پکار پر کان دھرے ہی نہیں۔ اسی وقت اس کے بیٹے نے پھر سے کوئی بات کرنے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور اسے متوجہ نہ پا کر اس کی تھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف گھمانے لگا۔ معراج نے بتول کی آواز تو سنی نہیں تھی۔ اس کا دھیان بیٹے کی طرف بھی نہیں گیا۔ بتول کی الجھن ایکا ایکی غصے میں بدلی اور انہیں بری طرح تپ ہی تو چڑھ گئی۔

"معراج۔۔۔" اگلے پل ان کے حلق سے نکلنے والی آواز اتنی کراری اور کڑک تھی کہ نہ صرف معراج بلکہ اس کا بیٹا بھی بری طرح چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

"کیا ہوا امی۔۔۔" اس کا لہجہ اور انداز بھی اتنا ہی پرسکون تھا۔

"کب سے آواز دے رہی ہوں کان پر جوں نہیں رینگتی تمہارے۔ آخر ایسا کون ہے۔ جس کے آگے اپنی اولاد کو دیکھنے کا وقت نہیں مل رہا تمہیں۔" معراج کا منہ کھل گیا۔ اس نے اسی کھلے منہ سے انہیں پھر اپنے بیٹے کو دیکھا۔ جو اسی کی طرح ناسمجھی سے کبھی اپنے باپ اور کبھی دادی کو دیکھ رہا تھا۔

"چچ۔۔۔" اس نے اس کی گود سے پیانو اٹھایا۔ اسے ایک طرف رکھا۔ پھر اسے گود میں اٹھا کر آگے آیا اور بتول کے بستر پر لٹا دیا۔

"رات بہت ہو گئی ہے۔ اب آپ کو بھی آرام کرنا چاہیے اور میرے منے کو بھی سونا چاہیے' چلو بیٹا آنکھیں بند۔۔۔ شاباش۔۔۔" اب کی بار منہ کھلنے کی باری بتول کی تھی۔ وہ آگے سے ہیں۔ بس بھی نہیں کر پائیں' اور وہ ایک

بار پھر سیل اٹھا کر اسکرین دیکھتا کمرے سے یہ جا وہ جا۔ بتول چند لمحے تو اس کے جانے کے بعد یوں ہی بیٹھی رہیں۔ پھر جب ان کے پوتے نے پکارا۔

"دادی! تب کہیں جا کے وہ کسی گہری نیند سے جاگیں۔

"دادی کہانی سنائیں نا۔" انہوں نے ایک تھکی ہوئی نظر اس پر پھینکی۔

"اپنے باپ سے سن جا کر۔" انہیں خود نہیں پتا تھا کہ انہیں اتنا غصہ آخر آ کس بات پر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

پہلی بار موبائل فون کی افادیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس نے جب سے موبائل فون لیا تھا۔ شاید تب سے اب تک کل ملا کر بھی اتنے میسجز کسی کو نہیں کیے تھے۔ جتنے اب ان چند گھنٹوں میں کر دیے تھے اور ان چند گھنٹوں میں اس نے اور بھی کچھ تھا جو جانا تھا' محبت کے علاوہ اور کوئی سواری آج تک ایجاد نہ ہو پائی تھی۔ جو دو انسانوں کے درمیان موجود فاصلوں کو اس سے زیادہ تیز رفتاری سے پاٹ سکے۔

مرد ذات سے پیدا ہو جانے والے سب سے خوب صورت جذبے محبت کی پہلی سیڑھی انسیت کے علاوہ اور کوئی چیز اتنی طاقت نہیں رکھتی کہ اس سے زیادہ عورت کو اپنا دیوانہ بنا سکے۔ نکاح کے بول کوئی طلسماتی طاقت نہیں صرف ایک احساس رکھتے ہیں۔ وہی احساس رفتہ رفتہ اپنائیت اور پھر محبت کی طاقت بن کر اس رشتے کی رگوں میں بہنے لگتا ہے۔ وہ اس سے پہلے صرف ہجر کے معنی جانتی تھی یا صرف نارسائی کے یا صرف قربانی کے۔ یا صرف خاموشی کے۔۔۔ ایک ان چاہا رشتہ بہت دھیرج سے مگر بہت تیزی سے من چاہا بن رہا تھا۔

زندگی کے دامن میں اس کے لیے سیاہ' سفید اور سرمئی کے علاوہ بھی بہت سے رنگ تھے۔ زندگی نے اس سے پہلے اپنا دامن کشادہ کیا ہی کب تھا۔ اب تو زندگی مسکرائی تھی۔ اس نے اپنی بانہیں وا کر دی تھیں۔ وہ انکشاف سے حیرت اور پھر حیرت سے یقین کی اور سفر شروع کر چکی تھی اور اس سفر میں معراج اس کا ہم سفر تھا۔

بنا پلکیں جھپکے مستقل ایک ہی جانب دیکھنے پر اس کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی تھی۔ تب ہی بے آواز سیل فون میں تھرتھراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے چونک کر فون اٹھایا اور گہری سانس بھر کے مسکرا دی۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ اس کی ایک "ہاں" کا منتظر تھا۔

"فون کروں؟" ایک ہی الفاظ پر مشتمل یہ کوئی آٹھواں میسج تھا۔

"نہیں۔۔۔"

"کیوں۔۔۔"

"سب باتیں کر تو لیں۔ اب کیا رہ گیا ہے۔ ساری باتیں ختم ہو گئی ہیں۔"

"تمہاری ختم ہوئی ہیں۔ میرے پاس باقی ہیں۔"

"تو۔۔۔؟"

"تو کیا۔۔۔ میں بولوں گا تم بس سنتی رہنا۔"

"مجھے نیند آ جائے گی۔"

"میں نہیں سونے دوں گا۔"

"میں بور ہو جاؤں گی۔"

"اتنی بری باتیں کرتا ہوں میں۔"

"میں کیا کہوں۔۔۔ آپ خود سمجھ دار ہیں۔" اس نے نچلے لب کا کونا دانتوں تلے دبایا اور سینڈ کا بٹن دبایا۔

"حد ادب لڑکی... میں تمہارا مجازی خدا... اس بات کا برا بھی منا سکتا ہوں۔"

"تو جلدی سے برا منا لیں اور سو جائیں۔"

"تمہیں میرے برا ماننے کی کوئی پروا نہیں۔"

"فی الحال نہیں۔" اس نے ایک مسکراتا ہوا چہرہ بھی ساتھ اٹیچ کر دیا۔

"اور اگر میں ناراض ہو گیا تو تمہیں سکون کی نیند آجائے گی۔"

"جلد ہی آجائے گی۔" کچھ دیر خاموش رہی۔ اگلے کئی منٹ تک کوئی پیغام نہیں آیا۔ وہ جو اس کو فون بند کر کے سو جانے کا مشورہ دینے لگی تھی۔ خود ہی تشویش میں پڑ گئی۔ بجائے سیل رکھ کر سونے کے ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگی۔

"اگر یہ بات تم اپنی آواز میں مجھے سنا دو تو... وعدہ کرتا ہوں اور تنگ نہیں کروں گا' فون کروں۔" عفت کی بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی۔

"السلام علیکم۔" کچھ دیر بعد سیل فون سے نکلتی آواز اس کی سماعتیں بھگو رہی تھی۔

"آپ کیا روز اتنی جلدی سو جاتی ہیں یا آج زیادہ نیند آرہی ہے۔" شرارت کی رمق میلوں کے فاصلے سے بھی اسے دکھائی دے رہی تھی۔

"میں فجر میں اٹھتی ہوں۔ اس لیے جلدی سوتی ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے فرصت سے کروٹ کے بل لیٹ گئی۔ جانتی جو تھی۔ کم از کم آج کی رات وہ سو نہیں سکے گی۔ اس کے چہرے پر کوئی پچھتاوا یا افسوس نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

رضوانہ کو ڈس چارج ہونے کے بعد گھر تک لاتے لاتے کافی دیر ہو چکی تھی۔ نیچے والے پورشن کی تمام بتیاں گل تھیں۔ حدید تیسری بار نائلہ کا فون ڈسکنیکٹ کرنے کے بعد اب چوتھی بار کال کرنے پر ریسیو۔ کر کے اکھڑ لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"کیا مصیبت ہے تمہیں کیوں فون کیے جا رہی ہو۔"

"مصیبت... مصیبت کیا ہوتی ہے۔ اتنی رات ہو گئی ہے۔ میں گھر میں اکیلی ہوں۔" اس نے بمشکل حدید کا لب و لہجہ کڑوے گھونٹ کی طرح حلق سے اتارا۔

"تو... " حدید پر اس کی مشکل سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

"تو... تو کیا مطلب... میں اکیلی ہوں' رات ہو گئی ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ آپ... آپ پلیز گھر آجائیں نا!" اپنے منت بھرے لہجے پر اسے خود جتنی حیرت تھی شاید اتنی حدید کو بھی نہیں ہوتی۔ کس نے سوچا تھا کہ حالات اس نہج پر آجائیں گے۔ ایک شخص جو کہ اس کا شوہر تھا' جسے اس نے کبھی شوہر جتنی اہمیت دی نہ توجہ' نہ وہ درجہ جو ایک بیوی کے ذہن و دل میں شوہر کا ہوتا ہے۔ جس کا نزدیک آنا اسے پسند نہیں تھا اور وہ اس شخص سے برملا اس کا اظہار بھی کر چکی تھی۔ آج خود سے ایک بار نہیں کئی بار فون کر کے اسے گھر بلا رہی تھی۔

اور وہ شخص جو دل سے اسے نہ چاہنے کے باوجود اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر چکا تھا۔ جو اس کے سرد اور ناقابل فہم' ہتک آمیز اور اکتائے ہوئے رویے کے باوجود' سب سے بڑھ کر ایک مرد ہونے کے باوجود فاصلے مٹانے کی ایک بار نہیں کئی بار کوشش کر چکا تھا۔ وہی شخص آج اس سے اس قدر بے زار تھا کہ اس کے نزدیک آنا تو دور اس کی بات تک سننے کا روادار نہ تھا۔

"تو... آ نہیں آرہے... کیا چچی کی چھٹی نہیں ہوئی۔"

"آتا ہوں... تھوڑی دیر لگے گی۔" وہ اور بھی کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ لیکن حدید کے روکھے رویے کو دیکھ کر

ہمت نہیں ہوئی۔

☆ ☆ ☆
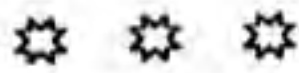
امی ۔۔۔ تائی اماں اور تایا ابو کے علاوہ گھر میں باقی سب کو علم ہو گیا تھا۔ انس دوسرے دن صبح ہی صبح اپنا بوریا بستر سمیٹ واپس کراچی آگیا۔ حیدر آباد میں جاب ملنے کی جو آس بندھی تھی وہ اس آخری انٹرویو کے بعد مکمل طور پر ٹوٹ چکی تھی۔ سفارش اور رشوت وہ دو تلواریں تھیں جو کامیابی کے میدان میں شہسوار اپنی میان میں نہیں بلکہ آستین میں چھپا کر رکھتا تھا اور وہ جو یہ سمجھتا تھا کہ ایسا صرف کراچی میں ہے تو یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ نتیجتاً" حبیب کی خبر اور اس کی حالت اس کے ارادوں کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ وہ بے حد شکستہ اعصاب کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تھا۔ حدید سرخ آنکھیں لیے ناشتے میں مصروف تھا اور نائلہ حسب معمول کچن میں۔

"خیریت تو ہے ہم کتنی صبح نکل پڑے۔"

"بس یار جب ایک بار اس کا سن لیا تو رکا نہیں گیا۔" حدید نے جواب نہیں دیا۔

"انس کے لیے بھی ناشتا بنا دو۔" اس نے آواز لگائی۔

"نائلہ یہیں ہے۔" اس نے بے حد محتاط ہو کر پوچھا تھا۔ "ہوں۔۔۔ میں لے جاؤں گا' اگر اسے میرے ساتھ جانا ہوا تو' مگر رات میں۔"

"رات میں کیوں۔۔۔" انس کو حیرت سی ہوئی۔ حدید نے ناشتا روک کر بے زاری سے اسے دیکھا۔

"آج مجھے ہر حال میں آفس نہ صرف جانا ہے' بلکہ جتنا بھی کام میرا پینڈنگ میں پڑا ہے وہ کمپلیٹ کر کے دینا ہے اوور ٹائم بھی کرنا پڑے گا اور وہ بھی وِد آؤٹ پے۔۔۔" انس اس کا انداز اور اس کی بات سمجھ کر چپ ہو گیا۔ حدید کا خیال تھا کہ وہ آگے سے تبصرہ کرے گا یا کم از کم ایک "کیوں" کا سوال تو ضرور ہی اٹھائے گا' لیکن اس کی طرف سے مکمل خاموشی پر خود ہی کہنے لگا۔

"تھکا کے رکھ دیا ہے ان اسپتالوں کے چکروں نے یار۔۔۔ ایک بندہ نکلا نہیں کہ دوسرا۔۔۔" اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"اسپتال کوئی اپنی مرضی سے تو نہیں جاتا نا۔" انس کی آواز دھیمی تھی۔

"پھر بھی یار۔۔۔ پرائیویٹ جاب کرتا ہوں۔ نہ ڈھنگ سے کوئی پرفارمنس دی ہے' نہ کوئی کام لگ کے کر پایا ہوں۔ اوپر سے اب یہ حبیب کی بات اور۔۔۔ اور تم تو جا کر بیٹھ گئے وہاں' یہاں میری خواری۔"

حدید جیسے ناک تک بھر چکا تھا۔ اسے خود اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کام جن میں خدا کے سوا اور کسی کی مرضی تھی نہ خوشی۔ ان کاموں میں وہ کسی معصوم انسان کو کیوں قصوروار ٹھہرا رہا تھا۔ کیوں۔۔۔ کیونکہ وہ تھک گیا تھا۔ تھک رہا تھا اور تھک چکا تھا۔ اسے اپنی تھکن اتارنے کے لیے۔ جس سہارے اور جس وجود کی ضرورت تھی وہ پاس ہوتے ہوئے بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ اس نے ایک جلتی ہوئی نظر ناشتا لا کر رکھتی' نائلہ کی طرف پھینکی تھی۔

انس گہری سوچ میں ڈوب چکا تھا۔ جمع جتھا آہستہ آہستہ اختتام کی طرف جا رہا تھا اور یہاں تو قدم قدم پر پیسے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسے جو بھاگ دوڑ دوسری نوکری کے حصول کے لیے کرنی چاہیے تھی وہ سارا اب اپنے سسرال کے چکروں میں نکلنے والا تھا۔ ظاہر ہے حبیب کو اسپتال میں لاوارثوں کی طرح تو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ پہلے ہی اللہ نے بہت کرم کیا تھا جو ایک انسان نما فرشتے نے نہ صرف اس کی جان بچائی تھی' بلکہ اس کے علاج معالجے کا خرچا بھی اپنے ذمہ لے رکھا تھا ورنہ شاید۔۔۔ اس کے آگے مزید سوچنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ چونکا' پھر سوہا کو فون کرنے کے ارادے سے اوپر جانے لگا تو حدید کی آواز آئی۔

"ہاں تمہیں ویسے بھی کسی کے جینے مرنے سے کیا سروکار۔۔۔ تم اپنی دنیا میں مست رہو بس۔۔۔"

☆ ☆ ☆

اگلے دن مزنہ کو لے کر جب ان کے میاں وہاں پہنچے تو سوہا' ماہا اور انس پہلے سے موجود تھے۔ مزنہ کو ساری صورت حال سے کس طرح آگاہ کیا گیا تھا اور کس قدر مصیبت سے ان کی بکھرتی ہوئی کیفیت کو سنبھالا گیا تھا یہ صرف ان کے شوہر صادق صاحب ہی جانتے تھے۔

حسیب ابھی آئی سی یو میں ہی تھا۔ کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ بلکہ ملنا بھی کیا وہ تو کومے میں ہی تھا' لیکن کسی کو اس کے قریب جانے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ ایسی صورت حال میں جبکہ ماہا اسے دیکھنے' اسے چھونے کے لیے حد سے زیادہ بے قرار تھی۔ یہ ڈاکٹری احتیاطیں اور پابندیاں اسے سخت زہر لگ رہی تھیں۔

انس بڑی مشکلوں سے ڈاکٹرز سے اجازت لے کر فقط چند منٹوں کے لیے اسے اپنے ساتھ آئی سی یو میں لے کر گیا تھا۔ ان چند منٹوں میں اس نے جس طرح خود کو سنبھالا یہ صرف وہ ہی جانتی تھی۔ آنسو بہا بہا کر اس کی آنکھیں ہمہ وقت نم ہی رہنے لگی تھیں۔ اسپتال آنے کے لیے گھر سے نکلتے وقت اس نے شکرانے کے نفل ادا کیے تھے کہ یہ ہی بہت تھا کہ حسیب ابھی زندہ تھا۔ گو مردوں جیسی حالت میں تھا۔ لیکن بہرحال اس کے دل میں ایک امید سی جاگ گئی تھی۔ اللہ نے اسے بالکل بے آسرا نہیں کیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ پہلے بھی خدا کے حضور اکثر ہی ناشکری کی مرتکب ٹھہری ہے۔ اب مزید نہیں۔

وہیں گڑگڑا کر باری تعالیٰ سے اس کی زندگی اور صحت کی دعائیں مانگتے اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ وہ اب اور آنسو نہیں بہائے گی بلکہ جس حد تک ممکن ہو گیا حالات کا سامنا اور مقابلہ کرے گی۔

آئی سی یو سے نکلتے ہی اس کا سامنا مزنہ سے ہوا۔ وہ اس ٹاکرے کے لیے تیار نہیں تھی۔ جب ہی یک دم ٹھٹک سی گئی۔ مزنہ قدرے بلند آواز میں روتی ہوئی آئیں اور اس کے گلے لگ گئیں۔ ماہا پتھر کے بت کی طرح ایستادہ ان کے ہائے وائے سنتی رہی۔ ماہا کے دل سے ابھی ان کی باتوں کی کڑواہٹ ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے خاموشی سے ان کے پیچھے ہٹنے کا انتظار کرتی رہی اور جب وہ سوں سوں کرتی پیچھے ہٹیں تو خود بھی خاموشی سے ایک طرف ہو گئی۔

"کیا کہتے ہیں ڈاکٹرز۔" مزنہ نے منہ بنا کر اپنے میاں کو دیکھا۔ انہوں نے خاصی بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گلا کھنکار کر انس کو مخاطب کیا۔

"درمیان میں ایک آدھ بار ایسا لگا جیسے ہوش آ جائے گا۔ ٹریٹمنٹ چل رہا ہے۔ اگلے اڑتالیس گھنٹے بہت اہم ہیں۔" انس دھیمی آواز میں بتانے لگا۔

سوہا مستقل ماہا کے قریب کھڑی اس کی دلجوئی کرتی رہی اور مزنہ ایک طرف بیٹھی بظاہر تسبیح کے دانے گراتی دل ہی دل میں ماہا کے لتے لیتی رہیں۔ اپنی یہ کم عمر اور سیدھی سادھی بھاوج انہیں ایک دم ہی بہت بری لگنے لگی تھی جانے کیوں۔۔۔

☆ ☆ ☆
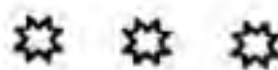
حدید کے آفس سے واپسی کا ٹائم ہو رہا تھا۔ وہ اسپتال جانے کے لیے تیار تھی۔ اس نے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے سوچا اور کہیں سے ایک بھولی بھٹکی سراہتی ہوئی نظر سر نکال کر مسکرانے لگی۔

"یہ میں ہوں نائلہ' ہر طرح سے ایک مکمل عورت' ایک نامکمل زندگی کے ساتھ۔۔۔" اس نے ایک گہری آہ بھر

کے سوچا۔ دفعتاً" موبائل کی بیل بجی۔

"شبیر حسین کالنگ۔۔۔"

"اوف۔۔۔ خدایا۔۔۔ ایک نامکمل زندگی اور ایک شرمناک کردار کے ساتھ۔۔۔" آئینے سے جھانکتی ہوئی ایک دوسری نائلہ نے طنزاً"اسے دیکھ کر جملہ مکمل کیا۔

"اف خدایا!" حدید کی واپسی کا وقت تھا۔ وہ بس آتا ہی ہوگا اور گھر کی چابی موجود ہونے کی وجہ سے وہ خود ہی دروازہ کھول لیتا تھا۔ اس نے ایک بے حد تھکی ہوئی نگاہ ڈال کر فون ریسیو کرلیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جب تک شبیر حسین کی منحوس آواز اس کی سماعتوں کو جلائے گی نہیں تب تک یہ فون بجتا ہی رہے گا۔

"کیا مصیبت ہے۔ اس وقت فون کیوں کیا ہے۔ جانتے ہو کہ میرے شوہر کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔"

"چل چل۔۔۔ بکواس نہ کر' بڑی آئی پتی ورتا۔۔۔" آگے سے اس نے اس انداز میں بات کی کہ نائلہ کی آنکھوں میں ذلت کے مارے آنسو آگئے۔

"بول بھی چکواب۔۔۔ یا کچھ اور گالیاں دینی ہیں۔" اب کی بار اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"وہ۔۔۔ نہ نہ میری رانی۔۔۔ کیا ہوا' خفا ہوگئی۔ اوئے گالیاں دینے کی تو اویں میں عادت ہے میری۔ تو ناراض نہ ہوا کر۔۔۔ یہ بھی پیار کا ایک انداز ہی ہے۔" نائلہ کا دل اور جل کر خاک ہوگیا۔

"یہ بتا۔۔۔ کہ اس دن تو میں زیور نہیں لے جاسکا۔ اب کس دن آؤں۔"

"اف اللہ۔۔۔ کیا تم پاگل ہو۔ یا ہوش و حواس میں نہیں۔۔۔ مجھ سے ایسے پوچھ رہے ہو جیسے میرے کمرے اور میری الماری سے لینے آرہے ہو۔ آخر تم سمجھتے کیوں نہیں کہ۔۔۔"

"زیادہ بکواس نہ کر۔۔۔ سب سمجھتا ہوں میں۔۔۔ تیرے بہانے۔۔۔ سیدھی طرح بتاتی ہے یا آؤں تیرے گھر' تیرے خصم سے کہہ کر تیری ڈولی اٹھوانے۔" کرب و اذیت کے بے پایاں احساس تلے دب کر اس کا دم گھٹنے لگا۔

"یا اللہ!" اس سے اس نے کس طرح ڈوب کر دل سے خدا کو پکارا تھا کہ ایک خیال نے بچھو کی طرح اسے ڈنک مارا اور وہ بیٹھے سے کھڑی ہوگئی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ شبیر! میں بتاؤں گی تمہیں دن اور وقت۔ تم ٹھیک اسی رات اسی وقت گھر آجانا۔ تمہاری آسانی کے لیے ہر چیز تیار ہوگی۔ میں خود دروازہ کھولوں گی' باقی کام تمہارا۔۔۔" دوسری طرف تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ غالباً" شبیر حسین کو خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ نائلہ اس طرح کی کوئی بات کرے گی۔

"سوچ لے اچھی طرح تو! کوئی ہوشیاری دکھائی ناتو۔۔۔"

"اچھا بس بس۔۔۔ میں فون بند کررہی ہوں۔ اب تم بس میرے فون کا انتظار کرنا۔" اس نے شبیر حسین کو زیادہ بات کرنے کا موقع نہیں دیا۔ فون بند کرکے اس نے خود کو پرسکون کرنے کے لیے دو تین گہری گہری سانسیں لی اور اپنی نم آنکھیں پونچھ کر باہر نکلی۔ دروازے پر کھٹکا ہوا اور اسی وقت حدید اپنی بائیک گھسیٹتا اندر آیا۔

☆ ☆ ☆

حسیب کے اسپتال میں ہونے کی خبر عفت کے سسرال والوں تک پہنچ چکی تھی۔ معراج سے کئی بار اسپتال جانے کی بات کرچکی تھیں۔ لیکن وہ انہیں لے کر جانے کے موڈ میں نہیں لگ رہا تھا۔

"ارے لے جاؤں گا نا اماں!"

وہ کچھ ناگواری اور ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگیں۔ چند دنوں سے اکلوتے بیٹے کے انداز کافی بدلے بدلے تھے اور سب سے بڑھ کر تو انہیں اس موبائل فون سے چڑ ہونے لگی تھی جواب کسی جزو لازم کی مانند اس سے

چکا رہتا تھا۔ اس وقت بھی جلدی جلدی کھانا ختم کرکے وہ اٹھا اور اسی غائب دماغی سے موبائل لے کر کمرے میں چلا گیا۔ بتول جو کوئی بات کرنے جا رہی تھیں' الفاظ آدھے ادھورے ان کے لبوں میں ہی رہ گئے۔ وہ منہ کھول کر معراج کو کھانا ختم کرکے اٹھ کر جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ معراج نے کمرے میں جا کر دروازے کو ہلکا سا بھیڑ دیا۔ یوں کہ ذرا سی درز باقی رہ گئی۔ انہوں نے آن کی آن میں پیر نیچے اتار کر چپلیں پھنسائیں اور بلی کی سی چال سے چلتی ہوئی دروازے کے پاس آکر کان لگائے۔

"یار... تم کب جاؤ گی وہاں... میں سوچ رہا تھا اماں کو لے کر آؤں تو تم سے بھی ملاقات ہو جائے۔"

چند لمحے وہ دوسری طرف کی بات سنتا رہا۔

"اچھا تو یہ بھی نہیں لگتا نا کہ تمہارے گھر میں ٹینشن ہو اور میں پہنچ جاؤں' تم سے ملنے تمہارے گھر۔" باہر کھڑی بتول کا دل دھک سے رہ گیا۔

"اس سے تو بہتر یہی ہے کہ کوئی میٹنگ کرلی جائے۔" اس سے زیادہ سننے کی ان میں تاب نہیں تھی۔ بے حد کلستے ہوئے دل کے ساتھ بڑبڑاتے ہوئے واپس کمرے میں آئیں اور دھم سے بیٹھ کر تکیے کے نیچے سے اپنا موبائل نکالا۔

"اسی لیے تو آنے سے پہلے ہی بری لگنے لگ جاتی ہیں اچھی بھلی لڑکیاں... دیکھو ذرا ابھی گھر میں قدم رکھا نہیں کہ منصوبہ بندیاں شروع کردیں اس لڑکی نے۔ اے ہم تو بہت معصوم سمجھ رہے تھے۔" چند لمحوں کے بعد ان کی پھپھولے پھوڑتی آواز سرگوشی سے ذرا ہی بلند تھی۔

"آپ کو اس سے کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں بتاتی ہوں نا کیا کریں آپ..." وہ خاموش ہو کر دوسری طرف کی بات سننے لگیں۔

☆ ☆ ☆

کوریڈور میں چھاتی ہوئی سرد مہری خاموشی اعصاب کو توڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ مزنہ مسلسل تسبیح میں مشغول تھیں۔ انہوں نے ایک دو بار کے علاوہ نگاہ اٹھا کر ماہا کی طرف دیکھا تک نہ تھا۔ ماہا تو ماہا' سوہا بھی ان کا انداز دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔ تب ہی دوسرے سرے سے حدید اور نائلہ آتے دکھائی دیے۔ دونوں کے چہروں پر سنجیدگی کے علاوہ ایک عجیب سی سرد مہری اور لاتعلقی دکھائی دیتی تھی۔ قریب پہنچ کر حسیب کی خیر خیریت اور سلام دعا سے فراغت کے بعد تھوڑی ہی دیر وہ لوگ بیٹھے۔ پھر انس کے موبائل پر عفت کا فون آگیا۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد وہ حدید کو لے کر ذرا دور کونے میں چلا گیا۔

"عفت نے مجھ سے مشورہ کرکے خالہ جان اور آنٹی کو سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے یہ کوئی چھپنے والی بات تھی بھی نہیں۔" حدید نے بات سن کر حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

"وہ تمہاری بات ٹھیک ہے' لیکن آنٹی کی طبیعت... عفت وہاں اکیلے گھبرا رہی ہے۔ اس سے انہیں سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے۔" حدید جواب دیے بنا خاموشی سے فرش کو گھورتا ہوا نچلے لب کا کونا دانتوں تلے کچل رہا تھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں ماہا کو گھر لے جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ خود انہیں تسلی دے تو وہ تھوڑا بہتر محسوس کریں۔"

ان تینوں نے مل کر ماہا پر زور دیا۔ سوہا بھی بات سمجھ کر ہاں میں ہاں ملانے لگی۔ آخر میں مزنہ نے اپنے وہیں رکنے کا عندیہ دیا۔ ان کے میاں بھی ان کے ساتھ تھے۔ بے حد لکر فقی اور حسرت بھری آنکھوں سے حسیب کے بے خبر وجود کو تکتی ماہا گھر واپسی کے لیے تیار ہو گئی۔ سوہا اور انس راستے بھر اسے سمجھاتے ہوئے آئے تھے کہ اگر

کے سامنے اگر تم خود ٹوٹ کر بکھر گئیں تو پھر انہیں سنبھالنا تقریباً ناممکن ہوگا۔ حسیب کی حالت سیریس تھی، نیلن کومے جیسی ناامیدی کی کیفیت بہرحال ان سے چھپالی گئی تھی۔ تب سے اب تک وہ بیسیوں بار ماہا کو شادی کے بعد واپس پاکستان آنے پر اتنی ملامت کرچکی تھیں کہ اب ماہا کو بھی ساری صورت حال کا ذمہ دار خود اس کا اپنا وجود منے لگا تھا۔ رضوانہ نے جب سے مصلا "سنبھالا تھا تو کئی گھنٹے بعد بھی جاء نماز سے اٹھی نہ تھیں۔ ماہا بھی عشاء کی نماز پڑھ کر کافی دیر خدا کے حضور سجدے میں جھکی اپنی زندگی میں آجانے والے اس ستم کو دور کرنے کے لیے کوئی روزن مانگتی رہی، کوئی دروانہ کوئی راستہ۔

بعض حادثے انسان کو اس صورت حال میں دھکیل دیتے ہیں کہ اسے اللہ کے سوا کسی سے اپنی مشکل بیان کرنے کا خیال تک نہیں آتا۔ فون کی گھنٹی بجی۔ کسی انجانے نمبر سے کال آرہی ہے۔ پاکستان سے تو نہیں لگتی۔ سوہا نے دیکھتے ہوئے فون ماہا کی طرف بڑھادیا۔

"ہیلو۔" ماہا کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ دوسری طرف کون ہوگا۔

"میں ۔۔۔ میں ولید ہوں۔ حسیب درانی کا بیٹا۔۔۔ آپ مجھے پہچانیں؟" دوسری طرف ایک نوعمر آواز اپنے لہجے میں دھڑکتے ڈھیروں خدشات سمیت کراس کی ساعتوں میں اتر گئی۔ ماہا سن سی کھڑی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

دوسرے دن بتول نے ناشتے کے بعد اپنی بیٹی کے کہنے کے عین مطابق رکشہ کیا اور دونوں ماں بیٹی خود ہی عیادت کا فرض نپٹانے پہنچ گئیں۔ اس وقت وہاں مزنہ اور صادق کے علاوہ ماہا بھی موجود تھی۔ وہ سپاٹ چہرہ لیے ان کی عیادت کے بے روح الفاظ سنتی رہی۔ اس کے لیے خود پر یہ پتھر کیفیت طاری کرنا ضروری بھی تھا اور بہتر بھی۔ ان دونوں خواتین کی وہاں موجودگی پر سخت بے آرام تھی۔ لیکن بہرحال عفت کے سسرال والوں کا معاملہ تھا۔ خدا خدا کرکے وہ لوگ واپسی کے لیے اٹھیں۔ رکشے میں بیٹھتے ہی بتول کی چھپی ہوئی مسکراہٹ باہر آگئی اور دانت نکل پڑے۔

"واہ بھئی واہ! کیسی تیزی دکھائی میں نے۔ یہ راجو تو ہم عورتوں کو بالکل پاگل سمجھتا ہے۔ اب لگے گا پتا۔ جب شام میں پوچھے گا نا چلنے کے لیے تو میں ٹھینگا دکھادوں گی۔" وہ ننھی بچی کی طرح خوش ہورہی تھیں۔

"حیران رہ جائے گا وہ بھی آپ کی اتنی کوئیک سروس پر۔" "یہاں تو اور کیا۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو آئے تھے تب اسی لڑکی کی ماں داخل تھی۔ پر میں ایک بات کہوں خدا لگتی۔ جب سے اس گھرانے میں رشتہ جوڑا ہے ایک کے بعد ایک مصیبت آتے دیکھ رہی ہوں بے چاروں پر۔"

رات تک بتول پر شادمانی کی کیفیت طاری رہی۔ اپنی آج والی حرکت پر بے حد فخر محسوس ہورہا تھا۔ اس خوشی کی کیفیت میں انہوں نے لاڈلے پوتے کے لیے سوجی کا حلوہ بنایا وہ بھی بادام کھوپرے والا اسی دم دروازہ بجا آنے والا معراج ہی تھا۔

"خیریت تو ہے آج اتنی دیر لگادی تم نے۔" بتول نے پریشانی سے پوچھا۔

"ہاں بس۔۔۔ وہ ذرا میں۔۔۔ ہسپتال میں پھنس گیا تھا۔"

"تم اکیلے ہی ہو آئے۔" بتول ہکا بکا رہ گئیں۔

"کیوں۔۔۔" "جب میں نے تم سے کہا تھا مجھے لے کر چلنا۔"

"تو آپ تو ہو آئیں نا! صبح" شرٹ کے کف کھول کر مصروف سے انداز میں پلٹتے ہوئے اس نے بتول کے قریب ہی کہیں پٹاخہ پھوڑا۔

بس۔۔۔ ہیں۔۔۔ کس۔۔۔ اور رے بھی چند بے۔۔۔ لفظ بے ربط انداز میں پھر ہونٹوں کی قید سے نکلے۔

معراج مطمئن سا کمرے سے جاچکا تھا۔ بنا خلاصہ پڑھے کہانی پوری کی پوری سمجھ میں آنا کسے کہتے ہیں یہ آج پتا چلا تھا بتول نے اپنی گردن اور جبڑوں میں بے انتہا کھنچاؤ محسوس کیا۔

☼ ☼ ☼

کتنی عجیب سی بات تھی۔ اس نے حبیب کی اولاد سے ' حبیب کی بیوی کی حیثیت سے بات کی تھی ' لیکن وہ اس کی ماں نہیں تھی وہ رو رہا تھا۔ حبیب کی خیریت پوچھ رہا تھا۔ اس سے پاکستان آنے کی اجازت مانگ رہا تھا اور وہ بس خاموشی سے اسے سن رہی تھی۔

"اسے کس نے بتایا ان کے بارے میں۔" وہ اس کی باتوں کو غائب دماغی سے سنتی ' سوچتی رہی اور لائن کے دوسری طرف بے طرح سناٹا محسوس کرکے وہ پکار اٹھا۔

"آپ۔۔۔ آپ سن رہی ہیں۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ آپ کو کیا کہوں۔۔۔ ماما۔۔۔ آپ میری ماما ہی تو ہیں۔" اس کی آواز اٹکی ' رکی ' جھجکی اور رندھی ہوئی تھی اور اتنی دیر سے اس کی بات سنتی ' ماہا کا دماغ گھوم گیا۔

"پاگل ہوئے ہو کیا۔ ماما کیوں کہہ رہے ہو مجھے۔"

"آپ۔۔۔ آپ بابا کی مسز ہیں تو۔۔۔"

بابا۔۔۔ بابا کی مسز۔۔۔ ماہا کے اندر غصے اور اشتعال کی شدید لہر اٹھی۔

"ہاں ہوں میں حبیب کی مسز۔۔۔ تو۔۔۔ یہ کیسے سوچ لیا تم نے کہ میں تمہاری ماں ہوں۔۔۔ کان کھول کر سن لو تم۔۔۔ میں کوئی تمہاری ماما وا ما نہیں ہوں اور کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں یہاں آنے کی۔ یہاں کوئی نہیں بیٹھا تمہارے انتظار میں اور رہے حبیب۔۔۔ تو ابھی تو ان کو خود اپنا ہی ہوش نہیں۔ لیکن جب انہیں ہوش آجائے گا ' تب بھی میں تمہیں یہاں بلوانے کی اجازت نہیں دینے دوں گی سمجھے۔۔۔ اور خبردار جو اب مجھے فون کیا دوبارہ تو۔۔۔"

بے انتہا تنفر سے چبا چبا کر کہتے اس نے بات مکمل کی اور دوسری طرف کی بات سنے بغیر لائن کاٹ کر سیل پھینک دیا۔ سوہا اندر آئی تو وہ سر ہاتھوں میں پکڑے بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا۔۔۔" وہ دیکھ کر رکی۔

"کچھ نہیں۔" اس نے سر اٹھایا تو آنکھوں میں گہری ہوتی سرخی نے کسی خاص بات کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن سوہا نے اس وقت اس سے کوئی بھی بات کرنے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ انس گھر سے آچکا تھا۔ اسے اسپتال کے لیے نکلنا تھا۔ سوہا آج گھر پر رک گئی تھی۔

ماہا نے ان باتوں کو اسی وقت سر سے جھٹک دیا تھا ' لیکن اب۔۔۔ حبیب کے پرائیویٹ روم میں منتقل ہوجانے کے بعد خالی اور خاموش سفید دیواروں کو تکتی ہوئی ' بار بار یہ ہی باتیں سوچ رہی تھیں۔

"کیا میں حبیب کے بیٹے کو جو کہ عمر میں مجھ سے چند سال ہی چھوٹا ہے۔ اپنا بیٹا بنالوں گی۔۔۔ مان لوں گی اسے اپنی اولاد۔" صرف سوچ کر ہی اس کے سر میں درد سا ہونے لگا۔

تب ہی۔۔۔ یوں ہی بھٹکتی بھٹکتی نظریں سامنے بے سدھ پڑے قیمتی لیکن خود سے بے خبر وجود پر پڑیں اور اسی پل۔۔۔ اسی پل اس نے حلقوں میں دھنسے جھریوں زدہ پپوٹوں میں جنبش محسوس کی۔ ایک ثانیے کو تو اسے لگا کہ یہ اس کا واہمہ ہے۔ لیکن اگلے پل۔۔۔ وہ تیر کی سی تیزی سے اٹھ کر نزدیک آئی۔ یہ اس کا واہمہ نہیں تھا۔ اس کا تنفس درہم برہم ہوگیا۔ حبیب کی بند آنکھوں کے پیچھے دبی پتلیوں میں بے حد خفیف سی زندگی جاگی تھی۔ ماہا بدحواسی

سے ڈاکٹرز کو بلانے باہر بھاگی۔

☆ ☆ ☆

حبیب کی شناخت ہو جانے کے بعد مغیث حسن پہلی بار ماہا سے ملنے اور حبیب کی خیریت دریافت کرنے آئے تھے۔ انہوں نے بے حد خلوص دل سے ماہا سے ہمدردی بھرے بول بولے۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور حبیب کے صحت یاب ہو جانے تک تمام مالی اخراجات خود اٹھانے کا عندیہ دیا۔ صادق اس وقت وہاں موجود تھے۔ ان کی پر خلوص پیش کش پر انہوں نے منع کرنا چاہا۔ لیکن ان کا کہنا تھا کہ وہ جو بھی کر رہے ہیں انسانیت کے نام پر کر رہے ہیں۔ جو ذمہ داری انہوں نے اٹھائی تھی۔ وہ اسے پورا کریں گے۔

ماہا پورے مکالمے کے دوران شش بیٹھی رہی۔ سر کا وہ منظر یاد کرتی رہی۔ جب حبیب کے بے جان وجود میں زندگی کے آثار جاگے تھے اور وہ ٹرین کی رفتار سے بھاگتے دوڑتے بے قابو ہوتے دل کو سنبھالتی ڈاکٹرز کو بلا کر لائی تھی۔ لیکن جب تک ڈاکٹر آئے تب تک۔ سب کچھ پہلے جیسا ہو چکا تھا۔ وہ ایک بار پھر سے بے خبری کی گہرائیوں میں اتر چکا تھا۔ ماہا بے یقین نظروں اور رکتی ہوئی سانسوں سے اسے پکارتی رہ گئی۔ ڈاکٹرز کے پاس وہی باتیں تھیں۔ تسلیاں تشفیاں دلاسے اور وہ پھر سے ایک بار گم صم سی ہو کر اس کے پاس ہی ٹک گئی تھی۔

کیا پتا پھر۔

پھر سے ایک بار۔ ایک بار پھر اسے ہوش آئے۔ وہ آنکھیں کھولے دیکھے اور اگر میں یہاں نہ ہوئی تو مایوس ہو کر دوبارہ آنکھیں موند لے پھر۔ صبح سے شام کے سائے ڈھلے اور رات نے دھرتی کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ تب اس نے چٹختے اعصاب اور تھکن سے اکڑ کر ٹوٹتی کمر کو محسوس کیا۔

"کتنے گھنٹے گزر گئے ماہا! کب سے ایسے ہی بیٹھی ہو۔ کیا حالت ہو رہی ہے تمہاری۔ چلو گھر چلو۔" سامنے سوہا کھڑی تھی اور اس سے ایک قدم پیچھے ترحم آمیز انداز میں اسے دیکھتا ہوا انس۔

"میں نہیں جا سکتی۔" بمشکل بول سکی۔

"کیوں۔" سوہا کو اس کی بات پر شاک سا لگا تھا اور وہ جواب دیے بغیر ڈبڈباتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

"کیا ہوا ہے ماہا کیا بات ہے۔" اب کی بار انس اس کے انداز میں غیر معمولی پن محسوس کرتا نزدیک آیا۔

"صبح جب میں آئی تھی تب۔" اس نے الف سے یے تک ساری کہانی سنا ڈالی اور آخر میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی سسکیاں آزاد ہو گئیں۔ سوہا اسے خود سے لگا کر تھپکنے لگی۔ ایک بات تو طے تھی ماہا اب کسی صورت اسے چھوڑ کر گھر نہیں جانے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ جلے پیر کی بلی کی طرح بے حد مضطرب لیکن چوکنا انداز میں صحن میں چکر لگا رہی تھی۔ حدید حسب معمول اس کی حرکتوں سے لاپروا سونے جا چکا تھا اور انس اور سوہا گھر آکر سونے چلے گئے تھے۔ اس نے محض رسمی طور پر ایک بار ہی حبیب کی کنڈیشن کا پوچھ کر اس کے بارے میں افسوس کا اظہار کیا تھا اور بس۔ تب سے اب تک اس کے انگ انگ میں جیسے چیونٹیاں کاٹ رہی تھیں اور پیروں تلے ببول اگ آئے تھے۔ پچھلے دو دن سے رات کو ڈیڑھ بجے کے بعد لائٹ چلی جاتی تھی۔ گرمی سے گھبرا کر وہ کمرے سے باہر نکلتی اور اوپر انس اور سوہا کی آدھی سوئی آدھی جاگی آوازیں آتیں۔ وہ دونوں بھی کمرے سے نکل کر کھلی چھت تلے بستر بچھا کر سو جاتے اور پھر سورج نکلنے کے بعد ہی جاگتے۔ اسے آج بھی اسی لوڈشیڈنگ کا انتظار تھا اور زندگی بھی نا کس کس چیز کا انسان کو کب کب

انتظار کرواتی ہے، مگر آج لگتا تھا لوڈشیڈنگ نہیں ہوگی۔ اسے اپنی ساری پلاننگ چولہے میں جاتی لگ رہی تھی۔ بے انتہا جھلا کر اس نے دو کا ہندسہ پار کرتی گھڑی کی سوئیوں کو دیکھا اور پھر دل سے ایک خیال اچانک ہی چوکڑی مار کر دماغ میں کودا۔ اس نے بے حد احتیاط سے کمرے کا دروازہ کھولا اور لاؤنج سے باہر صحن میں آگئی۔ صحن میں ایک انرجی سیور رات بھر کے لیے کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔

"جیسے ہی میں مسڈ کال دوں تم آجانا۔" کانپتے ہاتھوں سے اس نے میسج ٹائپ کر کے ایک جانے پہچانے لیکن ناپسندیدہ نمبر پر بھیجا۔ دوسری طرف سے فوراً" موصول ہونے والے جواب "اوکے" نے اسے بتایا کہ دوسری طرف بھی بے قراری اپنے عروج پر ہے۔ نائلہ کانپتے لڑکھڑاتے قدموں سے صحن میں ایک جانب بنے چھجے کے نیچے لگے لکڑی کے باکس تک گئی۔ پرانے زمانے کی تعمیر شدہ گھر میں بجلی کا میٹر اور گھر کی لائٹ کا مین سوئچ گھر کے اندر ہی لگا تھا۔ دل ہی دل میں آیتہ الکرسی کا ورد کرتے ہوئے اس نے وہ باکس کھولا اور وہاں لگا ہوا مین سوئچ آف کر دیا۔ ایک بے حد معمولی سی ٹھک کی آواز ہوئی اور پورا گھر اندھیرے اور جامد تاریکی میں ڈوب گیا۔

اب اس کے کانوں میں صرف اس کی اپنی سانسوں کی آواز تھی یا پھر اس کی اپنی دھڑکن کی یا شاید اس کا دل ہی کانوں میں دھڑک رہا تھا۔ چاند نہ پورا نہ باریک۔ بے حد مدھم سفید روشنی پورے صحن میں پھیلی ہر منظر کو دھندلا کر رہی تھی۔ گلی کے دوسرے گھروں میں جلتی اکا دکا لائٹوں کی روشنی اس کے گھر کو اجالنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

وہ بے حد محتاط اور چوکنے انداز میں وہیں کھڑی رہی۔ بالوں کی لٹوں سے بہتا پسینہ دھار بن کر کمر پر بہتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے فضا میں گھٹن اور حد درجے حبس سے اپنا دم نکلتا محسوس کیا اور پھر اوپر کی منزل پر مخصوص آوازیں گونجیں۔ انس اور سوہا آدھی ادھوری نیند سے جاگی تھکن زدہ آنکھیں لے کر صحن میں نکلے تھے۔ نائلہ کی سانسیں اٹکنے لگیں۔

اگر۔۔۔ اگر انہوں نے ایک بار بھی باہر جھانک کر کچھ اندازہ لگالیا "لائٹ روزانہ تو سب کی جاتی ہے، لیکن آج صرف ہمارے گھر کی۔۔۔ بے حد کپکپاتی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کر کے وہ تھوڑی دیر اور وہیں کھڑی رہی۔ انس یا آواز بلند بڑبڑایا۔ اس نے خالص مردانہ انداز میں بجلی والوں کے ہوتے سوتوں کو صلواتیں سنائیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ لاؤنج کم برآمدے میں ساکت کھڑی نائلہ نے اپنے ماتھے سے بھنوؤں پر اترتا پسینہ بھیگی ہتھیلی سے صاف کیا۔ چند منٹ احتیاط" وہیں کھڑی رہی، پھر اسی طرح دبے قدموں جا کر سوئچ آن کر دیا۔ کل ملا کر دس منٹ سے بھی کم وقت لگا ہوگا اور اس نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ کمرے میں آکر اس نے موبائل نکالا۔ مس بیل دی اور کمرے کا دروازہ پورا کھول کر بیڈ پر آگئی۔ اب اسے بے چینی سے شبیر حسین عرف شبو کی آمد کا انتظار تھا۔

ایک کالا سایہ بے آواز دیوار پھلانگ کر صحن میں کودا۔ نائلہ بستر سے یوں اٹھی جیسے کمر کے نیچے ببول بچھے ہوں۔ وہ لپک کر باہر آئی اور بلی کی سی چال سے اس کے نزدیک پہنچی۔

"رکو سنو۔" وہ چوکنا انداز میں صحن میں کھڑا تھا۔ جب نائلہ نے قریب آکر اسے روکا اور اس کے مکروہ چہرے پر نظر پڑتے ہی دل میں شدید خواہش اٹھی کہ کم از کم ایک آلۂ قتل تو اس کے پاس ضروری ہونا چاہیے تھا۔

"اپنا موبائل دو مجھے۔"

"وہ کس لیے۔" آس پاس کا جائزہ لیتے اس فرمائش پر اس نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"اگر حدید اٹھ گئے تو میں مسڈ بیل دے کر انہیں کمرے میں ہی روک لوں گی۔" وہ بنا کچھ کہے اسے دیکھتا رہا۔

"اوہو۔ جلدی کرو نا! گھر کے کسی اور بندے کا سیل میرے پاس نہیں ہے اور تمہارا نمبر بھی انجانا ہے۔ وہ فون میں الجھ جائیں گے تو۔۔۔" اس سے بات مکمل نہیں گئی۔ دھڑکتے دل اور ساتھ چھوڑتے حواس کے ساتھ اس طرح بولنا کسی طرح اسے سولی پر لٹکے نیم مردہ تن کی سی تکلیف دے رہا تھا۔ یہ صرف وہ جانتی تھی۔

"دو بجئ اب۔۔۔ اور جلدی جاؤ' اس سے پہلے کہ لائٹ چلی جائے۔" اسے یوں ہی اپنی جگہ جمے خود کو شک بھری نظروں سے دیکھتا پا کر دبی دبی آواز میں چیخ پڑی اور اس کے چیخنے کے انداز پر ہی اسے صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سیل نکالا اور نائلہ کو دیا۔ نائلہ نے ہتھیلی پھیلائی' لیکن اس نے موبائل ہتھیلی پر دھرنے کے ساتھ ہی اس کی ہتھیلی ہاتھ میں جکڑ کر اسے قریب کھینچا اور اس کا جبڑا دوسرے ہاتھ سے جکڑ لیا۔

"ایک بات یاد رکھنا۔۔۔ اگر تو نے کوئی چالاکی دکھائی نا۔۔۔ تو۔۔۔ زندہ گاڑ دوں گا زمین کے اندر۔۔۔" اس کے سرخ ڈیلے باہر کو ابلے ہوئے تھے۔ نائلہ کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ رواں رواں تن گیا۔ تب ہی کسی قریب کی دیوار کے کوئی بلی کرلائی۔ اس نے جھٹکے سے نائلہ کو چھوڑا۔

"صحن میں لوگ سو رہے ہیں' دھیان سے۔۔۔" وہ لڑکھڑا کر سنبھلی اور دھیرے سے کہہ کر پلٹ گئی۔ شبیر حسین تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ گیا۔ نائلہ نے اپنے کمرے کے دروازے پر رک کر دیکھا۔ پھر ہاتھ میں پکڑا موبائل آف کر کے گریبان میں ڈال لیا۔ ایک گہری سانس لے کر خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی جو کہ ناکام رہی۔ اگلے ہی پل وہ تیر کی سی تیزی سے حدید کے سر پر پہنچی اور اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"حدید۔۔۔ حدید اٹھیں جلدی۔۔۔ گھر میں کوئی چور گھس آیا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے' حدید اٹھیں۔" گہری نیند میں کانوں میں پڑنے والا جملہ حدید کی نیند اڑانے کے لیے کافی تھا۔

"کیا۔۔۔ کہاں۔۔۔" اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ توقع کے عین مطابق وہ اٹھ کر فوراً" ہی گرتا پڑتا بھاگا۔ نائلہ نے اسے دروازے کے قریب پکڑ کر بمشکل قابو کیا۔

"رک جائیں بھئی۔۔۔ ایسے تو وہ بھاگ جائے گا۔ آپ۔۔۔ یہ لیں۔" متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر اس نے بیڈ پر بچھی چادر کھینچی۔

"انس اور سوہا باہر سو رہے ہیں اور وہ سیدھا کمرے میں ان کی الماری میں گھسا ہو گا۔ مجھے پکا یقین ہے' اس سے پہلے اس دن بھی یہ ہی آیا ہو گا' انس کی الماری جو کھلی پڑی تھی۔ پیچھے سے جا کر اس کے اوپر ڈال دیجیے گا۔ ورنہ ہو سکتا ہے اس کے پاس ہتھیار بھی ہو۔" وہ جلدی جلدی چڑھتی سانسوں سے بولتی حدید سے زیادہ بدحواس ہو رہی تھی۔ چادر گول مول کر کے اس کے ہاتھوں میں پکڑاتی اس کے ہاتھوں میں واضح لرزش تھی۔ وہ مضطربانہ انداز میں حدید سے کہتی رخ پھیر گئی۔ اس کے اندر ہمت نہیں کہ حدید کی نظروں کا سامنا کر سکتی۔

حقیقت یہ تھی کہ یہ تمام کھیل اس نے اپنی تمام تر عزت اور زندگی داؤ پر لگا کر کھیل ڈالا تھا۔ اب اگر بازی اس کے ہاتھ سے نکل جاتی تو سب کچھ جاتا' لیکن وہ اس وقت یہ سب سوچنے کی حالت سے بے بہرہ ہو چکی تھی۔ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے اور کیا کر رہی ہے۔ اسے صرف یہ یاد تھا کہ وہ ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے اوپر عمل کر رہی تھی اور یہی عمل اسے اس جال سے نکال سکتا تھا' جس میں اس نے اپنی بے وقوفی سے قدم رکھا تھا اور پھر جکڑی گئی تھی۔ حدید کمرے سے جا چکا تھا۔ اس کا تنفس بڑھنے لگا۔ کافی دیر گزرنے' کوئی حرکت نہ آواز اور اس کے بعد ایک بے ہنگم شور نے اس کے دل کو الٹ پلٹ کر دیا۔ اس نے لگاتار۔ ان گنت بار تھوک نگلا۔ کپکپاتے ہونٹوں سے الٹے سیدھے درود اور آیت الکرسی کے حروف آگے پیچھے۔۔۔ آدھے پورے۔۔۔ پونے۔۔۔ فل اسپیڈ میں گھومتے ہوا دار دہانی پردوں کے نیچے اس کا جسم گیلا اور دماغ سن ہوتا چلا گیا۔ شور نزدیک آرہا تھا۔ اس نے ذرا سی درز کھول کر جھانکا۔

چادر کے اندر لپٹا ایک پہاڑ سا وجود بری طرح لڑھکتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے آیا۔ اسی پل اس کے پیچھے انس اور

حدید… بدحواس اور طیش سے بے حال اس پر پل پڑے تھے۔ اسی پل اس کے دماغ نے جیسے جھٹکا کھایا۔ وہ دروازہ کھول کر صحن عبور کر کے دوڑتی ہوئی باہر نکلی اور پڑوسیوں کا دروازہ بری طرح پیٹ ڈالا۔ ساتھ ہی اس کے حلق سے بیٹھی ہوئی پھٹی ہوئی، خراش زدہ چیخیں نکلنے لگیں۔

"چور چور… خالہ چور آگیا۔ گھر میں چور گھس آیا۔" اس کی آواز اس قدر وحشت ناک اور وجود اتنا وحشت زدہ لگ رہا تھا کہ عام حالات میں اگر وہ یہ سنتی تو خود اپنی ہی آواز نہ پہچان پاتی۔ آئینہ دیکھتی تو اپنی ہی شناخت سے مکر جاتی۔ تھوڑی دیر میں گھر کا صحن بھانت بھانت کی آوازوں سے بھر گیا۔ اس کا شور سن کر آس پڑوس کے لوگ جاگ گئے اور مردوں نے گھر میں گھس کر انس اور حدید کی گرفت سے نکلتے ہوئے چور کا مار مار کر بھر کس نکال دیا اور نیم جان ہوتے ہوئے شخص کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ عورتوں کے تسلیاں اور تشفیاں دے کر واپس چلے جانے تک وہ پتھر کے بت کی مانند صوفے پر گری رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد تنہائی اور خاموشی دوبارہ پورے گھر پر اسی طرح قابض ہو گئی جیسے چند لمحوں قبل یہاں زندگی اور ہنگامے کے کوئی آثار بھی تھے۔

کسی نے فوری طور پر پولیس کو کال کر دی تھی اور باقی سارے لوگ مارتے پیٹتے، چادر کے اندر بدحال ہوتے وجود کو گراتے گھسیٹتے مین روڈ تک لے گئے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ بری طرح رگڑ ڈالا۔ پھر دائیں طرف کی صوفے کی ہتھی پکڑ کر خود کو سہارا دے کر اٹھی اور لڑکھڑاتے قدموں سے اندر کمرے میں داخل ہوئی۔ ذرا سی ٹھوکر لگی اور وہ کٹی ہوئی شاخ کی مانند وہیں بیڈ کے کنارے زمین پر گر گئی۔ رات لمحہ لمحہ آگے سرک رہی تھی۔ وہ زمین پر گری پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ڈاکٹر بے حد مستعدی سے اپنا کام سرانجام دے رہے تھے۔

اسے ڈاکٹرز کے آنے کے بعد کمرے کے باہر ہی ٹھہرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ تب سے اب تک اس نے ہر وہ قرآنی آیت و سورت ٹوٹے ہوئے لب و لہجے میں بے ہنگم طریقے سے پڑھ ڈالی تھی۔ جو اس کے حافظے میں اس وقت محفوظ تھی۔

ایک بار اس نے ڈرتے ڈرتے بند دروازے کے اوپر لگے شیشے سے اندر جھانکا تو ڈاکٹر اور نرسوں کی پشت اور گھیرے میں گھرا ہوا وجود صرف پٹیوں میں جکڑا۔ مشینوں سے نبرد آزما دکھائی دیا۔ اس نے فی الفور خود کو وہاں سے ہٹا لیا تھا۔ اس کے بعد انس اور سوہا، مزنہ اور صادق بھائی کے آجانے کے بعد بھی اس کی ہمت نہیں تھی کہ دوبارہ اندر جھانک سکے۔

جانے کتنی دیر گزری۔ اس کی گیلی پلکیں جڑ کر سوکھ جانے کے بعد اندر سے ڈاکٹر باہر نکلے تو ان کا چہرہ اندرونی اطمینان کی تصویر تھا۔

"خدا کا شکر ہے۔ پیشنٹ کومے سے باہر آچکا ہے۔ زخم بے حد گہرے تھے۔ لہٰذا ریکور ہونے میں ٹائم لگے گا۔ مگر حالت خطرے سے باہر ہے۔ اس وقت وہ نارمل نیند میں ہیں۔ آپ ایک ایک کر کے انہیں دیکھ سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر کے بالکل سامنے اور سب سے قریب کھڑے پتھر کے بت کی جامد پتلیوں سے دو نمکین قطرے نکلے اور زرد عارض تر کر گئے۔

اس نے خشک حلق کو تر کر کے بے ساختہ آنکھیں موند لیں۔

"یا اللہ… تیرا شکر ہے۔" یہ اس کی زندگی کے پہلے تشکرانہ الفاظ تھے۔ جو اس قدر دل کی گہرائیوں سے نکلے تھے۔ اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس نے اس سے پہلے کبھی اتنے سچے دل سے اللہ کا شکر ادا کیا ہو۔

جانے کتنے دیر گزر چکی تھی۔ یونہی سجدے میں پڑے رہ کر خدا سے رازو نیاز کرتے ہوئے اس نے اپنے اگلے پچھلے سارے ہی گناہوں کی معافی مانگ ڈالی تھی۔ سارے ندامت کے آنسو بہا دیئے تھے۔ اس کے دل کا آئینہ شفاف ہو کر چمک رہا تھا۔

دل کو قرار آرہا تھا۔ بے یقینی سے یقین کی طرف سفر کرتی ایک عجیب سی کیفیت کے حصار میں تھی۔

"میں نے واپسی کی طرف قدم بڑھا دیا ہے۔ یقیناً" اللہ مجھے تھام لے گا۔" اس کے اندر سے کوئی صدا اٹھتی تھی۔ اور روح تک جا کر اسے شانت کرتی تھی۔ اگر خدا کے ذکر سے دل کو سکون ملتا تھا تو ہاں آج اس نے یہ سکون محسوس کیا تھا۔

سوہا باہر لاؤنج میں جائے نماز بچھائے نوافل ادا کرنے میں مگن تھی۔ اس سارے ہنگامے کے دوران وہ محض اپنے کمرے کے ایک کونے میں سمٹی تھر تھر کانپتی رہی تھی۔

اس کا زندگی میں کبھی نہ تو کسی چور ڈاکو سے پالا پڑا تھا۔ نہ اس نے کسی چھوٹی سی بھی چوری ڈکیتی کی واردات کو اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ کجا کہ اتنے مردوں کی دھاڑتی آوازیں۔ گالیاں، دھکم پیل اور شور شرابا۔ اوپر سے نائلہ کی چیخ و پکار۔

جس وقت حدید اور انس، اس چور کو دھکے دیتے گھسیٹتے مارتے پیٹتے سیڑھیوں سے نیچے لے گئے اس وقت وہ کمرے میں دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر زور زور سے رونے میں مصروف تھی۔

نیچے جمع ہونے والی محلے کی عورتیں نائلہ کو دیکھنے اور سنبھالنے میں مگن تھیں۔ اوپری حصے میں چھا جانے والی خاموشی سے انہوں نے گمان ہی نہ کیا کہ ابھی اوپر ایک سہما ہوا صنف نازک کا وجود موجود ہے۔ نہ ہی نائلہ کو دھیان آیا۔ اور نائلہ کا کیا کہنا۔

اسے اپنا ہی دھیان نہ تھا تو کسی اور کا کہاں تھا۔

اپنی عزت سے لے کر زندگی اور زندگی بھر کی خوشیوں سے لے کر تمام خونی اور کاغذی رشتوں تک، سب کچھ داؤ پر لگا کر کھیلی جانے والی بازی وہ جیت چکی تھی، ابھی اس خواب کی حقیقت پر یقین کرنے میں بھی اسے وقت درکار تھا۔

کافی دیر وہیں کمرے میں دبکے رہنے کے بعد جب سوہا کو یقین ہو گیا کہ ہر طرح کا ہنگامہ تھم چکا ہے۔ تب جا کر اس نے پہلے واش روم میں جا کر منہ دھویا اور گیلے ہاتھوں اور چہرے سے ٹپکتے وضو کے پانی کی ٹھنڈک کو محسوس کرتے اور خالی کمرے، کھلی الماری کو بے خیالی سے تکتے اسے نائلہ کا خیال آیا تھا۔

"اور نائلہ...... اب نائلہ کیا کر رہی ہے۔ پتا نہیں کہیں اس کی طبیعت ہی خراب نہ ہو گئی ہو۔"

دماغ کے مستقل منع کرنے کے باوجود وہ دل کی باتوں میں آگئی تھی۔ اور نیچے آکر جب نائلہ کو جائے نماز پر کھڑا دیکھا تو خود بھی لاؤنج میں نیت باندھ لی تھی۔ جس وقت حدید اور انس تھانے میں رپورٹ لکھوا کر واپس آئے تم اس وقت تک دونوں ہی کچھ وقت پہلے گزری افراتفری اور اس کے دیرپا اثرات سے سنبھل چکی تھیں۔

گو کہ فجر میں ابھی وقت تھا پھر بھی سوہا نے انس سے چائے کا پوچھا اور پھر چاروں کے لیے بنانے چلی گئی۔

نائلہ کمرے سے باہر نکلی اس نے اب تک، نماز کی طرح دوپٹا لپیٹ رکھا تھا۔ انس اور حدید تھکے ہوئے سے لاؤنج کے صوفے پر ڈھیر تھے۔

وہ بھی خاموشی سے وہیں ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

وہ ان سے شبیر کے بارے میں پوچھ کر تسلی کرنا چاہتی تھی کہ آیا کہ وہ تھانے میں بند رہے گا یا چھوڑ دیا جائے گا۔ اور ان لوگوں نے ایف آئی آر کٹوائی کہ نہیں۔ لیکن دل میں بیٹھا چور مسلسل اس کی خواہش کو دبا رہا تھا۔

اسے ڈر تھا کہ اس کے منہ سے خواہ مخواہ کوئی ایسی بات نہ نکل جائے۔

آخر وہ گھر میں رہنے والی ایک متوسط گھرانے کی عام سے تعلیم یافتہ عورت تھی۔ کوئی عادی مجرم یا ماسٹر پلان میکر نہیں تھی۔ جبھی چپکی ہو کر بیٹھی رہی۔

"کیا ہوا۔ پکڑ لیا پولیس نے اسے۔" سوہا چائے بنا کر لائی تو ٹرے درمیانی میز پر رکھتے ہوئے نائلہ کے الفاظ کو زبان دی۔

"پکڑا تو اسے ہم نے تھا۔ پولیس نے تو خالی اندر کیا ہے۔"

"چلو پکڑ تو لیا نا! شکر ہے عین موقع پر پتا چل گیا۔ ورنہ خدا نا خواستہ۔۔۔" وہ بے حد عام سے انداز میں حادثہ ہو جانے کے بعد کے تبصرے اور تجزیے کرنے لگی۔

"آج کل تو کچھ پتا نہیں بھئی۔ کبھی تو پورا گینگ ہی ہوتا ہے ساتھ۔۔۔" انس اور حدید خاموشی سے چائے پی رہے تھے۔ نائلہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔ صرف سوہا تھی جو نان اسٹاپ بول رہی تھی۔ شاید اس طرح وہ اپنے اوپر حاوی خوف کا ازالہ کرنا چاہتی تھی۔

"میں تو۔۔۔ بہت بری طرح ڈر گئی تھی۔" آخر میں سب کو چپ دیکھ کر اس نے اپنی بزدلی کا اعتراف کر ہی لیا۔

"کیوں۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات تھی۔" انس کو اس کی بات اچھی نہیں لگی۔

"لو۔۔۔ میں کیا روز چوری ڈکیتی دیکھتی ہوں۔" اسے بھی برا لگا۔

"تو ہم کیا روز دیکھتے ہیں۔" اب کی بار حدید بھی گفتگو میں کودا۔ لیکن اس کا مقصد صرف تفریح لینا تھا۔

"آپ لوگ مرد ہیں اور میں۔۔۔"

"تم بھی مرد بنو مرد۔۔۔"

حدید نے ذہن پر چھائی کثافت کو کم کرنے کی خاطر ماحول میں شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

واقعہ بہر حال اتنا بھی معمولی نہیں تھا۔ اس کے اثرات سے نکلنے کے لیے سب کو کوشش کرنی تھی۔

"میں تو سوچ رہا تھا۔ جب تک ہم اسے قابو کریں گے تم ون فائیو پر کال کر چکی ہو گی۔" انس نے بھی حدید والا ٹریک پکڑا اب' وہ صرف سوہا کو چڑا رہا تھا۔

"شکر ہے آپ نے یہ نہیں سوچا کہ میں کوئی وزنی ہتھیار لے کر پیچھے سے اس کے سر پر دے ماروں گی۔"

"ارے ہاں' وزنی ہتھیار سے خیال آیا۔ اس پر چادر ڈال کر پکڑنے کا آئیڈیا بھی برا نہیں تھا۔ ہمیں **ایکچوئیلی** نائلہ کو شاباش دینی چاہیے۔ جس نے اپنے آپ پر بھی قابو رکھا اور' حدید کو بھی بدحواس نہیں ہونے دیا۔" وہ تینوں اب ذہنی بوجھل پن کے فیز سے نکل کر بالکل اسی طرح باتیں کرنے لگے تھے۔ جیسے عام طور پر گھروں میں کوئی غیر معمولی واقعہ ہو جانے کے بعد کی جاتی ہیں نائلہ اپنا نام سن کر چونکی۔ پھر پھیکے پن سے مسکرا دی۔

"میں ابھی آتی ہوں۔"

چائے کا کپ خالی کر کے ٹرے میں رکھا اور کمرے میں آ کر گریبان سے شبیر حسین عرف شبو کا موبائل نکالا۔

موبائل آف تھا اور اب اسے زندگی بھر آف ہی رہنا تھا۔

فی الحال وہ اسے کھولنے کی حماقت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے جوں کا توں کپڑوں کی الماری کے سب سے نچلے خانے میں چھپا دیا۔ اس نے سوچا موقع دیکھ کر موبائل کو بعد میں ٹھکانے لگا دوں گی۔

☆ ☆ ☆

ناشتے کی میز پر بتول کا موڈ آف تھا۔

معراج کو صاف محسوس ہوا لیکن وہ آفس سے لیٹ ہو رہا تھا۔ اس وقت کوئی بھی بات چھیڑ کر گفتگو کو طول نہیں

دے، سنا علاقات، ان نے محلے کے نام ...

"کل کتنے بجے سوئے تھے رات میں۔" بتول سے اس کی خاموشی برداشت نہیں ہوئی۔ اس لیے پوچھ لیا۔
"بس جب آپ آئی تھیں کمرے میں اس کے فوراً" بعد۔" اس نے جلدی سے گرم چائے کا گھونٹ بھرا اور خستہ پراٹھے کا ٹکڑا توڑا۔
"اور اگر میں نہ آتی تو... لگے رہتے پوری رات۔" ان کی آواز میں آنچ سی تھی۔
"اوہو... اماں اب ایسی بھی بات نہیں۔"
"اچھا۔" طنزیہ انداز میں اسے دیکھا۔
"مجھے تو ایسی ہی بات لگ رہی... بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر..." معراج لقمہ منہ میں ڈال کر مسکرا دیا۔
"اگر ایسی بات ہے بھی تو اس میں کیا برائی ہے اماں! کیوں برا منا رہی ہیں۔"
"برائی ہے۔ جبھی برا مان رہی ہوں... ارے پہلے سے میل ملاقات رکھنے سے شادی میں نیا پن نہیں رہتا۔ پرانے لگنے لگتی ہے عورت۔ دل سے اتر جاتی ہے۔ بہت جلدی۔" معراج کی مسکراہٹ ہنسی میں بدل گئی۔
"اماں... وہ بیوی ہے میری۔ کوئی کپڑا لتا نہیں۔" اس نے ایک بار پھر بھاپ اڑاتی چائے کا کپ منہ سے لگایا۔ مجبوری تھی۔
"لو ابھی گھر آئی نہیں اور بیوی بھی بن گئی۔"
"بیوی گھر آنے سے بنتی ہے یا نکاح کرنے سے۔"
اگر معراج کو ذرہ برابر بھی پتا ہوتا کہ اس کی سرسری انداز میں کی جانے والی باتیں نہ صرف اس کی ماں کو بری لگ رہی ہیں۔ بلکہ کس حد تک بری لگ رہی ہیں۔ اور عفت کا مقام اس کی ماں کی نظروں اور دل میں نیچا کر رہی ہیں تو شاید وہ منہ بند کر کے سب سنتا رہتا۔
"اچھا... تو کیا میں نے غلطی کر دی نکاح کروا کے۔"
"ہم... م... م یہی تو میں کہنا چاہ رہا تھا آپ سے۔" اس نے ایک شرارت بھری مسکراہٹ کو لبوں میں دبا کر آخری نوالہ نگلا' خالی پلیٹوں کو پرے کھسکایا' چائے کا کپ خالی کر کے میز پر رکھا۔
"کیا... میں نے غلطی کی نکاح کروا کر۔"
"غلطی کی صرف نکاح کروا کر... رخصتی بھی ساتھ ہی کروا لیتیں تو کیا حرج تھا۔"
اپنی بات مکمل کر کے نہ چاہتے ہوئے بھی' بتول کا تپا ہوا چہرہ اور کھلا ہوا منہ دیکھ کر اس کی ہنسی نکل گئی اور پھر وہ ان کی اگلی بات سننے کے لیے رکا نہیں تھا۔
بتول وہیں بیٹھی دیر تک بڑبڑاتی رہیں۔ پھر بھڑاس نکالنے کے لیے بیٹیوں کو فون کھڑکانے کی نیت سے اٹھ گئیں۔
"نہ شرم نہ حیا۔ دیدہ ہوائی تو دیکھو۔ کیسے بے شرموں کی طرح ماں کے سامنے... ارے ایسے چونچال میں آ گئے جیسے پہلی پہلی شادی ہے..." غصے اور کھسیاہٹ میں اپنی ہی اولاد کی خبر لیتے انہیں احساس نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں اور کوئی سننے والا بھی ہے کہ نہیں۔

☼ ☼ ☼

سفید بے داغ بستر پر محو خواب وجود' خود سے اور اس سے بے خبر تو تھا۔ لیکن اس قدر آرام سے ہرگز نہیں تھا' جتنا ظاہری طور پر لگ رہا تھا۔ وہ کتنی دیر اس کا چہرہ نگاہوں میں جذب کرتی رہی۔
منظر دھندلا تا تھا۔ وہ آنکھیں صاف کرتی منظر پھر سے دھندلا جاتا۔ دفعتاً" داہنے ہاتھ میں خفیف سی لرزش جاگی۔

اس نے کپکپاتے ہوئے زرد ہاتھ اوپر [illegible] کر دیا۔

"حبیب... حبیب..." اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی۔

محبت بھرے لمس کی حرارت پا کر غافل وجود میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ کسمسایا۔ پھر ذرا سی گردن موڑی۔ درد سے بوجھل پپوٹے ذرا سے کھلے۔

پٹیوں میں جکڑے، زخموں سے چور شخص نے اپنی متاع جاں کو بے حد قریب سے دیکھا۔ اتنے قریب کہ اس کے وجود کی ساری حدت وہ خود میں اترتے محسوس کرنے لگا۔ اس کے لب بے یقینی تک کا سفر طے کرتے دائیں بائیں ذرا سا پھیلے۔ اور وہ مہربان وجود بے تابی سے اس پر جھک آیا۔

"حبیب... حبیب... آپ ٹھیک ہیں... آپ ٹھیک ہیں نا!" اس کے کانوں میں ریشم سی پھوار برسنے لگی۔ وہ آواز... وہ مانوس، محبت بھری آواز ابھی بھی آ رہی تھی۔

"حبیب آپ ٹھیک ہیں نا!... میں مجھے دیکھیں... میں ہوں ماہا!" حرف حرف زندگی بڑھ رہی تھی۔ لفظ لفظ سانسیں بندھنے لگی تھیں۔ وہ نرم ملائم ہاتھوں نے اس کا چہرہ آہستگی سے تھام لیا۔

"آنکھیں کھولیں۔ دیکھیں میں ہوں... حبیب میں ماہا!" اس کی پتلیاں، جھریوں بھرے پپوٹوں کے غلاف میں لمحے بھر کو لپٹ کر پھر سے نمودار ہوئیں اور اس بار ان میں پہچان کے رنگ بہت گہرے تھے۔

اس کا لرزتا ہوا ہاتھ اٹھا اور خود پر جھکی اضطراب سے خود کو ٹٹولتی ماہا کے سر پر ٹھہر گیا۔

ماہا کے تپتے وجود پر کسی نے گہرے بادل کا سائبان لا اوڑھایا۔ ماہا اس کی زرد آنکھوں میں پہچان کے نقوش انمٹ ہوتے دیکھ رہی تھی۔ اور وہ نم آنکھوں سے مسکراتی ہوئی ماہا کے چہرے پر دھوپ چھاؤں کا سنگم دیکھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے میں نوٹ کر رہی ہوں، جب سے آئی ہو تمہاری شکل پر بارہ بج رہے ہیں۔" حبیب سے ملنے اور لمحے بھر بات کر لینے کے بعد، ماہا کے پورے وجود سے امڈتی بشاشت واضح محسوس کی جا سکتی تھی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔ بات ہی ایسی ہوئی کہ اب تک طبیعت سنبھلی ہی نہیں۔" سوہا نے رات والے واقعے کی ایک ایک بات ماہا کے گوش گزار کر دی۔

"تم بتاؤ حبیب بھائی کی طبیعت۔"

"ہاں..." وہ ایک دم ہلکی پھلکی ہو کر مسکرائی۔

"اللہ کا شکر ہے پہلے سے بہت بہتر ابھی جب میں انہیں دیکھنے گئی تو ذرا دیر کے لیے ہوش آیا تھا۔ مجھے پہچان بھی گئے اور ہلکے سے مسکرائے بھی تھے۔" اس کے چہرے بچوں کی سی معصوم خوشی تھی۔

سوہا نے بے اختیار اس کی خوشی کے دائمی ہونے کی دعا کی۔ پھر کچھ سوچ کر اسے دیکھا۔

"ماہا! میں ایک بات کہوں۔ تم برا مت ماننا۔"

"کیا بولو... تمہیں ایسے رسمی انداز کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔"

"بس وہ... کیا کہوں... مجھے ابھی گھر جانا ہو گا فوراً"... انس کو کہیں انٹرویو کے لیے جانا ہے۔ تمہیں برا تو نہیں لگے گا اگر میں اتنی جلدی آ کر پھر واپس چلی جاؤں تو... میرا مطلب ہے..." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"سوہا... بھلا یہ بات مجھ سے کوئی کہنے والی ہے۔ کیا میں نہیں جانتی کہ انس بھائی اپنی جاب کی وجہ سے کتنے اپ سیٹ ہیں۔ تم بالکل فکر مت کرو۔ بالکل اطمینان سے جاؤ۔"

"نہیں کوئی ... مسئلہ۔"

"ارے نہیں ہوگا کوئی مسئلہ اور ہاں... امی کو فون کرکے حسیب کے بارے میں ذرا اور تفصیل سے بتا دینا... میں نے صبح فون کیا تھا مگر جلدی میں تھی تو زیادہ بات نہیں کر سکی۔"

"اوکے... میں چکر لگاتی رہوں گی۔"

"ہاں ہاں کوئی بات نہیں۔"

وہ ممنون نگاہوں سے اسے دیکھ کر اس کے گلے لگ گئی۔ پھر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"ہمیشہ خوش رہو۔"

"تم بھی..." ماہا کو اپنی بہن پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

☼ ☼ ☼

مغرب کا جھٹپٹا آسمان کو سرمئی سے سیاہ کرتا جا رہا تھا۔

"ارے دونوں وقت مل رہے ہیں۔ نیچے آجاؤ۔" بتول چھت پر کھیلتے پوتے کو بلاتے بلاتے سب سے نچلی سیڑھی سے چھت تک آگئی تھیں۔

"ارے رک جا... ٹھہر تو... ارے سنبھل کے دھیان سے۔" ننھا سا بچہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے ادھر ادھر بھاگتا انہیں ٹھیک ٹھاک تھکا چکنے کے بعد تیزی سے سیڑھیوں کے پاس گیا اور اتنی ہی رفتار سے اترتا چلا گیا۔

"یا اللہ! دیکھ کے کہیں گر مت جانا۔" اس کی رفتار دیکھ کر ہانپتی ہوئی دادی جو اسے پکڑنے کے خیال سے سیڑھیاں اترنے لگی تو اوپر سیڑھیوں پر ہی پیر پھسل گیا۔

بس لمحے بھر کی دیر تھی۔

باقی سیڑھیاں لڑھکتے ہوئے طے کرتی جب وہ سب سے آخری سیڑھی پر پہنچیں تو ان کی ہائے وائے سے پاس پڑوس میں سب کو حادثے کی اطلاع خود بخود ہو چکی تھی۔

جب تک ان کی بیٹیاں اپنی اماں کی خبر گیری کو آئیں تب تک پیر کی مرہم پٹی کروا باقی ماندہ چوٹوں پر مرہم لگوا کر بستر کو پیاری ہو چکی تھیں۔ واویلا البتہ جاری تھا۔

بڑی بیٹی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"راجو کو بتا دیا تھا۔"

"ہاں کیا تو تھا فون۔"

"تو وہ اب تک آیا کیوں نہیں۔ آفس کا ٹائم تو ختم ہو چکا۔" بتول کے کانوں میں اس بات کا پڑنا تھا کہ وہ اپنا پیر اور موچ بھول کر ایک نئی چیز کو لے کر شروع ہو گئیں۔

"ان کا کیا پوچھتی ہو۔ تمہارے بھیا کے تو ڈھنگ ہی نرالے ہوتے جا رہے ہیں... اسے نئی نویلی بیوی کا خمار سر پر چڑھا ہوا ہے۔"

"کیا مطلب..."

"آئے روز کسی نہ کسی بہانے سے پہنچ جاتے ہیں دیدار کرنے۔ پہلے وہ چچی ساس ایڈمٹ تھیں تو ان کے بہانے ملاقات کو چلے گئے۔ پھر بہنوئی ایڈمٹ ہو گیا وہ چھٹیں تو... اب سنا ہے کہ بے ہوش تھا۔ ہوش میں آگیا ہے۔ تو اس کی آڑ میں آج پھر طے ہو گئی ملاقات۔"

"ہیں۔۔۔؟" بیٹیوں نے انگلیاں دانتوں میں داب لیں۔

"اور خاندان بھی تو دیکھا۔ جنے کونسا ناس پیٹا ہے۔ تین بہنوں کی شادی ہوئی۔ بچہ ایک کے یہاں بھی نہیں۔ اوپر سے جب سے نکاح ہوا ہے ایک کے بعد ایک بری خبر سن رہی ہوں۔۔۔" بتول کا منہ کڑوا زہر ہو رہا تھا۔

"اور ہاں۔۔۔ ایک اور تو سنو نئی تازی۔۔۔" وہ رازدارانہ انداز میں آگے کو جھک کر کل رات والی اپنی کارکردگی اور صبح معراج کے منہ سے نکلی ہوئی بات مرچ مسالا لگا کر سنانے لگیں۔

"ارے کیا پاگل ہو گیا ہے راجو۔۔۔ ایسی بے شرمی سے کوئی کہتا ہے ماں کو۔"

"اور ایک بات تو آپ نے نوٹ ہی نہیں کی اماں۔۔۔" چھوٹی بیٹی کے انداز میں حد درجہ گہرائی تھی۔

"وہ کیا۔"

"آج راجو بھیا نے رخصتی کی بات کی اور آج ہی آپ گر گئیں۔" بتول بیٹھے سے یوں اچھلیں گویا بستر میں کسی نے اسپرنگ لگایا ہو۔

☆ ☆ ☆

ان کے موبائل پر موصول ہونے والی کال اتنی غیر متوقع تھی کہ چند لمحوں تک انہیں یقین ہی نہیں آیا کہ جو آواز وہ سن رہی ہیں وہ کوئی خواب نہیں، حقیقت ہے۔ جبکہ دوسری طرف موجود عورت اپنا تعارف کروانے کے بعد ان کی کیفیت سے قطعی بے خبر اپنی دھن میں بول رہی تھی۔

"میں پاکستان آنا چاہتی ہوں۔ میرا حسیب سے کوئی ریلیشن تو نہیں لیکن اس نے میرا بہت ساتھ دیا اس وقت' جب مجھے اس کی ضرورت تھی۔ اور ویسے بھی میں نے اور اس نے کافی عرصہ ایک دوسرے کی سنگت میں بہت اچھا گزارا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے دوست رہ چکے ہیں۔ پتا نہیں حسیب نے آپ کو میرے بارے میں بتایا ہے یا نہیں لیکن۔۔۔ مجھے اس کے منیجر سے اس کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کا علم ہوا تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ اوپر سے وہ کہہ رہا تھا کہ حسیب کا سارا بزنس یہاں سے وائنڈ اپ کر کے پاکستان جانا پڑے گا۔ تو میں نے سوچا۔ میرا فرض بنتا ہے ایک اچھے دوست سے کم از کم ایک آخری بار مل ہی لوں۔۔۔" وہ آگے بھی کچھ بول رہی تھی۔

مزنہ کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ انہوں نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر اڑی اڑی رنگت سے صادق کو دیکھا۔ جو انہیں فون اٹینڈ کرنے کے بعد یوں حق دق ہوتا دیکھ کر نزدیک آ گئے تھے۔

انہوں نے فون مزنہ سے لے کر کان سے لگایا اور دوسری جانب کی بات تحمل سے سننے لگے۔ کچھ دیر سننے کے بعد انہوں نے گہری سانس بھری۔

"ٹھیک ہے۔ اگر آپ ملنا چاہتی ہیں تو' آجائیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں لیکن۔۔۔" ان کی بات مکمل نہیں ہو سکی۔ مزنہ نے فون ان کے ہاتھ سے جھپٹ کر لائن کاٹ دی۔

"وہ عیادت کے لیے آ رہی ہے یا جگ ہنسائی کے لیے۔ کیا کہیں گے لوگوں سے ہم۔۔۔ کون ہے یہ عورت اور کیوں آ گئی اتنی دور سے ملنے۔۔۔"

اتنی تیزی اور جلدی جلدی بولنے سے مزنہ کا سانس پھول گیا۔ وہ کھڑے سے نزدیکی صوفے پر گر کر گہرے گہرے سانس لینے لگیں۔

صادق صاحب چند لمحے ان کا تنفس ہموار ہونے کا انتظار کرتے رہے پھر بولے۔

"سب کو سب کچھ پتا چل ہی جائے گا۔ آج نہیں تو کل۔۔۔ کیونکہ وہ اکیلی نہیں آ رہی۔ حسیب کے اس لڑکے کو بھی ساتھ لا رہی ہے۔۔۔ جسے اس نے ایڈاپٹ کیا ہوا ہے۔"

وہ چاہ کر بھی حقیقت کو واشگاف الفاظ میں بیان نہیں کر سکے۔ مزنہ پر پہاڑ ہی ٹوٹ گیا۔

"کیا... کیا کہا... اوہ میرے خدا!" انہوں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔
کیسے سامنا کروں گی میں بابا کا۔
"آپ... آپ اس عورت کو صاف منع کردیں یہاں آنے سے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے اسے زبردستی خوامخواہ کی محبت کا راگ الاپنے کی۔" "نہیں اور کوئی راستہ نہیں سوجھا۔
صادق ان کی ذہنی کیفیت سمجھ رہے تھے۔ جبھی بحث کرنے کے بجائے ٹھنڈے لہجے میں بولتے ہوئے ان کے برابر بیٹھ گئے۔
"چلو ٹھیک ہے۔ تم کہتی ہو تو میں منع کردیتا ہوں۔ مگر وہ لڑکا۔ جس کا اس دنیا میں حسیب کے سوا اور کوئی نہیں۔ کیا اسے بھی منع کردوں۔" مزنہ کے پاس ان کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔
"حسیب ہی بھری دنیا میں اس کا واحد رشتہ ہے۔ اور اس کا کفیل بھی۔ وہ کہاں جائے گا اگر حسیب کے پاس نہیں آئے گا تو... اور چلو مان لیا کہ وہ نہیں آیا۔ تو حسیب..." وہ چند لمحے رکے۔
"کیا وہ نہیں بلائے گا اسے صحت یاب ہونے کے بعد... اگر اسے اب پاکستان میں سیٹل ہونا ہی ہے۔ تو کس کے سہارے چھوڑے گا وہ اسے وہاں... اور بعد میں بلانے پر اگر اس لڑکے نے ہمارے خلاف اس سے کوئی شکوہ کیا تو..." مزنہ کو ان پے در پے سوالوں سے گھٹن سی ہونے لگی۔ ان کے اعصاب چٹخنے لگے۔ انہیں لگا ان کے وجود کی عمارت میں کوئی چیز ڈھے رہی ہے۔
مزنہ بری طرح ہار مان کر سسک پڑی تھیں۔ لیکن ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ان کی باتوں سے قائل ہوگئی ہیں۔
صادق صاحب نے بازو پھیلا کر انہیں تسلی دینے کے لیے خود سے لگا لیا۔
رشتے زندگی کے لیے جتنے ضروری ہوتے ہیں۔ ان سے وابستہ دکھ' زندگی کا پتا دینے کے لیے ان سے زیادہ ضروری ہوتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

اماں کے پیر میں آئی موچ کو ہفتہ بھر ہوچکا تھا۔
وہ گھر کے کام کاج سے مکمل طور پر بیٹھ گئی تھیں۔ ایک ہفتہ تک تو بیٹیوں نے بڑے تحمل اور سلیقے سے گھر کا انتظام باری باری سنبھالا۔ مگر پھر بھی جانے کس بے احتیاطی کے نتیجے میں ان کے اکلوتے پیارے بھتیجے کو دست لگ گئے۔ اور لگے بھی ایسے کہ صبح سے شام تک میں بچہ تو نڈھال ہی ہوگیا۔ لیکن بار بار اس کی گندگی صاف کرتے پھوپھو کا جی بھی بری طرح اوب گیا۔
معراج آفس سے گھر پہنچا تو بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر ہسپتال لے کر دوڑا۔ انجکشن دوائیں' احتیاط اور ہر چیز... کتنی ہی تدابیر تھیں جو اس کے پانی کی طرح لوز موشن کو روکنے کے لیے ڈاکٹروں نے ہدایت کی صورت میں' سر پر لاد دی تھیں۔
پھوپھو بے چاری وہاں تو خوب زور و شور سے سرہلاتی رہی اور گھر پہنچی تو بتول کا بھوک کے مارے شور سن کر سب بھول بھال گئی۔
کون سی دوا دینی تھی۔ کون سی رات کو سوتے وقت پلانی تھی۔ اور ایک خاص گلابی رنگ کا پانی تھا۔ جو کسی صورت بچہ منہ میں رکھنے کو تیار نہ تھا۔ بتول نے گود میں لٹا کر زبردستی پلانے کی کوشش کی تو اس نے وہ ہاتھ مارا کہ پوری بھری ہوئی بوتل فرش پر بہہ گئی۔
بتول نے اپنی محتاجی اور اس کی ضد پر جھنجلا کر اسے ایک تھپڑ رسید کردیا اور بس... بالکل یہی بس آخری منظر

معراج نے کمرے میں داخل ہوتے وقت دیکھا۔
"کیا کر رہی ہیں اماں آپ۔۔۔ پہلی ہی وہ ایسی قدر نڈھال اور کمزور ہو رہا ہے۔ آپ نے اور مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔" وہ کندھے سے لگا کر سسکتے ہوئے بچے کو تسلی دینے لگا۔
"ارے تو دوا ابھی تو نہیں پی رہا کسی صورت۔۔۔" انہوں نے بمشکل لفظ "منحوس" کو لبوں تک آنے سے روکا۔
"تو بچہ ہے چڑچڑا ہو گیا ہے۔ آپ اپنے آپ کو ہی دیکھ لیں۔ چار دن ہوئے نہیں بستر پر کہ بات بے بات غصہ کرنے لگیں۔"

اس نے خود بمشکل اپنی چڑچڑاہٹ ضبط کی تھی۔ اور بچے کو کندھے سے لگائے باہر نکل گیا۔
اماں کے بستر کی پائینتی کے قریب کھڑی خاموشی سے تماشا دیکھتی بہن کی برداشت کی حد بھی بس یہیں تک تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی دوا کی شیشی سائڈ میز پر رکھی اور ماں کے قریب آکر ہمدردانہ انداز میں بولی۔
"برا مت مانیے گا اماں۔۔۔ بھلا سب کا اسی میں ہے۔ سادگی اور خاموشی سے جتنی جلدی ہو سکے راجو کی بیگم کی رخصتی لے لیں۔"

☼ ☼ ☼

شام ڈھلنے میں کچھ دیر باقی تھی۔ جب اس نے دھلا دھلایا استری شدہ سوٹ نکال کر پہنا بال بنائے اور ہلکی سی لپ اسٹک لگا کر آنکھوں میں کاجل ڈالا۔ ابھی وہ ٹھیک سے خود کو آئینے میں دیکھ بھی نہیں پائی تھی کہ عفت کا فون آ گیا۔
"کتنے دن سے تم سے فرصت سے بات نہیں ہوئی۔ گھر کب آؤ گی۔" عفت کے فون سے اماں بات کر رہی تھیں۔ ان کا وہی ہمیشہ والا مطالبہ تھا۔ جبکہ پہلے تو نائلہ ہمیشہ ٹال ہی جاتی تھی۔ لیکن پچھلے چند دنوں میں اس نے آزادی اور خوشی کا جو بھرپور مزا چکھا تھا۔ اس نے اس کے مزاج میں بھی شوخی اور خوشی کے رنگ بھر دیے تھے۔
اس وقت بھی وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔
"آؤں گی اماں۔۔۔ اس اتوار کو تو ضرور ہی آؤں گی۔ ابھی حدید گھر آتے ہیں تو بات کرتی ہوں۔ اور یہ عفت کہاں ہے۔ کیا کرتی رہتی ہے۔ بات ہی نہیں کرتی مجھ سے۔"
"وہ اب تم سے بات کیوں کرے گی۔ اس کے پاس بات کرنے کے لیے اور بھی لوگ ہیں۔" اماں کو بھی شوخی سوجھی۔
جس پر نائلہ نے دوبارہ ٹھٹھا لگایا۔ البتہ دوسری طرف اماں کے نزدیک بیٹھ کر سبزی کاٹتی عفت شرمندگی سے اماں کو دیکھ کر رہ گئی۔
"اچھا یہ بات ہے۔ ذرا میری بات تو کروائیں۔" عفت نے چھری ہاتھ سے رکھ کر فون پکڑا۔ نائلہ بہت موڈ میں تھی۔ تھوڑی دیر تک چھیڑ چھاڑ کرتی رہی۔ عفت بھی مسکرا مسکرا کر جواب دیتی رہی اور دل ہی دل میں حیران بھی ہوتی رہی۔
وہ سمجھتی تھی کہ اماں اس بات سے انجان ہیں کہ اس کا اور معراج کا آپس میں کوئی رابطہ ہے۔ لیکن ماں باپ اتنے بھی انجان نہیں ہوتے جتنا اولاد ان کو سمجھ لیتی ہے۔
دوسری طرف نائلہ نے یونہی ہلکی پھلکی بات چیت کے بعد فون رکھا تو خود کو اس حد تک تر و تازہ محسوس کیا گویا کسی نے ابھی ابھی نئی زندگی لا کر اس کے وجود میں ڈالی ہے۔
وہ خدا کا جتنا بھی شکر ادا کرتی کم تھا کہ اسے راستہ بھٹکنے سے بچا کر خدا نے سیدھی صاف ستھری سڑک پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس نے خلوص نیت سے اپنی منزل کی سمت اپنا سفر شروع کر دیا تھا۔ اور کامیابی سے آگے کی اور قدم بڑھا رہی تھی۔ حدید کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ دن بلکہ وہ شام پوری جزئیات کے ساتھ اس کی نگاہوں میں گھوم

گئی۔ اس شام وہ اسی طرح ہلکی پھلکی تیاری کے ساتھ حدید کی آمد کی منتظر تھی۔ اور حدید جب گھر آیا تو بہت تھک چکا تھا۔

وہ کمرے میں آکر سیدھا صوفے پر پھیل کر نیم دراز ہو گیا اور آنکھیں موند لیں۔

نائلہ کو اسے اس قدر سنجیدگی میں دیکھ کر مخاطب کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ پھر بھی اس نے ٹھنڈے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا کر سلام کیا۔ حدید نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ سرخی تھی۔

"کیا ہوا آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔" وہ۔۔۔ جھجکتے ہوئے بولی اور برابر والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"نہیں۔۔۔ شاید مجھے بخار سا ہو رہا ہے۔"

اس کی آنکھیں ہنوز بند تھیں۔ نائلہ چند لمحے اس کا سرخ چہرہ دیکھتی رہی۔ پھر دھیرے سے اس کی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

حدید نے اس کے ٹھنڈے لمس کو محسوس کرتے ہی آنکھیں کھولیں۔ لیکن بنا حرکت کیے یونہی پڑا رہا۔

نائلہ نے کچھ دیر ہاتھ رکھا۔ پھر دھیرے دھیرے سر دبانے لگی۔

ہر جنبش کے ساتھ اس کی کلائی میں پڑی کانچ کی چار چوڑیاں آپس میں ٹکرا کر جلترنگ سا پیدا کر دیتیں۔ وہ سر دباتی رہی۔ یہاں تک کہ حدید شاید تھوڑی غنودگی میں چلا گیا۔

نائلہ کو جب احساس ہوا کہ وہ بیٹھے بیٹھے سو رہا ہے۔ تو اس نے دھیرے سے آواز دی۔ لیکن حدید نے شاید اس کی پکار سنی ہی نہیں۔

نائلہ نے بے حد آہستگی سے اس کے جوتے موزے اتارے پھر دوبارہ اس کا بازو ہلایا۔ اب کی بار وہ نہ صرف چونکا بلکہ سیدھا ہو کر تعجب سے اپنے پیروں کو دیکھنے لگا۔

"میں نے اتارے ہیں شوز آپ کے۔۔۔ ٹمپریچر تیز ہو رہا ہے۔ ادھر بیڈ پر لیٹ جائیں۔"

اسے واقعی بخار چڑھ رہا تھا۔ جبھی ایک بھی لفظ کہے بغیر شرافت سے بستر پر لیٹ گیا۔ نائلہ نے گرم دودھ کے ساتھ دوا کھلائی اور دوبارہ بیٹھ کر سر دبانے لگی۔

کتنے عرصے بعد یہ پہلا موقع تھا جب وہ حدید کے نزدیک گئی تھی۔ اسے چھو رہی تھی اور وہ بدک کر دور نہیں ہٹا تھا۔ نائلہ کو پتا تھا' اس کے سر دبانے سے اسے آرام مل رہا ہے اور وہ یہی چاہتی تھی۔ وہ اپنی ذات سے اسے آرام ہی پہنچانا چاہتی تھی۔ اس نے دانستہ و نادانستہ اسے جتنی بھی تکلیف دی تھی۔ اس کا ازالہ کرنا چاہتی تھی۔ جبھی اس وقت تک اپنے نرم ہاتھوں سے اس کے سر اور کنپٹیوں پر مساج کرتی رہی۔ جب تک اس کی پر حدت سانسوں کا زیر و بم ہموار نہیں ہو گیا۔ تب۔۔۔ ایک لمحے کو رک کر اس نے کچھ سوچا اور دھیرے سے اسے آواز دی۔

"حدید۔۔۔!" حدید نے کوئی حرکت نہیں کی۔

"مجھے معاف کر دیں ہر اس حرکت' ہر اس بات کے لیے۔ جس نے میری طرف سے آپ کو ذہنی اور جسمانی طور پر تکلیف میں رکھا۔" اس کی آواز بے حد دھیمی تھی۔ سرگوشی سے ذرا ہی بلند۔۔۔

"میں جانتی ہوں میں۔۔۔ آپ میری آواز نہیں سن رہے۔ جبھی یہاں بیٹھ کر آپ سے معافی مانگ رہی ہوں۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں کہ آپ کے سامنے بیٹھ کر آپ سے معافی مانگ سکوں۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ مجھ سے چند غلطیاں اور کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں۔ جن سے دوسروں کے ساتھ ساتھ خود میری اپنی ذات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ میں گیا ہوا وقت واپس لا کر اس نقصان کا ازالہ نہیں کر سکتی لیکن۔۔۔ بہت کچھ جو میری وجہ سے

غلط ہو گیا۔ اسے صحیح کرنے کی کوشش ضرور کر سکتی ہوں۔

میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے انس کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب ضرور دیکھے تھے اور پھر ایک عرصہ..... یہاں تک کہ اپنی اور اس کی شادی ہو جانے کے بعد بھی ان ہی خوابوں میں خود کو زندہ رکھا۔ یہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ لیکن اب.....

اب میں جاگ گئی ہوں۔ میں اپنے خوابوں سے دستبردار ہو کر حقیقت کی دنیا میں جینا سیکھ گئی ہوں۔ اور یہ دنیا اتنی بھی تلخ اور بے رنگ نہیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں آج سے میری زندگی 'میری محبت' میرا وجود اور میری وفا..... سب آپ کی امانت ہیں۔ جس میں آپ کبھی خیانت نہیں پائیں گے۔ مجھے معاف کر دیں بس۔ مجھے آپ سے اور کچھ نہیں چاہیے۔"

اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ پھنسنے لگا تو بات کرنا دشوار ہو گئی۔ آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

اپنے سامنے فرش بچھے قالین کے نقش و نگار کو گھورتے ہوئے اس نے حدید کے ماتھے پر رکھا ہاتھ ہٹا کر اپنے آنسو صاف کرنے چاہیے تھے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکی۔ حدید سو نہیں رہا تھا۔ وہ ساکت ہو گئی۔ وہ دھک سے رہ گئی۔

وہ جاگ رہا تھا۔ جانے کب سے۔ اس نے نائلہ کی باتیں سن لی تھیں۔ جانے کتنی اور کون کون سی اور اب اس کی کلائی اس کی گرفت میں تھی۔ نائلہ نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر منہ پھیر کر دوسرے ہاتھ سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی۔

حدید نے بنا کچھ کہے اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔ پھر دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر جھکایا اور اپنے سینے پر رکھ لیا۔

نائلہ کی دبی ہوئی سسکیاں اور رکے ہوئے آنسو آزاد ہو کر کمرے کی فضا اور حدید کا گریبان بھگونے لگے۔

☼ ☼ ☼

انسان کے چاہنے اور نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے۔ انسان کے سارے وعدے 'ارادے' تاویلیں اور منصوبہ بندیاں دھڑام سے منہ کے بل جا گرتی ہیں اور وہ انہیں اٹھا کر دوبارہ نظر بھی نہیں ڈال پاتا۔

ولید اپنی عیسائی ماں ڈزنی بلیک کے ہمراہ پاکستان آ چکا تھا۔ اپنے مسلمان باپ سے ملنے۔ اس کی عیادت کرنے اور اس کی خیریت معلوم کرنے۔

ماہا نے ہر چند کہ اسے مایوس کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔

وہ نہ صرف اس کی کال اٹینڈ نہیں کرتی تھی۔ بلکہ مزنہ کے ایک بار ذکر کرنے پر اس کے خلاف اتنے سخت الفاظ میں بات کی تھی کہ مزنہ کو دوبارہ اسے بتانے کی ہمت ہی نہیں پڑی کہ اس معاملے میں 'میں خود بھی تمہارے ہم خیال ہوں' لیکن میرے شوہر نامدار کافی دور اندیشی اور اپنے تئیں عقلمندی کے مظاہرہ کرتے ہوئے نا صرف اسے بلکہ اس کی کرسچن ماں کو بھی پاکستان بلا چکے ہیں۔

فی الحال تو وہ اسے ہوٹل سے پہلے اپنے گھر بلانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس کے بعد ہسپتال کا مرحلہ آتا۔ لیکن صادق کے ساتھ ساتھ خود مزنہ بھی یہی چاہتی تھیں کہ کسی دن..... کسی ایک دن ماہا تھک کر آرام کرنے کے بہانے گھر جائے تو ان ماں بیٹے کو حبیب سے ملوانے لے آئیں۔ مگر جب سے حبیب کو ہوش آیا تھا۔ تب سے ماہا نے خود گھر جانے کا نام نہیں لیا تھا اور اس صورت حال میں وہ ہرگز اس بچے ولید اور اس کی ماں کو ہاسپٹل لانے کا

رسک نہیں لے سکتے تھے۔
دوسری طرف ماما کو بھی شاید کسی قسم کی پیش رفت کا اندازہ تھا۔ جبھی وہ مزنہ اور صادق کی موجودگی میں حسیب کو ایک منٹ بھی تنہا نہیں چھوڑتی تھی۔
گزرتے دنوں میں جہاں حسیب خود سے حرکت کرنے' بولنے اور بات چیت کرنے قابل ہوا تو' اس نے خود ہی ماما کو خود سے دور جانے سے روک دیا۔ ماما خود بھی اب کونسا اسے چھوڑ کر کہیں جانا چاہتی تھی۔
خاندان والے دوست احباب اور رشتے دار.... جس جس کو پتا چلا' وہیں آکر مل لیا۔ باقی ماما اس کے پاس تھی اور اسے وہیں رہنا تھا۔

☆ ☆ ☆

تائی اماں' امی اور سوہا متذبذب سی بیٹھی ان کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ جو اب اپنی بات مکمل کرکے چائے اور بسکٹ سے انصاف کرنے لگیں۔
"دیکھیں بیٹا۔" بالآخر رضوانہ حسن نے ہی بات کا آغاز کیا۔
"آپ جو بات کہہ رہی ہیں۔ وہ ہم سمجھ رہے ہیں۔ آپ کی مجبوری بھی اور.... ظاہر ہے کہ بتول بہن گھر کی ذمہ داری نہیں اٹھا پا رہی ہوں گی تو انہیں مشکل تو ہو رہی ہو گی لیکن...." دوبارہ اسی تذبذب کا شکار ہو کر انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
"لیکن کیا آنٹی۔ جو بھی بات ہے کھل کر کہیں۔" امی اور تائی اماں نے گہری سانس لے کر ایک دوسرے کو دیکھا۔
حسیب کی حالت اور ہسپتال میں اس کی موجودگی معراج اور اس کی ماں بہنوں سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں تھا۔ ایسے وقت میں جب گھر کا ایک فرد خرابی صحت کی وجہ سے ہسپتال میں داخل تھا۔ گھر میں کسی خوشی خصوصاً" شادی جیسی بڑی تقریب کرنے کا خیال ہی کافی احمقانہ محسوس ہو رہا تھا۔
"جب تک میرا داماد مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو جاتا۔ ہم لوگ ایسی کسی تقریب کے بارے میں سوچ تک نہیں سکتے۔"
"ارے آنٹی یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ماشاء اللہ سے آپ کے داماد تو پہلے سے بہت بہتر حالت میں ہیں۔ ہم کب کہہ رہے ہیں کہ کل ہی رخصتی دے دیں۔ ایک سے ڈیڑھ ماہ کافی ہے۔ تب تک وہ بھی ٹھیک ہو جائیں گے اور دونوں طرف کی تیاریوں میں جو کسر رہ گئی ہے۔ وہ بھی پوری ہو جائے گی۔"
"جی.... تیاری.... لل.... لیکن بیٹا آپ نے تو یہ رشتہ کرتے وقت بہت پرزور اصرار کیا تھا کہ آپ کو جہیز کے نام پر کچھ نہیں چاہیے۔" تائی اماں کو ان کی باتوں سے اب حقیقتاً" پریشانی لگ گئی تھی۔
"جی جی.... وہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ لیکن یونہی تین کپڑوں میں تو اپنی بیٹی کوئی بھی نہیں اٹھا کر دیتا۔ آپ نے یقیناً" تھوڑا بہت تو جوڑا ہو گا نا!" یہ معراج کی بڑی بہن تھیں۔
جن کی اخلاقیات کا کل تک سارا گھر گواہ تھا۔ جو عفت کی بلائیں لیتے نہیں تھکتی تھیں اور آج وہ جو کچھ کہہ رہی تھیں۔ وہ تائی اماں کے ساتھ ساتھ امی کو بھی پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔
"کاش کہ اس وقت نائلہ ہی ہوتی یہاں۔"
تائی اماں نے گھبرا کر اپنی توپ مزاج بیٹی کو یاد کیا۔ جس نے اتوار کو آنے کا کہا تو تھا۔ لیکن ابھی تک آئی نہیں تھی۔

دوسری طرف تائی اماں کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں 'دونوں بہنوں کے اطمینان و سکون میں اضافے کے باعث بن رہی تھیں۔

"یہ پٹی انہیں بتول نے ہی پڑھا کر بھیجی تھی کہ ڈھکے چھپے الفاظ میں جہیز اور دوسری تیاریوں کا بھی کہہ دینا لگے ہاتھوں۔

"اے بالکل ہی کنگلا خاندان ہے۔ کیا پتا بیٹی کو ایسے ہی روانہ کردیں۔" ان ماں بیٹی نے یہ بات دانستہ ان لوگوں کو پریشان کرنے کے لیے چھیڑی تھی۔ کیوں کہ ان کے توہم پرست ذہنوں نے از خود یہ فرض کرلیا تھا کہ عفت کا وجود اس گھر اور گھر کے مکینوں کے لیے مبارک نہیں ہے۔

"دیکھیں آنٹی۔ دنیا دکھاوے کو ہی سہی بیٹی کو کچھ نہ کچھ تو سبھی والدین دیتے ہیں۔ زیور گہنے 'کپڑا لتا۔ ورنہ جہیز لینے سے انکار تو سارے ہی سسرال والے کرتے ہیں۔ اخلاقیات اور شرافت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ لیکن کچھ فرض تو آخر لڑکی اور اس کے گھر والوں کا بھی ہوتا ہی ہے۔"

انہوں نے چائے کی پیالی بات ختم کرکے منہ کو لگائی اور اس کی اوٹ سے دونوں خواتین کے ستے ہوئے چہرے دیکھے۔

"برا ماننے کی بات نہیں آنٹی۔ ہم کونسا جہیز کے بھوکے ہیں۔ خدا کا دیا سب کچھ تو ہے ہمارے پاس۔ بس بات یہ ہے کہ سو طرح کے لوگ ملنے ملانے والے ہوتے ہیں۔ جس کے جو منہ میں آئے بک دیتا ہے۔ آپ خود سوچیں ہمیں کیا اچھا لگے گا اگر 'ہماری اکلوتی بھابھی کے خاندان کو کوئی فقیر یا کنگلا کہے۔" کچن میں کھڑی عفت تک ان دونوں خواتین کی باتیں بخیر و خوبی پہنچ رہی تھیں۔ ناشتے کے لوازمات سے بھرپور انصاف کرنے اور اپنے قیمتی اقوال زریں 'ان دونوں خواتین کے حوالے کرنے کے بعد وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اچھا آنٹی دیر بہت ہوگئی۔ عفت کو ہماری طرف سے پیار کریجیے گا۔" امی بہت دھیمے قدموں سے انہیں دروازے سے رخصت کرکے پلٹیں تو کمرے میں تائی اماں سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں واضح لرزش تھی اور چہرے کے جو تاثرات تھے۔ انہیں چھپانے میں وہ یقیناً" ناکام رہی تھیں۔

رضوانہ نے چند لمحے انہیں دیکھا پھر نزدیک آکر گلے سے لگالیا۔

انہیں اپنے گریبان میں گرم آنسوؤں کی تپش انگاروں سے بڑھ کر جلاتی ہوئی لگی۔

"ارے آپ کیوں فکر کرتی ہیں بھابھی! اللہ بڑا کارساز ہے۔ ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔"

"کچھ نہ کچھ تو ہم بھی کر ہی لیتے لیکن انہیں اس طرح جتانے کی کیا ضرورت تھی اور کیا یہ لوگ کچھ نہ کچھ سے مطمئن ہونے والے لگتے ہیں۔ انہیں تو شاید بہت کچھ کی آس ہے۔"

"سب ہو جائے گا۔ اللہ بہتر کرے گا۔ دل میں وہم نہ پالیں۔ معراج خود بہت سمجھ دار لڑکا ہے۔ اسے پتا لگے گا تو وہ خود ان لوگوں کو سمجھائے گا اور ہاں۔۔۔ بھائی صاحب کو کچھ مت بتائیے گا۔ وہ خوامخواہ پریشان ہو جائیں گے۔"

بیرونی دروازے سے بھائی صاحب کے اندر آنے کی آواز آئی تھی۔ وہ اکثر شام کے وقت محلے کے ایک دو لوگوں کے پاس وقت گزاری کے لیے چلے جایا کرتے تھے۔

اندر کھڑی عفت نے بھی اپنی ماں اور چچی کی باتیں سن لی تھیں۔ اسے معراج کی بہنوں سے اس گھٹیا پن کی امید نہیں تھی۔ اس نے دل میں پکا ارادہ کیا۔

"معراج سے صاف کہوں گی۔ مجھ سے شادی کرنی ہے تو اسی حال میں کرنی ہوگی۔ کسی لمبے چوڑے جہیز کی امید رکھے۔"

(باقی آئندہ)

سمیرا غزل صدیقی

روشن لمحہ

"میری تو مت ہی ماری گئی تھی جو تجھ جیسی عورت سے شادی کرلی جب سے شادی ہو کے میری زندگی میں آئی ہے برباد ہی کر کے رکھ دیا ہے۔" تین سالہ شادی شدہ زندگی میں نادیہ نے یہ جملہ کوئی ہزارویں بار رشید کے منہ سے سنا تھا بلکہ اب تو اسے لگنے لگا تھا کہ رشید کا تکیہ کلام ہی یہی ہے۔

"گڑھے مردے نہ اکھاڑو چپ چاپ یہ کھانا کھالو۔" پتلی سی دال اور دو روٹی اس نے اک قہر آلود نظر رشید پہ ڈالتے ہوئے بان کی چارپائی پہ رکھی تھی اور خود سامنے کھڑے رال ٹپکاتے اپنے دو سالہ سپوت اسد کا منہ دھلانے چلی گئی تھی۔

"زبان چلاتی ہے بدذات عورت سلیقہ نام کا نہیں اور اکڑ گورنروں والی ہے یہ دال بنائی تھی تو کیا نلکا کھول کے چھوڑ دیا تھا اس میں، پتا بھی ہے پانی نہیں ہے شہر میں کہیں۔" وہ رشید ہی کیا جو کبھی کھانا نقص نکالے بنا حلق سے اتار لے۔

"یہ پتلی دال نہیں کھا سکتے تو جا کے ہوٹلوں میں کھاؤ کھانا" آمدنی نام کی نہیں ہے اور خرچے امیروں والے۔ خرچے کے سو روپے ہی دیے تھے تم نے اور اس میں یہی آتا ہے۔" وہ بھی تنک کے واپس آئی تھی۔

"بس بہت ہو گیا میرا ہی دماغ خراب تھا جو گھر کھانا کھانے آگیا اٹھالے یہ کھانا۔" وہ فوراً کھڑا ہوا تھا غصہ تو اس کی ناک جیسے دھرا ہی رہتا تھا وہ تو صد شکر تھا کہ اس نے پلیٹ صحن میں اٹھا کے پھینکی نہیں تھی۔

"کچھ خوف کرو خدا کا جب دیکھو کھانے کو کوستے رہتے ہو، ارے اگر شاہی کھانے کھانے کی عادت ہے تو اپنی کمائی میں دم پیدا کرو نہ کے کھانے کی بے عزتی کرو، یہ بھی روٹھ گیا نہ تو دو وقت کی روٹی کو روتے رہو گے۔" نادیہ نے تو جیسے قسم ہی کھا رکھی تھی اسے سمجھانے کی، لیکن اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ بولتی ایک زناٹے دار تھپڑ کی آواز صحن میں گونجی تھی۔

"بس... ہر وقت کوستی رہتی ہے منحوس عورت تیری زبان کی وجہ سے یہ حال ہو گیا ہے۔ جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں ہے دفع ہو جا یہاں سے۔" ستائیس سالہ جوان مرد نے تھپڑ مار کے اپنی مردانگی دکھا دی تھی۔ نادیہ کو بھی اب عادت ہو گئی تھی تھپڑ کھانے کی، آج پھر وہ گالی گلوچ کرتا ہوا لوٹ گیا تھا۔ نادیہ سر تھام کے بیٹھ گئی تھی۔ اس نے بڑی حسرت سے سامنے پڑے کھانے کو دیکھا پھر اسد کو گلے لگائے کھانا واپس رکھ آئی، اس کی بھوک بھی اب مٹ چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

گلی کے کونے پہ رشید کی اک چھوٹی سی پرچون کی دکان تھی جس میں صابن سرف سے لے کر ضرورت زندگی کی کافی اشیا موجود تھیں۔ یہ دکان رشید کے ابا، ماجد کی واحد جائیداد تھی۔ وہ اپنے زمانے کے ایماندار اور نیک انسان تھے۔ ناپ تول کرتے تو پوری پکی صرف جائز قیمت ہی لیتے، آج کل کے دکانداروں کی طرح اپنا کمیشن نہ مارتے۔ سوا اپنے اکلوتے سپوت رشید کو بھی انہوں نے بچپن سے یہ ہی سکھایا تھا۔ آمدنی اتنی تھی نہیں کہ وہ رشید کو اعلا تعلیم دلواتے، رشید بھی نکما تھا جو آٹھویں کلاس سے ہی اسکول سے بھاگ گیا۔ ابا نے مار لگائی اماں نے جوتے مارے، مگر اس نے میٹرک نہ کر کے دیا اس کی اکلوتی بڑی بہن راشدہ نے نہ صرف اچھے نمبروں سے میٹرک کیا بلکہ

پورے گھر کو سلیقے سے سنبھالا کچھ اس کی اماں نفیسہ کی بھی پرورش اچھی تھی یوں رشید نے دکان سنبھال لی ابا کے ساتھ۔

راشدہ اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے اپنی دور پرے کی خالہ کے گھر بہو بن کے چلی گئی اب نہ رشید کی کوئی شکایت کرنے والا تھا نہ اس پہ نظر رکھنے والا۔ اماں بھی بیٹی کی شادی کے بعد بیمار رہنے لگی تھیں اور ابا ایک دن نماز کے لیے گئے تو کبھی واپس نہ آئے "ٹریفک کی اندھیر نگری کا شکار بن گئے۔ نفیسہ ڈھے سی گئیں، دکان کی پوری ذمہ داری رشید کے کندھوں پر آن پڑی ابا کا محلے میں نام تھا وہ ایماندار تھے سو بکری اچھی تھی گھر کا گزر بسر بست اچھا نہ سہی تنگ ہو جاتا تھا۔

ایسے میں پڑوس والی خالہ نے رشید کی شادی اپنی بھانجی نادیہ سے کرنے کا مشورہ دیا' وہ لوگ بھی غریب تھے کچھ نفیسہ نے بھی اعلا ظرفی دکھائی یوں ایک مہینے میں چند جوڑوں اور کچھ ضروری سامان کے ہمراہ نادیہ رشید کے سنگ آگئی۔ ساس نے گھرداری اور کفایت شعاری اسے بھی گھٹی کی طرح پلادی۔ ایک سال میں اسد بھی ان کی زندگی میں آگیا یوں پوتے کی خوشیاں دیکھ کے نفیسہ بھی دنیا سے رخصت ہو چلیں اور ان کے جانے کے بعد ہی رشید کا اصلی روپ نادیہ پہ آشکار ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

رشید نے ہزار ہزار کے دس نوٹ نادیہ کی جانب بڑھائے تھے۔ اماں کے جانے کے بعد اب گھر اسے ہی چلانا تھا۔

"یہ کیا دیا ہے تم نے مجھے۔" نادیہ نے نوٹ گن کے حیرت سے اس کی جانب دیکھا تھا۔

"کیوں تو کون ہوتی ہے سوال پوچھنے والی۔" رشید فوراً" تن کے کھڑا ہوا تھا اسے بس اسی بات کا غرور تھا کہ وہ مرد ہے اوپر سے نادیہ میٹرک پاس تھی اور وہ آٹھویں' وہ نہیں چاہتا تھا کہ نادیہ اس کے سر چڑھے بلکہ وہ اسے ہمیشہ اپنے آگے دبا کے رکھنا چاہتا تھا۔

"کیوں نہ پوچھوں سوال اماں کو تو پورے بارہ ہزار دیتا تھا پھر اس بار دس ہزار کیوں؟ اتنی مہنگائی ہے گھر کا خرچ بجلی کا بل کہاں سے ہو گا سب؟" اسے اس کی ساس نے سمجھایا تھا کہ رشید کم عقل ہے تم سمجھ داری

سے چلنا سو وہ تیار تھی۔

"مہنگائی ہو یا کچھ بھی جب گاہک نہیں آرہے تو آمدنی کہاں سے لاؤں اوپر سے تیری زبان درازیاں میں کہتا ہوں سنبھل جا کہیں تیرا ہر وقت کا کوسنا ہمیں سڑک پہ نہ لے آئے۔" وہ تن فن کرتا چیختا ہوا چلا گیا تھا یہ ان کا پہلا جھگڑا تھا اور اس کے بعد تو جیسے یہ روز کا معمول بن گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سوا سالہ شادی شدہ زندگی میں وہ پہلی بار یوں اکیلی پڑوس میں گئی تھی سامنے والی اسما کے ہاں قرآن خوانی اور میلاد تھا۔ یوں بھی وہ نمازی اور دین دار تھی جب ہی ہر وقت رشید کو سمجھاتی رہتی تھی کہ نماز پڑھ اپنی آخرت کی فکر کر جسے وہ سراسر بدزبانی اور بدتمیزی گردانتا تھا۔

"لو آگئی خیانت دار کی بیوی بڑی پرہیزگار بنتی ہے اور میاں اتنا ہی بے ایمان۔" اسے دیکھتے ہی ایک پڑوسن نے کافی اونچی آواز میں سرگوشی کی تھی اس کا چہرہ فوراً" اترا تھا۔

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ لوگ کیا کیا ہے میری میاں نے؟" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے الجھ بیٹھی تھی اسے کوئی الزام برداشت نہ تھا۔

"لو جی تمہیں نہیں پتا کیا کہ تمہارے میاں نے اپنے مرحوم ابا کا نام مٹی میں ملا دیا۔ وہ جتنے ایماندار تھے وہ اتنا ہی بے ایمان ہے۔ ہر چیز ناپ میں کم تول کے دیتا ہے۔ اب تو کوئی بھی اس کی دکان سے سامان نہیں خریدتا۔ میرے میاں سے تین دفعہ ادھار لے چکا ہے کہ دکان کا سامان ڈلوانا ہے بے چارے میرے میاں نے تمہارے سسر کا خیال کر کے دے دیا' مگر بھئی وہ تو ادھار لے کے ایسا غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ جب پیسے مانگو بہانہ حاضر اب تو ہمیں دیکھ کے راستہ ہی بدل لیتا ہے بتا ہے اب تو جوا بھی کھیلنے لگا ہے' پچھلی گلی کے آوارہ آدمیوں کے ساتھ۔" الفاظ تھے یا سیسہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اماں کے جانے کے بعد رشید اتنا گر جائے گا وہ مارے غم کے کچھ بول ہی نہ پا رہی تھی۔

"تو نادیہ تو فکر نہ کر پیار سے سمجھا اسے سارے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں بس تیرا تھوڑا زیادہ ہے تو لگام کھینچ کے رکھ اس کی۔" اسما کو اس سے ہمدردی تھی وہ فوراً" باتیں بن کے آگے بڑھی تھی' وہ بہ مشکل اپنے آنسو روک پائی اتنے میں اسد نے بھی حلق پھاڑ پھاڑ کے رونا شروع کر دیا تھا' سو وہ اس کی خرابی طبیعت کا بہانہ بنا کے فوراً" وہاں سے نکل آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"رشید تو کب سدھرے گا آج بتا ہی دے مجھے پورے محلے میں بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔" اس کے گھر لوٹتے ہی وہ اس پہ چڑھ دوڑی تھی۔

"کیوں اب کیا کر دیا میں نے؟" وہ فوراً" معصوم بنا تھا۔

"اتنا معصوم نہ بن' محلے سے ادھار لیتے تجھے شرم نہ آئی' ناپ تول میں کمی کرتے تجھے شرم نہ آئی اپنے ابا کا ہی خیال کر کتنا فخر تھا انہیں تجھ پہ۔" اس کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تیز ہو گیا تھا۔

"تجھے دکان داری نہیں آتی بیچ میں نہ بول اور کسی سے بھی ادھار لوں تجھے کیا؟ تیرا تو خرچہ پانی پورا ہو رہا ہے نا' زیادہ میرے مسئلے میں نہ بول کھانا دے جلدی بھوک لگی ہے۔" رشید کو اس کا بولنا پسند ہی نہ تھا اور نہ ہی اسے اپنی کوئی غلطی' غلطی لگتی تھی۔ وہ چیخ رہا تھا اس وقت نادیہ کو جوئے والی بات بولنا مناسب نہ لگا وہ بھی تن فن کرتی کھانا لینے چلی گئی۔

"آج پھر آلو کے چندے بنا لیے تو نے' پتا ہے نا مجھے نہیں پسند۔" سالن دیکھتے ہی وہ چیخا تھا۔

"تو تو آج آلو ہی دے کر گیا تھا۔" نادیہ کا جواب فوراً" حاضر تھا۔

"آلو کی بھی کافی چیزیں بن جاتی ہیں پراٹھے ہی بنا لیتی۔ جا اٹھا لے یہ سالن ساری بھوک کا ستیاناس کر دیا۔" وہ ایک بار پھر کھانے کی بے عزتی کر کے اٹھ کھڑا ہوا تھا یہ سوچے بنا کہ اگر یہی رزق اس سے روٹھ گیا تو وہ کیا کرے گا۔

گزرتے وقت کے ساتھ ان کے حالات مزید بدتر ہوتے چلے جارہے تھے۔ نادیہ کی دعائیں اس کی کوششیں سب بے کار ہوتی چلی جارہی تھیں۔ روز روز کی ہائے ہائے کل کل کبھی جان پر پڑتی تو کبھی مال پر۔ نادیہ کے ابا نے اسے ہلکی سی سونے کی بالیاں ہی چڑھائی تھیں غریب لوگ بھلا اس سے زیادہ اور دے بھی کیا سکتے تھے اک روز رشید چیختا دھاڑتا گھر میں آیا تھا اور ادھار چکانے کے بہانے نادیہ کی واحد ملکیت وہ بالیاں بھی چھین کے لے گیا تھا اس کے جوا کھیلنے کے قصے اب اور زیادہ سننے میں آرہے تھے۔

چھوٹی سی پرچون کی دکان اب فقط بچوں کی چیزوں کی دکان میں تبدیل ہوکے رہ گئی تھی آمدنی تھی نہیں سامان کہاں سے بھرواتا فقط ٹافیاں' پاپڑ اور بسکٹ ہی گئے تھے۔ اسد اب دو سال کا ہو چلا تھا شروع سے ہی وہ ماں کا دودھ پیتا تھا پیمپر وغیرہ کے اخراجات نادیہ اٹھا نہیں سکتی تھی سو اب اسد کے مستقبل کے لیے وہ اور زیادہ پریشان تھی اور ان سب کا قصوروار رشید نادیہ کو ہی گردانتا تھا۔

"جب سے اس گھر میں آئی ہے برکت اٹھ گئی ہے۔ ہر وقت منحوس زبان' ایک اماں تھیں گھر سلیقے سے چلاتی ایک تو ہے۔" اٹھتے بیٹھتے رشید کا یہی تکیہ کلام تھا۔ یہ نہ سوچتا کہ اماں کے دور میں خود کیسا تھا۔ اپنی حرکتوں کی وجہ سے سب برباد کیا بھلا مرد اپنی غلطی کب مانتا ہے۔ اسی دوران محلے کے پرانے موذن صاحب نے رشید کی دکان کے سامنے ہی پرچون کی دکان کھولی جو چند ہی دنوں میں اچھی خاصی چلنے لگی۔ موذن صاحب اس کے مرحوم ابا کے کافی پرانے دوست تھے۔ رشید ان لوگوں میں سے تھا جو دوسروں کی کامیابی سے جلتے تھے' وہ روز دکان دیکھتا اور کڑھتا گھر جاکے سارا غصہ نادیہ پہ اتارتا۔ وہ بھی برابر سے جواب دیتی یوں پورا محلہ ان کی لڑائی جھگڑوں کا گواہ بن گیا۔ اس روز بھی وہ رات گئے جوا کھیل کے گھر لوٹ رہا تھا کہ موذن

"کیا تم جانتے ہو تمہارے حالات ایسے کیوں ہوگئے؟" ان کے لہجے میں ایسا ٹھہراؤ و دبدبہ تھا کہ رشید نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں کھڑا ہوکے ان کی بات سننے لگا۔

"میری بیوی کی زبان درازی کی وجہ سے جب سے اماں گئی ہیں اس نے اپنی منحوسیت سے میرا کاروبار بند کرادیا ہے۔" موذن صاحب کو یقین نہیں تھا کہ رشید یوں روڈ پہ کھڑا ہوکے اپنی بیوی کی بے عزتی کرے گا۔

"اگر وہ ایسی ہوتی تو تمہاری امی جب حیات تھیں جب تو ایسا کچھ نہیں تھا۔ دیکھو رشید تم میرے بہت ہی عزیز دوست کے بیٹے ہو' میں نہیں چاہتا کہ تم کوئی بڑا نقصان اٹھاؤ' تالی ہمیشہ دونوں ہاتھ سے بجتی ہے۔ سامان بیچتے وقت ناپ تول میں کمی کرکے انسان زیادہ دیر تک منافع نہیں کما سکتا' کیوں کہ اگر تم بے جا کسی کا حق مارو گے تو وہ تمہارے پاس بھی نہیں رہے گا اور یہی ہوا آہستہ آہستہ تمہاری بکری ختم ہوتی گئی۔ تمہارے والد ایمان دار تھے جب ہی دنیا ان سے سامان خریدتی تھی۔ اسی ناپ تول کی کمی کی وجہ سے اللہ نے پچھلی قوموں پہ عذاب بھیجا۔ پھر تم کیسے محفوظ رہتے۔ یہاں تک کہ تم رزق کی عزت تک نہیں کرتے کیا میں نہیں جانتا کہ دال سبزی کو کس قدر حقارت سے دیکھتے ہو جب بھی دکان پہ کبھی تمہارا کھانا آتا تم وہ پھینک دیتے' باہر سے سموسے لے کے کھالیتے۔

دیکھو رشید! رزق کی عزت کرو گے تو وہ تمہاری عزت کرے گا ورنہ وہ تمہارے گھر سے اٹھ جائے گا اور یہ جو تم جوا کھیل رہے ہو سب سے بڑی نحوست یہی ہے۔ اللہ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے۔

"شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے آپس میں عداوت اور بغض ڈلوادے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ پس کیا ہو تم' باز رہنے والے

(سورۃ المائدہ آیت نمبر 91)

موذن صاحب کا انداز ایسا تھا کہ بات اس کے دل کو

لگی تھی وہ کچھ نہ جواب دیتے ہوئے گھر چلا گیا تھا۔ وہ پوری رات اس نے ان کی باتوں پہ غور کرتے ہوئے گزاری تھی۔

☆ ☆ ☆
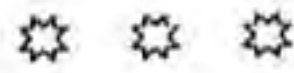
رات گئے وہ کسی کام سے واپس لوٹ رہا تھا کہ تیز ہوا کے تھپیڑے آندھی میں تبدیل ہونے لگے تھے۔ آسمان رات کی سیاہی میں بھی بادلوں سے گھرا اک دم سرخ ہو رہا تھا۔ اس کے پاس نہ گاڑی تھی نہ کوئی اور سواری وہ بس سے اسٹاپ پہ ہی اتر گیا تھا بس اسٹاپ سے گھر تک کا فاصلہ تقریباً" بیس منٹ کا تھا۔ اس وقت گلیاں کافی سنسان تھیں۔ دور تک کوئی انسان نظر نہیں آرہا تھا۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اور موسم کی تبدیلی اس کی روح فنا کرنے لگی تھی۔ اس کے قدم اب کافی تیز ہو چکے تھے آندھی بھی اب تیز ہونے لگی تھی اس سے پہلے کہ تند و تیز ہوا کے جھونکے سب کچھ اکھاڑ پھینکتے' بادل بہت زور سے برسنے لگے تھے جل تھل اتنی تھی کہ کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

وہ اب تقریباً" بھاگنے لگا تھا تنگ گلیوں میں پانی کا بہاؤ اور اس کا جمع ہونا کسی اذیت سے کم نہ تھا۔ کڑاکے دار بجلی کی چمک نے اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر ڈالے تھے اس سے پہلے کہ وہ مزید بھاگتا کوئی چیز اس کے پاؤں سے لپٹی تھی۔ جوں ہی بجلی کی چمک اس کے پاؤں پہ پڑی بڑا سا سانپ اپنے پاؤں سے لپٹا دیکھ کے اس کی دل خراش چیخ فضا میں گونجی تھی۔

"یا اللہ مجھے بچالے۔" پسینے میں شرابور آواز میں اس نے کہا تھا انسان چاہے کتنا ہی گناہ گار ہو وقت مصیبت میں صرف اللہ کو پکارتا ہے۔

"کیا ہوا آپ ٹھیک تو ہیں۔" نادیہ نے قرآن شریف بند کر کے اس کی جانب دیکھا' فجر کی اذان ہو چکی تھی۔

"نہیں..... کچھ نہیں۔" رشید کو یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے آس پاس پرانا منظر دیکھ کے اس کے کچھ اوسان بحال ہوئے تھے نادیہ پھر قرآن شریف کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"اور جو کوئی خدا سے ڈرے گا۔ وہ اس کے لیے (رنج و محن سے) مخلصی کی صورت پیدا کر دے گا۔ اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے (وہم) گمان بھی نہ ہو اور جو خدا پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کی کفایت کرے گا خدا اپنے کام کو (جو وہ کرنا چاہتا ہے) پورا کر دیتا ہے خدا نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔"

(سورۃ الطلاق آیت ۲،۳)

سورۃ الطلاق کی آیت نمبر ۲ اور ۳ بمعہ ترجمہ اس نے بلند آواز میں تلاوت کی تھی رشید کا دل کسی نے جکڑ لیا تھا۔

"تو کیا مولوی صاحب ٹھیک کہہ رہے تھے میں ہی غلط تھا کیا۔" اس نے خود کلامی کی تھی پھر ایک ایک کر کے اسے اپنی تمام کوتاہیاں یاد ہو چلی تھیں ہدایت کے لیے اک لمحہ ہی کافی ہوتا ہے جو اسے اللہ نے نصیب کر دیا تھا۔ اس نے بستر چھوڑ کے وضو کیا نماز پڑھی خوب گڑگڑا رب ﷻ سے معافی مانگی۔ بچپن کے بعد آج اس نے نماز پڑھی تھی۔ نادیہ کے لیے یہ منظر عید سے کم نہ تھا نماز پڑھ کے وہ نادیہ کے پاس آیا تھا۔

"مجھے معاف کر دو نادیہ..... میں گناہ گار ہوں غلط تھا۔ مجھے ایک موقع دو میں اپنے تمام گناہوں کا کفارہ ادا کروں گا' سب ادھار چکاؤں گا۔ تمہاری وہ بالیاں بھی تمہیں لادوں گا کبھی کھانے میں نقص نہیں نکالوں گا بس تم میرا ساتھ دے دو۔" سچے دل سے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا وہ اس کے سامنے دست دراز تھا۔

"مجھے بھی معاف کر دیں آئندہ کبھی تیز آواز میں بات نہیں کروں گی غلطی میری بھی تھی۔" رشید کے ہاتھ پر اس نے بڑی محبت سے اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا دونوں کی آنکھوں میں سکون و اطمینان اتر چلا تھا اس ایک لمحہ نے رشید اور نادیہ دونوں کی زندگی پر سکون کر ڈالی تھی۔

کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

خواہشات

خواہشیں انسان پر غلبہ پالیں تو انسان سیدھے رستوں کی پہچان کھو دیتا ہے اور غلط راستوں پر چلنے والوں کو فقط رسوائی اور جگ ہنسائی ملتی ہے۔

(سائرہ رضا۔ اب کر میری رفوگری)

ثریا شاہ۔ کھڈوریکا

ماں

لوگ کہتے ہیں مائیں معاف کر دیتی ہیں' انہیں معاف کرنا ہی پڑتا ہے کیونکہ وہ اس محبت کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہیں جو وہ اپنی اولاد سے کرتی ہیں ماں وہ تختی ہے جس پر اولاد کچھ بھی لکھ سکتی ہے' مگر ماں صرف محبت لکھتی ہے۔

(سمیرا حمید۔ حیات ممکن ہے)

فوزیہ ثمروٹ۔ گجرات

ظالم امتحان

کوئی مانے یا نہ مانے ہم تو یہی کہیں گے کہ بچہ پیدائش کے وقت صرف اس لیے روتا ہے کہ اب اسے اس ظالم دنیا میں نازل ہونے کی پاداش میں کئی امتحان دینے پڑیں گے۔ تعلیمی امتحان غالباً" واحد مصیبت ہے جو بتا کر آتی ہے۔ جوں جوں امتحان کا وقت قریب آتا جاتا ہے نبض تیز اور سانسیں اکھڑنا شروع ہو جاتی ہیں جیسے وقت نزع آن پہنچا ہو۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہماری موت کا ٹائم ٹیبل نہیں دیا ورنہ بندہ ہر وقت الٹی گنتی گنتا رہتا ہے۔ موت تو خیر سب کو آتی ہے مگر اس جینے کا کیا کیجیے جس میں ہر گھڑی امتحان ہو' ویسے بھی روز جینا اور روز مرنا خاصا مشکل کام ہے۔ امتحان کے دنوں میں ان لوگوں پر خاص غصہ آرہا ہوتا ہے جو گدھے گھوڑے سب بیچ کر سو رہے ہوتے ہیں یہ غصہ رفتہ رفتہ حسرت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر یہ حسرت یوں شعر میں ڈھل جاتی ہے۔

ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں
جب سارا عالم سوتا ہے

(ڈاکٹر محسن۔ انکھیلیاں)

حرا قریشی۔ بلال کالونی ملتان

پاسا

زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے' جب آپ اپنا سارا دماغ ساری طاقت' ساری ترکیبیں اور ساری صلاحیتیں صرف کر چکے ہوتے ہیں اور پاسا پھینک چکے ہوتے ہیں۔ اس وقت سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور آپ کچھ نہیں کر سکتے۔

(اشفاق احمد۔ بابا صاحبا)

طاہرہ ملک' رضوانہ ملک۔ جلال پور پیروالا

خالق

وہ نیکیاں دیکھ کر تھوڑی دیتا ہے۔ وہ تو ان کو بھی دیتا ہے جو اس کا نام تک نہیں لیتے اور ایسوں کو بھی جو ساری عمر کسی کا بھلا نہیں سوچتے۔ وہ اگر نیکیوں کو حساب سے تول کر دینے لگ پڑتا تو کسی کو کچھ بھی نہ ملتا۔ مخلوق بھلا خالق کو کیسے کچھ لوٹا سکتی ہے۔ اس نے ہاتھ پاؤں' آنکھیں' جسم کے سارے عضو دیے ہیں۔ وہ کوئی ہماری نیکیوں کا اجر نہیں ہے۔ دن میں کتنی بار سانس لیتے ہیں ہم' اگر ایک نیکی کے بدلے ایک سانس ہوتو بتائیں ہم کیسے پورے اترتے۔

(بشریٰ سعید۔ رقص جنوں)

ام ہانیہ عمران۔ گجرات

تلافی

آگہی کے لمحے انسان پر بالکل اچانک وارد ہوتے ہیں اور تب وہ خود پر حیران اور متاسف ہوتا ہے اس لیے کہ وقت کی ڈور کبھی تو ہاتھ آجاتی ہے اور کبھی اتنا وقت بیت چکا ہوتا ہے کہ مداوے کا یا تلافی کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔

(آسیہ مرزا۔۔۔ یہ جفائے غم کا چارہ)
ثریا راجپوت۔۔۔ ضلع ننکانہ صاحب

زندگی

زندگی میں ایک چیز ہوتی ہے جسے کمپرومائز کہتے ہیں۔ پرسکون زندگی گزارنے کے لیے ان کی بہت ضرورت پڑتی ہے۔ جس چیز کو تم بدل نہ سکو اس کے ساتھ کمپرومائز کرلیا کرو مگر اپنی کسی خواہش کو کبھی بھی جنون مت بنانا۔ کیونکہ زندگی میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمیں کبھی نہیں مل سکتیں، چاہے ہم روئیں یا چلائیں بچوں کی طرح آنکھیں رگڑیں وہ کسی دوسرے کے لیے ہوتی ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ زندگی میں ہمارے لیے کچھ ہوتا ہی نہیں۔ کچھ نا کچھ ہمارے لیے بھی ہوتا ہے۔

(عمیرہ احمد۔۔۔ امربیل)
فائزہ بھٹی۔۔۔ پتوکی

قومی ترانہ

میرے حافظے میں بھینس کے بارے میں ایک ایسا واقعہ بھی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ اس جانور کی نسبت سے مصیبت اور پریشانی میں ذہنی سکون بھی حاصل ہوسکتا۔

1928 میں برطانیہ میں مقیم ہندوستانی طلبا نے ایک ہاکی ٹیم بنائی اور یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں میچ کھیل کر انگریزوں کو آج کل کی طرح ایک دو گول سے نہیں بلکہ درجنوں گولوں سے ہرایا اس فاتحانہ دورے میں بارسلونا میں جو میچ ہوا اس میں ہمارے وطن کے اس بھاری بھرکم دودھ دینے والے جانور (بھینس) نے ایک ناقابل فراموش کردار ادا کیا کہ ہماری عزت کو دیار غیر میں بھیس میں لٹنے سے بچالیا۔

ہوا یوں کہ میچ ہونے سے پہلے منتظمین نے ہماری ٹیم سے خواہش کی اپنا قومی ترانہ پیش کریں۔ اس وقت ہمارا قومی ترانہ کہاں تھا جو پیش کرتے اور اگر "گاڈ سیو دی کنگ" والا ترانہ گاتے تو خود نکو بن جاتے۔ ٹیم والے بے بسی کے عالم میں حیران و پریشان کھڑے تھے کہ اچانک ان میں سے ایک منچلے نے یہ گانا شروع کردیا۔

"میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا
وہ روز چرن کو جاتی تھی اور
پیٹ بھرن کو آتی تھی
مری بھینس کے ڈنڈا کیوں مارا
کیوں مارا

ہماری ٹیم نے اس کے ساتھ گانا شروع کردیا۔ ہزاروں تماشائی بڑے احترام سے سن رہے تھے اور ہم لوگوں کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ اس طرح بھینس کے حوالے سے ہمارا قومی بھرم قائم رہا۔

(نواب مشتاق۔۔۔ احمد خان)
اقصی مریم ملغانی۔۔۔ اسوہ مریم ملغانی۔۔۔ کوئٹہ

بچپن

جب ہم چھوٹے تھے ہمیں بڑے ہونے کا انتظار کرنا مشکل لگتا تھا لیکن اب جب کہ ہم بڑے ہوگئے تو ہمیں احساس ہوا کہ ٹوٹے کھلونے اور زخمی گھٹنے، ٹوٹے دلوں اور زخمی جذبات سے بہتر ہیں۔

(عنیزہ سید۔۔۔ آئیں گے ایک روز ابر باراں)
ثنا شہزاد۔۔۔ کراچی

دنیا

میرے رب نے "دنیا" کو بہت محبت سے تخلیق کیا ہے، اسے محبت نہیں دے سکتے، مت دیں اس کی عزت تو کریں۔ یہ بھی اللہ سے منسوب ہے اور جو چیزیں اللہ سے منسوب ہوتی ہیں ان کی عزت کی جاتی ہے، انہیں نفرت سے دیکھنا کمتر سمجھنا یا حقیر گردانا انسان کو جچتا نہیں۔

(تنزیلہ ریاض۔۔۔ عہد الست)
سیدہ نسبت زہرا۔۔۔ کھوڑ ویکا

☆ ☆

شعلہ عزیز

دوران حج وفات

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے کہ ایک شخص جو احرام باندھے ہوئے تھا' اونٹ سے گرا اور گردن ٹوٹ جانے کی وجہ سے فوت ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اسے بیری کے پتوں اور پانی سے غسل دے دو اور انہی کپڑوں میں کفن دے دو اور اس کا سر نہ ڈھکو کیونکہ قیامت کے دن یہ اسی طرح تہلیل یا تلبیہ کہتے ہوئے اٹھایا جائے گا۔" 838

(جامع ترمذی شریف)

گناہوں کا اعتراف

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ایک آدمی گناہ کرتا ہے' پھر کہتا ہے کہ پروردگار! مجھ سے گناہ کا ارتکاب ہوا' مجھے معاف فرما دے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے گناہ کا کام کیا اور اسے یقین ہے کہ اس کا کوئی رب بھی ہے جو گناہوں کو معاف فرماتا ہے یا ان پر مواخذہ فرماتا ہے۔ میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو تین مرتبہ مزید دہرایا کہ بندہ پھر گناہ کرتا ہے اور حسب سابق اعتراف کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ حسب سابق جواب دیتا ہے' چوتھی مرتبہ آخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے کو یقین ہے کہ اس کا کوئی رب بھی ہے جو گناہوں کو معاف فرماتا یا ان پر مواخذہ فرماتا ہے' میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا۔" 9245

(مسند احمد بن حنبل)

رشیدہ فیض۔۔۔ جام پور

تین کام

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔
تین کام ایسے ہیں جن کو کرنے سے ابن آدم کے سارے کام قابو میں آجائیں گے۔

1۔ تم اپنی مصیبت کا کسی سے شکوہ نہ کرو اور اپنی بیماری کسی کو مت جتاؤ۔
2۔ اپنی زبان سے اپنی خوبیاں بیان نہ کرو۔
3۔ اپنے آپ کو مقدس اور پاکیزہ نہ سمجھو۔

رضوانہ وسیم۔۔۔ میاں چنوں

سنہری باتیں

☆ مشکلوں سے لڑنا نہیں بلکہ سنبھل کر گزرنا سیکھو ورنہ آپ کی شخصیت تباہ ہو جائے گی۔
☆ کوئی بھی انسان پوری دنیا کے لیے نہیں جیتا' بلکہ کچھ خاص لوگوں کے لیے جیتا ہے جو اس کی ساری دنیا ہوتے ہیں۔
☆ عزت دل میں ہونی چاہیے لفظوں میں نہیں اور ناراضی لفظوں میں ہونی چاہیے دل میں نہیں۔
☆ ماں باپ کی نافرمانی موت سے پہلے موت کا اعلان ہے۔
☆ ایسی غربت پر صبر کرنا جس میں عزت محفوظ ہو' اس امیری سے بہتر ہے جس میں ذلت و رسوائی ہو۔

☆ راستہ پوچھنے سے شرم نہ کرو ورنہ منزل بھٹک جاؤ گے۔

☆ کثرت کی آرزو ہمیشہ دکھی کرویتی ہے۔

☆ وہ شخص کامیاب نہیں ہوپاتا جس میں ناکامی کا خوف کامیابی کی چاہت سے زیادہ ہو۔

☆ اپنی زبان کو سلام کرنے کا عادی بنالو اس سے دوست بڑھتے ہیں اور دشمن کم ہوتے ہیں۔

☆ اپنے رب پر بھروسہ رکھو کیونکہ اللہ وہ نہیں دیتا جو ہمیں اچھا لگتا ہے بلکہ اللہ وہ دیتا ہے جو ہمارے لیے اچھا ہوتا ہے۔

ایمان علی۔۔۔ پھول نگر

علم کی قیمت

امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے صاحبزادے حماد نے سورۃ فاتحہ ختم کرلی تو امام رحمتہ اللہ علیہ نے معلم کو ایک ہزار درہم عطا کیے معلم نے امام رحمتہ اللہ علیہ سے کہا۔

"میں نے ایسا کون سا بڑا کام کیا ہے کہ اتنی بڑی رقم آپ نے عطا فرمادی؟"

امام رحمتہ اللہ علیہ نے معلم کو جواب دیا۔

"تم نے میرے بچے کو جو کچھ سکھایا ہے اسے حقیر مت سمجھو۔ خدا کی قسم! اگر میرے پاس اس سے زیادہ رقم ہوتی تو میں بے تامل وہ بھی دے ڈالتا۔"

نصرت مختار۔۔۔ کراچی

بکھرے ہر سو خوشبو

☆ ہم جتنا اسلحہ اکٹھا کرچکے ہیں اگر ہم اتنے پھول اکٹھے کرتے تو دنیا مہک جاتی۔

☆ اگر دنیا میں کوئی محبت کرنے والا باقی نہ رہے تو سورج اپنی حرارت کھو بیٹھے۔

☆ گل داؤدی ایسے موسموں میں کھلتا جب کوئی اور پھول نہیں کھلتا سچا دوست بھی ایسے موسموں میں ساتھ دیتا ہے جب کوئی اور ساتھ نہیں دیتا۔

☆ انسان سارے درندوں سے خطرناک ہے شاید ہی کوئی ایسا درندہ ہو جو اپنی جنس کو چیرتا پھاڑتا ہو۔

☆ اچھی کہانی وہ ہوتی ہے جو تمہیں یہ محسوس کرائے کہ اس کے کردار تم بھی ہوسکتے ہو۔

☆ اپنے چند لمحوں کی خوشی کے لیے کسی کے لبوں کی مسکراہٹ کبھی نہ چھینو۔

☆ وقت ایک لہر کی مانند ہے اسے ضائع مت کرو۔

☆ سب سے بدنصیب شخص وہ ہے جس کے ڈر سے لوگ اس کی عزت کریں۔

ارم رحمن۔۔۔ کھلابٹ ٹاؤن شپ

اچھی اور نیک بیوی

علماء نے لکھا ہے کہ نیک بیوی کے اندر چار صفات ہوتی ہیں۔

1۔ اس کے چہرے پر حیا ہو۔ انسان کے چہرے پر خوب صورتی سرخی پاؤڈر سے نہیں بلکہ حیا سے آتی ہے۔ جس کے چہرے پر حیا ہو۔ اللہ رب العزت اس کے چہرے کو پرکشش بنادیتے ہیں۔

2۔ زبان کے اندر شیرینی ہو۔ یعنی نرم بولنے والی ہو۔ جب خاوند سے بات کرے تو نرم لہجے میں کرے۔ جب نامحرموں سے بات کرنا پڑجائے تو آواز اور لہجے میں سختی اور بے گانگی ہو۔ اور خاوند سے بات کرے تو بے حد نرمی ہو۔

3۔ عورت کے ہاتھ میں ہر وقت کام میں لگے رہتے ہوں (یعنی عورت گھر، بچوں اور خاوند کے کام کاج میں لگی رہے۔)

4۔ اس کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہو۔ جب یہ محبت ہوگی تو ان کے ارشادات کے مطابق ضرور خاوند سے بھی محبت ہوگی اس کی اطاعت شعار ہوگی۔

فوزیہ ثمرہ بٹ۔۔۔ گجرات

☆ ☆

بُشریٰ محمود

روبینہ صدف، کی ڈائری میں تحریر

خلیل فاروقی کی غزل

تمہاری بھیگتی پلکوں سے میں نے بارہا پوچھا
کہ دل کے کھیل میں جیتنے والے بھی رہتے ہیں

وہ جن کی چشم خود بین کو دیکھا نہیں کرتی
بھلا کس دل کے غم کے تار میں موتی پروتے ہیں

تمہاری بھیگتی پلکوں سے میں نے بارہا پوچھا
کہ جلنے اور جلانے میں بھلا کیا لطف آتا ہے

بس اک جھوٹی انا کے واسطے برباد ہو جانا
خودی کے زعم میں انسان کتنے دکھ اٹھاتا ہے

فرحت جبیں، کی ڈائری میں تحریر

سعداللہ شاہ کی غزل

مجھے کچھ اور کہنا ہے،

وہ کچھ سنتا تو میں کہتا، مجھے کچھ اور کہنا تھا
وہ پل بھر کو جو رک جاتا، مجھے کچھ اور کہنا تھا

غلط فہمی نے باتوں کو بڑھا ڈالا یونہی ورنہ
کہا کچھ تھا، وہ کچھ سمجھا، مجھے کچھ اور کہنا تھا

کمائی زندگی بھر اس کے نام کیوں کر دی
مجھے کچھ اور کرنا تھا، مجھے کچھ اور کہنا تھا

کہاں اس نے سنی میری، سنی بھی ان سنی کر دی
اسے معلوم تھا اتنا، مجھے کچھ اور کہنا تھا

رواں تھا پیار نس نس میں، بہت قربت تھی آپس میں
اسے کچھ اور سننا تھا، مجھے کچھ اور کہنا تھا

صبا ایشال، کی ڈائری میں تحریر

فیضان عارف کی غزل

محبتوں میں ہر اک لمحہ وصال ہوگا یہ طے ہوا تھا
بچھڑ کے بھی ایک دوسرے کا خیال ہوگا یہ طے ہوا تھا

یہ کیا سانسیں اکھڑ گئی ہیں سفر کے آغاز سے ہی یارو
کوئی بھی تھک کر نہ راستے میں نڈھال ہوگا یہ طے ہوا تھا

وہی ہوا نا بدلتے موسموں میں تم نے ہم کو بھلا دیا
کوئی بھی رت ہو نہ چاہتوں کو زوال ہوگا یہ طے ہوا تھا

جدا ہوئے ہیں تو کیا ہوا پھر یہی تو دستور زندگی ہے
جدائیوں میں نہ قربتوں کا ملال ہوگا یہ طے ہوا تھا

چلو کہ فیضان کشتیوں کو جلا دیں گمنام ساحلوں پر
اب یہاں سے نہ واپسی کا سوال ہوگا یہ طے ہوا تھا

نصرت جبیں، کی ڈائری میں تحریر

ناصر کاظمی کی غزل

رد نقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ
لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ

اب کی فصل بہار سے پہلے
رنگ تھے گلستان میں کیا کیا کچھ

کیا کہوں اب تمہیں خزاں والو
جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ

دل ترے بعد سو گیا ورنہ
شور تھا اس مکاں میں کیا کیا کچھ

رضوانہ وسیم، کی ڈائری میں تحریر
احمد فراز کی غزل

قربت بھی نہیں دل سے اتر بھی نہیں جاتا
وہ شخص کوئی فیصلہ کر بھی نہیں جاتا

آنکھیں ہیں کہ خالی نہیں رہتی ہیں لہو سے
اور زخم جدائی ہے کہ بھر بھی نہیں جاتا

ہم دوہری اذیت کے گرفتار مسافر
پاؤں بھی ہیں شل، شوق سفر بھی نہیں جاتا

دل کو تری چاہت پہ بھروسا بھی بہت ہے
اور تجھ سے بچھڑ جانے کا ڈر بھی نہیں جاتا

پاگل ہوئے جاتے ہو فراز اس سے ملے کیا
اتنی سی خوشی سے کوئی مر بھی نہیں جاتا

فائزہ محمد زبیر خان، کی ڈائری میں تحریر
قتیل شفائی کی نظم

سب دل رکھنے کی باتیں ہیں
سب اصلی روپ چھپاتے ہیں
اخلاق سے عاری لوگ یہاں
لفظوں کے تیر چلاتے ہیں

ہم خوشبو کے سوداگر ہیں
اور سچا سودا کرتے ہیں

جو گاہک خود پھولوں جیسا ہو
ہم بن داموں بک جاتے ہیں

ہم شہر وفا کے لوگوں کا
تم حال بھلا کیا جانو گے

ہم دل کا درد چھپاتے ہیں
اور آنسو تک پی جاتے ہیں

مدیحہ نورین مہک، کی ڈائری میں تحریر
کیفی اعظمی کی غزل

کی ہے کوئی حسین خطا ہر خطا کے ساتھ
تھوڑا سا پیار بھی مجھے دے دو سزا کے ساتھ

گر ڈوبنا ہی اپنا مقدر ہے تو سنو
ڈوبیں گے ہم ضرور مگر ناخدا کے ساتھ

منزل سے وہ بھی دور تھا اور ہم بھی دور تھے
ہم نے بھی دھول اڑائی بہت رہنما کے ساتھ

رقص صبا کے جشن میں ہم تم بھی ناچتے
اے کاش تم بھی آ گئے ہوتے صبا کے ساتھ

ایسا لگا غریبی کی ریکھا سے ہوں بلند
پوچھا کسی نے حال کچھ ایسی ادا کے ساتھ

شگفتہ سلیمان

نمرہ، اقرا ـــــ کراچی

نہ منزلوں کو نہ ہم رہ گزر کو دیکھتے ہیں
عجب سفر ہے کہ بس ہم سفر کو دیکھتے ہیں
ہماری دربدری کا یہ ماجرا ہے کہ ہم
مسافروں کی طرح اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

مدیحہ نورین مہک ـــــ برنالی

ہتھیلی پر رکھے پھولوں پہ جو آنسو گرے تھے
ہم اپنے دل میں ان کی حکمرانی سن رہے تھے
گزرتی عمر کے ہر ایک لمحے کی زبانی
محبت رائیگانی! رائیگانی سن رہے تھے

فوزیہ ثمریٹ ـــــ گجرات

کوئی تو بات ہے اس میں فیض
ہر خوشی جس پر لٹا دی ہم نے

روبینہ یاسمین ـــــ بھائی پھیرو

مجھ سے مخلص نہ واقف میرے جذبات سے تھا
اس کا رشتہ تو فقط اپنے مفادات سے تھا
اب جو بچھڑا ہے تو کیا روئیں جدائی پہ تیری
یہ اندیشہ تو ہمیں پہلی ملاقات سے تھا

طاہرہ ملک، رضوانہ ملک ـــــ جلال پور پیر والا

آؤ آنکھوں سے بات کرتے ہیں
لفظ مطلب بگاڑ دیتے ہیں

ایم۔آر۔کے ـــــ مظفر گڑھ

میں نے جب بھی پیار مانگا مجھے نفرتیں ملی ہیں
جسے ساری دنیا ترسے مجھے ایسا پیار دے دو
تیرے ساتھ کھیلنی ہے مجھے زندگی کی بازی
میں کبھی نہ جیت پاؤں مجھے ایسی ہار دے دو

روبی ـــــ کراچی

دوستی ان سے ہو گئی ہے عدم
جن کی ہر بات کاروباری ہے

مہر ـــــ کراچی

کس دل میں کیا چھپا ہے
صرف خدا جانتا ہے
دل اگر بے نقاب ہوتے
سوچو کتنے فساد ہوتے

عائشہ ـــــ گوجرہ

ادھورا لفظ ہوں میں، سنو تکمیل چاہیے
جہاں سے تم نے چھوڑا تھا وہیں سے مکمل مجھ کو

عذرا ناصر ـــــ کراچی

تم نے کیسا یہ رابطہ رکھا
نہ ملے ہو نہ فاصلہ رکھا
تو نہ رسوا ہو اس لیے ہم نے
اپنی چاہت پہ دائرہ رکھا

اقصیٰ ناصر ـــــ کراچی

اسے کہو بہت نامراد شے ہے جنوں
اسے کہو مجھے ہے بہت جنوں اس کا

اریبہ شمشاد، منیبہ شمشاد ـــــ باغ

میں تمہیں بھول جاؤں گا لیکن یہ شرط ہے
گلشن میں چل کر پھول کو خوشبو سے جدا کرو

فرحین ظفر، بینا ظفر، شاہدہ ظفر ـــــ کراچی

محبت میں خسارہ کر لیا ہے
تیرے دکھ کو گوارا کر لیا ہے

نازش ریحان ـــــ کراچی

کبھی تو نے خود بھی سوچا کہ یہ پیاس ہے تو کیوں ہے
تجھے پا کے بھی میرا دل جو اداس ہے تو کیوں ہے
مجھے کیوں عزیز تر ہے یہ دھواں دھواں سا موسم
یہ ہوائے شام ہجراں مجھے راس ہے تو کیوں ہے

فائزہ محمد زبیر خان ـــــ کراچی

زبردستی سے جب بیٹیاں بٹھائی جاتی ہیں ڈولی میں
جنازے ان کو کہتے ہیں وہ باراتیں نہیں ہوتیں

فائزہ بھٹی ___ پتوکی

روز آجاتی ہے میرے پاس تسلّی دینے
شبِ تنہائی بتا تو میری کیا لگتی ہے

آسیہ جاوید ___ علی پور چٹھہ

وہ بات کیوں کریں جس کی خبر ہی نہ ہو
وہ دعا کیسے کریں جس کا اثر ہی نہ ہو
کیسے کہہ دوں تمہیں لگ جائے میری عمر
کیا پتا اگلے پل میری عمر ہی نہ ہو

حورین زینب ___ کہروڑ پکا

بہت حفاظت سے رکھا ہے ان چراغوں کو
بجھنے بجھنے بھی ہواؤں سے الجھ پڑتے ہیں
دیکھ فرعون کے لہجے میں بات نہ کر
ہم تو پاگل ہیں خداؤں سے الجھ پڑتے ہیں

روزینہ نعیم ___ گوجرانوالہ

میری آوارگی میں کچھ دخل ہے تمہارا بھی محسن
تمہاری یاد آتی ہے تو گھر اچھا نہیں لگتا

یاسمین ملک ___ کراچی

اب نہ صورت ہے نہ وہ عکس گری ہے مجھ میں
خشک دریا کی طرح ریت بھری ہے مجھ میں

حنا کرن ___ بھلوال بھیرہ

پیار تو ان کو بھی ہم سے ہے مگر جانے کیوں
ہم کریں بات تو وہ بات بدل جاتے ہیں
آرزو یہ ہے کہ اظہارِ محبت کر دیں
لفظ چنتا ہوں تو لمحات بدل جاتے ہیں

رضوانہ ملک، طاہرہ ملک ___ جلال پور پیر والا

تو کیا یہ طے ہے کہ اب عمر بھر نہیں ملنا
تو پھر یہ عمر بھی کیوں تم سے گر نہیں ملنا

رفعت جبیں ___ ملتان

اب نہ وہ صورت ہے نہ عکس گری ہے مجھ میں
خشک دریا کی طرح ریت بھری ہے مجھ میں

کشور منیر ___ کراچی

اناؤں، نفرتوں، خود غرضیوں کے ٹھہرے پانی میں
محبت گھولنے والے بڑے درویش ہوتے ہیں

ناہید راشد ___ کراچی

سفرِ زندگی کا اب ہوا ختم سمجھو نادان!
کہ اس کے رویوں سے اب جدائی کی مہک آتی ہے

صبا سلیم ___ کراچی

غضب کا پیار تھا اس کی اداس آنکھوں میں
غم تک نہ ہوا کہ وہ چھوڑنے والا ہے

ادیبہ ___ کراچی

اسے کہنا جفت اور طاق کا ہمیں کوئی ہم سے وابستہ
ہمیں جب بھی لگی ضرب لگی تقسیم ہوئے بکھر گئے

حنیفہ، مہوش ___ اٹک

وہ انکار کرتے ہیں اقرار کے لیے
نفرت بھی کرتے ہیں پیار کے لیے
الٹی چالیں چلتے ہیں یہ دیوانگانِ عشق
آنکھوں کو بند کرتے ہیں دیدار کے لیے

یاسمین کنول ___ پسرور

گفتگو کیجیے کہ نعمتِ انساں ہے شکیب
جالے لگ جاتے ہیں جب بند مکان ہوتا ہے

تانی چوہدری ___ آکسفورڈ یو کے

دھوپ میں ہو جو چھاؤں کی طرح
ایسا اک مہربان تلاش کریں
پیار کے پھول جس میں کھلتے رہیں
چاہتوں کا جہاں تلاش کریں

سونیا ربانی ___ قاضیاں محلہ بالا

ہوا چلی تو خوشبو میری بھی پھیلے گی !!
میں چھوڑ آئی ہوں درختوں پہ اپنے ہاتھ کے رنگ

صائمہ سلیم سندھو ___ گوجرہ

ناشناسا کی طرح جو آج ملتا ہے مجھے
اک تعلق سا کبھی اس کو میری ذات سے تھا

خورشید مقبول ___ کھیوڑہ

کتنے بے درد ہیں تیرے قید خانے کے محافظ ساقی
آنکھ لگتی ہے تو زنجیر ہلا دیتے ہیں

==

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

فرائیڈ جھینگے

اشیا:

جھینگے (بڑے سائز کے)	1/2 کلو
انڈے (پھینٹ لیں)	2 عدد
میدہ	1/2 کپ
کارن فلور	1/2 کپ
نمک	حسب ذائقہ
سویا سوس	2 کھانے کے چمچے
پانی	1/2 کپ
سیاہ مرچ (کٹی ہوئی)	ایک کھانے کا چمچہ
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت (فرائی کے لیے)

ترکیب:

انڈے پھینٹ کر اس میں سویا سوس، پانی، نمک، کٹی ہوئی سیاہ مرچ، میدہ، کارن فلور اور بیکنگ پاؤڈر مکس کرلیں۔ جھینگوں کو دھو کر چھلنی میں رکھ کر پانی خشک کرلیں۔ فرائی پین میں تیل ڈال کر گرم ہونے کے لیے رکھ دیں۔ جھینگوں کو آمیزے میں ڈبو کر تل لیں۔ براؤن ہوجائے تو ٹشو پیپر پر رکھ دیں۔ سلاد اور کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

کرسپی کارن فرائیڈ فش

اشیا:

مچھلی کے بڑے ٹکڑے بنوالیں	ایک کلو
انڈے	دو عدد
کارن فلور	چار کھانے کے چمچے
کارن فلیکس کو توڑلیں	Coat کرنے کے لیے
	حسب ضرورت
تیل	تلنے کے لیے
پانی	125ml
لیموں کا رس	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
اجوائن پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
کالی مرچ پاؤڈر	1/2 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

تیل چار کھانے کے چمچ

ترکیب :

لیموں کا رس، ہلدی، لال مرچ، ادرک، لہسن، اجوائن، کالی مرچ، نمک اور چار کھانے کے چمچ تیل کو ایک ساتھ اچھی طرح مکس کرلیں۔ اب مچھلی پر اس مکسچر کو لگا کر تین گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اب انڈا، نمک، کارن فلور اور پانی سے مکسچر بنالیں۔ مچھلی کو اس مکسچر میں ڈبو کر کارن فلیکس سے Coat کرکے گرم تیل میں گولڈن براؤن ہونے تک ڈیپ فرائی کرلیں۔

ڈھاکہ ناریل گوشت

اشیا :

گوشت	ایک کلو (گول بوٹیاں)
گھی یا مکھن	پچاس گرام
(چار کھانے کے چمچ)	
پیاز	دو عدد (باریک کٹی ہوئی)
پسا ہوا لہسن	دو کھانے کے چمچ
ادرک	دو انچ کا ٹکڑا (باریک کٹی ہوئی)
ہلدی	ڈیڑھ چائے کا چمچ
پسی ہوئی سرخ مرچ	دو چائے کے چمچ
پسی ہوئی کالی مرچ	ایک چائے کا چمچ
پسی ہوئی میتھی	دو چائے کا چمچ
ناریل کا دودھ	ڈھائی کپ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

گھی میں پیاز سرخ کرلیں۔ ادرک لہسن اور دوسرے مسالے ڈال کر پانچ منٹ تک بھونیں۔ مسالا خشک معلوم ہو تو تھوڑا سا پانی ڈال دیں۔ اب اس مسالے میں گوشت ڈال کر سنہری ہونے تک بھون لیں۔ اس میں ناریل کا دودھ ڈال دیں، جوش آجائے تو سوا گھنٹے تک ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ گوشت گل جائے تو اتار کر میتھی اور پودینہ ڈال کر چند منٹ ڈھانپ دیں۔ ڈھاکہ ناریل گوشت تیار ہے۔

ماربلڈ فروٹ ڈیزرٹ

اشیا :

سیب چوکور کٹے ہوئے	دو عدد
امرود	دو عدد
اورنج جوس	1/2 کپ
کیلے	چار عدد کٹے ہوئے
براؤنیز	تین عدد
فریش کریم	300ml
آئسنگ شوگر	ایک کھانے کا چمچ
چینی	دو کھانے کے چمچ
پانی	1/4 کپ

چاکلیٹ سیرپ کے لیے

اشیا :

کوکو پاؤڈر	1/4 کپ
براؤن شوگر	چار کھانے کے چمچ
گرم پانی	1/2 کپ
ونیلا ایسنس	چند قطرے
گارنش کے لیے	چیریز

ترکیب :

☆ سیب اور امرود کے چھلکے اور بیج صاف کرکے ایک پین میں پانی اور چینی کے ساتھ ملا کر 7-5 منٹ پکائیں۔

☆ جب نرم ہوجائیں اس میں کینو کا رس اور کیلے ڈال کر پکائیں مکس کرکے چولہے سے اتارلیں۔

☆ براؤنیز کو چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ آئسنگ شوگر کریم میں مکس کرلیں۔

☆ چاکلیٹ سیرپ الگ سے پکا کر چولہے سے اتار کر ٹھنڈا کریں پھر ونیلا ایسنس شامل کریں۔

☆ ڈش میں پہلے فروٹس پھر براؤنیز پھر کریم اور چاکلیٹ سیرپ ڈال کر کانٹے کی مدد سے ماربلنگ کریں۔

☆ چیریز سے گارنش کریں۔ ٹھنڈا کرکے پیش کریں۔

☆ ☆
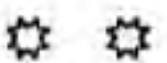
حسن و صحت

ادارہ

تِل کے انسانی زندگی میں فوائد

ممکن ہے تِل سے ہی تیل کا لفظ نکلا ہوگا۔ عام طور پر دو قسم کے تِل دیکھنے کو ملتے ہیں' لیکن اصل میں تِل کی تین قسمیں ہیں۔ کالے' سفید اور سرخ۔ طب کے مطابق کالے تِل سب سے زیادہ مفید ہیں۔ غذائی اور دوائی اعتبار سے کالے تلوں میں ہی سب سے زیادہ فوائد موجود ہیں۔ اس کے بعد سفید تلوں اور سب سے آخری میں لال تلوں کا درجہ ہے' لیکن لال تل نایاب ہیں۔ اپنی خصوصیات میں تل گرم' تلخ اور لذیذ ہے۔

تِل کے فوائد اور استعمال

تِل دماغ' جلد' دانتوں اور بالوں کے لیے مفید ہے۔

☆ بھوک بڑھاتا ہے۔

☆ صبح اگر ایک مٹھی بھر تِل چبا کر کھالیے جائیں تو نہ صرف اس سے غذائیت بلکہ طاقت بھی حاصل ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ دانت اس طرح مضبوط رہیں گے کہ ادھیڑ عمر تک ان کی مضبوطی قائم رہے گی اور دانت درد کی شکایات بھی نہیں ہوگی۔

☆ کہا جاتا ہے کہ تِل میں کیلشیم کافی مقدار میں موجود ہے۔ اسی لیے بچوں کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔ بچوں کو تِل کے لڈو بنا کر کھلانا بھی فائدہ مند ہے۔ رات کو جو بچے بستر پر پیشاب کردیتے ہیں ان کو کالے تلوں کے لڈو رات کو سونے سے پہلے کھلادیں اور ساتھ میں ایک ٹکڑا مولی کھلا دیں' اس سے یہ عادت چھوٹ جائے گی۔

☆ جلد کسی جگہ سے جل گئی ہو تو تِل کا تیل ذرا سا گرم کرکے لگایا جائے تو اس سے جلن کو آرام اور فائدہ ہوگا۔

☆ ہاتھ پاؤں جلنے کی کیفیت میں بھی تِل کو دودھ کے ساتھ پیس کر لگائیں۔ فائدہ مند ہے۔

☆ تازہ زخم یا گھاؤ نہ بھر رہا ہو تو تِل میں شہد اور گھی ملا کر لگانے سے دیگر دوائیوں یا مرہم کے مقابلے میں جلد آرام آئے گا۔

☆ سردیوں میں ہاتھ پاؤں کی جلد یا ہونٹ پھٹنے کی شکایت ہوجاتی ہے اس سے بچنے کے لیے تِل کے تیل کا استعمال کرکے دیکھیے۔

☆ کان کے درد میں تلوں کے تیل میں لہسن کو گرم کرکے چھان کر کان میں اس کا قطرہ ٹپکانے سے درد کم ہوجائے گا۔

☆ زیتون کے تیل سے تلوں کے تیل کے فوائد کچھ کم نہیں بلکہ ذائقہ میں تِل کا تیل زیتون کے تیل سے بہتر ہے۔

☆ تِل کے تیل کا ایک فائدہ قبض کے لیے ہے کہ یہ قبض کو بھی رفع کرتا ہے اور پیچش وغیرہ میں بھی مفید ہے۔

☆ ماہواری کے درد اور ماہواری ٹھیک طرح سے نہ ہونے کی شکایت میں تِل کھانے چاہئیں۔ اس کے لیے دو چائے کے چمچے تِل پیس کر ایک گلاس پانی میں ابال لیں۔ یہاں تک کہ پانی ایک چوتھائی رہ جائے پھر یہ پانی پی لیں۔ یہ ماہواری کی بے قاعدگی کو بھی درست کرے گا۔

☆ خون آور بواسیر یا خون آور دستوں میں ایک حصہ تِل' چینی دو حصے اور بکری کا دودھ چار حصے لے کر ایک ساتھ ملا کر کھانے سے فائدہ ہوگا۔

☆ بچوں کو اگر پاخانہ کے ساتھ خون آرہا ہو تو تھوڑے سے تلوں کے ساتھ چینی پیس کر یا کوٹ کر

شہد کے ساتھ ملا کر کھلائیں۔

☆ تلوں کے تیل کو اگر منہ میں دس منٹ رکھ کر کلی کر لیں اور تیل پھینک دیں تو دانت بھی مضبوط ہوں گے اور پائیوریا کا مرض نہیں رہے گا۔

☆ دانت کے درد میں ہینگ یا کلونجی کے ساتھ تل کا تیل ملا کر گرم کر کے کلی کرنے سے آرام ملے گا۔

☆ بند ناک کھولنے کے لیے یہ نسخہ آزمائیے۔ پسی کالی مرچ یا پسی اجوائن کو گرم تل کے تیل میں ملا کر ناک میں ڈالیں، سونگھیں یا مالش کریں۔

☆ پھٹی ہوئی ایڑیوں کے لیے موم اور نمک کو گرم تلوں کے تیل کے ساتھ لگانے سے فائدہ ہو گا۔

☆ روز صبح سویرے ایک ٹیبل اسپون کالے تل منہ میں تھوڑے تھوڑے کر کے باریک کر کے چبائیں۔ جب رس کی طرح ہو جائے تب نگل لیں۔ اسی طرح پورا ایک چمچہ تل ختم کریں اور پھر ٹھنڈا پانی پی لیں (ٹھنڈے سے مراد عام پانی ہے، فریج میں رکھا ٹھنڈا پانی مراد نہیں) یہ تل کھانے کے تین گھنٹہ بعد تک کچھ کھانا منع ہے۔

اس طریقہ کے مطابق تل کھانے کے ساتھ ساتھ اگر تل کے تیل کی مالش بھی کی جائے تو دبلے پتلے شخص کا دبلا پن کم ہو گا اور جو بہت موٹے ہیں ان کا کافی حد تک پیٹ کم ہو سکتا ہے۔ جن لوگوں کے وقت سے پہلے بال سفید ہونا شروع ہو جاتے ہیں وہ تلوں کے تیل کے استعمال سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو یہ تیل موافق آجائے ان کے بال گرنا بھی بند ہوں گے اور مضبوط بھی ہوں گے۔

کہا جاتا ہے کہ جو لوگ اوپر بتائے گئے طریقہ کے مطابق روزانہ تل ایک سال تک کھاتے رہیں ان کی عمر ایک جگہ پر آکر تھم جاتی ہے۔ یعنی بڑھاپا جلدی نہیں آتا۔

اس طریقہ میں یہ بات یاد رکھیں کہ جن لوگوں کو اس طریقہ کے مطابق تل کھانا موافق آئے وہ اسی ترکیب کے مطابق کھائیں ورنہ ایک اسپون سے کم کر کے آدھا چمچہ کھانا شروع کریں۔

☆ ☆

مرتبہ: ثمینہ شریف

امید

ایک گدھا دوسرے سے "یار میرا مالک مجھے مارتا بہت ہے۔"

دوسرا۔ "تو بھاگ کیوں نہیں جاتا؟"

پہلا۔ "بھاگ تو میں جاؤں، لیکن مالک کی خوب صورت بیٹی جب بھی کوئی شرارت کرتی ہے تو وہ اسے کہتا ہے کہ تیری شادی اس گدھے سے کرادوں گا۔"

"بس اسی امید پہ رکا ہوا ہوں۔"

مصباح۔۔۔ سرگودھا

صحیح عمر

ایک ساٹھ سالہ ارب پتی بہت دن بعد کلب میں اپنی اٹھارہ سالہ نئی نویلی بیوی کے ساتھ داخل ہوا تو اس کے دوست نے علیحدگی میں حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تم سے شادی پر کیسے راضی ہوگئی۔"

"میں نے اپنی عمر کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔"

ارب پتی نے جواب دیا۔

"کیا تم نے اسے اپنی عمر چالیس سال بتائی۔"

دوست نے پوچھا۔

"ارے نہیں یار۔۔۔ میں نے اپنی عمر نوے سال بتائی تھی۔"

ارب پتی نے مسکرا کر کہا۔

سنعیہ۔۔۔ کہروڑپکا

احتیاط

ایک کم اعتماد خاتون کو ڈرائیونگ سکھاتے ہوئے انسٹرکٹر نے دیگر ہدایات کے ساتھ ایک مخلصانہ مشورہ دیا۔

"محترمہ! بالکل پرسکون ہو کر ڈرائیو کیا کریں۔ اس دوران اپنے ذہن کو تمام مسائل اور الجھنوں سے دور کرلیا کریں صرف ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھیں اور کچھ نہ سوچیں۔"

خاتون نے فرماں برداری سے اثبات میں سرہلایا اور خاموشی سے گاڑی چلانے لگیں، خاموشی طویل ہوئی تو انسٹرکٹر نے سرسری سا پوچھا۔

"ویسے آپ کی عمر کیا ہوگی؟"

"سرپلیز۔۔۔ اس وقت ایسے مشکل سوال نہ کریں جن کا جواب مجھے بہت سوچ سمجھ کر دینا پڑے۔"

خاتون نے گھبرا کر جواب دیا۔

سیدہ نسبت زہرا۔۔۔ کہروڑپکا

سوال

لڑکا لڑکی سے کہہ رہا تھا۔

"جان من میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں جتنی آج تک شاید دنیا میں کسی مرد نے کسی عورت سے نہیں کی ہوگی۔ تم میری نظر میں دنیا کی سب سے اچھی، سب سے پیاری اور سب سے حسین لڑکی ہو۔ تم میری زندگی کے اندھیروں میں روشنی کی طرح ہو۔ تم میرے خوابوں کا محور و مرکز ہو۔ میری امیدوں اور امنگوں کی دنیا تمہارے دم سے جاری ہے۔ تمہاری خاطر میں دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت سے ٹکرا سکتا، سمندروں کا سینہ چیر سکتا، پہاڑوں کو توڑ سکتا ہوں۔ تمہاری خاطر میں جان بھی دے سکتا ہوں۔ بس اب تم مجھے یہ بتادو کہ تم مجھ سے شادی کرو گی یا نہیں؟"

"وہ سب تو ٹھیک ہے، لیکن تم نے مجھے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تم مجھے پسند بھی کرتے ہو یا نہیں؟"

لڑکی بولی۔

لاریب رانی۔۔۔ راجن پور

مذاق

شوہر۔ "تمہاری امی کی مذاق کرنے کی عادت نہیں گئی۔"

بیوی۔ "کیا کہہ دیا امی نے؟"

شوہر۔ "آج مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ میری بیٹی سے شادی کرکے خوش تو ہو نا؟"

حنا کرن۔۔۔ پتوکی

انتقام

"پیاری روزی جب میں مرجاؤں تو پھر تم ڈیوڈ سے شادی کرلینا۔"

"وہ کیوں؟"

"کیوں کہ ایک دفعہ اس نے مجھ سے ایک غلط گھوڑے پر شرط لگوائی۔"

ثمینہ زاہد۔۔۔ ایبٹ آباد

زہر

ایک شخص کا اپنی بیوی سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور وہ گھر سے چلا گیا۔ شام کو جب بھوک ستانے لگی تو وہ گھر میں واپس آیا اور بیوی سے دریافت کیا۔

"کھانے کے لیے کیا تیار ہے؟"

"زہر۔" بیوی نے غصے میں جواب دیا۔

"میری تو ایک دوست کے ہاں دعوت ہے، جو بچے وہ اپنی والدہ محترمہ کو بھیج دینا۔" اور یہ کہہ کر وہ کھانا کھانے قریبی ہوٹل چل دیا۔

حیا الشال۔۔۔ جہلم

ہمسایہ

ایک صاحب کہیں جارہے تھے۔ راستے ان کا کوئی پرانا ملنے والا نظر آگیا۔ انہوں نے علیک سلیک کے بعد تعجب سے پوچھا۔

"کمال ہے صاحب، آپ زندہ ہیں؟ میرا خیال تھا کہ آپ کو دنیا سے سدھارے کافی عرصہ ہو گیا ہو گا۔"

"خوب! یہ خوش فہمی آپ کو کیوں ہوئی بھلا۔"

ملاقاتی نے مسکرا کر پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ کل آپ کا ہمسایہ مل گیا تھا اور آپ کی بڑی تعریفیں کر رہا تھا۔"

غزل۔۔۔ ملتان

سڑک

ڈاکٹر۔ "جب کار ایک عورت چلا رہی تھی تو تمہیں سڑک سے دور ہٹ جانا چاہیے۔"

مریض۔ "کون سی سڑک؟ میں تو پارک میں لیٹا ہوا تھا۔"

آرام وسکون

ڈاکٹر مریض کے معائنے کے لیے اس کے گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بچوں کے شوروغل کی وجہ سے کمرے میں زبردست ہنگامہ ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر نے یہ صورت حال دیکھی تو مریض سے بولا۔

"محترم! آپ کو مکمل آرام کی ضرورت ہے، میری رائے یہ ہے کہ آپ کل سے اپنا دفتر جوائن کرلیں۔"

پارس عمتانہ۔۔۔ شورکوٹ

میری دعا مل جا

پرنام سنگھ کی اپنی بیوی سے سخت لڑائی ہو گئی، اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"واہ گورو۔۔۔ میں زندہ نئیں رہنا چاہندا تو مینوں چک لے۔"

پرنام سنگھ کی بیوی اس سے زیادہ اکتائی ہوئی تھی، اس نے ہاتھ اٹھا دیے۔

"واہ گورو میں وی زندہ نئیں رہنا چاہندی، تو مینوں چک لے!"

یہ سن کر پرنام سنگھ نے دوبارہ ہاتھ اٹھا لیے اور کہنے لگا۔

"واہ گورو میری دعا بھل جا ایہدی منظور کر لے!"

فوزیہ حنا۔۔۔ بھائی پسرو

☼ ☼

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

حکیمہ جبیں۔۔۔ کوئٹہ' سید آباد

س۔ کس موسم میں محبت سستی ہوتی ہے؟
ج۔ گرمی کے موسم میں۔
س۔ عورت کے پاس سب سے قیمتی چیز کون سی ہے؟
ج۔ حیا۔

عاکفہ صدیقی۔۔۔ کراچی

س۔ کیا بات ہے آخر آپ ہماری بھابھی کو سمجھتے کیا ہیں' ہاں نہیں تو؟
ج۔ میں آپ کی بھابھی کو سمجھنے والا کون؟

توحید صدیقی۔۔۔ کراچی

س۔ سنا ہے محبت اندھی ہوتی ہے۔ بہری اور گونگی وغیرہ بھی ہوتی ہے کیا' یہ ٹھیک ہے؟
ج۔ سنی سنائی باتوں پر اچھے بچے کان نہیں دھرتے

نازنازش گل۔۔۔ کراچی

س۔ فروری کے شمارے میں کالم (نہلے پہ دہلا) کے اوپر جو تصویر شائع ہوئی ہے وہ آپ کی ہے؟ اگر آپ کی ہے تو کتنے سال پرانی ہے؟
ج۔ میری نہیں ہے۔
س۔ ماہنامہ "کرن" کے فروری کے شمارے میں آپ کے نام کے ساتھ میں نے انشاء کا اضافہ دیکھا۔ کیا آپ پیارے انشاء جی کے بیٹے ہیں؟
ج۔ جی ہاں۔

رابعہ مختار روبی

س۔ پڑوسی اگر عیب دار ہوں تو؟
ج۔ چپ سادھے رہیے۔

فرحت جبیں۔۔۔ کراچی

س۔ آپ اتنے پیارے پیارے جواب کیسے دے دیتے ہیں؟
ج۔ کرسی پر بیٹھ کر' قلم سے لکھ کر

شمیم مصطفیٰ قریشی۔۔۔ کراچی

س۔ السلام علیکم! کیا وجہ ہے کہ کرن کے ذوالقرنین صاحب میرے سوالوں کے جواب نہیں دیتے؟
ج۔ انہیں سمجھاؤں گا کہ آپ کے سوالوں کے جواب ضرور دیا کریں۔

گلنار شگفتہ گل۔۔۔ راولپنڈی

س۔ میں نے ایک جگہ پڑھا ہے کہ ذوالقرنین کا مطلب "دو سینگوں والا" ہے تمہیں واقعی۔۔۔؟
ج۔ کسی گھٹیا کتاب میں پڑھا ہوگا۔

اس ماہ کا خط

رابعہ عمران چوہدری۔۔۔ رحیم یار خان

اکتوبر کا شمارہ میرے ہاتھوں میں آج بھی ویسا ہی خوش گوار تاثر دے رہا تھا جیسا آج سے دس سال پہلے دیتا تھا۔ "کرن" کا ٹائٹل بہت عمدہ اور کرن کتاب کی تو کیا ہی بات ہے۔ اتنے بے شمار اور کار آمد ٹوٹکے جن سے ہم مستفید ہوئے۔ بہت زبردست لگی۔ اداریہ پڑھ کر حمد اور نعت سے مستفید ہوئے۔ راحیلہ بلوچ کے الفاظ جو انہوں نے محمود بابر فیصل کی یاد میں لکھے ہمیں بھی دکھی کر گئے۔ سروے انٹرویوز اچھے لگے سب سے پہلے "صدف ریحان گیلانی" کی تحریر پڑھی۔ "صمصام عبید موسوی" کا نام پڑھ کر ہی بد مزہ ہو گئے مگر جب ذرا آگے بڑھی تو تحریر ماشاء اللہ انتہائی دلچسپ اور اچھی لگی۔ نظیر فاطمہ کی تحریر "قربانی" کرن کی سب سے بہترین اور خوب صورت تحریر لگی۔ کاش کے طلیفے جیسی سوچ سب کی ہو تو کیا ہی بات ہے اور اگر "طلیفے" جیسی سوچ ان لوگوں کی ہو جو قربانی کر کے صرف اپنے احباب اپنے رشتے دار اور اپنے ہم پلہ لوگوں کو یاد رکھتے ہیں تو شاید ہی کوئی غریب ایسا نہ بچے جو عید کے دن بھی گوشت نہ کھا سکے۔ ویل ڈن نظیر فاطمہ کیپ اٹ اپ۔

صدف آصف کا ناولٹ "جیت" واقعی جیت گیا۔ کتنی بچیاں جہیز جیسی بری رسم کی وجہ سے اپنے بالوں میں سفیدی لیے ماں باپ کی دہلیز پر بوڑھی ہو رہی ہیں۔ کہانی میں بہت سے مثبت پہلو تھے اور سبق آموز بھی۔ عابدہ احمد کی تحریر بھی خوب صورت ترین تھی۔ لفظوں کا خوب صورت انتخاب اچھا لگا۔ دیا شیرازی کی تحریر "میں ہوں نا" پڑھ کر صفیہ کی حماقتوں پر ہنسی بھی آئی بڑی حقیقت پر مبنی کہانی لکھی۔ واقعی جناب دنیا مطلب کی اور صفیہ صاحبہ "میں ہوں نا" کی تفسیر۔ امت العزیز شہزاد کی تحریر "تعویذ" بھی کافی دلچسپ اور اچھی لگی مگر "تعویذ" پر اتنا یقین بھی شرک ہے۔ "جو کرتا ہے اللہ کرتا ہے اور جو اللہ کرتا ہے وہ صحیح کرتا ہے۔" لیکن چونکہ یہ ایک اصلاحی کہانی تھی تو ایسا کرنا بھی کچھ غلط نہیں۔ آسیہ مظہر چوہدری کا افسانہ پڑھ کر انتہائی دکھ ہوا کہ عورت تو ہر موڑ پر قربانی دیتی ہے یہ کیسی عورت تھی یا عورت کے نام پر شرمندگی کا دھبا۔ "خلش" سیما بنت عاصم نے بھی خوب لکھا چھوٹا سا افسانہ بہت گہری بات سمجھا گیا۔ نوک جھونک زندگی کا حصہ ہے مگر رنجشوں کے بڑھتے ہی رشتوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔

سلسلے تو سب ہی مجھے بہت پسند آئے۔ شازیہ اعجاز، شاہدہ عامر، فوزیہ ثمر کا انتخاب اچھا لگا۔ شاعری میں صبا خان اور ثریا شاہ، سعدیہ عرفان کا انتخاب خوب رہا۔ اشعار تو سب ہی لاجواب تھے۔ "کچھ موتی چنے ہیں" میں ٹاپ کے موتی چنے ادارے نے۔ رضوانہ ملک کا تبصرہ پسند آیا اور تبصرے کا مزہ اور حسن تب ہی قائم رہتا جب ہم ہر ٹاپک کو مد نظر رکھ کر بات کریں۔ تو پلیز میری گزارش ہے کہ تبصرے کے لیے صفحات کو بڑھا دیا جائے۔

ج۔ رابعہ عمران! کرن کو پسند کرنے کا شکریہ۔ قارئین تک آپ سب کی رائے پہنچانا مقصود ہوتا ہے اور اس رائے کی روشنی میں ہم کرن کو بہتر سے بہتر کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں، لیکن تبصرے ہم زیادہ طویل شائع نہیں کر سکتے ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ بہنیں اس محفل میں شامل ہو جائیں۔

ماریہ طفیل۔۔۔ تلعبہ

اس دفعہ کرن بہت جلدی مل گیا تھا۔ ٹائٹل بھی بہت پسند آیا۔ حمد و نعت بھی اچھی تھی اور زینب جمیل سے ملاقات میں بہت مزہ آیا۔ "راپنزل" اس دفعہ بہتر تھی۔ "ردائے وفا" بھی بس کوئی خاص نہیں تھی۔ "شاید" میں فائزہ افتخار پتا نہیں کون سے موڑ پر جانا چاہتی ہیں اور سالار ام ہانی کے

ساتھ ایسا کیوں کررہا ہے اس دفعہ اس کا کردار پسند نہیں آیا۔ "میں گمان نہیں" اس دفعہ بہت اچھی تھی زیان کو اس کی غلطی کی سزا تو ملنی چاہیے۔ ایبک اس کے ساتھ بالکل ٹھیک کررہا ہے اور اب رُتم پتا نہیں وہاب کے ساتھ مل کر کون سی چال چلے گی۔ اب اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔

مکمل ناول "تمہارا اسیر" بہت اچھا تھا اس کو بیان کرنے کے لیے میرے پاس لفظ نہیں بس شہناز صدیق آپ نے تو کمال کردیا۔ "محبت ہم سفر میری" ناولٹ بھی بہت پسند آیا' لیکن ایبک پہ غصہ بھی آیا کہ اس نے معصوم سی ہانیہ پر شک کیا۔ باقی سارے افسانے بہت اچھے لگے خیر اس دفعہ کا کرن بہت اچھا تھا پورا ماہ انتظار کرتے ہیں' لیکن جب آتا ہے تو صرف دو دن میں پورا رسالہ ختم ہوجاتا ہے۔ ٹھیک اگلے ماہ تک کے لیے اللہ حافظ۔ اور میں غزل بھیج رہی ہوں قابل اشاعت ہو تو ضرور شائع کیجیے گا۔

ج۔ ماریہ! "کرن" میں غزل شائع نہیں ہوتی۔ "یادوں کے دریچے" میں ہم کسی مشہور شاعر کی غزل یا نظم شائع کرتے ہیں جو آپ کی ڈائری میں محفوظ ہو۔ کرن کو پسند کرنے کا شکریہ۔

حبا خان۔۔۔ بہاولپور

میں کرن کی بہت پرانی قاری اور اس سے بڑھ کر شیدائی ہوں۔ بہت دنوں بعد دوبارہ خط لکھنے کی جسارت کی ہے۔ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ کرن ہاتھ میں کیا آیا دل خوشی سے بھر گیا۔ جلدی جلدی ایک نگاہ ڈالی تو سارے سلسلے لاجواب لگے۔ فرحین اظفر کا ناول "ردائے وفا" بس ٹھیک جارہا ہے۔ نائلہ پر اتنا ظلم۔۔۔ البتہ "راپنزل" میں شہرین کی وجہ سے دلچسپی برقرار ہے' تنزیلہ جی نے اپنی روایات برقرار رکھی ہے۔ نبیلہ ابرار راجہ کا "میں گمان نہیں یقین ہوں" اچھا لگا۔ زیان کو کیا ہوگیا؟۔ "تمہارا اسیر" ٹھیک رہا۔

ناولٹ میں سب سے پہلے "شاید" پڑھا۔ فائزہ جی کی وجہ سے بہت مزا آرہا ہے۔ سالار اور ام ہانی۔۔۔ خوب۔۔۔ اس کے بعد صدف آصف کا ناولٹ "جیت" بہت کمال کا لکھا گیا واقعی اس دور میں تاب دار جیسی ماؤں کی ضرورت ہے۔ جو گھر بنانے کے لیے اپنی لڑکیوں کو صحیح تربیت دیتی ہیں۔۔۔ مصنفہ تک تعریف پہنچادیں۔ "محبت ہم سفر میری" بھی اچھا تھا۔ بس ایک دوبار کہانی میں جھول سا محسوس

افسانے سارے ہی اچھے لگے۔ خاص طور پر سیما بنت عاصم کا "خلش" نظیر فاطمہ کا "قربانی" اور امت العزیز کا "تعویذ" زیادہ پسند آئے۔ شاعری کا انتخاب اس بار محفل لوٹ گیا۔ کرن کا دسترخوان خوب۔

امید ہے کہ اس خط کو بھی "نامے میرے نام" میں جگہ مل جائے گی۔

ج۔ پیاری بہن حبا! آپ کے خط کو ضرور جگہ ملے گی۔ آپ کرن کی پرانی قاری ہے تو ہر ماہ شامل ہوا کریں نا۔ مصنفہ تک آپ کی تعریف پہنچادی جائے گی۔ کرن سے محبت کا تہہ دل سے شکریہ۔

روزینہ نعیم' یاسمین نعیم' سمیرا نعیم۔۔۔ دکھیالی گوجرانوالہ

ہم پھر حاضر ہیں اپنے نئے اور تازہ شدہ تبصرے کے ساتھ۔۔۔ اب کی بار ٹائٹل تو بہت ہی خوب صورت تھا۔ لڑکی تو بالکل میری آپی ہی لگ رہی تھی بچی میں۔ بلال قریشی کو "میری بھی سنیے" میں پڑھا اچھا لگا پڑھ کر اس کے بعد چھلانگ لگائی "شاید" کی طرف لو جی ہوگئی شادی' لیکن یہ کیا سالار اور وہ بھی نشہ کرتا ہے یہ تو پہلے بھی مجھے کوئی اچھا نہیں لگا تھا اب تو اور بھی برا لگنے لگا۔ آج جس کہانی نے مجھے قلم اٹھانے کے لیے مجبور کیا وہ ہے "محبت ہم سفر میری" شبانہ جی بالکل پسند نہیں آئی۔ "تمہارا اسیر" بھی اچھی کہانی تھی اور پلیز فرحین اظفر جی اب کہانی کو جلدی ختم کریں بور ہونے لگے ہیں۔ افسانوں میں سب ہی اچھے تھے "اب کے برس عید" گڈ گڈ۔ "قربانی" بھی اچھا تھا سبق آموز۔ عابدہ احمد نے ایک حساس موضوع کو لیا اور اس کے متعلق بہت ہی اچھے طریقے سے لکھا نمبر ون تھا۔ نبیلہ جی اب آپ بھی اس کی آخری قسط لے ہی آئیں باقی ڈائجسٹ ابھی پڑھا نہیں ہے اور پلیز شاہین جی ہاشم ندیم کا انٹرویو بھی شائع کریں۔

اور یہ بتائیں کہ آپ میرے اشعار کو "مجھے یہ شعر پسند ہے" میں شامل کیوں نہیں کرتیں کیا صرف کراچی والوں کا ہی حق ہے اس پر؟

ج۔ روزینہ نعیم! کرن پر تبصرے اور اپنی رائے کا اظہار کرنے کا بے حد شکریہ۔ آپ کی شکایت سر آنکھوں پر' لیکن آپ شاید غور سے نہیں پڑھتیں ہمارے سلسلوں میں تقریباً" پورے پاکستان سے ہی سب شریک ہوتے ہیں۔

طاہرہ ملک ــــ جلالپور پیروالا

اس ماہ کا کرن ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا' لیکن کچھ سوگوار سا بھی لگا وجہ ایک خوب صورت سے انسان کا اس ماہ میں اپنے پیاروں کو داغ مفارقت دے جانا محمود بابر فیصل کے بارے میں پڑھ کر بے اختیار آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے اور دل سے بے اختیار دعا نکلی اے اللہ عزوجل اس پیارے انسان کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمانا کرن ہزاروں کیا لاکھوں لوگوں کے ہاتھوں میں جاتا ہے میری ان سب سے درخواست ہے کہ آپ ان کے لیے سورۃ فاتحہ' درود شریف اور جو کچھ آپ پڑھ سکیں ان کے ایصال ثواب کے لیے پڑھ لیں وہ ہمیں اتنا خوب صورت تحفہ عطا کر گئے اور ہم اپنی محبت کا ثبوت اس طرح دے سکتے ہیں۔

"دیار غیر کی عیدالاضحیٰ" شاہین رشید جی کا خوب صورت سروے تھا۔ مقابل ہے آئینہ "سیدہ نسبت زہرا" سے مل کر بہت اچھا لگا۔ "راپنزل" میں حبیبہ کے خطرناک ارادے لگ رہے ہیں اس نے تو صوفیہ پر بجلی گرانے کی پوری تیاری کر رکھی ہے کہیں شوہر کے ایکسیڈنٹ میں اس کا ہاتھ تو نہیں؟ سلیم بے چارے پہ افسوس ہوا کہ محبت کرنے کے جرم میں دوستی سے بھی گیا شہرین کی تبدیلی اچھی لگی دعا ہے کہ قائم رہے۔ "شاید" سعد بے چارے کو تو ملک بدر کی سزا سنا دی گئی اور لگتا ہے ام ہانی کی طویل سزا شروع ہونے والی ہے سالار کا کردار فی الحال تو سمجھ سے ماورا ہے کہ وہ چاہتا کیا ہے اور ایسا کیوں کر رہا ہے۔ سعد کی ماں کے سب جاننے پہ حیرت نہیں ہوتی کیوں کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ماں اولاد کے دل کا حال نہ جانے۔ "قربانی" اس چھوٹے سے' لیکن خوب صورت سے افسانے میں ان لوگوں کے لیے سبق ہے جو عید کے دن بھی لوگوں کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سبب بنتے ہیں طیفے کا اپنے حصے میں سے غریب بوڑھے شخص کو دے دینا بہت اچھا لگا صحیح معنوں میں قربانی تو طیفے کی ہوئی۔ "جیت" صدف آصف نے خوب صورت ناولٹ لکھا عکرمہ کا پشمینہ کو پسند کرتے ہی ڈائریکٹ رشتہ بھیجنا اور اس کی والدہ کا جہیز لینے سے انکار کر کے ان کی مشکلات کو کم کرنا بہت اچھا لگا۔ دنیا میں اس طرح کے اچھے لوگ بھی تو ہوتے ہوں گے اور ان ہی اچھے لوگوں کی وجہ سے دنیا چل رہی ہے۔

"من کے عید منائیں" عابدہ احمد نے لڑکوں کو بہت

اچھا نہیں دیا کہ جب بات اپنی بھری کورٹوں پہ آتی ہے تو تب دوسروں کے جذبات و احساسات کا صحیح معنوں میں احساس ہوتا ہے۔ "میں گمان نہیں یقین ہوں" ایبک کا زبان کے پول کھولنا اچھا لگا بھئی یہ کیا آتم توش کی وجہ سے سب کو پریشان کر رکھا تھا اور یہ رنم کس خوشی میں ایبک پہ ڈورے ڈال رہی ہے اسے کہاں ملنے والا ہے ایبک؟ اور معاذ ہی اس کے دہرے روپ کو سمجھ جائے گا اگلے ماہ آخری قسط ہوگی پڑھ کر اچھا لگا کہ بہت جلدی سب ٹھیک ہوجائے گا۔ "محبت ہم سفر میری" شبانہ شوکت جی آپ کا ناولٹ بہت اچھا لگا' لیکن ایبک کی جلد بازی پہ غصہ آیا یہ کیا ایبک جی جو محبت کرتے ہیں وہ اعتبار بھی کرتے ہیں یہ کیا بھئی سمانہ نے جھوٹ بولا اور آپ نے اعتبار کر لیا خیر اینڈ اچھا لگا۔ ہانیہ کی قسمت سنور گئی ایبک کی ممی لاجواب تھیں۔

"میں ہوں نا" آج کل کے نفسا نفسی کے دور میں جانے کیوں لوگ دوسرے کے احساسات کو کیوں نہیں سمجھتے صفیہ جیسی نیک لڑکی کو پہلے گھر والوں نے اپنے مفاد کے لیے یوز کیا اور پھر سسرال میں بھی ویسے لوگوں کا سامنا کرنا پڑا' لیکن شکر ہے سمیر کی شکل میں اچھا ہسبینڈ ملا جس نے صفیہ کی آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا۔ "تعویذ" واہ جی تعویذ نے تو جادو کر دیا ایک بگڑی ہوئی لڑکی کو سدھار دیا اور ناصر کے گھر کو بھی بچا لیا۔ "ردائے وفا" ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا "بازی الٹ گئی" ثمن کا تو مجھے دماغ خراب لگا پہلے لو میرج اور پھر اتنا بڑا طلاق کا ڈرامہ اس کے انجام تو پھر ایسا ہونا ہی تھا خلش سیما بنت عاصم نے اینڈ میں دونوں سہیلیوں کی صلح کرا ہی دی۔

"کچھ موتی چنے ہیں" سب کے انتخاب لاجواب تھے "کرن کرن خوشبو" امینہ ملک' فوزیہ ثمر بٹ اور رباب سرفراز کی پسند' پسند آئی "یادوں کے دریچے" سے کرن سرمد' مدیحہ نورین اور یاسمین ملک کی غزل پسند آئی۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" بریرہ اکرام' عائشہ' بینا ظفر اور شاہدہ ظفر کے اشعار پسند آئے کرن کا دسترخوان ہمیشہ کی طرح بیسٹ لگا۔ کرن کتاب اتنی کار آمد لگی کہ پڑھ کر دل خوش ہوگیا "حسن و صحت" بلش آن کے بارے میں جان کر اچھا لگا نا مے میرے نام میں رضوانہ ملک' آسیہ ارم کا خط اچھا لگا۔ برتھ ڈے وش کرنے کے لیے رضوانہ ملک تھینکس۔

ج۔ طاہرہ! آپ ہماری مستقل قاری ہیں اور آپ بہت
اچھا تبصرہ کرتی ہیں۔ ہر ماہ یونہی تبصرہ کیا کریں۔ شکریہ۔

ثنا شہزاد۔۔۔ کراچی

اس بار کرن 10 تاریخ کو ملا ہمیشہ کی طرح حمد و نعت پڑھ کر "نامے میرے نام" کی طرف دوڑ لگائی مگر یہ کیا اس بار بھی میرا خط غائب تھا۔ یہ تو غلط بات ہے نا پچھلے مہینے اتنا خوش کر دیا دل اور اس بار خط نہ پا کر دل اداسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا میں سچ کہہ رہی ہوں مجھے کرن سے بہت محبت ہے۔ خیر خط اس بار نہ چھپا تو کیا ہوا ہم نے ہمت نہیں ہاری اور پھر سے کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئے کیوں کہ پیارے کرن سے ہم اپنی زندگی میں تو جدا نہیں ہو سکتے۔

سب سے پہلے بابر بھائی کے بارے میں پڑھا اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔ دل میں آیا کاش میں بھی کبھی ان سے مل سکتی۔ انٹرویو زپسند آئے۔ سروے میں سب کے جوابات اچھے لگے۔ فاخرہ گل اٹلی اور نبیلہ ابر جدہ میں شفٹ ہو گئیں تو یہ اب ہمیں اتنی اچھی اچھی کہانیاں کیسے بھیجیں گی لکھ کر۔

افسانے اس بار سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی درس دیا گیا تھا ویلڈن۔ ناولٹ "محبت ہم سفر میری" میں ہیرو صاحب کان کے اتنے کچے نکلے کہ کسی اور کی باتوں میں آکر اپنی محبت پہ شک کر لیا پسند نہیں آیا محبت میں اگر اعتبار نہ ہو تو وہ محبت کس کام کی۔ "جیت" بھی صدف آصف نے اچھا لکھا کاش ہر لڑکے کی ماں ایسا سوچنے لگے اور تین جوڑوں میں لڑکی کو بیاہ کر لے جائے تو غریبوں کی بیٹیاں ماں باپ کی دہلیز پر کبھی بوڑھی نہ ہوں۔ "شاید" میں سالار پر حد سے زیادہ غصہ آتا ہے کوئی ایسا کیسے ہو سکتا ہے جو اپنی ماں کو عزت نہیں دیتا وہ ہانی کو کیا عزت دے گا۔ محبت کی پہلی شرط ہی عزت ہے ہانی پچھتائے گی اپنے فیصلے پر۔ "راپنزل" میں نینا کو سلیم کی محبت ٹھکرانی نہیں چاہیے تھی ہر انسان کے سینے میں دل ہوتا ہے اور اس میں کسی بھی خاص انسان کی محبت گھر بنا سکتی ہے یہ تو ایک بے اختیاری جذبہ ہے۔ فرحین اظفر شکر ہے آپ حسیب کو منظر عام پہ لے آئیں اب جلدی سے وہ کوے میں سے باہر آجائے اور پلیز کہانی کی رفتار بڑھائیں نائلہ اگر واقعی میں اپنے کیے پر شرمندہ ہے تو حدید اسے معاف کردے۔

ج۔ عنبر گل شادی کو [illegible] اب ... بور کر رہا تھا جب ثنا ہی کسر دے رہا دل چاہ رہا ہے یہ ناول ختم ہی نہ ہو۔ شہناز صدیقی نے تو بازی لوٹ لی کیا زبردست شاہکار تخلیق کیا ہے الفاظ نہیں ہے تعریف کے لیے اس ماہ کی ٹاپ کہانی تھی یہ عرشمان کا نام بہت اچھا لگا اس کی دیوانگی نے تو مجھے بھی دیوانہ بنا دیا شہناز صدیقی کا۔ پلیز اس بار خط کو جگہ دے دیجیے گا بہت خوشی ہوتی ہے۔ کرن میں اپنا نام دیکھ کر۔ امبر گل کو شادی کی بہت بہت مبارک باد قبول ہو اللہ پاک انہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمین)۔

ج۔ پیاری ثنا! تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر آپ کا خط شامل نہ ہو سکا۔ "کرن" کی پسندیدگی کے لیے دل سے شکریہ۔

آپ فکر نہ کریں نبیلہ ابر راجہ اور فاخرہ گل کی کہانیاں آپ کو پڑھنے کے لیے ملتی رہیں گی۔ "مقابل ہے آئینہ" میں آپ کے جوابات جلد ہی شائع کر دیے جائیں گے۔

رضوانہ ملک۔۔۔ جلالپور پیروالا

خوب صورت ٹائٹل سے سجا کرن 12 کو ملا تو سب سے پہلے "نامے میرے نام" دیکھا تو اس ماہ کا خط میں اپنا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کیوٹ سی زینب جمیل سے ملاقات اچھی رہی۔ محمد بلال قریشی اور سیدہ نسبت زہرا کی باتیں اچھی لگیں۔ "دیار غیر کی عید الاضحیٰ" اچھا ٹاپک تھا اس میں بیرون ملک رہنے والے لوگوں کے بارے میں پتا چلا کہ ایسے موقعوں پر وہ کیا فیل کرتے ہیں۔

محمود بابر فیصل کے بارے میں جب بھی پڑھتے ہیں تو دل دکھ سے بھر جاتا ہے کہ اتنے اچھے اور پیارے انسان دنیا میں نہیں رہے میری تو یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور انہیں جنت میں اعلا مقام عطا کرے۔

تنزیلہ ریاض کا ناول "راپنزل" پہلی قسط سے ہی زبردست جا رہا ہے۔ شہرین کا خود پر توجہ دینا، گھر کے معاملات میں دلچسپی لینا اور اپنی بیٹی ایمن سے پیار کرنا۔ شہرین میں آئی یہ مثبت تبدیلی بہت اچھی لگی۔ مائی موسٹ فیورٹ ناول "ردائے وفا" میں عفت اور معراج دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے محبت پیدا ہو گئی ہے معراج تو عفت کو خوش رکھے گا، لیکن اس کی ماں اور بہن تھوڑا ٹف ٹائم دیں گی۔ چلیں شکر ہے کہ ماہا کو حسیب کے بارے

میں پتا چل گیا ہے کہ وہ بے چارہ اسپتال میں ہے اور زندگی و موت کی جنگ لڑ رہا ہے۔ "میں گمان نہیں یقین ہوں" میں رنم کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ہیروئن سے ولن بن رہی ہے اسے ایبک اور زیان کے بیچ نہیں آنا چاہیے۔ فائزہ افتخار کا ناول "شاید" میں پتا نہیں آگے ہانی کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ سالار کا عجیب رویہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایسا کیوں ہے۔ صدف آصف کا ناولٹ "جیت" بہت ہی اچھا تھا عکرمہ کی دادی اور مما دونوں بہت اچھی تھیں عکرمہ کی مما کا ان سے جہیز نہ لینا بہت اچھا لگا۔ شبانہ شوکت کا ناولٹ بھی بہت اچھا تھا اس میں ایبک کی مما بہت اچھی تھیں کہ انہوں نے ایبک اور ہانیہ کے درمیان غلط فہمی ختم کروائی اور ان دونوں کو ایک کروایا۔ شہناز صدیقی کا ناول "تمہارا اسیر" بیسٹ ناول تھا اس میں سائرہ بیگم نے عانیہ کے ساتھ کافی برا کیا شروع میں تو لگا کہ سائرہ بیگم بہت اچھی ہیں جو اسے اتنا پیار دے رہی ہیں، لیکن یہ تو اینڈ میں پتا چلا کہ اس میں ان کا مفاد پوشیدہ تھا عرشان بہت ہی پیارا نام تھا عرشان کی بی جی نائس تھیں۔ "تعویذ" بہت اچھا افسانہ تھا کہ اس تعویذ نے غزالہ کو سدھار دیا ناصر نے بالکل ٹھیک کہا کہ مریض کو دیکھتے ہوئے اس کے مطابق طریقہ علاج اختیار کرنا چاہیے۔ "میں ہوں نا" بھی اچھا افسانہ تھا صفیہ جیسے سیدھے سادھے لوگوں کو دنیا یونہی بے وقوف بناتی ہے، لیکن اس کا شوہر سمیر اچھا بھی تھا اور سمجھ دار بھی صدف ریحان، نظیر فاطمہ، سیما بنت عاصم، آسیہ مظہر چوہدری اور عابدہ احمد سب کے افسانے اچھے تھے۔ اور کرن کتاب "کار آمد گھریلو ٹوٹکے" بھی بیسٹ تھی تبصرے سب کے اچھے تھے۔ "مسکرائی کرنیں" میں طاہرہ ملک، اینلا اور نورین ظفر کی کرنیں پسند آئیں۔ "کرن کا دستر خوان" میں ساری ڈشز بہت اچھی تھیں۔ "یادوں کے دریچے سے" میں مدیحہ نورین مہک کی غزل اچھی لگی۔

ج۔ پیاری بہن! ہر مرتبہ کی طرح اس مرتبہ بھی کرن پسند کرنے کا تہہ دل سے شکریہ۔

مسز تقی نقوی علی۔۔۔ علی پور ضلع مظفر

اکتوبر کا شمارہ آج ہی ملا تو بس دل نے کہا کہ آج ہمت کر ہی ڈالو۔ خط لکھنے کی۔ اگر نصیب میں ہوا تو شائع ہو جائے گا نہیں تو ردی کی ٹوکری تو ہے۔۔۔ 36 سال میری عمر ہے اور ڈائجسٹ پڑھنے کا کام اس وقت سے ہے جب الفاظ کے ابہام کا پتا نہیں ہوتا اور بس ایک پڑھنے کا شوق کہ کچھ بھی مل جائے۔ بس پڑھنے کو۔ میں ڈائجسٹ اداریہ سے شروع کرتی ہوں اور "نامے میرے نام" تک پڑھتی ہوں یعنی کچھ بھی نہیں چھوڑتی سوائے اشتہارات کے۔ ان پہ بھی نظر ڈال ہی لیتی ہوں۔ میرے خط لکھنے کی وجہ بنا تنزیلہ ریاض جی کا "راپنزل" ویل ڈن تنزیلہ جی اتنا خوب صورت ناول لکھا۔ اس کے علاوہ فائزہ جی کا "شاید" وہ بھی بہت زبردست ہے اس میں مجھے سعد کی معصومانہ محبت بہت اچھی لگتی ہے۔ تبصروں میں حرا قریشی ملتان کا اور طاہرہ ملک جلال پور کا تبصرہ اچھا لگتا ہے۔ باقی ابھی شمارہ پڑھا نہیں مکمل تو اگر خط شائع ہو گیا تو پھر ان شاء اللہ آئندہ ضرور حاضر ہوں گی۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اللہ حافظ اس امید کے ساتھ کہ خط ضرور شائع ہو گا۔

ج۔ پیاری بہن! خط لکھنے کے لیے ہمت کی ضرورت کیوں ہے۔ آپ بہنوں کا "کرن" ہے اور آپ بہنیں بے دھڑک اس میں شامل ہو سکتی ہیں۔ دیکھ لیجیے آپ کا خط شامل اشاعت ہے۔ امید ہے آئندہ بھی آپ تبصرہ کرتی رہیں گی۔

ثمینہ اکرم، بہار کالونی ملیاری۔۔۔ کراچی

کافی عرصہ بعد "نامے میرے نام" میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر شرکت کر رہی ہوں۔ پھر آپ کی محبت بھری چھاؤں کی کمی بھی تو بہت محسوس کر رہی ہوں اور یہی چیز میرے قلم اٹھانے کا محرک بنی 12 اکتوبر کو کرن ڈائجسٹ نے خلاف توقع جلدی مل کر حیران کر دیا۔ ٹائٹل کچھ من کو نہیں بھایا۔ شاید مرے اندر کا موسم کچھ اداس اداس سا ہے۔ محمود بابر فیصل کو اللہ پاک اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)۔ کبھی کبھار کرن میں ذوالقرنین جی کی کوئی تحریر، افسانہ ہی شائع کر دیا کریں۔ (ایک ادنیٰ گزارش) 11 نومبر کو شہید معیز اکرم کی برسی ہے۔ تمام قارئین اور دوست احباب سے دعا مغفرت کی التجا ہے۔

دیار غیر میں مقیم ہم وطنوں کی عید کا احوال پڑھا۔ یہ لوگ حصول علم یا حصول روزگار کے لیے وہاں مقیم ضرور ہیں، مگر عید کا اصل مزہ تو اپنوں کے درمیان اپنے وطن میں ہی آتا ہے۔ زینب جمیل اور بلال قریشی کے انٹرویوز کو سرسری سا پڑھا۔ کرن کی بہت پرانی قاری سیدہ نسبت

زہرا آئینہ کے مدمقابل تھیں ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ آپ کو اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔ (آمین)۔ تنزیلہ ریاض "راپنزل" لے کر جلوہ گر ہوئی ہیں اس ناول میں کہانی کے پہلے کردار مہر کو اب تک یکسر ہی نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ شہرین نے ایک غلط قدم اٹھایا اب اپنی بیٹی ایمن کو دیکھ کر آنے والے وقت سے خوف محسوس کرتی ہے۔ صوفیہ اگر کاشف کی طرف سے تحفظات کا شکار ہے تو ایسا بے جا بھی نہیں۔ نیناں کا کردار بہت کھلنڈری اور لاابالی لڑکی کا ہے جو ہر وقت اپنے گھر والوں سے ناراض ناراض ہی نظر آتی ہے۔ اب اس نے سلیم کا پرخلوص ساتھ بھی ٹھکرا دیا ہے۔ "ردائے وفا" "فرحین اظفر" شروع میں تو بہت بور کر رہی تھیں، مگر اب کہانی کچھ آگے بڑھی ہے۔ ہر بار نائلہ پر بہت غصہ آتا ہے۔ جو جائز محرم ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو گناہ کے دلدل میں دھنسا رہی ہے۔ شکر ہے کہ اس قسط میں حسیب کا پتا چل گیا۔ افسانے اس بار سب کے سب ہی اچھے لگے۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ "بازی الٹ گئی" میں ثمن نے اپنے آپ کو خود ساختہ طلاق یافتہ بنا کر غیر مرد سے تعلقات استوار کر لیے۔ اس طرح کی کہانیاں مجھے بہت بری لگتی ہیں۔ افسانہ "تعویذ" "امت العزیز شہزاد" یہ ایمان کی کمزوری ہی ہے کہ تعویذ گنڈوں پر ہمارا عقیدہ مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ "صائمہ باجی" نے غزالہ کو راہ راست پر لانے کے لیے اچھا قدم اٹھایا۔ "من کے عید منائیں" عابدہ احمد یہ افسانہ بھی اچھا لگا، مگر سب زیادہ سے افسانہ "قربانی" "نظیر فاطمہ" کا پسند آیا۔ اس میں طیغبے کی منفرد قربانی کرنے کی ادا بہت اچھی لگی۔ "شاید" "فائزہ افتخار" ہر بار بہت توجہ سے پڑھتی ہوں۔ یہ ایک ہلکی پھلکی مزاحیہ 'ادبی چاشنی والی تحریر ہے۔ "میں گمان نہیں" "نبیلہ ابر راجہ" اس دفعہ نیناں نے اپنا بہروپ ختم کیا اور اپنی اصل شناخت رنم کے ساتھ جلوہ گر ہوئی، مگر وہ ذیان اور ایبک کی زندگی کو جہنم کیوں بنا رہی ہے۔ ناول "تمہارا اسیر" "شہناز صدیقی" عانیہ سائرہ بیگم کے ہاتھوں اچھی بے وقوف بنی۔ وہ تو عرشمان نے عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے 'زبردستی شادی کر لی' ورنہ عانیہ ساری عمر روتی رہتی۔ "محبت ہم سفر میری" "شبانہ شوکت" کہاں تو ایک ہانیہ پر جیسے سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہے اور کہاں ذرا سی غلط فہمی کو کلیئر کرنے کے بجائے بدلہ لینے کے لیے اتنا اوچھا طریقہ اختیار کیا۔ یہ کہانی کا بہت ہی کمزور پوائنٹ تھا۔ کرن کرن خوشبو میں بہت اچھی حکایات پڑھنے کو ملیں۔ "کچھ موتی چنے ہیں" بہت اچھا سلسلہ ہے۔ مجھے بھی اپنا انتخاب ارسال کرنا ہے۔ "نامے میرے نام" چند ماہ سے خطوط کے جوابات دینے والی تبدیلی اچھی لگی۔ سب سے زیادہ اس ماہ کا خط میری توجہ کا مرکز بنا ہے۔ "مسکراتی کرنیں" اس بار بہت اچھا انتخاب شائع کیا گیا۔ "حسن و صحت" میں بہت اچھی ٹپ ملی۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" کافی اچھے اشعار پڑھنے کو ملے۔ سارے مستقل سلسلہ وار سلسلے بہت محنت سے ترتیب دیے جاتے ہیں اس لیے سب کی حوصلہ افزائی ضروری ہوتی ہے۔

ج۔ ثمینہ اکرم! آپ نے "نامے میرے نام" میں بہت عرصے بعد شرکت کی کہاں غائب تھیں؟ کرن کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔

اللہ تعالیٰ معیز اکرم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

فوزیہ ثمروٹ، ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

اکتوبر کا شمارہ خلاف توقع بہت جلد مل گیا 10 اکتوبر کو خوشی دوچند ہو گئی کیوں کہ اسی تاریخ کو آپ کی پیاری سی قاری کی دنیا میں تشریف آوری ہوئی تھی۔ خوب صورت سی دلہن بنی ماڈل بہت پیاری تھی۔ سب سے پہلے "نامے میرے نام" کو پڑھا۔ محفل میں ماہ دولت کی شرکت تسکین قلب کا باعث بنی اور اپنی مدیرہ کے جواب پر ڈھیروں ڈھیر پیار آیا۔ ہمیشہ کی طرح شان مصطفیٰ والا صفحہ دل و ذہن کو منور پر سکون کرتا ہے۔ "کون دیس سدھار گئے" میں راحیلہ بلوچ نے بہت اچھے طریقے سے محمود بابر صاحب کو خراج تحسین پیش کیا۔ حقیقت یہی ہے یہ عظیم ہستیاں بھول جانے والی نہیں۔ "دیار غیر کی عیدالاضحیٰ" پیاری سی نبیلہ ابر راجہ پسند آئیں۔ زینب جمیل اور بلال قریشی کے الگ الگ انٹرویو کیوں کیے اب تو شادی ہو گئی تھی کپل کا انٹرویو کرتی نا آپ۔ "مقابل ہے آئینہ" سچی سچی کہہ رہی ہوں ہر ماہ بورنگ لگتا ہے۔

سب سے پہلے جس تحریر کا مجھے شدت سے انتظار ہوتا ہے وہ پڑھا مطلب "راپنزل" چلے یہ تو خوش آئند بات ہے کہ شہرین خود یہ اپنی بیٹی اور گھر پہ توجہ دے رہی ہے لگتا ہے حبیبہ نامی طوق صوفیہ کے گلے میں لٹک کر رہ رہی ہے

گا۔ "میں گمان نہیں یقین ہے" چلو اچھا ہوا ہمیں کہنا نہیں پڑا نبیلہ صاحبہ نے خود ہی آخری قسط کا بتا دیا۔ ناولٹ "شاید" اس بار بھی توجہ اور دلچسپی سے پڑھا ہے۔ ام ہانی کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے یہ سالار عجیب شخصیت کا ملک ہے۔ اب دو سال تک سالار نامی جیل میں قیدی بن کر رہے گی ام ہانی۔ فائزہ جی ہمت کر کے یہ بھی قصہ بیان کر دیجیے سالار کیوں اتنی بے رخی سے پیش آتا ہے اپنی والدہ سے اور والد کا ذکر اتنی بے رحمی سے کیوں کرتا ہے۔ فرحین جی کا "ردائے وفا" پڑھا۔ شکر ہے نائلہ کا ذکر نہیں تھا اس بار اور یہ بھی اچھی خبر رہی کہ حسیب کا پتا چل گیا ماہا کو۔ ان تمام سلسلے وار تحریروں کو پڑھنے کے بعد شہناز صدیق کا ناول "تمہارا اسیر" پڑھا دل بجا نہیں اس تحریر نے تو ہمیں بھی اپنا اسیر ہی کر لیا۔ ہیرو کا نام اچھا تھا۔ عرشمان عرش کا شہزادہ۔ "محبت ہم سفر میری" تحریر اچھی تھی، مگر خاص متاثر نہ کر سکی۔ "بجیت" صدف جی کا اچھا تھا ناولٹ۔ "من کے عید منائیں" کردار کی مضبوطی ہی ایمان کی مضبوطی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شرط نہیں مرد عورت کی۔ مرد کی جب اپنی انا پہ ضرب لگتی ہے تب یہ بلبلا اٹھتا ہے ایسے ہی جیسے توقیر کے ساتھ ہوا سائرہ کی ثابت قدمی میں اس کی عزت تھی۔ توقیر کی بات مان کر شاید وہ خود ہی نظروں میں ہی گر جاتی۔ اس ماہ کے افسانے اچھے تھے ہر ایک اچھا درس مقید لیے ہوئے تھا۔

تمام سلسلے بے حد پسند آئے۔

ج۔ فوزیہ! "آپ کچھ موتی چنے ہیں" میں آپ کو ضرور شریک کریں گے۔ "مقابل ہے آئینہ" آپ کو پسند نہیں مگر ہماری اور بہت سی بہنوں کو پسند ہے۔ "کرن" کی کہانیوں پر تبصرہ کرنے کا بے حد شکریہ۔ فکر نہ کیجیے آپ بہت اچھی طرح اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں۔

فائزہ محمد زبیر خان ــــ کراچی

اکتوبر کے شمارے کے لیے تو 9 تاریخ سے ہی بک اسٹال کے گرد کسی پروانے کی طرح منڈلانا شروع کر دیا تھا کہ پہلے جائیں... تو پہلے پائیں، مگر شمع کی وہی بے نیازی یعنی ملا وہی 13 تاریخ کو۔ کیا زبردست ٹائٹل ہے اکتوبر کا۔ حمد و نعت تو ہر بار ہی خوب صورت ہوتی ہے، مگر اس بار "اثر فاضلی جے پوری" کی "حمد" یقین جانیے اتنی زبردست میرے پاس تو الفاظ ہی نہیں ہیں کن الفاظ میں اس خوب صورت حمد کی تعریف کروں۔ بے شک محمود بابر فیصل جیسی زندگی سے بھرپور شخصیت کو بھلانا بہت ہی مشکل ہے۔ زینب جمیل سے ملاقات تو اچھی لگی، مگر بلال احمد قریشی کی تو کئی بار سن چکے ہیں، کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی۔ اپنے "مقابل آئینہ" میں "سیدہ نسبت زہرا" کا عکس بہت اچھا لگا کیوں کہ یہ اک مستقل قاری ہیں تمام قاریوں نے جو "کچھ موتی چنے ہیں" اس میں سب سے زیادہ چمکتے دمکتے موتی، شازیہ اعجاز، شاہدہ عامر اور جام پور کی شمع مسکان کے لگے۔ "کرن کرن خوشبو" میں تو فوزیہ ثمر بٹ کی عینی کی "پانچ منٹ" بعد ہونے والی آمد اور "کولمبس کی کامیابی کا راز" تو میں نے ہنس ہنس کر سب کو سنائی ہی سنائی۔ "یادوں کے دریچے" میں تو تمام غزلیں ہی اچھی تھیں۔ "حسن و صحت" میں بلش آن کے لیے دیے گئے ٹپس بھی کار آمد تھے۔ "مسکراتی کرنوں" میں اس بار یہ بات اچھی لگی کہ کم و بیش تمام ہی مسکراہٹیں نئی نئی سی لگیں (کم از کم مجھے تو)۔ "تنا رے میرے نام" کا تو کیا تذکرہ کروں کہ یہ تو ہے ہی پسندیدہ (پہلے بھی ذکر کر چکی ہوں یعنی خط کے ابتدا میں)۔ چلیں جی اب سلسلہ وار ناولز کی بات ہو جائے تو سب سے پہلے "راپنزل" کہانی تو دلچسپی سے بھرپور ہے، مگر انداز تحریر حد درجے سادہ کہیں سے بھی کچھ چونکا دینے والا نہیں لگ رہا۔ اب آتی ہوں "میں گمان نہیں یقین ہوں" کی طرف تو پچھلے ماہ اپنے تبصرے میں جو جو لکھ کر بھیجا تھا وہ صحیح ثابت ہوا یعنی ذیان ڈرامہ کر رہی تھی (دیکھا!) رنم ایک بہت ہی خود غرض کیریکٹر جو صرف اپنے آئیڈیل کو پانے کے چکر میں اک شادی شدہ مرد (ابیک) کی زندگی میں زبردستی گھسنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اب ذرا "ردائے وفا" کی بات ہو جائے۔ اس کی پچھلی اقساط کو لے کر کچھ وجوہات کی بنا پر چند ایک شکایات تھی، مگر اس ماہ کی قسط پڑھ کر تمام گلے شکوے دور ہو گئے۔ فائزہ افتخار کے ناولٹ "شاید" کی پچھلی قسط میں سعد پر بہت ترس آیا اور دل بھر آیا۔ ہائے بے چارے کی معصوم و نادان محبت کچھ کچھ سپنوں کی دنیا کا سیر کراتا افسانوی افسانوی سا، مگر پھر بھی بہت اچھا تھا شہناز صدیق کا مکمل ناول "تمہارا اسیر"۔ شبانہ شوکت کا ناولٹ "محبت ہم سفر میری" بے حد خوب صورت۔ صدف آصف کے ناولٹ "بجیت" کا سینٹرل آئیڈیا بے شک شاندار تھا

☼ ☼